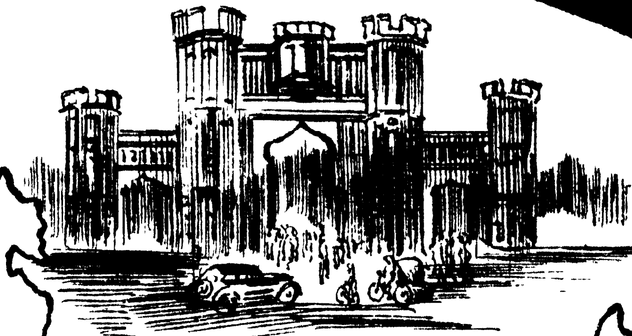
شہاب



صنعتی نمبر

آٹھویں نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ

خواتین کے تاثرات



ایڈیٹر محمد عبدالرزاق بسمل

۹۲/۵۸۶

ارشاد شاہانہ

حضار محفل۔

مصنوعات ملکی کی اس آٹھویں نمایش کا افتتاح کرکے مجھ کو بالخصوص اس لئے زیادہ مسرت ہوئی کہ یہ نمایش سرعت سے ترقی کر رہی ہے۔ اور اس سال متعدد نئے اسٹال اور نئے مظاہرے قایم کئے گئے ہیں اور نئے میدانوں میں قدم رکھا گیا ہے۔

حالیہ تباہ کن جنگ جو بمصداق اس آیۂ کریمہ کے ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور جو ہندوستان کی شرقی سرحد کو پار کرکے صوبۂ آسام تک پہنچی تھی۔ اس میں بانفضال الٰہی برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کو فتح نصیب ہوئی گو کہ یہ سچ ہے کہ اس جنگ کے دوران میں خداوند تعالیٰ جل شانہ نے مملکت حیدرآباد کو غنیم کی دستبرد سے محفوظ اور مصئون رکھا تاہم ایک زمانہ ایسا بھی گزرا جس میں ہوائی حملہ کا خطرہ ضرور پیدا ہوگیا تھا۔ اس جنگ کے زمانہ میں حیدرآباد کے اکثر صنعتی اور مالی ذرائع سامان جنگ کے تیار کرنے اور غنیم کی مدافعت کیلئے برطانیہ کو مدد دینے میں معروف رہے۔ اور گو کہ باوجود اس کے کہ اس نازک زمانہ میں بھی مملکت حیدرآباد کی صنعتی اور دوسری ترقیات بحمداللہ جاری رہیں۔ تاہم جنگ کی حالات کی وجہ سے ترقی کی رفتار میں لازماً رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔ لیکن اب جب کہ جنگ ختم ہوچکی ہے۔ ہمارا عین فرض ہے کہ ملک کی صنعت اور تجارت کی ترقی کو دوسری سب چیزوں پر فوقیت دیں اور اوس میں پوری کوشش کریں۔ اس طرح کی کوشش اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی اقتصادی اور معاشی کشمکش اور تجارتی رقابت تمام دنیا میں شدت کے ساتھ پیدا ہوگئی ہے۔ ان حالات میں جو قوم یا ملک صنعت و حرفت میں بازی لیجائیگا وہی ترقی کرسکیگا اور جو پیچھے رہ جائیگا اسکو افلاس اور بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تنظیم مابعد جنگ کے سب کاموں میں اوس حقیقت کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

اس ملک کا سب سے بڑا اور سب سے قدیم پیشہ زراعت ہے۔ اور گو کہ حال میں مختلف قسم کی دوسری صنعتیں بھی پیدا ہوگئی ہیں اور پیدا ہوتی جاتی ہیں تاہم ملک کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زرعی پیداوار ہے۔ اور اس پیشۂ زراعت میں رعایا کی سب سے بڑی جماعت مصروف ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہندوستان فی الجملہ ایک زرعی ملک ہے۔ اس لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ زراعت کے جدید طریقے رعایا کو سکھائے جائیں اور زراعت کے

جدید آلات اور اوزار جو ملک کے اندر تیار ہو سکتے ہوں وہ بنائے جائیں اور ان کا استعمال رعایا کو سکھایا جائے - اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سررشتہ زراعت اور اس نمایش کی کمیٹی میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اشتراک عمل کی ضرورت ہے - دوسری طرف بلدہ میں زرعی کالج اور اضلاع میں زرعی اسکولوں کی شدید ضرورت ہے - لہذا مجھے امید ہے کہ اگریکلچرل کالج کی اسکیم جلد تکمیل کو پہنچے گی -

مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ ہمارے ٹرننگ کالج نے جو فن تعلیم کی کتابیں ترجمہ و تالیف کی ہیں وہ ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتی ہیں -

ملکی مصنوعات کی نکاسی کے لئے مشترکہ سرمایہ کی تجارتی کمپنی قائم کرنے نیز صناعوں کو بلا سودی قرض اور بچوں کو صنعتی تعلیمی وظائف مجلس کے فنڈ سے دینے کی تجاویز بہت مناسب ہیں - ان کو عمل میں لایا جائے -

جتنی آمدنی مجلس نمایش کو دوسرے ذرائع سے حاصل ہے - اسی مقدار میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے اس کو امداد دینے کا مسئلہ ایسا ہے جس پر سررشتہ متعلقہ غور کر سکتا ہے - میں اس وقت کوئی وعدہ نہیں کر سکتا -

بہترین اختراعات اور بہترین سجاوٹ کیلئے جو انعامات مقرر کئے گئے ہیں - بہت مناسب میں خواتین کی دست کاری کیلئے بھی مسابقت کے اصول پر انعام مقرر ہو تو مناسب ہے -

مختلف صنعتوں کے نمونے رکھنے کے لئے ایک مستقل "نمونہ گھر" قایم کرنے کا خیال اچھا ہے لیکن یہ امر صراحت طلب ہے کہ باغ عامہ کی موجودہ عمارتوں میں اس کیلئے جگہ نکل سکیگی یا جدید عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت ہوگی - بہرحال اس بارے میں تفصیلی تجاویز میرے پاس بتوسط کونسل پیش کیجائیں تو اس پر حکم مناسب صادر کیا جائیگا -

اس خیال سے کہ آئندہ یہ نمایش بارش کے ایام میں نہ ہو - سال آئندہ اس پر غور ہوگا کہ اس کے لئے کونسا مہینہ مناسب ہوگا جس کا اعلان بر وقت کیا جائے گا -

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زین یار جنگ نے نمائش کی تنظیم میں جس سلیقہ اور محنت سے کام کیا ہے - اور اس میں مختلف قسم کی جدت پیدا کی ہے - اور ہر پہلو سے اس کو ترقی دی ہے - ان کی اس خدمت کو میں قدر کی نظر سے دیکھتا ہوں - نیز مجلس نمایش کی کارگذاری کی قدر کرتا ہوں - جس نے اس کام میں ان کو مدد دی - کہ مجھے یہ دیکھنے کا انتظار رہے گا کہ آئندہ سال اس نمایش میں (جو ملک کی اچھی خدمت کر رہی ہے) کیا مزید ترقی ہوگی ؛

سپاس نامہ

خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بہ پیشگاہ والا اعتبار بندگان عالی حضرت جلالت الملک سلطان العلوم شہریار حیدرآباد دبرار

بعد از آستاں بوسی بکمال ادب مؤدبانہ عرض ہے کہ اس آٹھویں نمائش مصنوعات مملکت آصفیہ کی یہ خوش بختی ہے کہ آقائے ولی نعمت بہ نفس نفیس اس کی افتتاح فرما رہے ہیں جس پر ارکین مجلس نمائش ہمیشہ فخر و ناز کریں گے کیونکہ اس نمائش کا تدریجی ارتقاء صرف حضرت جہاں پناہی کی شاہانہ سرپرستی کا نتیجہ ہے اور یہ تو مسلمہ ہے کہ مملکت آصفیہ کی موجودہ ترقیاں اور خوش حالیاں تمام تر حضرت پیر و مرشد کی حکیمانہ تدبر کی مرہون منت ہے۔

اس نمائش کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد یورپ میں قیامت خیز جنگ چھڑ گئی جس سے مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوئے مگر مملکت آصفیہ کے طول و عرض میں امن و عافیت کا دور دورہ رہا اور اہل ملک کی زندگی ترقی میں کوئی ایسی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی جو محسوس کی جا سکے اور اس احساس کا یہ نتیجہ تھا کہ ایسے زمانہ میں بھی یہ نمائش ہوتی رہی اور اسی زمانہ کے یہ برکات ہیں کہ پانچویں نمائش سے اس کا افتتاح اعلیحضرت جلالت الملک اپنے دست ہمایونی سے فرمانے لگے۔

جنگ کے اختتام سے مملکت آصفیہ میں بھی ایسے مسایل پیدا ہو گئے ہیں جن کے حل کرنے کے لئے حضرت پیر و مرشد کی شاہانہ سرپرستی میں اہل ملک کی خاص توجہ اور انہماک کی ضرورت ہے۔ اور وہ مسایل یہ ہیں:-

۱- زرعی قدرتی وسایل سے ممکنہ استفادہ - ۲- تجارت و صنعت کا فروغ - ۳- ایسے ذرائع تعلیم جن سے اہل ملک میں عملی صلاحیت کی نشو و نما ہو - ان ہی مسایل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نمائش کے آٹھویں سالانہ جلسہ میں جن موضوعات پر غور کیا جانے والا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- مملکت آصفیہ میں امداد باہمی کے مابعد جنگ رجحانات - ۲- مملکت آصفیہ کے مابعد جنگ معاشی مسائل -
۳- مملکت آصفیہ کی مابعد جنگ ترقیات کا مالیاتی پہلو - ۴- مملکت آصفیہ کی آب پاشی کے معاشی مسایل -

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ توجہات شاہانہ کی بدولت یہ نمائش یکے بعد دیگرے کامیابی کے زینوں پر چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور حکومت سرکار عالی کا تعاون صناعوں کا اشتراک عمل اور اہل ملک کے اعتماد سے قوی توقع ہے کہ یہ ارتقائی صورت آئندہ برقرار رہے گی۔

اس نمائش کے انعقاد کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے قدرتی ذخائر سے اہل ملک کو روشناس کیا جائے۔ پیداوار میں اسباب ترقی سے واقفیت ہو، اور مصنوعات کے مظاہرات سے صنعتی کاروبار میں عملی ترقی کا راستہ پیدا ہو غرض کہ مملکت آصفیہ کی ہمہ جہتی ترقی نمایاں کی جائے جس سے اہل ملک کی خوش حالی کی ضمانت

دی جاسکے۔

نمایش میں نہ صرف مصنوعات کے مختلف شعبے قایم کئے جاتے ہیں بلکہ سرکاری سررشتوں اور قومی اداروں کے کام کو بھی خاص خاص شعبوں میں نمایاں کیا جاتا ہے۔ فنون لطیفہ۔ ملکی ثقافت اور طیلسانین عثمانیہ کی تالیفات و تراجم کے شعبے بھی ترتیب دئے جاتے ہیں۔

پچیس سال پہلے جب کہ جامعہ عثمانیہ کا منشور خسروی شرف صدور نہیں لایا تھا۔ اہل ملک درسی کتب اور تعلیمی مصنوعات کے لئے بھی بیرونی امداد کے محتاج تھے۔ آج فن تعلیم کی حد تک کلیہ تعلیم المعلمین سرکار عالی سارے ہندوستان میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اور درسی کتب آلات تعلیم وغیرہ کی حد تک حیدرآباد بیرونی مصنوعات کا بہت کچھ مقابلہ کر رہا ہے۔ ہر فنی تعلیم سے متعلق سرکاری منصوبے بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اس سال نمایش میں صنعتی تعلیم اور تعلیمی مصنوعات کا ایک علحدہ شعبہ بھی قایم کیا گیا ہے۔ اور یہ پہلی مرتبہ سررشتہ تعلیمات کے اسٹال بھی اس شعبہ میں شریک ہیں۔

خواتین کی دستکاری کے اسٹال پہلے بھی نمایش میں قایم ہوتے تھے۔ اور اس سال بھی ان کا ایک جداگانہ شعبہ ترتیب دیا گیا ہے تاکہ خواتین کی خانہ داری کے مختلف شعبوں میں جو سلیقہ و شعور ہے۔ اس سے اہل ملک واقف ہوتے جائیں اور یہ امر صنف نازک کی عمرانی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ نیز مظاہرہ اطفال کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

حسب احکام خسروی تیسری اور چوتھی نمائش کے موقع پر سررشتہ زراعت کے اہتمام میں باغبانی اور زراعتی کی بھی نمایش کی گئی تھی۔ مگر موسم کی ناموزونیت کی وجہ سے یہ سلسلہ بعد میں ترک کر دیا گیا تھا مگر اس سال مجلس نمایش نے متعلقہ سررشتوں اور دیگر اہل ملک کے تعاون سے تعطیلات عید الضحٰی میں مویشی اور پرندوں کی نمایش کا انتظام کیا ہے۔ دیہی ترقی و تنظیم کے اسٹال اس کے سوا ہیں۔ جن کو متعلقہ سررشتے قایم کر رہے ہیں۔

گذشتہ سال کی طرح صوبہ داران و تعلقداران اضلاع اور جاگیرداروں اور سمستانوں نے بھی اپنے اپنے علاقوں کے اسٹال اس سال قائم کئے ہیں۔ علاوہ صرف خاص مبارک کا اسٹال بھی شریک ہے۔ نیز اضلاع برار کے حسب اسٹال ایجنٹ برار سرکار عالی اور مسٹر انعام الحق آئی۔ سی۔ ایس۔ کمشنر برار کی دلچسپی سے قایم ہوئے ہیں۔ مسابقت کی خاطر سب سے بہتر ضلع اور سب سے بہتر جاگیر کو "رولنگ کپ" بھی دئے جائیں گے۔

اس سال مجلس نمایش نے اپنے موازنہ میں کئی ہزار روپیہ کی گنجایش نمایش گاہ میں زیادہ سے زیادہ سہولتوں کے اہتمام اور صناعوں کے آرام و آسایش کے لئے مہیا کی ہے۔ جس میں انعامات بھی تقسیم کئے جائیں گے۔ ان انعامات میں بہترین ایجادات کے لئے دو ہزار روپیہ کے تین انعام اور بہترین تجاویز کے تین انعام

رکھے گئے ہیں۔

طیلسانین جامعہ عثمانیہ اور دوسرے اہل ملک کی معاشی تصانیف اور مقالات کی طباعت و اشاعت کے سوا صنعتی ڈائرکٹری کی مستقل طور سے سالانہ ترتیب و تالیف اور اس کی وسیع پیمانہ پر تقسیم و تشہیر بھی مقصود ہے صنعتی و معاشی کتب و رسایل کو کثیر تعداد میں خرید کر معاشی کتب خانہ کو توسیع دی جائے گی جو عارضی دفتر نمایش میں عام استفادہ کے لئے قایم ہے۔

ارشاد خسروی کی تعمیل میں ملکی مصنوعات کی نکاسی کے لئے مشترکہ سرمایہ کی ایک تجارتی کمپنی کے قیام سے متعلق مجلس نمائش کی تجاویز ایسے متعلقہ حکام سرکار عالی کے سامنے ہیں۔ امید ہے کہ جلد از جلد ایسی کمپنی کے قیام کی منظوری حاصل ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ گذشتہ سال ایک صنعتی "نمونہ گھر" کی ابتداء کر دی گئی ہے جس میں مختلف مصنوعات کے نمونہ صناعوں کے پتے اور مصنوعات کی قیمت کی صراحت کے ساتھ جمع کئے جا رہے ہیں۔ احاطہ نمایش میں آنے والے افراد اس "نمونہ گھر" کا معاینہ کرنے کے بعد ان مصنوعات کی خریدی کے لئے فرمائشات دفتر نمایش میں داخل کرتے ہیں۔ اگر باغ عامہ کی کوئی متعلقہ عمارت اس کیلئے مل سکے تو بہت جلد عجائب خانہ باغ عام کی طرح یہ صنعتی "نمونہ گھر" بھی عام دلچسپی کا موجب بن سکے گا۔

مجلس نمائش کا صناعوں کے ساتھ جو ربط گذشتہ سات سال سے قایم ہے اس سے اس کا یقین ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو کیوں کر فروغ دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ انہیں سرمایہ کے حصول میں دشواری نہ رہے۔

مجلس نمایش فی الحال دس ہزار روپیہ سے ایک مستقل فنڈ قایم کر چکی ہے جس سے صناعوں کو مناسب کفالت پر بلاسودی قرضے دئے جایئں گے۔ ہر سال اس فنڈ میں مناسب رقومات کی شرکت بھی پیش نظر ہے سرکار عالی کا انڈسٹریل فنڈ بڑی بڑی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے مختص ہے اس کے مقابل چھوٹے چھوٹے صناعوں کو آسانی کے ساتھ اور سہل طریقہ کار کے تحت قرضوں کی اجرائی کا افادہ بھی بہت دور رس ہوگا۔ مجلس نمایش نے اس سال صنعتی تعلیمی وظایف کیلئے بھی کچھ رقم محفوظ کی ہے تاکہ ملک میں ماہر فن صناعوں کی کمی کی شکایت کا کچھ نہ کچھ ازالہ ہو سکے۔

اس موقع پر اس کی صراحت بھی ضروری ہے کہ مجلس نمایش کو کاروباری تنظیم کی خاطر قانون کمپنی ہائے سرمایہ مشترکہ کے تحت رجسٹر کرا لیا گیا ہے۔ جو منافع مجلس نمائش کو ہر سال ہوتا ہے۔ اس کو مشترکہ سرمایہ کمپنیوں کی طرح باہم تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ نمایش کی ترقی و مزید استحکام کے لئے اس کو محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے اور لائے جانے کے قابل ہے کہ مجلس نمایش کے اخراجات کی تکمیل کا ایک ذریعہ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی رقمی اعانت ہے۔ گذشتہ چار سال سے اس فنڈ کی مجلس امناء

سالانہ (۸۰۰۰) ہزار روپیہ کا گرانٹ کاروبار نمایش کی تکمیل کے لئے منظور کیا ہے جو موجب تشکر ہے۔
لیکن اب نمایش کے کاروبار اتنے ترقی پذیر ہیں کہ اس کے لحاظ سے اب یہ امداد اس عام اور مسلمہ اصول کے مطابق ہونا چاہئے کہ جتنی آمدنی مجلس نمایش کو دوسرے ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ اتنی ہی رقم سرکار عالی سے بطور گرانٹ عطا ہو۔

اس موقع پر ایک ضروری امر کے طرف توجہات شاہانہ مبذول کرانے کی جسارت کی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اب تک نمایش کا افتتاح ارشاد خسروی کی تعمیل میں یکم ذی الحجہ سے ہوتا ہے لیکن آئندہ سے ماہ ذی الحجہ کئی سال تک موسم بارش میں آتا رہے گا۔ اس لئے اگر منشائے ہمایونی ہوگا تو یکم فروردی کی تاریخ نمایش کے افتتاح کے لئے مقرر کردی جائے گی۔ تاکہ موسم کا اعتدال نہ صرف صناعوں اور دوسرے خدمت گزاروں کے لئے سہولت کا باعث ہو۔ بلکہ اطراف و اکناف سے نمایش کے معائنہ کے لئے لوگ جمع ہوسکیں۔

۔ آخر میں فدوی جاں نثار کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ ان اکابرین سررشتہ جات اور اداروں کا مجلس نمایش کی جانب سے دلی شکریہ ادا کرے۔ جن کے تعاون اور ہمدردیوں سے یہ نمایش کامیاب ہوتی رہی ہے۔ اس خصوص میں حضرت والاشان ہز ہائی نس اعظم جاہ بہادر پرنس آف برار دام اقبالہ اور حضرت والاشان شہزادہ معظم جاہ بہادر دام اقبالہ کی دلچسپیاں کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔

اب بہ کمال ادب معروضہ ہے کہ حضرت ظل سبحانی از راہ مکارم سلطانی آٹھویں نمایش مصنوعات مملکت آصفیہ کا افتتاح فرماکر مجلس کی عزت افزائی فرمائیں تاکہ صنعت و تجارت کے فروغ و ترقی کی دست مبارک سے ضمانت مل سکے۔ اللہ تبارک و تعالی سے امید ہے کہ اس افتتاح کی برکت سے مجلس نمایش کا کام مستقل سودمندی اور حقیقی خدمت کا ایک نیا نشان راہ ثابت ہوگا اور ہم سب جاں نثاران دولت کی بصد منت و اخلاص بارگاہ صمدیت میں یہ دعا ہے کہ آقائے ولی نعمت کے سایہ ہمایونی کو دیر گاہ سلامت باکرامت رکھے اور خانوادہ شاہی کو زیر سایہ ہمایونی ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ آمین بہ جاہ طٰہٰ و یٰسین۔
زیادہ حد ادب

آلہی آفتاب عمر و دولت و اقبال دائماً تاباں و درخشاں باد

معروضہ

فدوی جان نثار زین یار جنگ
صدر مجلس نمایش معاشی کمیٹی انجمن طیلسانین عثمانیہ (حیدرآباد دکن)

نمائش مصنوعات ملکی

زینت ساجدہ بی۔ اے

مہینوں سے مجھے انتظار تھا کہ بقر عید کا مہینہ آجائے۔ بات یہ ہے کہ یہ مہینہ عید تو لاتا ہی ہے لیکن میرے لئے عید ہی بھی لاتا ہے وہ نمائش مصنوعات ملکی ہے۔ ہر سال دیکھتی ہوں پھر بھی اکتاتی نہیں جتنے دن بھی خواتین کے لئے مخصوص ہوتے ہیں ان سب میں ضرور جاتی ہوں۔ یہ بھی مردوں کی خودغرضی ہے کہ وہ تو سارا مہینہ صبح و شام نمائش دیکھتے رہتے ہیں اور عورتوں کو صرف تین چار دن ہی دیتے ہیں۔

پرسوں کالج سے گھر آ رہی تھی موڑ پر بڑا سا اشتہار نظر آیا دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔ یوم خواتین مصنوعات ملکی کا اعلان تھا۔ گھر آ کر امی سے ذکر کیا۔ امی کہنے لگیں کہ تم تو ہر دفعہ جاتی ہو، میں ان سب چھوٹے چھوٹے بچوں کو سمیٹے کہاں تمہارا ساتھ دے سکونگی۔ کسی دن فرصت ہو تو دیکھ آؤں گی تم منجھلی سسرال سے آئے تو اس کے ساتھ چلی جانا۔ اتنا روکھا سوکھا لمبا چوڑا جواب سن کر جی جل گیا منجھلی آپا سسرال جا کر بیٹھ رہتی ہیں اُن کا کیا ہے۔ پرائی بیٹی پڑوسن برابر اور یہاں میرے لئے سارا گھر اداس ہو جاتا ہے۔ بھابی گھر میں ہیں بھی تو کیا وہ تو بھائی صاحب کے ساتھ مردانہ میں بھی چلی گئی ہیں اور ان کی ساری دلچسپیاں بس انہی کے گرد گھومتی ہیں۔ یوں بھی کبھی سینما جانے پک نکس جاتے انھوں نے مجھے پوچھا تک نہیں۔ چھٹی کا دن گزارنا تو میرے لئے مصیبت ہو جاتا ہے اور سہاتی شامیں تو کسی طرح گذر ہی نہیں سکتیں۔

بڑی مشکل سے منجھلی آپا کو خط لکھ کر بلایا بہن ہو تو واقعی میری منجھلی آپا جیسی۔ وہ مجھ سے کسی بارے میں الجھتی ہی نہیں اور میں اپنی مرضی کے موافق ان کا ساتھ دلسکتی ہوں جمعہ کا دن ادھر آیا اور میں نے صبح سے ہی وہاں جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جلد جلد ہوم ورک سے فارغ ہو گئی۔ بننا سنورنا مجھے پسند نہیں۔ ہاں دوسروں کی نمائش دیکھنا بہت پسند ہے۔ میں مصنوعات ملکی کے ساتھ ساتھ خواتین ملکی کی نمائش بھی دیکھنے جاتی ہوں، دو بجے ہوں گے کہ باغ عام کی پھاٹک پر پہنچ گئے۔ خدا کی پناہ! سڑک سواریوں سے پٹی ہوئی تھی۔ سارے شہر کے رکشے، تانگے، شکرامیں اور موٹر کاریں سمٹ سمٹ کی سب یہیں آئی تھیں۔ چیونٹی کی چال سے پردہ گیٹ تک پہنچے

گرمی کے مارے برا حال ہو گیا۔ جوں ہی اتر کر ٹکٹ لیا
نفیس کی پیاری صورت نظر آئی جی خوش ہو گیا
اور ساری کوفت جو راستہ بھر یہاں تک آتے
آتے اٹھائی تھی بسر گئی۔

ہم تینوں چلے۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ
نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس سرے سے اس
سرے تک ایک چکر لگا آئیں گے۔ پھر جی چاہے کہیں
جائیں۔ ہم نے پہلے شکار گاہ کا رخ کیا تاکہ اسے
دیکھ لیں تو نمایش کے احاطہ میں داخل ہوں۔ شکار
گاہ حسب معمول بڑی سجائی ہے، ہاتھی، شیر،
چیتے، نیل گائیں، ہرن، سبھی کچھ وہاں موجود ہیں
انسان کی فطرت ہی شاید شکاری ہے کہ وہ کبھی
انسانوں کا شکار کرتی ہے کبھی حیوانوں کا۔ ہرنوں
کی آنکھیں مردہ تھیں اس لئے وہ خوبصورتی ان
میں نظر نہ آئی جو زندہ آنکھوں میں ہوتی ہے پھر
بھی جی چاہا ایک آدھ بارہ سنگھے کا سر چرا کر لے
چلو۔ مگر وہاں چوری کا موقع ہی کیا تھا۔ ہزاروں
آنے جانے والے اور پھر وہاں کے نگران کار۔

شکار گاہ میں جتنی مشکل سے داخل ہوئے
تھے وہاں سے نکلنا اس سے بھی زیادہ مشکل تھا،
عورتوں کا سمندر تھا کہ دروازہ پر امنڈ آیا تھا۔
ہم تو خیر وخوبی نکل آئے۔ لیکن ایک بیوی کا پیر
بری طرح کچل دیا۔ اور پھر معافی بھی مانگ لی ہمارا
آج کل کی تہذیب کی برکتوں میں سے ایک برکت
یہ بھی ہے کہ تکلیف پہنچا کر معافی مانگ تو چھٹی ہو گئی۔

اب ہم نمایش کے احاطہ میں داخل ہو گئے
سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرف سے دیکھنا شروع
کریں۔ کیونکہ ہر طرف سے "جا اینجاست" کی آواز
آتی۔ بغیر کسی مقصد کے یونہی گھوم گھوم کر دیکھتے
رہے۔ فرنیچر کی دکان میں گئے۔ صوفوں پر بیٹھ کر
آرام کیا۔ آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ خوامخواہ
پلنگوں اور میزوں کی قیمت دریافت کی۔ اور آگے
چل دئے۔ کھلونوں کی دوکانوں پر عورتوں کی بڑی
بھیڑ تھی۔ ہم نے ہر ایک کو غور سے دیکھا تو
سب کی سب ایک دو عدد بچوں کی مائیں تھیں
اور ماؤں کو سب سے پہلا خیال کسی جگہ بھی آتا
تو وہ بچوں کا ہی ہوتا ہے۔ ہماری منجھلی آپا نے
بھی اپنے منوں کے لئے کچھ کھلونے خریدے رنگین
کھلونے بچوں کا دل لبھاتے ہیں اور انسانی کھلونے
ہمارا۔ ایسا کچھ زیادہ فرق نہیں ہے دل بہلانے میں
زیورات کی دکانیں جگمگ کر رہی تھیں
خدا معلوم کیا بات ہے۔ جب سے جنگ چھڑی
ہے جوہریوں اور سناروں نے سونا اور جواہرات
بیچنے کے بجائے خریدنے کا اعلان کیا ہے دکانوں
پر سونے اور اصلی جواہرات کی چیزیں نظر آئیں
چاندی کا سامان اور جھوٹے زیورات قسم قسم کے
تھے ان کی چمک اور وضع اتنی پیاری ہوتی ہے
کہ خریدے بنا نہیں رہا جاتا۔ وہ دن گئے جب
اصلی چیز کی پرکھ تھی۔ آج کل تو لینے والے بھی جھوٹے
اور دینے والے بھی جھوٹے۔ جو چیز چلے وہی اچھی نظر آئے۔

نفیس نے ٹاپس اور چوڑیاں خریدیں۔ منجھلی آپا نے دلہا بھائی کے لئے ایک چاندی کا سگریٹ کیس لیا۔ میں نے ساڑھی کا ایک بروچ لیا۔

چوڑیوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ رونق تھی۔ کیوں نہ ہو سہاگ یہاں بکتا تھا۔ ہم کو چوڑیاں خریدنا تو تھا نہیں مگر یونہی دکان کی سیر کرلی۔ رنگ برنگی چوڑیاں۔ چکیلی کھنکتی چوڑیاں اور ان کے نام تو بہت ہی عجیب تھے۔ چل چل رے نوجوان، ہماری بات وغیرہ وغیرہ۔

بیدری اسٹال دیکھا۔ وہاں کی بنی ہوئی چیزیں اپنی خاص خصوصیت کی وجہ مشہور ہیں۔ اب زیورات میں بہت اچھے اور نئے ڈیزائن بننے لگے ہیں۔ ساڑھیوں کے پن، بالیاں، چوڑیاں اور کڑے سبھی خوبصورت ہوتے ہیں، تھالیاں کشتیاں اور ڈبیاں بھی نئی نئی وضع کی بنائی جانے لگی ہیں۔ ہماری ملکی صنعتوں میں اس صنعت کو اور زیادہ ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ خوبصورت چاندی کا کام سیاہ پس منظر کے ساتھ بہت خوب نظر آتا ہے۔

ہاتھی دانت کا کام بھی دیکھا۔ نازک اور خوبصورت۔ نفیس نے ٹاپس لئے۔ میں نے ہاتھی دانت کا ترشا ہوا ایک چھوٹا سا ہاتھی لیا۔ اس سے بنی ہوئی چیزوں میں کچھ نسائیت ہوتی ہے۔

برتن اور کانچ کے سامان کے اسٹال دیکھے حیدرآباد کو اگر موقع دیا جائے تو وہ اپنی ہر ضرورت کی تکمیل بخوبی کرسکتا ہے۔ برتن اگرچہ نازک نہ تھے لیکن ایسے برے بھی نہ تھے کہ کام نہ چلے۔ صابون، خوشبو اور معالجوں کی دکان دیکھی۔ گوٹے ٹھپے کے اسٹال پر کچھ خرید و فروخت ہوئی۔ اورنگ آبادی اسٹال پر سلک ہمرو بہت اچھے نظر آئے۔ ایک ساڑی خریدی۔

پان کی دکانیں جگہ جگہ تھیں۔ جی بہت چاہتا تھا کہ خرید کر پان کھائیں۔ لیکن منجھلی آپا کے خیال میں یوں سر بازار پان خرید کر چباتے پھرنا شہدوں لفنگوں جیسا لگتا ہے۔

ہوٹلوں پر بڑی بھیڑ تھی۔ کوئی میز خالی نہ تھی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے لیمن پیا اور نکل آئے۔ باقی دکانیں بھی دیکھ ڈالیں۔ عام اسٹالوں میں مچھلیوں والا اسٹال بہت پسند آیا۔ رنگ برنگی چھوٹی بڑی خوبصورت مچھلیاں تھیں۔ معلوم نہیں بیچاریاں کہاں کہاں سے پکڑ کر لائی گئی تھیں۔ گھبرائی گھبرائی بے چین بے چین تیرتی پھرتی ہیں اور ہم انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوسکتے ہیں کہ واہ کیا پھرتیلی ہیں۔ بیچاری مچھلیاں۔

جھولوں پر جگہ نہ ملی۔ کشتی رانی کا تو ٹکٹ ملنا ہی نہ تھا۔ منجھلی آپا تھک کر ستانے ہی ہری دوب پر بیٹھ گئیں۔ ہم بھی کچھ دیر ٹھٹھک گئے۔ وہیں تارا سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ بے بی شو ہے۔ اس کی اپنی بچی بھی نمائش میں آئی ہے

ہم تینوں بے بی شو والے ڈیرے میں گئے
مختلف مائیں نہایت فخر کے ساتھ اپنے نتائج
امتحان ساتھ لائی تھیں۔ ایک بچہ تو بڑا اچھا
تھا۔ گول گول نرم نرم۔ ماں خود بھی بڑی پیاری
سی تھی۔ یہ پہلی کوشش تھی۔ جب ہم نے خوب
تعریف کی تو خوش ہو گئی۔ انعامات کی تقسیم کے
بعد ہم باہر نکل آئے۔

آپا پھاٹک کے پاس جاکر بیٹھ گئیں۔
ہم نے وعدہ کیا کہ ایک دفعہ اور گھوم کر پھر آئیں گے
میں اور نفیس چلے۔ ہم دونوں کو اور کیا چاہئے۔
گپ ہانکتے لوگوں کو دھکا دیتے اوروں پر تنقید
کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک دلہن
بیگم سے ملاقات ہوئی جو شرمائی لجائی نندوں کے
جھرمٹ میں گھونگٹ کاڑھے سر جھکائے ٹھمک
ٹھمک چلی آ رہی تھیں۔ ساڑھی خوب چمکیلی تھی
آنکھیں بند تھیں۔ ہم دونوں کی سمجھ ہی میں نہ آیا
کہ یہ آنکھیں بند کئے آخر کونسی نمائش دیکھیں گی۔
بعد میں سمجھ میں آگیا کہ یہ اپنی نمائش کے لئے آئی
تھیں۔ اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔
کہ ہزاروں آدمی ان کے دلہنیاپے کی تعریف کریں
اور ان کے جگمگاتے کپڑے و زیور دیکھیں۔

بٹن فیکٹری پر دو نئی بیاہی لڑکیاں کھڑی
تھیں۔ یہ ہم نے ایسے جانا کہ بات بات میں "ان"
کا ذکر آ جاتا تھا۔ ایک دوسری سے کہہ رہی تھی
"سکینہ میں تو یہ نیلا گھنڈیوں کا سٹ لوں گی
انہیں یہ نیلا نیلا آسمان جیسا رنگ بہت پسند ہے
ان کی پسند آسمان جیسی وسیع ہے ——— دوسری
بولی "آپا" آمینہ میں تو یہ سبز سیٹ لوں گی۔
اس پرکا ڈیزائن تو دیکھ تتلی پھول کو چوم
رہی ہے۔ "زندگی کی کتنی پیاری تصویر ہے اور
اس سے بڑھ کر کیا چاہئے کہ میں اس عید پر اپنی
"زندگی" دیدوں"

ایک بڑی بی مسلسل نفیس کو گھور رہی
تھیں۔ آخر قریب آکر پوچھنے لگیں کہ نام اور
پتہ کیا ہے۔ نفیس نے نہایت ادب کے ساتھ
غلط نام اور پتہ بتا دیا وہ بڑی خوش ہو گئیں اور
اپنے صاحبزادے کی تعریف کرنے لگیں جو اس سال
تحصیلدار بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جب
اپنا پیچھا چھڑا کر ہم دونوں چلے تو ہنسی کے مارے
برا حال تھا۔ معلوم نہیں نفیس کو وہ بیچاری کہاں
کہاں ڈھونڈیں گی۔

شام ہو چکی تھی۔ چراغ جل اٹھے آتش
بازی دیکھنے کو ہم دور نکل آئے۔ تالاب میں کنول
کے پھولوں کو پیار کرتی کشتی بہہ رہی تھی اور
اس میں چند لڑکیاں بیٹھی گاتی جا رہی تھیں آگے
سے ایک غبارے والا گذرا۔ رنگین غبارے لئے۔
ہم دونوں نے دو غبارے خریدے۔ اور منجھلی آپا
کے ساتھ اپنی سواری کی تلاش کرنے لگی پھاٹک
پر ایک اژدہام مجمع تھا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی
فکر تھی۔ قیامت میں بھی لوگ اتنے خود غرض

نہ ہوتے ہوں گے جیسے یہاں ہو جاتے ہیں۔ آپا گاڑی بلانے چلی گئیں۔ اور میں کھڑی سوچتی رہی کہ نمائش دیکھنے کا فی خوشی ہوئی۔ اب جاتا ہے۔ اتنی ساری دلچسپیوں کو پیچھے چھوڑ کر اور ہم ساتھ کیا لئے جا رہے ہیں؟ معمولی چیزیں اپنے رنگین غبارے کو دیکھ کر ڈھارس ہوئی کہ ایک حسین چیز خرید لی۔

(۴) اضلاع اپنی کسی نہ کسی خصوصیت کو نمائش میں پیش کر رہا ہے اور مختلف وہاں کی تیار کردہ اعلیٰ درجہ کی اشیاء بیک وقت نظر آتی ہیں اورنگ آباد کا ہمرو مشروع کمخواب۔ آج بھی ہندوستان بھر میں مشہور ہے اور اسے آپ نمائش میں دیکھ لیجئے۔ بیدری ظروف اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ پیٹھن کے زرین بارڈر اور دیگر کام۔ کریم نگر کا تارکشی کا کام۔ الغرض نمائش کیا ہے ایک عجائب خانہ ہے کہ وہاں بہتر سے بہتر اور نادر چیزیں دیکھ سکتے ہیں اب جنگ ختم ہوگئی اور ظاہر ہے کہ زمانہ میں امن امان پھیل جائیگا اور حاصل کی ہوئی فنی تربیت اب کام آے گی۔ ملک کے طول عرض میں صنعت و حرفت کے فروغ کیلئے آئے دن جو مزید کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہو رہی ہیں ان میں فنی دانوں کی اہمیت خاص طور پر بڑھ جائیگی یہ امر بھی سب پر روشن ہے کہ آئندہ طریقہ تعلیم کو زیادہ فنی بنایا جائے گا۔ دیگر حصول و دولت میں صنعت و حرفت کی اہمیت آج سے کل زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ کیا اچھا ہو، اگر ہر شخص اس بات کا عزم کرلے کہ وہ ہر ضرورت کی چیز اپنے ملک کی بنی ہوئی خریدے اور صرف وہ اشیاء جو اپنے ملک میں نہیں تیار ہوتیں باہر سے خریدے بلکہ اس مسئلہ میں غور و فکر کرے کہ کیوں نہیں وہ چیزیں بھی......ملک میں بنائی جائیں اور [illegible]

نمائش کی ضرورت

سیدہ زہرا رضویہ

زمانہ بدلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہماری بھی معاشرتی اور تمدنی زندگی بھی کروٹیں لیتی رہتی ہے تاریخ بتاتی ہے کہ انسان پہلے وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ جنگل کے پھل پھول کھاتا اور پتوں سے بدن ڈھانکتا غاروں و کھوؤں میں سو کر اپنی زندگی بسر کرتا تھا پھر زمانہ نے ترقی کے اعلیٰ منازل طے کئے انسان کو اپنی ضرورتوں کا احساس ہوا، اور اس نے اپنی دماغی کاوشوں سے زندگی کا نظام العمل بدلا۔ بجائے پتوں سے تن ڈھانکنے کے لباس تیار کئے اور جنگلات میں رہنے کے بجائے شہر آباد کئے اور اب اپنی ضرورتوں کو ذرا مہذب طریقہ پر پورا کرنے کے قابل ہوا ۔۔ زمانہ نے کروٹ لی یا یہ کہ ترقی کی سماج نے چولا بدلا اور ہر طرف تعلیم کے چراغ جگمگاتے ہوئے نظر آنے لگے۔ انسان تہذیب و تمیز کے گہوارہ میں جھولنے لگا اسی رفتار سے انقلابات آتے رہے اور ضرورتیں بڑھتی گئیں اور ساتھ ہی ایجادات بھی ہونے لگیں اس کے ساتھ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ایسی صنعتیں اکٹھا کر کے دوسروں کو مسابقت اور ترقی کا شوق دلایا جائے۔ اس طرح نمائش نے جنم لیا ۱۸ءکے تک بحر صنعت میں بڑے بڑے طوفان آئے جسے "صنعتی انقلاب" کہا جاتا ہے۔ ۱۳۲۸ف میں پہلی نمائش مصنوعات ملکی حیدر آباد کا افتتاح نواب سر اکبر مرحوم نے فرمایا۔ اس نمائش میں تقریباً سو اسٹال تھے اور یہ دس دن تک رہی انہی ترقی پسند حضرات کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم

نمائش کی داستان

صغرا عبدالسبحان

نزہت! تم نے حیدرآباد کی نمائش مصنوعات ملکی کی تفصیل بڑی دور سے بیٹھ کر دریافت کی ہے۔ میں نے تو لکھا تھا کہ تم آجاؤ تو آنیوالی نمائش میں میری شرکت بھی ضروری ہو جائے گی مگر تم نے الٹا میرے سر ایک نیا کام تھوپ دیا یعنی میرا نمائش میں جانا تو چولہے میں گیا اور اب تمہارے لئے نمائش کی تفصیلات پیش کرول خیال تو تھا کہ اس سال کی نمائش دیکھ کر ہی تم کو خط لکھتی مگر جانے میرا یہاں سے جانا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ صرف نمائش کے لئے اضلاع والوں کا حیدرآباد جانا ذرا مشکل ہی ہو جاتا ہے۔ خیر تو آؤ مختصر سی سیر نمائش گاہ کی کرلو۔ ذیحجہ کا پورا مہینہ نمائش ہوتی ہے جس میں چار دن عورتوں کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ دن تعطیل کے ہوتے ہیں۔ اس دن ہماری تیاریاں صبح سے ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر دو بجے سے زنانہ انتظام ہوتا ہے تو بارہ بجے ہی سے موٹریں، تانگے اور رکشا نمائش گاہ جاتے نظر آتے ہیں۔ بعض خواتین شام میں چار بجے سے تیار ہونا شروع ہوتی ہیں تو کہیں چھ بجے جاکر آرائش مکمل ہوتی ہے۔ گویا یہ بھی نمائش کے کسی اسٹال کی رونق بنیں گی۔ اُترنے کا انتظام اچھا ہوتا ہے لیکن بعض خواتین اس خیال سے کہ اندر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ اپنی سواری کی باری کا انتظار نہیں کرتیں بلکہ بیچ میں ہی میں اترتی جاتی ہیں گو وہ باغ کے اندر ہی اترتی ہیں مگر اس طرح دروازے تک جانے میں منتظمین کے سامنے ہونا پڑتا ہے جو تھوڑی تھوڑی دور پر کھڑے رہتے ہیں ٹکٹ گھر پر بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ آنا کہ بغیر کسی کا دھکا کھائے اگر ٹکٹ لے لیا تو بڑی بازی ماری۔ اندر داخل ہونے پر ہر مذہب ہر وضع اور ہر فیشن کی خواتین نظر آئیں گی یہاں کئی کئی برس کے بچھڑے آپس میں مل جاتے ہیں۔ ان میں ایسی خواتین بھی ہونگی جو باوجود کسی زمانہ میں اچھی خاصی جان پہچان کے ملنا نہیں پسند کرتیں اور انجان سی ہو جاتی ہیں اور ایسی بھی کہ ان کی نظریں نمائش کے سامان سے زیادہ اپنی پرانی ملنے والیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ یہاں سینکڑوں اور ہر قسم کے اسٹال بڑی خوبصورتی اور نفاست سے لگے ہوتے ہیں۔ یہ مصنوعات صرف ملکی ہی ہوتے ہیں ہر اسٹال کی مالک خواتین ہوتی ہیں کسی اسٹال پر

ان کے ساتھ بارہ چودہ سال تک کے بچے ان کی
مدد کرتے نظر آئیں گے۔ پردے کا معقول انتظام
رہتا ہے۔ ایک چیز بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی
ہے وہ بچوں کا گم جانا۔ ہر مرتبہ دو چار بچے
ضرور اپنی ماؤں کو تلاش کرتے اور روتے
نظر آتے ہیں اور اسی طرح مائیں بھی پریشان نظر
آتی ہیں۔ گو نمائش گاہ کے اندر کمسن والنٹرس
موجود ہوتے ہیں جو بچوں کو ان کی ماؤں سے ملاتے
ہیں۔ اسی لئے بچوں کو ایسے موقعوں پر نہیں لانا
چاہیئے گو ہماری یہ نمائش بہت ہی دلچسپ اور
ہمارے لئے بہت بڑی تفریح گاہ ثابت ہوتی ہے
مگر اس میں چند باتوں کی کمی ہے جنھیں ضرور پورا
ہونا چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ دو چار ڈیرے ایسے
ضرور ہونے چاہیئیں جن پر نمبر پڑے ہوں اور وہاں
خواتین اپنے ان بچوں کو کسی کے ساتھ بٹھا دیں
جو بہ مجبوری ساتھ آئے ہوں کیونکہ بچوں کو
سوائے خاص مجبوری کے اپنے ساتھ ہرگز نہیں
لانا چاہئے۔ اور اس خیمہ کا نمبر یاد رکھیں جس میں
بچہ بیٹھا ہو اس طرح واپسی میں بچے بہ اطمینان
ساتھ آسکتے ہیں۔ دوسرے واپسی کا انتظام ہے
کیونکہ واپسی کے وقت بڑی گڑبڑ ہوتی ہے رات
کے دو دو بج جاتے ہیں کرایہ کی سواریاں دقت
سے دستیاب ہوتی ہیں۔ عورتیں سواریوں کے
لئے قناتوں سے باہر آجاتی ہیں۔ اس کی ضرورت
ہے کہ منتظمین سواریاں فراہم کریں اور کرایہ بھی
معقول طے کر دیا کریں کیونکہ اس وقت کرایہ
چوگنا ہو جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اشیاء کی
قیمت میں اضافہ نہیں کرنا چاہئیے قیمتیں اس
حد تک ہوں کہ ہر آدمی اپنے ملک کی صنعت سے
فائدہ اٹھائے اور صرف اس لئے خالی ہاتھ واپس
نہ ہو کہ فلاں چیز بہت گراں تھی۔ چوتھی یہ کہ صرف
چار دن عورتوں کے لئے کافی نہیں اس میں اضافہ
ہونا چاہیئے ۔

صغرا عبدالسبحان کی بعض تجاویز ارباب نمائش
کے لئے لائق غور ہیں۔ کیونکہ یوم خواتین میں
تخلیہ کے لئے بڑی کشمکش کا سبب یہ ہوتا ہے کہ
خواتین کو وقت پر سواریاں نہیں ملتیں اور جب
ملتی بھی ہیں تو کرایہ کے طے کرنے میں بڑی دقتوں کا
سامنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے بارہ ایک بج جاتے
ہیں۔ مجلس نمائش بلدیہ اور پولیس کے تعاون سے
محلوں کے کرایوں کو طے کرے تو نہایت سہولت
ہو سکیگی۔ اس کام کے لئے چند مستعد رضاکار مقرر
کر دئے جائیں تو بدنظمی پر قابو حاصل ہو سکتا ہے
یوم خواتین میں اس دفعہ ایک روز کا اضافہ
ہو گیا ہے۔ آئندہ مزید اضافہ کی توقع
کی جا سکتی ہے۔
رفتہ رفتہ ان تمام سہولتوں پر
قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مدیرہ

"نمائش اور خواتین"

عطیہ سلطانہ متعلم الف۔ اے
سال دوم

مجھے ڈر ہے کہیں آپ عنوان سے دھوکہ نہ کھا جائیں اور سمجھنے لگیں کہ میں عورت کے ذوق نمائش پر روشنی ڈال رہی ہوں۔ یعنی بتا رہی ہوں کہ حسن، دولت، قابلیت کی نمائش عورتوں کی فطرت ہے یہ بات نہیں میں تو اس نمائش کا ذکر کر رہی ہوں جس کو عرف عام میں نمائش مصنوعات ملکی کہتے ہیں۔ آپ نے عید کی تیاری کا ہنگامہ دیکھا ہوگا۔ نمائش کی گڑبڑ بھی عید ہی کی مترادف ہوتی ہے جس کا اہتمام مہینوں پہلے شروع ہوتا ہے۔ بچی نے فریاد کی "امی چوڑیاں نہیں ہیں" والدہ نے جواب دیا۔ اے بیوی ٹھیرو جلدی کیا ہے۔ نمائش قریب آرہی ہے پھر اپنی پسند کی خرید لینا تمھاری پسند کی ملنا مشکل ہے۔ دوسرے "تم کتنی دوکانوں کی خاک چھانتی پھروگی" "نئے کپڑے لیئے۔ لیکن پہننا مشکل۔ ابھی سے پہن کر کیوں خراب کرتی ہو۔ نمائش کے لئے رکھ چھوڑو۔ شہر بھر کی خواتین جمع ہوتی ہیں، اس وقت پہنو تو بات بھی ہے سال کے (۱۲) ماہ میں سے ایک مہینہ تو وہ ہوتا ہے جس میں نمائش ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد تین ماہ "ذکر عیش" یعنی نمائش کے تذکرے میں بسر ہوتے ہیں اس کے بعد کے تین ماہ وہ ہوتے ہیں جب نمائش کا حاصل کردہ اثاثہ ختم ہونا شروع ہوتا ہے تب ہی سے سچ پوچھیے تو نمائش کا انتظار بھی شروع ہو جاتا ہے۔ آخر خدا خدا کرکے نمائش برائے خواتین کا اعلان نظر آتا ہے تو پوچھیے مت کس تیزی سے تیاری ہونے لگتی ہے۔ ملازمین کی عجیب گت بنتی ہے، گھر کی سواری ہو تو کوئی ڈر نہیں۔ اس دن "صاحب" تو کسی صورت ہاتھ نہیں لگا سکتے کیونکہ بیگم صاحبہ نمائش میں جانے والی ہوتی ہیں۔ پھر واپسی کا خدا ہی حافظ ہے۔ دس اور گیارہ بارہ تک بھی معزز خواتین کا دل گھر لوٹنے اور اس "جنت قلب و نظر" کو چھوڑنے نہیں چاہتا۔ پہلے ہی سے کرایہ کی سواری کے انتظامات ہونے لگتے ہیں۔ اپنے دوست، عزیز و اقارب کو نمائش میں آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ بہترین زیور، بہترین کپڑوں کا التزام کیا جاتا ہے۔ کیونکہ خواتین کے مدنظر "نمائش" دیکھنا ہی نہیں۔ "نمائش کرنا" بھی ہوتا ہے۔ صبح ہی سے انتظامات ہوتے ہیں اور نمائش کے وقت تک تیاری مکمل

ہو جائے۔ نمائش کے اندر کا حال نہ پوچھئے پردے
کی بات ہے۔ پردے میں رہنا چاہئے۔ لیکن قابل
دید منظر وہ ہوتا ہے جب نمائش کی بھول بھلیوں
میں کوئی ساتھی گم ہو جاتا ہے اور یہ شعر ورد زبان۔

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

عرصہ حشر تو وہ رہتا ہے۔ لیکن حساب کتاب
کا میدان نہیں بلکہ اس وقت کا جب اللہ کے
نیک بندے جنت میں چلے جاتے ہیں کیونکہ یہاں
حوریں ہی نہیں غلماں بھی ہوتے ہیں۔

دکانوں کا حال قابل دید ہوتا ہے دکاندار
"اور گاہک" کی چشمک کا لطف اس وقت آتا ہے
جب دکاندار فروخت کرنا چھوڑ کر "گاہک" کے
لباس کے تراش خراش میں دلچسپی لینے لگتے ہیں
"اور گاہک" سودا خریدنا چھوڑ کر دکاندار کے
بچوں شوہر کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگ جاتے
ہیں بعض اوقات دوران خرید میں سودے کی قیمت
پر وہ ہڑبونگ مچ جاتی ہے کہ پارلیمنٹ کا اجلاس
یاد آجاتا ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ "چکانا"
کس قدر کٹھن مسئلہ ہے اور عورتیں کس عمدگی و خوش
اسلوبی سے یہ فرض انجام دیتی ہیں۔ تب ہی تو
مرد دکاندار خواتین "گاہکوں" سے بہت گھبراتے
ہیں۔ بات یہ ہے کہ عورت کو دھوکہ دینا بہت
مشکل ہے۔ مرد چونکہ خود دھوکہ دیتے ہیں اس وجہ
سے آسانی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ لیکن عورتیں
نہ تو خود دھوکہ دیتی ہیں اور نہ دھوکہ کھاتی ہیں۔
نمائش کے خریداروں کی یوں تو بہت سی اقسام
ہیں۔ لیکن ان کی تقسیم سن و سال کے لحاظ سے
کی جائے تو آسانی رہتی ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ
اور جگہوں کی بہ نسبت زیب و زینت و آرائش کے
سامان والی دکانوں پر خواتین کا جم غفیر زیادہ ہوتا
ہے۔ ان میں بھی "چوڑیوں" اور "زیورات" کی
دکان پر نوخیز خواتین کا مجمع بہت رہتا ہے منشی
پریم چند آنجہانی کی بالغ نظری کا یہاں قائل ہونا
پڑتا ہے کہ واقعی ہندوستانی عورت کو "زیور"
سے بہت محبت ہوتی ہے "زیور" یہ سونے چاندی
کے ٹکڑے یہ بھی تو وہ "جادو" ہے وہ "طلسمی ڈنڈا"
جس سے وہ اپنے شوہروں کو رجھاتی ہیں لیکن
وہ نہیں سوچتیں کہ "زیور" پہن کر وہ کتنی مضحکہ خیز
بن جاتی ہیں سجی سجائی "جاپانی گڑیا" ——
ایک کھلونا —— مردوں کے کھیلنے کے لئے۔ وہ
کرے بھی کیا۔ "یہ زندگی" خود کھیل ہے۔ یہ خود بھی تو
ایک بڑی سی "نمائش" ہے، جسے اللہ میاں چلاتے
ہیں۔ اپنا دل بہلاتے۔

گھریلو اشیاء کی دکانوں پر خواتین کی
زیادہ تعداد نظر آتی ہے۔ کتابوں کی دکان کا
خواتین کو پتہ ہی نہیں ملتا۔ بھولے بھٹکے کوئی
ادھر نکل بھی جاتی ہیں تو رنگین خوبصورت تصاویر
دیکھنے لگتی ہیں۔

اشیائے خورونوش کی دکانوں پر اسلام کی

تعلیم "مساوات" کا عملی نمونہ نظر آتا ہے۔ یہاں بلا امتیاز مذہب و ملت سن و سال ہر قسم کی خواتین نظر آتی ہیں ۔ بائرن حسین عورتوں کو کھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ معلوم نمائش میں اگر بائرن کو آنے کی اجازت ہوتی تو کتنے بائرن دم توڑ دیتے ۔ غرض نمائش اپنے اندر یک کرشمہ دو کار کا جلوہ رکھتی ہے ۔

نمائش

سعیدہ منظہر بی، اے

انساں کی فطرت میں نمائش کا ہے ازار

نرگس چمن میں، آہو بیاباں میں ہے بیمار

بننے کا سنورنے کا فقط اتنا ہے مطلب

معمولی اگر ہوں بھی تو ہوں کچھ تو طرحدار

تقریر کا اک طرح سے منشا بھی یہی ہے

گفتار کا، کردار کا، افکار کا اظہار

آداب کا ہر وقت یہ مفہوم رہا ہے

قائل ہو زمانہ جو کرے تھوڑی سی گفتار

افسانہ و ناول ہوں کہ تاریخ و سیاست

منظر پہ اُبھر آئیں کسی طرح سے افکار

ہیرے کا جگر چاک کرے قوت اظہار

ہے اصل میں سوچیں تو یہی منظر اشعار

ایلورا ایجنٹہ ہو کہ وہ تاج محل ہو

تحقیق سے دیکھیں تو فقط ذوق کے شہکار

ہر چیز نمایش ہی سے منظر پہ ہے آتی

سیپی سے نکل سر پہ چڑھے گوہر شہوار

ہر سال نمائش کا دکن میں ہے مطلب

عالم پہ نمایاں ہو مگر قوت فنکار

نمائش مصنوعات ملکی

منیرہ بانو کاؤسس جی

سال نو کی طرح نمائش مصنوعات ملکی بھی حیدرآبادیوں کے لئے ایک قومی عید کے مانند ہوگئی ہے، اس کو نہ صرف حکومت سرکار عالی اور عوام کا تعاون حاصل ہے بلکہ حکیم السیاست حضرت سلطان العلوم شہریار دکن و برار کی سرپرستی اور دست ہمایونی سے افتتاح کا فخر بھی حاصل رہا ہے اس سال جو نمائش ہوگی وہ آٹھویں نمائش ہوگی، سال بہ سال یہ نمائش ترقی پذیر نظر آتی ہے اور ارکین معاشی کمیٹی قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس نمائش کو ایک بلند معیار پر پہنچانے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ اس سے ملکی تجارت اور صنعت کو فروغ ہی حاصل نہیں ہوا ہے بلکہ اکثر مردہ صنعتوں میں ایک جان پڑگئی ہے۔ ملکی صناعوں کے لئے یہ باعث ترغیب ثابت ہوئی ہے اور عوام کو بھی اس کا علم ہو رہا ہے کہ اُن کے ملک میں کیا کیا صنعتیں موجود ہیں، علاوہ ازیں تعلیم یافتہ طبقہ کے رجحانات بھی صنعت و حرفت کی جانب اسی نمائش کی بدولت ہونے لگے مختصر یہ کہ نمائش اہل ملک کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئی ہے اور آئے دن اس کے انتظامات میں بہتری اور وسعت پائی جاتی ہے تاہم چند امور اب بھی کارکنان نمائش اور معاشی کمیٹی کی توجہ کے محتاج ہیں۔

اولاً گذشتہ سال نمائش گاہ کے اسٹالوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی عمل میں آئی تھی۔ اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ نمائش گاہ میں چند احاطہ اس طرح پر ترتیب پائے تھے اور تمام تر نقشہ اس قدر پیچیدہ تھا کہ اکثر اسٹال نمائش بین کی نظروں سے چھوٹ گئے اس کے لئے جا بجا واضح اشارات یا علامات کا نمایاں کیا جانا اور جملہ داخلوں پر نمائش گاہ کا ایک مکمل نقشہ اور اسٹالوں کی فہرست آویزاں ہونی ضروری ہے تاکہ عوام کی راست رہنمائی ہو۔

مختلف صنعتوں کے مظاہرات کو زیادہ جاذب منظر بنایا جائے اور صناعوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ مظاہرات کے ساتھ ساتھ وہ اس صنعت کے متعلق عوام کو معلومات بہم پہنچاتے رہیں۔ کسی صناع کے خاموش مظاہرے سے عوام مطمئن نہیں ہو سکتے۔

شعبہ تفریحات خاص توجہ کا محتاج ہے اولاً اس میں تفریح ہی کا فقدان ہوتا ہے

کیونکہ اس میں کچھ ایسے ہی اسٹالوں کی بہتات ہوتی ہے جو صرف بچوں یا ایک مخصوص طبقہ کی تفریح کا سامان بن سکتے ہیں۔اس شعبہ میں ایک بہتر اور مقبول عام فضا پیدا کرنے کی کوشش مناسب ہوگی تاکہ عوام کا ہر طبقہ اس سے لطف اندوز ہو سکے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ افتتاح نمائش کے وقت اسٹال مکمل نہیں رہتے اور عموماً نمائش کا پہلا ہفتہ اسٹالوں کی کمی کی وجہ سے نمائش بین کے لئے دلچسپ نہیں ہوتا۔کیونکہ اکثر اپنی ضرورتوں کی وجہ افتتاح کے بعد اضلاع وغیرہ چلے جاتے ہیں اور بعض اتنی فرصت اور وقت نہیں کہ کچھ دنوں انتظار کریں۔نمائش کو روز اوّل ہی سے دلچسپ اور جاذب نظر بنانا مناسب ہے تاکہ شروع ہی سے نمائش میں دلچسپی کے سامان پیدا ہو جائیں۔

یوم خواتین کے انتظامات کو کامیاب بنانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے تاہم چند امور ابھی قابل اصلاح ہیں۔دوران نمائش میں چند روز جو خواتین کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں یہ خواتین کی کثیر تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے ناکافی ہیں اگر اس میں مزید تین چار دن کا اضافہ کیا جائے تو خواتین کے اژدحام پر ایک بڑی حد تک قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔علاوہ ازیں سواریوں کا داخلوں سے قریب ٹھہرانے کا اور ان کی واپسی پر ان کا داخلوں تک لانے کا معقول انتظام ضروری ہے۔اس میں کوتوالی کے تعاون عمل کے علاوہ خواتین رضاکاروں کی خدمات کی بھی ضرورت ہے جو اچھی انتظامی صلاحیت رکھتی ہوں اسی طرح فروخت ٹکٹ کے لئے ہر داخلہ پر متعدد ٹکٹ گھر اور ٹکٹ خریدنے کے بعد نمائش گاہ میں داخل ہونا خواتین کے لئے ایک کڑی منزل ہے کیونکہ ہر داخلہ پر اندرونی باب داخلہ صرف ایک ہوتا ہے۔اس میں بھی اضافہ مناسب ہوگا تاکہ خواتین کا وقت باب داخلہ پر ضائع نہ ہو۔

ملا اب کی مرتبہ یوم خواتین میں ایک روز کا اضافہ کیا گیا ہے۔

نمائش

نمایش ہو بھی چکی اور ہونیوالی بھی ہے ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ہم نے نمائش کو دیکھا اور نمائش نے ہم کو، نمائش کی نمائش بھی ہوئی اور نمائشی بیویوں نے بہت سے دل کے حوصلے بھی نکالے۔ کوئی اپنی نمائش کرتا ہے اور کوئی دوسروں کی نمایش دیکھتا ہے جس کو دیکھئے وہ نمائشی ہے۔ جس چیز پر ہاتھ ڈالئے وہ نمائشی ہے۔ اسی نمائش بینی کے دیکھنے اور دکھانے میں سیر بھی کی تکلیف بھی اٹھائی۔ کھایا پیا بھی اور بھوکے پیاسے بھی رہے، بیٹھنے کو جگہ نہیں، سر چھپانے کی گنجائش نہیں۔ کہیں ذرا پاؤں ٹکانے کا موقع ملا اور کسی نہ کسی نے کہا کہ بیگم صاحب یہ جگہ تو میں نے لیلی ہے۔ کل ہی مالن کو پیسے دے کر جگہ نکالی ہے۔ آپ کہیں اور فرش کریجئے۔ وہ تو کہو غنیمت یہ ہوا کہ نمائش کے دنوں میں کبھی بارش بیگم نے نمایش بینی کا شوق نہ کیا۔ اگر کہیں وہ بھی چیلی پوٹی لے کر اس میں شرکت فرمالیتیں تو خدا جانے نمائش کہاں ہوتی ہم کہاں ہوتے۔ کس کس کی نمائش ہوتی۔ کون ہماری نمایش دیکھتا اور ہم کس کی نمایش کرتے اور ان نمائشی بناؤ سنگھار پر کیا آفت آتی۔ جو ہوتا وہ ہوتا نمائش نے اپنی نمائش میں کسر نہ رکھی مگر ہم نے نمائش سے منہ موڑ لیا۔ پچھلی نمایش بھی تمناؤں اور آرزوؤں ہی میں ختم ہو گئی۔ اب کیا ہونے والا ہے ہم شرکت کر سکیں گے یا نہیں اللہ بہتر جاننے والا ہے۔

اللہ بھلا کرے مما کا کہ ہر دفعہ بڑے شوق اور چاؤ سے نمائش میں جانے کی اجازت دیتی ہیں۔ ہر قسم کا انتظام بڑی خوبی و سلیقہ سے کرتی ہیں۔ ہر وقت نمائش کی سیر خرید و فروخت کا ذکر کرتی ہیں اور اللہ تعالے اونہیں زندہ و سلامت رکھے۔ سواری و شکار کا انتظام۔ ساتھ والیوں کا انتخاب۔ ماماؤں کو حکم احکام۔ جوڑوں اور کپڑوں کی تنظیم تو تین چار روز پہلے ہی شروع کر دیتی ہیں۔ فرش صراحی اور پاندان کی تیاری میں غیر معمولی مصروفیت رہتی اور ایسی ایسی باتیں کرتیں ہیں کہ ہمارا شوق نمائش بینی تیز تر ہو جاتا ہے۔ اب اسے اتفاق کہو یا بخت کہ جس روز نمائش میں جانے کا دن ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی پچر لگ جاتی ہے کہ سارا کیا دھرا رہ جاتا ہے۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے

اقبال جہاں بیگم
نور افشاں

اور جو آنٹی پڑتی ہے وہ سلجھائے نہیں سلجھتی۔ سچ
پوچھو جانے کے روز صبح کو مما کی طبیعت خراب ہوجاتی
ساتھ ہی کوئی ماما چیخنے چلانے لگتی۔ جیسے بچھو
نے کاٹ لیا ہے۔ کیسی نمائش کہاں کا سیر تماشہ
اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔ مامائیں وہ غوغا
مچاتیں کہ غوغائیاں بھی شرما جاتیں۔ گھر کا گھر
دوا دارو۔ دوڑ دھوپ۔ عیادت اور تیمار
داری میں مصروف ہو جاتا۔ ڈاکٹر آتا۔ دوا آتی،
پیٹ سینکا جاتا۔ پٹی باندھی جاتی۔ دوا کی
شیشی بھری خالی ہو جاتی اور کسی کو دم مارنے
کی فرصت نہ ہوتی۔ ہم بہنیں مٹر مٹر سب کی
صورتیں دیکھتیں اور دل ہی دل میں بیٹھے کے
درد کو کوستیں اور مما کے جلدی اچھے ہو جانے
کی دعا بھی کرتیں۔ ادھر گھر میں یہ کھلابلی ہوتی
ادھر ہم بہنیں چپ دم سادھے کمرے کے کونے
میں موم کی گڑیا بنے بیٹھے رہتے۔ بات ایسی ہوتی
کہ نہ تو سچ سمجھ بنتی اور نہ جھوٹ۔ نتیجہ یہ ہوتا
کہ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو جاتی
اور ہم دل میں گھٹ کر رہ جاتے۔

ماما کی بیماری اور دکھ کو تو ہم بہانہ سمجھتے
اور ماماؤں کا چیخنا چلانا بھی نمائشی کہ نہ درد
ہے اور نہ بیماری ہے۔ موئی فیلبانی نے فعل کیا
ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہو۔ سچ ہو یا جھوٹ۔ گھر کا
گھر دوڑ دھوپ میں مصروف ہوتا۔ کوئی دوا کو
دوڑتا کوئی تیمارداری کر رہا ہوتا۔ مگر جب گھر کی

بڑی بوڑھی بھی ایسی ہی ہوں تو بھلا ایسی حالت
میں کس کا دل چاہتا کہ نمائش میں چلو یا نمائش
میں جانے آنے کا ذکر کرو۔ ہر ایک ایسے کام میں
مصروف ہوتا کہ بات کرنے کی فرصت نہ ہوتی۔
مگر واہ وا۔ ہماری مما بھی بڑی خوبیوں کی بیوی
ہیں۔ اپنی تکلیف و بے چینی پر بھی ہمارا خیال
رکھتیں ہیں۔ ایسی تکلیف میں بھی وہ بڑے لاڈ
و چاؤ سے کہیں کہ بیٹیا سب سامان تیار ہے وقت
تنگ ہو رہا ہے۔ تم بہنوں نے تیاری بھی کر لی ہے
کیوں ذرا سی بات کیلئے اپنا دل چھوٹا کرتی ہو
کئی دنوں سے نمائش میں جانے کا شوق چرایا ہوا
ہے۔ جاؤ اور شوق سے جاؤ۔ سب بہنیں مل کر
چلی جاؤ۔ گلشن اور دوا کو ساتھ لیجاؤ۔ مجھے میرے
حال پر چھوڑ دو۔ ہاں ذرا میری صندوقچی دیدو۔
میں تمھیں ہاتھ خرچ کو دیدوں وہ دوا کے پاس
رکھوا دینا۔ اور بیٹیا دیکھنا ذرا اپنا اور اپنی بہنوں
کے ہاتھ گلے کا خیال رکھنا۔ ایسے میلے ٹھیلوں میں
بہت سی ہاتھ چالاک لقتندریاں آجاتی ہیں کہیں
تمھیں بے گت دیکھ کر درگت نہ بنائیں اور کوئی
چیز اتار کر آنا کافی دیجائیں۔ اچھی بیٹیاں اپنی
چیز کی آپ حفاظت کرتی ہیں۔ میرا کیا ہے۔ تھوڑی
دیر میں اچھی ہو جاؤں گی۔ میں نے بہت نمائش
دیکھی ہیں۔ اب سفید چونڈا لے کر گئی تو نہ گئی تو
سب برابر ہے۔ میرا جانا تو تمھارے لئے تھا۔
عین وقت پر یہ موا درد ایسا ہوا ہے کہ کسی

علاج کر سکتا ہی نہیں۔ خدا معلوم جائے گا یا جان
لے کر جائیے گا۔ تمہارے کھیل کھانے کے دن ہیں
جاؤ اور ضرور جاؤ۔ سہیلیوں۔ ہمجولیوں سے
ملو۔ تمہارے اسکول کی لڑکیاں بھی ہوں گی
اون کے ساتھ سیر کر لینا کوئی اچھی چیز پسند
آئے تو وہ بھی خرید لینا۔ مگر بیٹیا دیکھنا۔ ذرا
جلدی آ جانا۔ زیادہ دیر نہ ٹھیرنا۔ وہاں سوار
ہونے میں بڑی تکلیف اور دقت ہوتی ہے بیچاری
موئے پولیس والے اون بیویوں کی تو سواریاں
دروازے پر لگا دیتے ہیں جو جلدی جانا نہیں
چاہتیں اور جو بیویاں جلدی کرتی ہیں اون کی
نہ سواری آنے دیتے ہیں اور نہ ماماؤں کو تلاش
کرنے دیتے ہیں۔ پولیس والے انتظام تو کرتے
ہیں مگر انتظام میں بڑی بدانتظامی ہوتی ہے
اس انتظام میں اپنا انتظام کرنا عقلمندی ہے
تمہاری واپسی تک شاید یہ کمبخت درد بھی کم
ہو جائے اب تو زیادہ ہی ہوتا جاتا ہے دیکھنا
ذرا وہ بلاسٹر کا ٹکڑا گرم کر کے دیدو ابھی ڈاکٹر
صاحب نے بھیجا ہے۔ شاید کچھ آرام ہو۔

بھلا غور کرنے کی بات ہے۔ ایسی حالت میں
کس سنجتی کا دل چاہیگا کہ گھر میں ماں کو بیمار چھوڑ
کر سیر تماشے کو نکل کھڑے ہو۔ کس کی ہمت ہے
جو ماں کو اس حال میں تڑپتا چھوڑ کر نمائش میں
جائے یہ تو وہی مثل ہوئی کہ

ساتھ لے دے کے یاروں کو
مینڈکی چلی مداروں کو

نا بھئی نا۔ ہم سے یہ نہ ہوگا۔ لاکھ شوق سہی
لاکھ انتظام سہی۔ آخر وہ ہماری ماں ہیں۔ درد
سے بے چین ہیں۔ دوا پیتی ہیں تو اچھو ہو جاتا
ہے اور دوا یونہی کی یونہی سے نکل جاتی ہے پان
کھاتی ہیں تو گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے۔ ابکائیاں
آتی ہیں۔ گھڑی گھڑی چوکی پر جاتی ہیں۔ اینٹھ
سے پیٹ سکواتی ہیں۔ ہمارا تو یہ جگرا نہیں کہ
ماں کو اس حال میں چھوڑ کر سیر سپاٹے کو نکل جائیں
اور اگر جائیں بھی تو وہاں کیا خاک دل لگے گا جو
نمائش دیکھیں گے۔ انجن چھوڑ گھسیٹن میں پڑنا
کونسی خوبی کی بات ہے۔ اس ہفتہ نہیں اگلے
ہفتہ۔ اس سال نہیں اگلے سال۔ نمائش بھی
دیکھ لیں گے۔

اماں کو اس حالوں گھر میں چھوڑ کر جا بیٹھیں
تو جو ملے گا ناک پر انگلی رکھ کر باتیں بنائیگا
برابر والیاں الگ نکٹو بنائیں گی۔ کوئی تیوری
پر بل ڈالے گا ناک بھوں چڑھا کر خیر خواہی کے
سوال کرے گا جو بیویاں اپنی ناک چوٹی میں گرفتار
ہیں اون کو تو اور زیادہ موقع اپنے اوپر سے
چھینٹا اتارنے کا ہاتھ آجائے گا۔ اور اگر خدا
نخواستہ شیطان کے کان بہرے۔ کچھ اونچ نیچ
ہو گئی تو جیتے جاگتے چٹیا کٹ گئی۔ اخبار والوں
کو مضمون ہاتھ آیا۔ شہابی بہنوں نے لون مرچ
لگا کر وہ ورق رنگین کئے کہ توبہ ہی بھلی۔

نا بھی نا۔ ہم سے تو ناک کاٹ کے چوتڑ تلے
نہیں رکھی جاتی۔

اللہ ہماری اماں کو دن دونی رات چوگنی
عمر دے۔ اون کا دکھ سچا ہو یا جھوٹا ہمیں تو
گھر سے نہیں نکلنا چاہیئے۔ ماما موتی کا کیا ہے
اوس کی بیماری مما کی بیماری کے ساتھ ہے۔ وہ
اچھی ہوئیں اور اوس نے کدکڑے مارنے
شروع کئے۔ جیتی جان کے سو میلے۔ یو نمائش
ہو رہی ہے تو ہونے دو۔ اللہ کو امان۔ پیروں کا
سایہ۔ امی جی رہی تو پھر بھی نمائش دیکھ لیں گے
ہر ہفتہ نمائش میں زنانہ انتظام ہوتا ہے۔ ہر
سال نمائش ہوتی ہے۔ جیتے رہے تو آج نہ دیکھی
تو کل دیکھ لیں گے۔ کیونکہ کہا ہے کسی نے کہ اپنا
من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا ۔

روغنی صنعت

لطیف النساء

ملک کے لئے نمایشات کا انعقاد فال نیک
ہوتا ہے کیونکہ اس کی قیام سے صناع میں مسابقت
کا شوق پیدا ہوتا ہے ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ روغنی
صنعت ہماری معاشرتی زندگی پر خوب چھائی
ہوئی تھی جوں جوں مشینوں کی بہتات اور کم قیمت
اشیاء یورپ سے آنے لگیں ان صنعتوں پر ایک مردنی
چھا گئی اگر یہی عالم رہا تو ہماری یہ قدیم صنعت
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دے گی۔

خوب یاد ہے اور بعض گھرانوں میں نرمل
کے روغنی کھلونے۔ پلنگ کے پایہ۔ شطرنج۔ زیر
مشق۔ قلمدان۔ منقلائی تاش۔ چرمی روغنی صندوقچہ۔
پھل پھول۔ مختلف کھلونے اب بھی موجود ہیں
انہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس سے کئی
گھرانے پرورش پاتے تھے۔ یہ کام نہایت پائیدار
اور خوشنما ہوتا تھا بارشیں اور امتداد زمانہ سے
اس میں کسی تغیر کا امکان بھی نہ تھا۔ جہاں ہمارے
یہاں شادی بیاہ کا جہیز جوڑا جاتا تھا اوس میں
پہلی چیز جہیز کا پلنگ ہوتا تھا اور یہ پلنگ روغنی
پایوں کا ہوتا اور صندوق جو اس میں شامل
ہوتے تھے وہ بھی روغنی ہوتے تھے جن کی چمک دمک
اب بھی باقی ہے۔ لیکن صناع روز بروز بے التفاتی
کی بدولت مفقود ہوتے جا رہے ہیں اس کی
اصلی وجہ وہی مشین کی اشیاء اور ملک کی قدردانی
کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

آٹھ ایک سال سے صنعتی نمائش کا قیام
عمل میں آرہا ہے اور ایسے قدیم صنعت کو نمایاں
کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی موقع نہیں مل سکتا
البتہ نمائش میں بطور نمایش بعض اسٹال پر ایسی
اشیاء نظر سے گذرتی ہیں لیکن ملک اور افراد
ملک کے عام بے التفاتی نے انہیں پھلنے اور
ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ ارباب نمائش جنھوں نے

بقیہ مضمون صفحہ (۳۰)

نمائش کی نسبت چند خیالات

مس رتیا کرسٹ جی

ہر سال باغ عامہ میں مصنوعات ملکی کی نمائش قایم ہوتی ہے اس نمائش کا مقصد یہی ہے کہ حیدرآباد میں جتنی بھی صنعتیں ہیں اور سال بہ سال نئی نئی چیزیں تیار ہوتی ہیں ان کو پبلک کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ پبلک واقف ہو کر ان کو خریدنے پر مائل ہو، لیکن یہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نمائش گاہ میں خرید و فروخت شروع کر دی جاتی ہے، بہتر تو یہ ہے کہ نمائش گاہ میں ہر چیز کا ایک ایک نمونہ رکھا جائے تاکہ اگر لوگوں کو پسند ہو تو اصل دکان پر جا کر اس کو خریدیں۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ابتدا نمائش سے آخر تک ہر قسم کے نمونے موجود رہیں گے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اصل دکان سے واقف ہو کر ہمیشہ وہیں سے خریدنے کی کوشش کریں گے۔

نمائش گاہ میں تھوڑی سی جگہ میں کئی اسٹال لگا دئے جاتے ہیں اور ایک چیز کے کئی کئی اسٹال قایم ہو جاتے ہیں مثلاً ایک جوتے کے اسٹال کو لیجئے کہ کئی اسٹال محض جوتے کے جوڑوں سے ہی بھر جاتے ہیں۔ اگر چند اسٹال اس کے لئے مخصوص کر کے دوسرے مصنوعات کے لئے جگہ نکالی جائے تو زیادہ جگہ نکل آئیگی اور لوگوں کو چلنے پھرنے میں سہولت ہوگی بعض ایسی چیزیں جو پبلک میں پہلی مرتبہ پیش کی جاتی ہیں ان کے اسٹالس میں نمائش بینوں کی زیادہ کثرت ہوتی ہے مثلاً سمکیات کا اسٹال جب پہلی مرتبہ قایم ہوا تو اس قدر بھیڑ ہو جاتی تھی کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا اور گذشتہ سال ریڈیو اسٹیشن کا اسٹال جدید قایم ہوا تھا اور اس اسٹال میں بھی ویسی ہی کثرت تھی، چاہئے تو یہ تھا کہ ان اسٹالوں کے لئے کافی گنجائش رکھی جاتی تاکہ لوگ سہولت کے ساتھ چل پھر سکیں اور جی بھر کر لطف اٹھا سکیں چیزوں کے ٹوٹنے پھوٹنے کا بھی اندیشہ نہ رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سمکیات میں آئنوں کا ایک ڈبہ ٹوٹ گیا تھا اور تمام مچھلیاں باہر نکل پڑی تھیں۔

ہر سال محکمہ طبابت و صحت عامہ کی جانب سے بیماریوں کا حال اور ان کے علاج کے طریقے پیش کئے جاتے ہیں عموماً پلیگ اور ہیضہ جیسی عام بیماریوں کا حال بیان ہوتا ہے لیکن آج کل

مختلف وجوہات کی بنا پر نئی نئی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں اور بعض بیماریاں جو شاذ و نادر ہوا کرتی تھیں اب عام طور پر متعدی امراض کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ مثلاً "خارش" کا آج کل بہت زور ہے جس کو دیکھو اس مرض میں مبتلا نظر آتا ہے بہتر ہوگا کہ اس سال نمائش میں خارش کے متعلق خاص طور پر اس کے علاج اور روک تھام کے طریقے عوام کو بتلائے جائیں۔

نمائش میں کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام بھی ضروری ہے لیکن ان کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب ہونا چاہئے جہاں عام طور پر لوگوں کی نظریں نہ پڑتی ہوں کیونکہ نمائش میں مختلف مذہب و خیال کے لوگ جمع ہوتے ہیں ان کے لئے ایسی چیزوں کا نظارہ جن کی ان کے مذہب میں ممانعت ہے ناگوار ہوتا ہے اس کے علاوہ اکثر لوگ پبلک مقام پر بیٹھ کر کھانا پینا پسند نہیں کرتے اس لئے بہتر ہوگا کہ خاص کر ہوٹلوں کے لئے نمائش گاہ کے آخری حصہ میں جہاں کوئی اور قابل دید چیزیں نہ ہوں انتظام کیا جائے۔ تاکہ لوگ باطمینان بیٹھ کر کھا پی سکیں۔

زنانہ نمائش کے دن سواریوں کے اتارنے چڑھانے کے لئے بائے اسکوٹس کو مقرر کیا جاتا ہے اس کے بجائے بے پردہ گرل گائیڈز کو رکھا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا تاکہ پردہ نشین خواتین کو غیر مردوں کے ذریعہ اپنی سواریوں کا بند و بست کرنا نہ پڑے اور گرل گائیڈس جس کسی کو سواری کی ضرورت ہو اس کے انتظام کے لئے پہرے کے جوان کو یا نمائش کے منتظمین کو کہکر اس کا انتظام کر سکتی ہیں۔

یہ چند خیالات ہیں جن کی جانب ارباب نمائش توجہ کریں تو اچھا ہوگا۔

---

۱ - آپ نے جو کچھ کہا ہے درست ہے مگر غور کیجئے سازی ایک ملکی صنعت ہے اور صناع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اوس کی قدر ہو اور خرید و فروخت میں ترقی ہوتی جائے اس لئے متعدد اسٹالس ہوں تو کوئی ہرج نہیں۔

۲ - خارش کا اس سال بھی زور رہا ہے اور خدانخواستہ اس میں آئندہ اضافہ نہ ہوگا اس لئے اس کے لئے خاص کر طور پر کسی اسٹال کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

۳ - نمائش میں جو مصنوعات ہوتی ہیں وہ ختم نمائش تک بجنسہ باقی رہتی ہیں اور خریدار ختم نمائش پر اونہیں حاصل کرتا ہے البتہ جوشئی زیادہ ہوتی ہے اون کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

۴ - ہاں یہ ممکن ہے کہ ہوٹلیں ایک ہی مقام پر رہیں تو سہولت ہوگی چاہے وہ کتنا ہی بڑا رسٹورنٹ کیوں نہ ہو۔

مدیر

روح ترقی

مظہر اہلیہ وفا

ترقی کی صنعت ہی روح رواں ہے
وہی ملک سرسبز ہے یہ جہاں ہے

معیشت تمدن کے گُر اس میں موجود
درخشندہ دولت کے دُر اس میں موجود

زراعت تجارت بھی محتاج اس کی
ہے دنیائے حرفت بھی محتاج اس کی

یہ دنیا نہ ہوتی جو صنعت نہ ہوتی
کوئی زندگی کی بھی صورت نہ ہوتی

نہ کھاتے نہ پیتے نہ رہتے نہ بستے
یوں ہی جیتے جی موت کو سب ترستے

ممالک کو اس نے مہذب بنایا
چمن کی طرح گوشہ گوشہ سجایا

ترقی کی صنعت سے وابستگی ہے
کہ جیسے مہ و مہر سے روشنی ہے

ہے کاریگروں کی جہاں پر حکومت
اُبلتی ہے دولت انہیں کی بدولت

یہ اوزار سے اپنے فرماں روا ہیں
یہ لشکر ہے اون کا یہی دست و پا ہیں

اُدھر رخ ہو اپنا زمانہ جدھر ہو
ترقی کا میدان جو پیش نظر ہو

جہاں میں ہے سائنس کا بول بالا
ہر اک سمت پھیلا ہے اس کا اجالا

نہیں ایسا شعبہ کوئی زندگی کا
کہ سائنس کا اس پہ پرتو نہ چمکا

ہے صنعت میں بھی اس کی جدت نمایاں
کہ رنگ قدیمی ہے صنعت کا پنہاں

ترقی کا ہے دور یہ دور عثماں
دکن کی ہے تاریخ بھی جس پہ نازاں

کھلیں صنعتی درسگاہیں دکن میں
بہار آئی ایجاد کی اس چمن میں

ہے عثمانیہ[1] صنعتی اک دبستاں
جو قایم ہوا حسب فرمان سلطاں

صناعات[2] ملکی کا ہے اک ادارہ
قدیمی صنائع کا ہے اس سے احیاء

ہے دارالتجارت بھی اک کیمیائی
نئی صنعتوں کی ہے جس میں ترقی

---

[1] عثمانیہ مرکزی صنعتی اسکول قیام آذر ۱۳۳۲ف [2] ادارہ مصنوعات ملکی قیام ۱۹۳۱ء

پڑی صنعتی کارخانوں کی بنیاد | صنائع کا گنجینہ ہے حیدرآباد
بنا صنعتوں کا ہے معدن دکن بھی | ہے میا جس گلاس اور صابن بھی
نمایش ہے صنعات ملکی کی ہر سال | عروج و ترقی کی ہے نیک یہ فال
کیا افتتاح اس کا شاہ دکن نے | خوشا ملک والوں کے اب بخت چمکے
ہے صنعت پہ شاہی توجہ کا پرتو | اٹھو خواب غفلت سے اے ملک والو
مری پیاری بہنو گزارش ہے میری | یہ ارمان دل ہے یہ خواہش ہے میری
کرو علم حاصل تو صنعت بھی سیکھو | اصول رموز معیشت بھی سیکھو
مرض مفلسی ہے دوا اس کی صنعت | ہنر کیمیا ہے ہنر گنج راحت

رہیں شاہ عثماں دوانا سلامت
بصد جاہ و اجلال و اقبال و حشمت

مانچسٹر جو انگلستان میں کپڑوں کی صنعت کا مشہور مرکز ہے حال ہی میں ایک نمایش پہننے کے کپڑوں کی ہوئی۔ یہی کپڑے آیندہ ہوٹلوں۔ مہمان خانوں میں استعمال کئے جائیں گے۔

جن کپڑوں کی نمائش کی گئی ان میں وہ کپڑے تھے جو باورخانوں کے لئے مستعمل ہوں گے جیسے تولیئے میز پوش۔ رومال وغیرہ اور ایسے کپڑے آئندہ تیار ہوں گے جو انگلش گھرانوں میں عموماً استعمال کئے جاتے ہیں۔

نمایش دیکھنے والوں نے چھینٹوں کو بہت پسند کیا جن پر پھول، بوٹے اور جانوروں کی تصویر تھیں۔ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے بھی اپنے اندر کشش رکھتے تھے جن میں نہایت نزاکت سے رنگوں کا امتزاج تھا۔ ایک کمرے میں ایسے دھاری دار کپڑے تھے جو کمروں کے پردوں کے لئے مخصوص تھے جس میں ہلکے نفیس رنگوں کی آمیزش تھی۔

اختتام جنگ کی وجہ انگلستان کے پارچہ بافی کی صنعت کو اوس وقت کا انتظار ہے کہ لوگ یہاں آئیں اور اون کے صنعت کے کمالات کو دیکھیں۔

لہ صنعتی کارخانجات قیام اگست ۱۹۲۵ء بمقام شاہ آباد

فریبِ نگاہ

یہاں پر مجھے مولوی حالی کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو انھوں نے اپنے مقدمہ میں لکھے ہیں اور جو یہ ہیں :- کبھی شاعر کے پیچھے ایک کراسی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے مثلاً ہر تقریب یا تہوار پر تہنیت کا قصیدہ لکھنا۔ یا ہر ہفتہ یا عشرہ میں مشاعرہ کی طرح پر غزل سرانجام کرنی۔ گو بظاہر اس میں آزادی کی کچھ مزاحمت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن انسان کی فطرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ایسی "کریں" اس کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیتی ہیں وہ جس طرح ممنوعات پر بالطبع حریص ہے اسی طرح تکلیفات سے بالطبع ابا کرنیوالا ہے۔

انشاء اللہ خاں جب تک مطلق العنان رہے سعادت علی خاں کے دربار میں نت نئے شگوفے اور چٹکلے چھوڑتے اور بات بات پر لطیفے انشا کرتے لیکن جب سعادت علی خاں نے یہ کر لگادی کہ ہر روز دو ایسی باتیں بیان کر دیا کرو جو کبھی نہ سنی ہوں پھر وہی انشاء اللہ خاں تھے کہ پاگلوں کی طرح گلی کوچوں میں لڑکوں سے پوچھتے پھرا کرتے تھے کہ بھئی کوئی نئی بات بتاؤ۔ آخر اسی جستجو میں قطعی پاگل ہوگئے۔ یورپ کے ایک زبردست شاعر کا حال سنا ہے کہ جب اس نے اپنی آئندہ تصنیفات کا کاپی رائٹ کسی پبلشر کے ہاتھ فروخت کر دیا تو وہ کہا کرتا تھا کہ اس معاہدہ سے میری طبیعت بند ہوگئی جاتی ہے۔ جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں ساتھ ہی یہ خیال گذرتا ہے کہ اب ہم جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل کی اپج سے نہیں۔ بلکہ اپنا معاہدہ پورا کرنے کو لکھتے ہیں اس خیال سے طبیعت خود بخود بیٹھی جاتی ہے۔

جہاں بانو ایم۔ اے

بہر حال جہاں تک ممکن ہو کسی مضمون کے لکھنے پر اس وقت تک قلم نہ اٹھانا چاہیے جب تک اس کی چینک دل کو نہ لگی ہو کسی کی ریس سے۔ کسی کی فرمائش سے کسی کے دباؤ سے۔ یا کسی اور مجبوری کے سبب۔ بغیر اقتضائے طبعی اور ولولہ باطنی جو چیز لکھی جائے گی اس میں اثر اور زور نا پید ہوگا ۔ اسی نوعیت کا یہ مضمون میرا بھی ہے۔ بغیر امنگ کے ایک چیز لکھدی ہے

۱؎ تکلیف کرلگانے کو کہتے ہیں۔ جیسے تکلیف شرعی۔

بیان میں حقیقت ہو تو ہو لیکن رنگینی اور روانی
نہ ملیگی۔ اس طرح کی دشواریوں کا جنھیں سامنا
رہا ہے وہی میری مشکل کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہاں
تو مجھے صنعت و حسن کاری کے اس خوبصورت
حسین شیرازہ پر کچھ لکھنا ہے جو بکھرا ہوا بھی ہے
اور منظم بھی۔ وہ خود میں اتنی جاذبیت رکھتا ہے
کہ اس کے حسن کو معرض بحث میں لانے سے اس کا
نکھار سب غارت ہو جاتا ہے۔ ایک دیکھنے کی چیز ہے
ایک حقیقت ہے۔ افسانہ نہیں۔ جن و پری کا قصہ
نہیں۔ صبح بنارس یا شام اودھ جیسی دلچسپیاں
ہفتہ کے دن جس کو دیکھنے کی آرزو میں گنے جاتے
تھے۔ جمعہ کے دن کی دیرینہ تمنا ختم ہی نہ ہوتی
تھی۔ کیونکہ جمعہ کا دن "یوم خواتین" سے معنون
تھا۔ اور کسی طرح جمعہ آتا ہی نہ تھا۔ اور آتا تو
اپنے ساتھ اتنی مصروفیتیں لاتا کہ طبیعت بوکھلا
جاتی۔ حیدرآباد کے چپہ چپہ سے لوگ آتے۔ قسم قسم
کی ٹولیاں۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ کسی
گروہ میں تہذیب، رکھ رکھاؤ اور سلیقہ۔ کسی
جمگھٹے میں بھونڈا پن، بدتمیزی اور جہالت۔ ٹکٹ
گھر پر ایک جم غفیر کا سا اژدھام۔ ہر ایک کو۔
یہ جلدی کہ ہمیں ٹکٹ پہلے ملے۔ انسان میں شاید
کا لپکا ہو تو معمولی معمولی باتیں اس کو غیر معمولی
سی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ میرا جی سکون و طمانیت
کا متلاشی۔ اور میرے ہمراہیوں کا تقاضہ کہ ہمارا
بھی کبھی کبھی ساتھ دو۔ اچھی زبردستی تھی ان سب
کی۔ بعض وقت مروت بھی مصیبت ہو جاتی ہے
ٹکٹ لے کر دو قدم بھی آگے نہ بڑھائے تھے کہ کسی نے
آکر پیچھے سے آنکھیں بند کر دیں۔ گویا فرمائش نہ
دیکھو۔ ہمارے تصور میں کھو جاؤ۔ اب ہم چل رہے
ہیں لیکن بالکل اندھوں جیسے۔ ہاتھ سے ہاتھ کو
ٹٹولا۔ بھلا اس طوفان بے تمیزی میں میں کیا سمجھوں
کہ میری آنکھیں بند کر دینے والا کون ہے کہ پتہ لگے۔
کیونکر معلوم ہو۔ انگلیاں، انگوٹھیاں، کلائی
چوڑیاں۔ گھڑی۔ ساری محسوسات کا کچھ بھی تو
نتیجہ نہ نکلا۔ اور ان کے دست شفقت کی ستم ظریفی
کا یہ عالم کہ نیک بخت نے آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھانے
کی قسم ہی کھائی ہے "ایک دعوت قبول تو نام
بتائیں" لیجئے۔ ستم بالائے ستم۔ دعوت کا ہی کی
یہاں آنکھوں کا فشار نکل رہا ہے اور انھیں دعوت
کا خبط ہے۔ مجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں۔ ہم بیزار
بیٹھے ہیں۔ ہم نے پنڈ چھڑانے کہہ دیا۔ اچھا قبول
ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اندھے کو دو آنکھیں ملجائیں
یہی ہے اس کے لئے بہت کچھ۔ پلٹ کر دیکھوں تو
نجمہ کھڑی قہقہہ لگا رہی ہے۔ برسوں بعد اس سے
ملنا ہوا تھا۔ بہت بدل سی گئی تھی۔ ہم دونوں نے
ایک دوسرے میں کئی تبدیلیاں محسوس کیں۔
ہماری صورت شکل بدل گئی تھی لیکن فطرت تو وہی
تھی جو آج سے ۸۔۹ سال قبل تھی۔ اس نے
لاکھوں میں مجھے پہچان لیا۔ اور میں نے آنکھیں
کھولیں تو ایسے لگا کہ یہ نقشہ کہیں دیکھا ہوا ہے

بالکل بجا نابوجھا جیسے ؎

پیہم ہجوم یاس سے آتا نہیں یقین
تم میرے سامنے ہو کہ دھوکہ نظر کا ہے

نمایش کی ساری دلچسپی کا مرکز ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے تھے اس کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیا جو ساتھ آئے تھے۔ اس نوعیت کے میلے ٹھیلے کتنے بچھڑوں کو ملا دیتے ہیں اور کیوں ملاتے ہیں۔

باغ عام کا چپہ چپہ ع

"دامان باغباں۔ وکف گلفروش ہے"

کی حقیقت کی عکاسی کر رہا تھا۔

جدہر نظر اٹھتی۔ دکانوں اور بازاروں کا ایک لامتناہی سلسلہ۔ بیدر کی سیاہ وسفید صنعتیں۔ کریم نگر کی نقرئی سحر کاری۔ ورنگل کے قالین وخوبصورت شطرنجیاں۔ اور زنگ آباد کا ہمرو وکمخواب۔ ضلع بیٹھ تعلقہ چینچولی کے کمبل۔ سرپور وکاغذ نگر پورے کے کاغذ۔ سب سے زیادہ جاذب نظر تشکار گاہ کی تفصیلی سیر۔ ہاتھی کی سواری کا مظاہرہ۔ جھولے کی پینگیں۔ خود ساختہ برخود غلط نجومیوں کے دم دلاسے۔ لکی ڈپ کی قسمت آزمائیاں۔ غرض ؎

گر اک ادا ہو۔ تو اسے اپنی قضا کہوں

ایک چھوٹی سی صاف ستھری رسٹران میں ہم نے چاء پی۔ اور ایک ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سے ہم سب کو دیکھ سکتے تھے۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ اس طوفان بے تمیزی میں تھوڑا سا سکون اور ذری سی تنہائی بھی دم غنیمت معلوم ہوتی تھی انسان کے لئے انسان کا مطالعہ کرنا واقعی ایک دلچسپ شغل ہے۔ کسی کو دیکھ کر طبیعت چاہتی تھی کہ بار بار اس طرف کو دیکھیں۔ کچھ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں اس شکل میں۔ شاید کوئی چھپا ہوا جوہر تھا۔ نری خوبصورتی ہی نہ تھی۔ بلکہ کچھ اور بھی تھا اس حسن میں۔ پلٹ کر دیکھوں تو اور بہت سی نظریں اسی چہرہ پر گڑ کر رہ گئی تھیں کشش صرف ظاہری حسن کی نہ تھی۔ فطرت میں کوئی حسن مضمر تھا۔ ؎

اے تماشاگاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشہ می روی

بعض لڑکیاں پنجابی لباس میں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ کسی خاتون نے بہت سا زیور پہن لیا تھا اور معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ صرف اپنے زیور کی نمائش کے لئے آئی ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سے بچے تھے کچھ شاید ان کے اپنے بچے تھے کیونکہ لباس اس طرح کا تھا کہ اس خاتون سے جیسے ملتا جلتا۔ بعض کچھ غریب بچے تھے۔ ان کے دیکھے سے عبرت سی ہونے لگی۔ جب یہ اپنے بچوں کو اچھی اچھی چیزیں خریدے دیتیں ان مفلس بچوں کے چہروں پر اداسی وحسرت کھنڈ جاتی۔ ان کے بھی دل ہیں۔ یہ بھی بچے تھے۔ ان دلوں میں امنگیں بھی ہونگیں، پھر ان کی تمنائیں؟ کون ہے جو ان کا

لحاظ کرے۔ سچی مسرت کا راز شاید اسی میں مضمر ہے کہ تم خوش ہونے سے پہلے کسی دکھی دل کی معصوم تمنا پوری کر دو۔ اپنی مسرت کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ ہی آپ ملجائے گی۔ یہی سب سے بڑی شانتی ہے۔ میں فلسفیوں کی طرح سوچ رہی تھی اور نجمہ چادر پر چادر اڑا رہی تھی۔ اس آتش سیال سے اس کا جی ہی نہ بھرتا تھا۔ مجھے جو دیکھی تو کہنے لگی "بس آ گئی یہاں بھی سوچ۔ یہ بیٹھے بیٹھے تجھ پر کیا دورہ پڑ جاتا ہے۔ چپ بیٹھے دم نہیں گھٹتا؟" اس نے بڑی چنچل طبیعت پائی ہے۔ وہ دنیا کو اس چشمہ سے دیکھتی ہے جس میں گلاب کی پتیاں لگی ہیں "کیا سوچ رہی ہے بھئی؟"

آخر اس سے صبر نہ ہوا۔ اور پوچھ ہی لیا "یہی —— کہ صنعتوں کی ترقی سے ذہنیتوں کی ترقی کا کیا تعلق ہے؟ آخر ہم میں صلاحیت و انسانیت کیوں نہیں آتی؟ مادہ کی ترقی ہی کیا جب روح کو فیض نہ پہنچے —— اُنھ —— رہنے دے اپنی منطق۔ یہ کالج کا کمرہ نہیں ہے۔ یہ تفریح گاہ ہے ایک ایسا مقام ہے جہاں ہم اپنا دل بہلانے اور غم غلط کرنے آئے ہیں۔ مسرت پہلے تو کہاں ملتی ہے اور ملتی ہے تو بہت تھوڑی سی۔ پروانہ کی زندگی جیسے۔ شعلہ کی بھڑک۔ شرارے کی زیست تو اس لمحہ کو بھی اپنی متفکرانہ موشگافیوں سے غارت کر دے گی تب —— وہ کہے جاتی تھی اور میری آنکھیں تجسس میں لگی تھیں۔ کسی کا بہت گہرا اخلاق۔ کسی کی بے مروتی۔ کسی کی ملنساری۔ کسی کا غرور۔ کسی کا عجز و انکسار۔ یہ نمائش تو ایک ضمنی و عارضی دلکشی ہے۔ ایک وقتی کھیل ہے یہ دنیا۔ اس کی میری طبیعت ذرا نہ ملتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں بھی اس جیسی بن جاؤں۔ لیکن فطرت کیسے بدلے!!

میں نے سر کو ایک جنبش دی۔ خیالات کو جھٹک دیا مجھ پر سے یہ دورہ کا جھٹکا گذر گیا اور میں اس کے ساتھ نمائش کی بھول بھلیوں میں کھو گئی ؎

اہل تدبیر کی وا ماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

(بقیہ صفحہ ۲۲) نمائش کے قیام سے ملک میں صنعتی بیداری کی روح پھونک دی ہے اور مردہ صنعتوں میں تازہ جان ڈال دی ہے اگر اس کی جانب توجہ فرمائے تو یہ مٹتی ہوئی صنعت پھر ایکبار سنبھالا لے سکتی ہے نمائش سے پہلے یہی حال بیدری بٹن سازی وغیرہ کا تھا جب سے نمائش کا قیام عمل میں آیا ہے بیدری صنعت کافی فروغ اور زیادہ مقدار میں فروخت ہو رہی ہے چنانچہ اس ذوق کے پیش نظر ان کارخانوں نے نئی نئی اشیاء بنانی شروع کر دی ہیں جس میں ایرنگ۔ سیفٹی پن بٹن۔ ساڑیوں کے بروچ وغیرہ قابل ذکر ہیں ورنہ اس سے پہلے بجز حقہ، کشتی، ڈبیہ وغیرہ کے بہت کم چیزیں دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن اب تو ہر ضرورت کی چیز بیدری کارخانے پیش کرنے آمادہ ہیں۔

نمائش مقام لندن و جرمن

صغرا ہمایوں مرزا

نمائش ایک ایسی چیز ہے جس کے سبب لوگوں کو دستکاری کی ترغیب ہوتی ہے اور وہ آگے بڑھ سکتے ہیں صنعت وحرفت تجارت میں ترقی ہوتی ہے سامان جو فروخت ہوتا ہے اس سے فائدہ بہت ہوتا ہے عورتوں کے ہاتھ کی دستکاری کی نمائش تو ضرور ہونی چاہیے اسی خیال سے میں سالہا سال سے صرف عورتوں کی دستکاری کی نمائش کیا کرتی ہوں پکوان کی بھی نمائش کر چکی ہوں۔ ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد کی رزیڈنٹ کی بی بی مسز کینز صاحبہ سے افتتاح کروایا تھا ان کو پکوان بہت پسند آیا تھا۔ ابھی ۱۲ اکتوبر کو لیڈی حیدری کلب میں پکوان کی نمائش و دستکاری کی گئی جس کا افتتاح لیڈی حیدری یار جنگ بہادر نے کیا۔

میں نے نمائش لندن کی دیکھی ہے اور جرمن کی بھی۔ اگر اس کی تفصیل لکھوں تو بہت طول ہو جائیگی ۱۹۲۴ء میں لندن میں نمائش ہوئی جس کا نام امپائر ایگزیبیشن۔ انگلستان کے تحت جتنے ممالک ہیں ان سب کو اس میں حصہ لینا پڑا۔ لندن کے قریب ویملی پارک ایک مقام ہے اس جگہ نمائش ہوئی تھی (۲۶۰) ایکڑ تقریباً تین سو بیگہ رقبہ زمین کو گھیر کر نمائش گاہ بنائی گئی تھی اور دس کروڑ پونڈ (فی پونڈ پچیس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) خرچ کر کے ایک شہر آباد کیا گیا تھا تالاب بنائے تھے، پہاڑ بنائے تھے جس پر ریل چلتی تھی ہر ایک شہر کا سامان ایک ایک مکان بنا کر رکھا تھا جس کو پویلین کہتے ہیں کینیڈا۔ جاوا ہندوستان برودہ غرض ہر جگہ کے مکانات الگ الگ بنا کر سب چیزیں سجا کر رکھ دی تھیں ایک شیشہ کا کمرہ بنایا تھا جس میں جنگل چشمہ جاری تھے جو پہاڑوں سے نکل کر بہہ رہے ہیں پانی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کہیں کھیت ہے ناگر چل رہا ہے کینیڈا کا جنگل بنایا ہے جنگل میں شیر اور رکینڈا پانی پی رہے ہیں سمندر بنایا ہے جہاز چل رہے ہیں غرض ہر قسم کی چیز دکھائی دیتی تھی۔ ایک مسکہ کا گھوڑا بنایا تھا بالکل گھوڑے کے قد کا۔ آئینہ چاروں طرف لگا دئیے تھے برف سے کام لیا گیا تھا مشین کہیں چل رہی ہیں بسکٹ مشین پر بن رہے ہیں آٹا ڈال دیا جاتا ہے مشین میں فوراً بسکٹ تیار ہوتے جاتے ہیں بہت سی عورتیں تیار بسکٹ مشین سے کھاتی جاتی ہیں اور ڈبوں میں بھرتی جاتی ہیں خوبصورت عورتوں کی نمائش بھی تھی ایک حصہ میں خوبصورت عورتوں کو رکھا تھا۔ کوئی کتاب پڑھ رہی ہے کوئی پلنگ پر لیٹی ہے کوئی

ؔ جاپان و روس نے تجارت کے سبب ترقی کی۔

سی رہی ہے۔ کوئی کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ کھیل تماشے بہت تھے۔ جتنے قسم کے مشین ہیں کیا کیا کام بنا ہے سب بتایا تھا کہیں کپڑا بنایا جارہا ہے۔ کہیں لکڑی کا کام ہو رہا ہے۔ کہیں بلور کے برتن بن رہے ہیں غرض سب کچھ دکھایا تھا۔

لندن سے ہم جرمن سید ہمایوں مرزا صاحب کے علاج کیلئے گئے تھے اتفاق سے جب واپس ہونے لگے لب زک علاقہ جرمن میں نمائش ہو رہی تھی وہاں کا یہ طریقہ ہے کہ لیپزگ میں دکانوں میں نمائش ہوتی ہے ہم جب ہوٹل سے نکلے تو پہلے یہ دیکھا کہ سیکڑوں آدمیوں کے سینوں پر تختیاں لٹک رہی ہیں کسی کے ہاتھ میں لمبی سی لکڑی ہے اس پر تختہ سا لگا ہوا ہے کسی کے ہاتھ میں جھنڈے ہیں ان سب پر اشتہار ہر چیز کا چسپاں ہے۔ غبارے اڑ رہے ہیں ان پر اشتہار ہیں اس پر لکھا ہوا ہے کہ فلاں فلاں نئی ایجاد ہوئی، فلاں مقام پر ملتی ہے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک فوج ہے کہ سڑک پر گذر رہی ہے اور ہر شخص کے سینہ پر ایک مڈل لگا ہوا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ڈھائی مارک کو اس طرح کا مڈل ملتا ہے یہ لینے کے بعد جہاں جہاں نمائش کے مکانات ہیں ان میں جاکر لوگ ہر چیز دیکھ سکتے ہیں ورنہ بار بار ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے اوپر جو دیکھا تو بہت سے ایروپلین اڑ رہے تھے تماشہ دیکھنے والے اس میں بیٹھ کر دیکھتے ہیں ایروپلین ایسے اڑ رہے تھے جیسے ہندوستان میں چیلیں اڑتی ہیں اس میں آواز بہت ہوتی ہے آواز سے کان پھٹے جارہے تھے اب ہم ایک دکان میں گئے اس میں تمام تصنیفیں رکھی ہوئی تھیں جو کہ چھ مہینے کے اندر شائع ہوئی تھیں قرآن شریف بھی تھا۔ قرآن تو نئی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس لئے رکھا تھا کہ نئی وضع سے چھاپا گیا تھا۔ فارسی کی کتابیں بھی بہت سی تھیں اہل جرمنی علوم مشرقیہ کی بہت قدر کرتے ہیں یہاں ہر علم کی بہت قدر و منزلت ہے وہاں سے ہم اور ایک مکان میں گئے جہاں قسم قسم کے کپڑے تھے جس میں چھ مہینے کے اندر وضع قطع تراش خراش میں تغیر و تبدل ہوا ہے بلور کے برتن ایک مکان میں رکھے تھے غرض ایک ایک مکان فاصلہ سے ہوتا ہے کوئی ایک میل کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے کوئی مکان قریب بھی ہے کسی مکان میں صرف چاندی کے برتن کسی میں صرف جرمن سلور کے برتن ہر قسم کے رکھے ہوئے تھے اور دور دور کے شہروں سے تاجر آئے تھے جو سامان پسند کرکے آرڈر دیتے ہیں نمائش آٹھ روز تک ہوتی ہے اس کے بعد صاحب مال ان لوگوں کے پاس مال ایکدم بھجوا دیتے ہیں متفرق طور پر یہاں مال فروخت نہیں ہوتا ایک بہت بڑے مکان میں چھاپنے کی مشینیں رکھی ہوئی ہیں جو نئی قسم کی ایجاد ہوئی ہیں ایک مکان ہے جہاں سیکلیں موٹریں وغیرہ ہیں ان مکانوں پر باہر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہاں فلاں فلاں چیز ملتی ہے اس نمائش سے مالی منفعت حاصل کرنیکی غرض نہیں ہے بلکہ یہ اسلئے ہے کہ کاریگروں کے دماغ میں نئی نئی چیزیں بنانے کا شوق پیدا ہو اسلئے یورپ میں ہر سال نیا فیشن بدلتا رہتا ہے کہ بنانیوالوں کو موقع ملے کہ وہ نئی نئی وضع کی چیزیں ایجاد کریں ۵

۵ کیا اچھا ہو کہ ہمارے حیدرآباد میں بھی اسی طرح کی نئی نئی چیزیں نمائش میں آیا کریں موجودہ نمائش میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے خدا کرے کہ اسکا مستقبل ملک کی ضرورتوں کو پورا کرے اور صناع اور مزدور کا مستقبل شاندار بن جائے۔

نمائش مصنوعات

زبیدہ عبدالسلام

نمائش کے نام سے ایک ایسا تصور پیدا ہوتا ہے جو ہر نمائش کے موقع پر دیکھنے میں آتا ہے یوم خواتین کے دن موٹر گاڑیوں کی ایک قطار۔ ایک ہنگامہ عظیم۔ اِدھر پولیس کا انتظام۔ اُدھر تانگہ والوں کی آپس میں لڑائیاں دس دس منٹ سے ایک ایک قدم کی رفتار۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ایک انتہائی کشمکش اور شدید انتظار کے بعد گاڑی گیٹ میں داخل ہوتی ہے۔ اُتر تو جاتے ہیں لیکن یہاں فوراً ہی داخلہ نہیں ملتا کیونکہ وقت مقررہ پر ٹکٹ گھر کھلتا ہے۔ بعض شوقین عورتیں بہت ہی جلد آنے کی زحمت کرتی ہیں کیونکہ اگر دیر ہو جائے ان کی گاڑی کا نمبر دور پڑ جاتا ہے بعض عورتیں تو اس قدر شوقین ہوتی ہیں کہ پردہ کو بالائے طاق رکھ کر چند قدم آگے ہی اتر جاتے ہیں۔ طویل انتظار کے بعد داخلہ کھلتا ہے۔ اب ٹکٹ گھر پر یورش نہ پوچھئے ایک پر ایک گرتی ہیں خود انھیں اپنی سُدھ نہیں اوروں کا کیا خیال کریں گی۔ بڑی آفتوں سے ٹکٹ حاصل کرتی ہیں اور داخلہ گیٹ تک آتی ہیں یہاں بھی انہیں داخل ہونے کی اس قدر جلدی رہتی ہے گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر دیر ہو جائے تو ان کو داخلہ ہی نہیں ملے گا۔ بعض تو ایسی جان باز ہوتی ہیں کہ اس کش مکش سے فائدہ اٹھا کر بغیر ٹکٹ کے ہی گھس جانے کی کوشش کرتی ہیں اور اکثر ولے اس میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ اب جو لا ہی کشادہ اور وسیع حصہ میں داخل ہوتی ہیں بس عالم نہ پوچھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارہ سال قید میں رہ کر اب رہا ہوئی ہیں رنگ برنگ کی پریوں سے تمام باغ رشک جناں بن جاتا ہے۔ ان میں بھی دو قسم کی پریاں ہوتی ہیں۔ فیصد دس وہ ہوتی ہیں جو معلومات حاصل کرنے اور عجائبات دیکھنے آتی ہیں اور باقی وہ ہوتی ہیں جو محض تفریح کھیل تماشا اور شاپنگ کے شوق میں آتی ہیں اور جنھیں پہننے اور اوڑھنے کا بھی بیحد شوق ہوتا ہے۔ اس سج دھج سے آتی ہیں کہ گویا چوتھی کی دلہن ہیں۔ اپنے لباس اور زیورات کی بہار دکھانے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں اپنی بہار دوسروں کو اور دوسروں کی بہار اور فیشن پرستی سے خود معلومات حاصل کرتی ہیں۔ ان میں ہر قوم و مذہب کی عورتیں ہوتی ہیں اور ان کا رنگ ڈھنگ، طرز و طور لباس گفتگو وغیرہ

جدا ہوتا ہے۔

ایک سرسری نظر اسٹالس اور مصنوعات پر ڈالتی ہیں پھر تفریح کی سوجھتی ہے۔ جھولوں پر ایک ہنگامہ عظیم ہوتا ہے۔ بچوں بوڑھوں کی قید نہیں اور بیٹھتی بھی ہیں تو ایسی کہ انھیں خود اپنی بھی خبر نہیں۔ ساڑی کا آنچل ایک طرف جاتا ہے تو خود ایک طرف۔ خوشی سے اس قدر چیختی ہیں گویا انہیں جنت دنیا ہی میں مل گئی۔ بعض تو جھولوں کی اتنی شوقین ہوتی ہیں کہ ٹکٹ پر ٹکٹ خریدتی چلی جاتی ہیں۔

اس کے بعد کشتی کی طرف آئے۔ یہ ایک بہت ہی دلچسپ چیز ہے۔ یہاں ایک مجمع کثیر ہوتا ہے رنگ۔برنگ کی ساڑیوں میں ملبوس کشتی میں بیٹھتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیلے آسمان پر توس قزح کی کمان دھیرے دھیرے چلی جارہی ہے۔ سب سے زیادہ ہجوم یہیں رہتا ہے کیونکہ حیدرآباد کی عورتوں کو ایسے موقع ملتے ہی کب ہیں۔

ہاتھی اور اونٹ کی سواریوں کا جائزہ لیجئے۔ یہاں کا تو منظر ہی اور ہوتا ہے دیکھنے سے ہنسی بھی آتی ہے اور شرم بھی۔ اگر نوعمر لڑکیاں بیٹھیں تو اتنا برا معلوم نہیں ہوتا۔ اکثر بڑی بڑی اور موٹی عورتیں اس قدر بیخوف بیٹھتی ہیں کہ پناہ بخدا۔ ہاتھی بعض وقت اِدھر اُدھر جھکتا ہے تو پھر چیخوں کی صدائیں سُننے کہ گویا بھیانک راگ چھڑ گیا ہے۔ اگرچہ فیل بان اطمینان دلاتا رہتا ہے مگر یہاں تو لطف اٹھانے سے زیادہ خود تماشائی بننا مقصود ہوتا ہے۔ اب تفریحات میں آیئے۔ ایک وسیع میدان میں متعدد اسٹالس ہوتے ہیں کسی میں آدمی کا سر اور سانپ کا جسم اور ایک طرف مچھلی کا جسم اور انسان کا سر لیکن بعض بھولی عورتیں اس کو حقیقت سمجھ کر جوق در جوق گھستی ہیں۔ کہیں گڑیوں کا ناچ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ یورش اس اسٹال پر ہوتی ہے جہاں چوڑیاں ہوتی ہیں۔ کئی سال سے یہ سلسلہ جاری ہے اور کافی فروخت ہوتی ہیں۔ کھیل تماشوں سے فارغ ہوکر ہم دوسری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مختلف جگہ ہوٹلیں قایم ہیں بعض ہندو اور بعض مسلم۔ یہاں کی دنیا ہی اور ہوتی ہے۔ بعض عورتیں کھانے کی اس قدر دیوانی ہوتی ہیں کہ اپنے ملنے والیوں کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔ ان کے پیش نظر محض خوردن کا مشغلہ رہتا ہے۔ بعض کرسیوں کا لحاظ ہی نہیں کرتیں۔ گویا کرسیوں کو اچھا خاصا دسترخوان بنا دیتی ہیں اس پر اضافہ یہ ہوتا ہے قیمتوں کے وقت مچھلی بازار کا عالم بن جاتا ہے۔ بعض اوقات حجت و تکرار یہاں تک کی نوبت آتی ہے۔

ہوٹلوں کے علاوہ ٹوکرے والیوں کی بھی کثرت رہتی ہے اس کا امتیاز نہیں کہ کیا لیں اور کیا نہ لیں یہاں خوردن کا معاملہ ہے۔ جھیوں کی آڑ ہو تو ناک میں دم آجاتا ہے۔ جب عورتوں کا مجمع

ایکدم سے آجاتا ہے اور جگہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے
تو کڑاہیوں پر گرتے گرتے بچتی ہیں اور چیخوں کا
وہ غل مچتا ہے کہ قیامت ہی آگئی۔ گزشتہ نمائش
میں کچھ انتظام اور جگہ کی تبدیلی سے تکلیف اٹھانی
پڑی۔ کیونکہ رقبہ نمائش کافی وسعت کا طالب ہے
جو کارپردازان نمائش کے بس کی بات نہیں ورنہ
وہ اس سے زیادہ سہولت بہم پہنچا سکتے۔

اب نمائش کے اصلی مقصد پر آنا چاہیے
حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد مصنوعات میں کافی
ترقی کر گیا ہے لیکن گاہک ایسے نہیں کہ ان کی قدر
کریں اور صناعوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ خوش
اسلوبی کے ساتھ اسٹالس سجائے جاتے ہیں کہ بغیر
داد دئے نہیں رہ سکتے۔ محکمۂ بلدیہ کی طرف سے
چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں اور یہاں بھی لوگوں کا
ایک مجمع کثیر ہوتا ہے۔ سائنس کے شعبہ میں مختلف
ترشہ اور گیس کی تیاریوں کا عملی مظاہرہ ہوتا
ہے جہاں ایسی ہی خواتین دلچسپی لیتی ہیں جنھیں
اس کا ذوق ہوتا ہے وہی خواتین دلچسپی لیتی
ہیں جن کو سائنس سے لگاؤ ہو۔

شکار گاہ کو خاص اہمیت ہے یہاں ایک
مجمع کثیر ہوتا ہے۔ نگران کار یہاں کی کافی حفاظت
کرتے ہیں۔ آمد و رفت کے راستے علحدہ علحدہ رہتے
ہیں۔ کتب خانہ کا ایک اسٹال ہوتا ہے جہاں
نئی نئی تصانیف اپنی بہار دکھاتی ہیں۔ کھلونوں
کی دوکانوں پر کافی یورش رہتی ہے۔ بعض بچے
ان کے خریدنے پر مچلتے ہیں مائیں تو خرید کر دیتی ہیں
مگر بعض اپنے بچوں کو پیٹنا شروع کر دیتی ہیں۔
کپڑوں اور زیورات کی دوکانوں پر ایک مجمع
رہتا ہے۔ کوئی ساڑی کی قیمت دریافت کرتی
ہیں تو کوئی بلوز کا نمونہ۔ کوئی پراندہ پر تکرار
کر رہی ہیں کسی کی سانڈل پر نظر ہے تو کوئی
چپلی دیکھ رہی ہے زیورات کی دکان پر ایک
ہنگامہ ہے کوئی ایرنگ لے رہی ہیں تو کوئی انگوٹھیاں
اور چوڑیاں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پہلی اور آخری
نمائش کے دن عورتوں کی بہت یورش رہتی ہے
آخری نمائش میں کانفرنس بھی رکھی جاتی ہے مختلف
تحریکات ہوتی ہیں، اور ووٹ لئے جاتے ہیں
Baby Show کیا جاتا ہے۔ مائیں
اپنے بچوں کو لاتی ہیں۔ صحت مند اور توانا بچوں
کو انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ یہاں عموماً عورتوں
کا تعلیم یافتہ طبقہ دلچسپی لیتا ہے اور وہ جو روشن
خیال ہوں۔ نمائش میں مختلف جگہوں پر ٹیلیفون
ہوتے ہیں۔ یہاں گائیڈ کی لڑکیاں متعین رہتی
ہیں یا رضاکار بچے۔ بعض شریر لڑکیاں یہاں
بھی دھوم مچاتی ہیں۔ خواہ مخواہ ٹیلیفون کرتی
جاتی ہیں۔ ایسی بہت کم ہوتی ہیں جو ضرورت
پر فون کریں۔ اکثر اسٹالس پر گائیڈ کا انتظام
رہتا ہے۔

۵ بجے کے وقت ایک بڑے سے میدان میں
رضاکار بچے بیانڈ پر اپنے کرتب دکھاتے ہیں

لاٹھی بازی اور کشتی وغیرہ -

شام کے ٹھنڈے وقت کچھ عورتیں سبزی پر بیٹھی ہیں اپنی سہیلیوں سے مصروف کلام رہتی ہیں اور لائیٹ میں بڑا لطف آتا ہے۔ نمایش میں ملاقات کا زیادہ موقع ہوتا ہے ایک زمانہ کے بچھڑے ہوؤں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ گڑبڑ میں بعض وقت بچے چھوٹ جاتے ہیں اور ان کی تلاش شروع ہوتی ہے -

پانچ بجنے کے بعد لوڈ اسپیکر سے نشریات شروع ہو جاتے ہیں "فلاں نمبر کی گاڑی آگئی ہے جلد تشریف لائیے"۔ فلاں صاحب کے زنانہ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ انتظار کر رہے ہیں" وغیرہ وغیرہ

اب جوں جوں رات ہونا شروع ہوتی ہے نشریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آٹھ بج گئے۔ نو بج گئے۔ جلد برخاست ہو جائیے۔ یہ لیجئے گیارہ بج گئے۔ نمائش برخاست ہوگئی۔ براہ مہربانی آپ لوگ بھی برخاست کیجئے"۔ مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ وہ اپنی تفریح میں مشغول رہتی ہیں۔ آخر میں یہ دھمکیاں دیجاتی ہیں کہ مرد اندر آنیوالا ہے جلد برخاست ہو جائیے" لیکن یہاں کسی کو احساس نہیں رہتا۔ اس لئے رات کے تین چار بجتے ہیں جب کہیں مجمع رخصت ہونے لگتا ہے۔ اکثر اوقات رات میں آتش بازی بھی کی جاتی ہے۔ اب واپسی کے وقت گیٹ کا جائزہ لیجئے تو یقیناً میدان حشر اور پرسش اعمال کا تصور کھنچ جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو دھکے دیتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ بعض تو مردانہ گیٹ تک جا کر سوار ہوتی ہیں۔ پھر بھی موٹروں کے گیٹ پر کافی سہولت ہوتی ہے۔ مگر ٹانگوں، شکراموں اور رکشاؤں کے گیٹ کا عالم ناقابل بیان ہے -

میں یہ ضرور کہوں گی ایسی تفریح کا آپ کو موقع ہی کب ملتا ہے جب ملتا ہے تو تفریح کے ساتھ اپنی اپنی معلومات میں اضافہ بھی کریں ورنہ محض نمایش کو تماشہ سمجھ کر دیکھنا آپ کے لئے مفید نہ ہوگا۔ اپنے خیال کو وسعت دیجئے اور سوچئے کہ اس قدر وسیع نمائش کے ترتیب دینے اور انتظامات کرنے میں کارپردازان نمایش کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اپنا خیال ہے کہ کامل ایک مہینہ کے رات دن جاگتے ہی میں کارکنان نمائش گزار دیتے ہوں گے۔ ہمنوں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ خود بھی نمائش اور اوس کے انتظامات کو مقبول بنانے کے لئے اپنی سعی مشکور سے دریغ نہ کریں ؛

یوم خواتین اور پریشانیاں

معصومہ جنگ بہادر

نمائش کے دوران میں مجھے اگر کوئی دلچسپی
ہوتی ہے تو وہ یوم خواتین ہے کیونکہ اس روز
خواتین کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے لائق رہتے
ہیں۔ ہر ایک کی بڑھ چڑھ کر یہ خواہش ہوتی
ہے کہ وہ آج اپنے آرائش کا کمال مظاہرہ کریں
پھر آتی ہیں تو اس شان سے کہ باید و شاید بعض
تو اپنے ساتھ بوق بند طوق بند لیتی آتی ہیں
اور جہاں جی چاہا فرش کیا اور پاندان
کھولا آپ کھاتی ہیں اور دوسری بہنوں
کی بھی تواضع کرتی ہیں اونہیں اس کا احساس
نہیں رہتا کہ یہاں سے چند گھنٹوں میں بوریہ بستر
باندھنا پڑے گا۔ نہایت بیفکری کے ساتھ اپنی
بساط بچھاتے ہیں کہ کارپردازان نمائش کے
تخلیہ کی آوازیں بھی نمائش کی ہنگامہ پرور
چیخوں میں ضم ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان بیچاریوں
کو سال میں ایک ہی مرتبہ تو جی کھول کر تفریح
کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس قیامت کی گرم بازاری
میں اکثر و بیشتر اپنی ساتھیوں سے جدا ہوتی
ہیں تو اوس وقت اون کی پریشانیوں پر ہنسنے
کو تو نہیں بلکہ ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ہے۔
ایک بڑی بی کوئی ساٹھ پینسٹھ برس کی
جن کے منھ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت جہاں
بھر کے کپڑے پہنی ہوئی جن کے جلو میں نصف درجن
بہو بیٹیاں تھیں۔ خمیدہ کمر عصا کا سہارا لئے
نمائش کا بغور معائنہ کر رہی ہیں گویا آج وہ
صناع اور کارپردازان نمائش کی حقیقی حوصلہ
افزائی کرنے والی ہیں۔ غرض واپسی کا جب وقت
ہوا تو ہم نے دیکھا کہ بہو بیٹیوں کا قافلہ
پریشان ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ
بڑی بی غائب ہیں کہیں پریاں اڑا نہ لے گئی
ہوں مگر اماں جان۔ اماں جان کی آوازیں
چیخ و پکار کی محفل میں صور اسرافیل کا کام
دے رہی تھیں۔ لیکن تلاش میں نمائش کا چپہ
دیکھ ڈالا لیکن بڑی کو تو آج یہ سمائی تھی کہ
بہو بیٹیوں کو پریشان ہی کر دیں۔ ڈھونڈتے
ڈھانڈتے جب کشتیوں کی جانب دوڑیں تو
دیکھا کہ بڑی نہایت مسرت سے چلی ناؤ منجدھار
کا لطف اٹھا رہی ہیں۔ لڑکیوں کو اطمینان
اور سکون ہوا۔ سنا تو یہ کہ عموماً بچے کھو جاتے
ہیں مگر بوڑھے بچوں کے کھو جانے کا نظارہ آج
اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اس لئے میری یہ تجویز ہے کہ یوم خواتین کے

روز بچوں اور بوڑھے بچوں کے گلے میں نام۔ مکان
کا نمبر۔ محلہ کی ایک ایک تختی ڈال دی جائے
تو ساتھیوں کو پریشانیوں سے چھٹکارا ملیگا
اور کارپردازان نمائش کو انتظامات کرنے میں
دشواری بھی نہ ہوگی۔ ساتھ والیاں لطف و
مسرت سے نمائش کا بے کھٹکے معائنہ کرسکیں گی۔

کھجور کی ٹوکریاں اور پرس

سلیم النساء

دو ایک سال سے دوران نمائش میں کھجور کی پتیوں کے
رنگین پیاکٹ اور گھونگوں کے چھوٹے چھوٹے ہینڈ بیاگ
اور پیسہ رکھنے کے خوشنما پرس دیکھنے میں آتے ہیں اور
دوران نمائش میں ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے ہیں اس کے
بعد اگر بازار میں ڈھونڈے سے نہیں دکھائی دیتے کہ اس
کام کرنے والے کون ہیں اور ان کے مکانات کہاں واقع
ہیں گزشتہ نمائش کے وقت ایسی چند چیزیں میں نے
خرید کر اپنی بعض سہیلیوں کو بیرون حیدر آباد بھجوائے
تھے۔ جنھوں نے اس حقیر سوغات کی بڑی قدر
کی اور جنھیں ابتک وہ عزیز ہیں۔ یہ پیاکٹ
وغیرہ بازار سے سودا لانے۔ لڑکیاں اسکول کو
کتابیں لیجانے میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

اگرچیکہ یہ ایک معمولی صنعت ہے اور معمولی
اشیاء سے تیار کی جاتی ہے۔ لیکن جب مفید اور فائدہ
بخش ہے تو اس کو عام طور پر بازار میں کثرت سے
آنا چاہئیے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کا کام کے کرنے والے
بالکل غریب اور نادار ہیں اور وہ اپنی جمع پونجی میں
جس قدر ایسے اشیاء تیار ہوتے ہیں نمائش کے
موقع پر تیار کرکے لے آتے ہیں اور جب سرمایہ ختم
ہو جاتا ہے تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دہر کر بیٹھے منھ دیکھا
کرتے ہوں گے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اراکین نمائش ان کا پتہ
چلاکر انھیں بلوائیں اور چند ہلکی شرائط بطور
تقاوی یا قرضہ انھیں امداد دیں تو ان کی زندگیاں
سدہر جائیں گی۔ اس صنعت میں اور بھی جدت
اور سلیقہ کی گنجائش ہے۔

باہر کے بُنے ہوئے رومی ٹوپیوں کے
اندر جو خول چڑہائے جاتے ہیں وہ یہیں تیار
ہوسکتے ہیں۔ ان کی ٹوکریاں بھی بنائی جاسکتی
ہیں۔ گھونگوں کے گلدان اور گملے بھی تیار ہوسکتے
ہیں جو میز کی زینت کا کام دیں گے۔ غرض اس میں
بہت ساری اشیاء کے تیاری کی گنجائش ہے بشرطیکہ
تفہیم اور تعلیم سے انہیں ایسے گر سکھائے
جائیں۔

غالباً ملک میں سب سے اچھی ہلکی اور
کارآمد یہی صنعت ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس
کو فروغ دیا جائے اور اس کی ضرورت کو کافی
طور پر محسوس کرایا جائے۔

خواتین کی آمد نمائش میں

تین نہیں بجنے پاتے کہ موٹروں، ٹانگوں رکشاؤوں، شکراموں اور بنڈیوں کا تانتا بندھ جاتا ہے جس میں امیر غریب، وسیع اور مختصر خاندانوں سے بھری ہوئی خواتین آتی تھیں گاڑی والوں کی چیخ و پکار اور موٹروں کی پوں پوں کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کی گڑبڑ، بچوں کا شور و غل اور پردہ نشیں خواتین کی ہنگامہ آرائیاں اور زور زور سے باتوں کی آواز، عجیب وحشت خیز سماں ہوتا ہے جب ہم نمائش گاہ میں داخل ہوئے تو ہر قسم کی زرق برق "سونے میں زرد اور چاندی میں سفید" خواتین اور بہت سے میلے کچیلے اور صاف ستھرے بچوں اور خادماؤں سے دوچار ہوئے۔ ہر ایک چکا چوند کرنے والی خاتون خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے گستاخی معاف گویا یہ "خواتین کی نمائش" ہوتی ہے۔

غریب مائیں اپنے بچوں کو لادے ہوئے تھیں اور جو مائیں غریب نہیں تھیں وہ اپنے بچوں کو لدائے ہوئے تھیں گویا ہر ایک نے اپنی آل و اولاد کو ساتھ ہی رکھنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا تاکہ لوگ بے اولاد نہ سمجھیں یا ان کے بچوں کی تعداد کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

ایک بیچاری خاتون کو اس حالت میں دیکھا کہ کاندھوں پر ننھا بچہ ہے ایک ہاتھ میں دودھ کی شیشی ہے وغیرہ اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ایک اور بچی کی انگلی پکڑے ہوئے جا رہی تھی۔ بچہ رو رہا تھا اور بچی کسی بات پر مچل رہی تھی۔ انھوں نے نمائش تو کیا دیکھی ہوگی بلکہ اپنے آپ کو نمائش میں پیش کیا تھا۔ ایک اور خاتون جو غالباً موٹر نشیں تھیں اپنے دوچار عدد بچوں کو باری باری آیاؤں کے پاس سے لے کر سمجھا رہی تھیں اور انہیں مختلف کھلونے اور مٹھائیاں دلانے میں مصروف تھیں۔

ریحانہ

ایک ضعیفہ جو جھک کر دوہری ہو گئی تھیں لکڑی ٹیکے ہوئے قدم قدم اس طرح جا رہی تھیں کہ گویا نمائش گاہ کی زمین کا رقبہ ناپ کر چھوڑیں گی ان کے ساتھ چند ایک چھوکریاں تھیں جو نانی "نانی" کہہ کر ان کی رہبری کر رہی تھیں۔

ایک خاتون پریشان حال اپنے بچے کی تلاش میں نہایت بدحواس ہو رہی تھیں ہر ایک سے

اس کا حلیہ بیان کر کر کے رو رہی تھیں مگر بیچارے
تماشائی سب کے سب اس کا پتہ دینے سے
قاصر تھے۔

ایک ادھیڑ عمر کی خاتون جو راشننگ اور
جنگ کی فکروں کے باوجود بھی دبلی نہ ہو سکی تھیں
ایک تو یوں بھی موٹاپے کی وجہ سے انھیں حرکت
کرنا دشوار تھا پھر اس پر کار چوبی کھیوے کی
ساڑی اور پازیب نے عجیب ستم ڈھایا تھا
انہیں ساڑی کو سنبھالتے اور نزاکت سے قدم
اٹھاتے ہوئے دیکھ کر خواتین خواہ مخواہ ہنستی
تھیں۔ مگر بیچاری کیا کرے جب کسی سے کچھ پوچھتی
تو جواب دینے کی بجائے قہقہہ لگایا جاتا۔ غرض
ہوا یہ کہ ان کی موٹی سی ناک غصہ سے لال انگارہ
ہو گئی، لگیں کوسنے، نمائش کو، اور نمائش
دیکھنے والوں کو، نمائش گاہ کو، اپنے ملازمین کو
غرض سب نے ان کی گالیاں کھائیں اور سیر نہ ہوئے۔

ایک جگہ کوئی بڑی بی خاموش بیٹھی ہوئی
تھیں ان کے پاس ایک لڑکی بھی تھی جب ان سے
پوچھا گیا کہ "کیوں کیا آپ کچھ دیکھنا نہیں
چاہتیں" تو انھوں نے سرد آہ بھر کر کہا "دیکھ
کر کرنا کیا ہے پاس پیسے بھی تو ہو صرف دیکھنے
سے تو دل ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ دنیا سونے
روپئے والوں کی ہے۔ انہیں بہاتا ہے یہ سب
کچھ دیکھنا، ہاں البتہ بہت دن سے حیدرآباد کی
امیر زادیوں کو دیکھنے کا ارمان تھا۔ بس اب جی
بھر کر دیکھ لیا۔"

الغرض جدھر جاؤ یوں معلوم ہو رہا تھا
کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی مصیبت میں مبتلا ہے کسی کو
نمائش سے سروکار نہیں۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ
نمائش گاہ کی ہنگامہ آفریں شام۔ چڑیاں
چہچہا رہی تھیں گویا ان تمام نمائش بینوں کو
اس مصیبت (نمائش) سے چھٹکارا ملنے کی خوش
خبری سنا رہی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ
یہ سب کی سب گھر جا کر آرام سے سوئیں گی شاید
پھر کبھی بھی نمائش دیکھنے کا نام نہ لیں۔ کیونکہ کسی
کا زیور کھو گیا تھا تو کسی کا بچہ، غرض ہر ایک
نے ایک نئی پریشانی مول لی تھی۔ انہیں نمائش
میں آنے کی اچھی طرح سزا مل گئی تھی۔ لیکن آہ
اس میں قصور کس کا! نمائش کا یا نمائش دیکھنے
والوں کا۔ کارپردازان نمائش آسائش کا انتظام
کرتے ہیں لیکن ہم جیسی آنے والیاں اون کے
انتظام کو قایم نہیں رکھتے۔ پھر شکایت کس منہ سے۔

میرے ذہن میں ایک تجویز آتی ہے۔...
کاش ان خواتین کے لئے ایسا انتظام کیا جائے کہ
نمائش گاہ میں داخل ہونے سے پیشتر سب کے قیمتی
لباس، زیورات اور چھوٹے بچے چھین لئے جائیں
اور موٹی کھدر کی ساڑیاں سب میں بلا تفریق
امیر غریب یکساں تقسیم کر دی جائیں۔ جن کو پہن کر
یہ باطمینان نمائش کی سیر سے لطف اندوز ہوں
اور نمائش کے مقاصد کو سمجھیں۔ واپسی کے وقت

کھدر کی ساڑیاں لے کر ان کا مال واولاد انہیں واپس کر دیا جائے۔ تب سب کی سب خوش خوش وبے فکر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو سکیں گی۔ اس طرح ان کے یہ عذرات قابل سماعت نہ ہوں گے کہ "بچے کے ستانے کی وجہ سے ہم نے اچھی طرح نمائش نہیں دیکھی" یا زیور کھو جانے سے ہم پریشان رہے یا دوسری خواتین کی چمک دمک نے ہم کو خیرہ کر دیا تھا" ہاں یہ کہنا تو میں بھول گئی کہ بہت ضعیف یا موٹی خواتین کو جو کہ اچھی طرح چلنے پھرنے سے معذور ہوں نمائش گاہ میں داخل ہونے سے روک دی جائیں۔ لیکن اس طرح کے انتظام میں یقیناً سب کو اعتراض ہوگا اور ہونا بھی چاہیئے۔ میں نے محض تفریحاً اس طرح کی تجویز پیش کی ہے مگر یہ ضرور کہوں گی کہ نمائش کے اہتمام اور اوس کے انعقاد میں واقعی بڑی محنت و مشقت اوٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن ہم آنے والیوں کو اس کا خیال ہونا چاہیئے کہ ایسی نمائشوں سے حقیقی فائدہ اٹھائیں اور ملکی مصنوعات کے خرید سے صناع اور مزدور کی حوصلہ افزائی کریں۔ اگر بعض اشیاء گراں بھی ہوں تو اپنے صناع کی ہمت افزائی کے لئے ایسا ایثار کریں تاکہ وہ ملک کی مکمل ضرورتیں رفتہ رفتہ پورا کر سکیں۔ یہی عین مقصد نمائش کے انعقاد کا ہوتا آیا ہے۔

صنعت شکر سازی پر ایک نظر

عارف النساء رضیہ

گذشتہ پندرہ سال کے اندر ہندوستان کی صنعت شکر سازی میں قابل لحاظ ترقی ہوئی اور شاید دنیا کے دیگر حصے اس ترقی کو حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ملک کے جغرافیائی حالات کے لحاظ سے شکر سازی کے بہت سارے کارخانے شمالی ہند میں واقع ہیں اس صنعت کی ترقی میں جزیرہ نمائے ہند بہت پیچھے رہا کیونکہ آبپاشی کی سہولتوں کے میسر نہ آنے اور بارش کی کمی کی وجہ سے اس کی کاشت میں بےحد اخراجات برداشت کرنی پڑتے تھے۔ لیکن بہت تھوڑی دیر میں ان مقامات میں اصلاح کرلی گئی۔ دکن کی آب و ہوا اور آبپاشی سہولتیں اور زمین نیشکر کی کاشت کے لئے موزوں ہونے کی سبب سے بڑی خوبی زمین زرخیز اور مسامدار ذیلی پرتوں پر مشتمل ہے۔ اس قسم کا خاص طور پر قابل لحاظ قطعہ وہ ہے جو نظام ساگر کی نہر سے سیراب ہوتا ہے اور ممکنہ سہولتیں حاصل رہیں۔

کاشت نیشکر } مملکت آصفیہ میں تقریباً ہر سہ ساٹھ ہزار سے نود ہزار ایکڑوں میں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے اس کا ½ حصہ نظام ساگر پراجکٹ کے تحت ہے اس پراجکٹ کے تحت نیشکر کے ساٹھ ہزار ایکڑوں کی آبپاشی کے لئے پانی مہیا کیا جا سکتا ہے اور آج کل اس کے تحت چالیس ہزار ایکڑوں کی کاشت ہو رہی ہے جس کا کثیر حصہ نظام شوگر فیاکٹری میں صرف ہوتا ہے۔

نظام شوگر فیاکٹری بڑی حد تک رعیت کے فراہم کردہ نیشکر پر منحصر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خود فیکٹری کے بہت بڑے حصہ پر بھی نیشکر کاشت ہو رہی ہے۔ حکومت نے مقامی کاشتکاروں میں کارخانہ کے ذریعہ تقاوی دی ہے۔ اس کے علاوہ خود کمپنی کی جانب سے موسم کے شروع ہونے سے قبل اور دوران میں مقامی کاشتکاروں کو تقاوی پیشگی دی جاتی ہے اس کے علاوہ "سررشتہ زراعت اشاعت" کھاد اور تخم کا انتظام بھی کرتا ہے اس طرح سے کاشتکاروں کے فائدے کا کام ہموار طریقہ پر جاری ہے اور بلا واسطہ طور پر مواضع کے ساہوکاروں کے پنجے سے "مکمل امداد باہمی" چھڑایا جا رہا ہے۔ موجودہ زمین فیکٹری کی پچیس ہزار ایکڑوں میں سالانہ کاشت کی جاتی ہے۔ یہ تمام زمین عملی طور پر خالصہ کی افتادہ تھی۔ فیکٹری کی زمینات زیادہ تر پچاس فیصدی کالی مٹی پر مشتمل ہیں جسے آبپاشی کے لئے

غیر موزوں قرار دیا گیا ہے۔ اس ضلع میں مزدوری کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ یہ وسیع طور پر سیراب شدہ رقبہ ہے ہزاروں کی تعداد میں مزدوروں کو باہر سے لانا پڑا جن میں سے اکثر یہیں آباد ہو گئے۔ مقامی کاشتکاروں کو اس وقت ملازم رکھا جاتا ہے جب کہ وہ اپنے زرعی کاروبار سے فارغ ہوتے ہیں۔ اس طرح سے مقامی رعایا کو سال کے بارہ مہینے کام ملتا ہے جس سے ان کی معاشی حالت سدھر رہی ہے۔

اقسام نیشکر } کارخانہ کی زمینیات میں کثرت سے اُوسانی نیشکر بویا جاتا ہے۔ جون اور جولائی کے مہینوں میں اسے بوتے ہیں اور اسی سال کے اکتوبر و نومبر میں فصل کاٹنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس طریقہ کار سے کارخانہ کو یہ موقع ملتا ہے کہ کچلنے کا کام اکتوبر کے ابتدائی مہینہ میں شروع کر دیا جاتا ہے تاکہ اکتوبر سے اپریل تک سات مہینوں میں کام جاری رہے۔

کاشتکار بآسانی تیس ٹن فی ایکڑ نیشکر حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن کارخانے میں اڑسانی کی فصل سے (۴۲) ٹن فی ایکڑ نیشکر حاصل کیا جاتا ہے۔

آمدنی کے نقطہ نظر سے نیشکر کے مختلف اقسام میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ضروری ہے جس میں شکر کی کافی مقدار بھی موجود رہے "پی او جے ۲۸۷۸" کی کاشت کی جا رہی ہے جس سے اچھے نتائج بہ لحاظ آمدنی اور مقدار رس نکل رہے ہیں۔ سرد مہینوں میں بارہ سے تیرہ فیصدی تک رس حاصل ہوتا ہے۔ "پی او جے ۲۸۷۸" کی کاشت میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ سخت زمین مثلاً "چوکا سایل" میں سی او ۲۹۰ اچھی طرح اگتا ہے۔ سی۔ او ۴۱۹ جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ پی۔ او جے ۲۸۷۸ سے بھی اچھا ہوتا ہے۔ اس میں مزید فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی کٹائی آخری موسم میں یعنی مارچ اور اپریل کے مہینوں میں ہو سکتی ہے اس سے اطمینان بخش نتائج ظاہر ہو رہے ہیں۔

شکر کی حمل و نقل } کچلنے کے لئے روزانہ ایک ہزار تین سو سے دو ہزار آٹھ سو ٹن تک زیادہ نیشکر کی ضرورت ہوتی ہے اور اسے فصل درو کے بعد چوبیس (۲۴) گھنٹوں کے اندر ۲۵ میل تک کی مسافت سے لانا ہوتا ہے۔ اس مقدار کا پچاس فیصد حمل و نقل نظام اسٹیٹ ریلوے کے ذریعہ سے آتی ہے بقیہ پچاس فیصد کا بڑا حصہ فیاکٹری کے لائٹ ریلوے کے ذریعہ اور بقیہ لاریوں اور مقامی بنڈیوں کی مدد سے منتقل کر دیا جاتا ہے۔

شکر سازی } نظام شوگر فیاکٹری کی تجویز اس طرح کی گئی ہے کہ وہاں روزانہ دو ہزار پانچ سو ٹن نیشکر کچلی جا سکتی ہے لیکن نئی قسم کی نیشکر کی وجہ سے جس کی وہاں کاشت ہوتی ہے ابھی تین ہزار سے پچیس ہزار تک تیار ہو رہی ہے۔

شکر کے کارخانہ کا ضمنی حاصل "مولاسس" بڑے کام کی چیز ہے۔ اس سے بہت سارے کام لئے جاسکتے ہیں مثلاً الکحل کی تیاری کے لئے عصری مشین نصب کیا گیا ہے جس سے فی یوم پچاس ٹن مولاسس" سے تین ہزار گیلن الکحل تیار ہو رہا ہے اس کا دوسرا ضمنی حاصل "پریسمڈ" ہے جس کو زمین کے بنانے اور کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں نائٹروجن، فاسفورس، ترشہ، پٹاس اور چونا پایا جاتا ہے۔

نظام شوگر فیاکٹری کو قومی طمانیت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے کیونکہ یہ صرف معمولی صنعت نہیں ہے بلکہ ایک قومی ادارہ ہے۔ اس فیاکٹری پر بڑی حد تک نظام ساگر پراجکٹ کی ترقی کا دارومدار ہے جس پر حکومت کے ساڑھے چار کروڑ روپیے صرف ہوئے ہیں اس فیاکٹری کی وجہ سے کئی ہزار اشخاص برسر روزگار ہیں اسکے علاوہ یہ دیگر زرعی ترقیوں اور ذیلی صنعتوں کا مرکز ہے۔ فیاکٹری کا کبھی معائنہ کیجئے تو ایک دنیا دکھائی دیتی ہے جہاں اچھے پیمانہ پر مختصر اور خوبصورت مکانوں کے سوا دواخانہ اور رہائش کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔

نمائش میں داخلہ

بلقیس جہاں

عموماً دیکھا گیا ہے کہ یوم خواتین کے روز کثرت سے خواتین آتی ہیں اور جن کی یہ کوشش رہتی ہے کہ انہیں جلد جلد داخلہ مل جائے اور اس جلد بازی میں بڑی کش مکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ داخلہ کا دروازہ ایک ہی ہوتا ہے اور ٹکٹ گھر بھی ایک ہی رہتا ہے ایسی حالت میں بڑی بدانتظامی پیدا ہوتی اور پھر بچوں کے چیخ پکار سے تو حواس غائب ہو جاتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اس کا آسان حل یہ ہوگا کہ جس طرح مردانہ حصہ میں متعدد ٹکٹ گھر ہوتے ہیں اوسی طرح زنانہ کے لئے مردانہ سے زیادہ ٹکٹ گھر کا انتظام کیا جائے تو ایسی چپقلش نہ ہوگی اور داخلہ کے لئے بھی دو ایک دروازوں کا اضافہ عمل میں آئے تو اس میں خواتین کو بھی سہولت ہو سکے گی اور کارپردازان نمائش کے انتظامات بھی برقرار رہ سکیں گے یہ مسئلہ اراکین نمائش کے غور و فکر کیلئے پیش کیا گیا ہے۔

خواتین کیلئے لمحہ فکر

ناہید

جب کبھی نمائش دیکھنے کا موقع ملا میری آنکھیں نمائش میں خواتین کی ایسی دست کاریوں کی جویا رہیں جن سے وہ اپنے گھر بیٹھے اپنے لئے قوت لایموت کا سامان پیدا کر سکیں کیونکہ کئی ایسے شریف گھرانے ہیں جو کسی کے آگے دست سوال دراز کرنے میں اپنی شرافت کی توہین سمجھتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ گھریلو صنعتیں اتنی رائج ہوں کہ ایسی پردہ نشیں خواتین ماہانہ چالیس۔ پچاس روپیہ اپنی دست کاریوں کی بدولت بلا کسی جدوجہد کے پیدا کر سکیں۔

نمائش میں اگرچیکہ ایسی صنعتیں دیکھنے میں آتی ہیں لیکن وہ محض نمائشی تھیں اون کے نکاسی اور اون کے فروغ پر زیادہ توجہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ مابعد جنگ کی بدولت ایسی صنعتوں کو ترقی پانے کا خود بخود امکان پیدا ہوگیا ہے اس کی بھی ضرورت ہے کہ چند دردمند خواتین ایک منظم ادارہ قایم کریں اور بہت سارے اراکین بہم پہنچا کر اس کام کا آغاز کریں، ان اراکین کا یہ کام ہوگا کہ وہ اپنے اپنے سمت میں دورہ کرکے ایسا مواد بہم پہنچائیں کہ کتنے گھرانے ایسے ہیں جہاں کامدانی۔ کشیدہ کاری، کارگہ، زردوری، سلمہ ستارہ، سویٹر، بنیان وغیرہ کا کام کر سکتے ہیں۔ جب اس کا علم ہوجائے تو ان کی جستجو اور کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ایسے کام فراہم کرکے ان گھروں میں پہنچائیں اور وہ گھرانے تکمیل کار کے بعد اوس کو واپس کریں البتہ ان کی نکاسی اور اس کے فروغ کے لئے شوروم کی ضرورت اور اخبارات میں اعلان کرنا پڑے گا اور یہ ایسی مشق ہے جو نہایت آسانی سے حل ہو سکتی ہے، ہاں ہمت ارادہ اور اپنے طبقہ کا درد ہو تو یہ مراتب خود بخود طے ہو سکتے ہیں جس کی بدولت کئی گھرانے جو دوسروں کے دست نگر ہیں اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو سکیں گے، ورنہ یوں آپ نے سال میں ایک مرتبہ نمایش دیکھ لی اور اوس سے کوئی فائدہ نہ اوٹھایا اور اپنے طبقہ کی اعانت نہ کی تو پھر اس کا مقصد ہی فوت ہو جائیگا۔ چند بیفکر اور ہمدرد خواتین کو اب میدان عمل میں آنا چاہیئے اور اپنے فرقہ کی امداد اور اون کی مجبور زندگیوں کو مفید اور کارآمد بنائیں ورنہ اپنے ذات کی حد تک تفریح اور بیفکری سے

قوم کی کشتی کبھی ساحل مقصد تک نہیں پہنچی اور نہ پہنچ سکتی ہے تاوقتیکہ دل میں اپنے فرقہ کا درد اور اون کی مصیبتوں کا کرب نہ ہو۔ یہی وہ خیر جاریہ ہوگا کہ آئندہ آنیوالی نسلوں کی بچیاں اپنے بزرگوں کے کارناموں سے مسرور رہوں گی اور اون میں بھی اپنے طبقہ کے ترقی اور عروج کا جذبہ پیدا ہوگا۔ دوسری قوم کی خواتین سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہئے کہ وہ اپنے طبقہ کی اصلاح اور سنوار کے لئے آج کیا کیا کر رہی ہیں۔ اور ہندوستان کے وسیع اور عریض حصہ میں کئی ایک ادارے قایم ہو چکے ہیں، جن سے اون کی زندگی اون کے تمول کا پتہ چلتا ہے اس کے لئے سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ عزم راسخ ہو تو راستہ کی مشکلات خود بخود رفع ہو جائیگی۔ کچھ عرصہ شاید ایک ایسے ادارہ کی آواز کانوں نے سنی تھی لیکن آنکھوں کو مشاہدہ کا اتفاق نہیں ہوا اگر اوس ادارہ کا کوئی وجود ہے تو اس کے احیاء کا اب اچھا موقع ہے بسم اللہ کہکے اس کام کو شروع کر دیا جائے اور آئندہ سال کی نمائش میں ایسے ادارہ کو انہیں دیکھ سکیں۔

---

۴۴ جہاں نفسا نفسی کا عالم ہو جب کہ ہر ایک کو نمائش میں داخلہ کی فکر ہو، اس میں ہم بھی برابر کی ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ سب سے پہلے ہمیں داخلہ ملے اور اس داخلہ کی بدولت اکثر اوقات ہم خود سواریوں سے جلد اترتی ہیں ایسی حالت میں غور کیجئے کہ پردہ کی ذمہ داری کس پر ہے۔

یوم خواتین اور پردہ

اختر النساء

نمائش ہر سال ہوتی ہے نہایت سلیقہ سے اسٹال قایم ہوتے ہیں اور خواتین کی بدولت خرید و فروخت کا بازار گرم ہوتا ہے صناع اپنے مصنوعات کا صلہ پاتے ہیں اگر خواتین میں اپنی مصنوعات کے خرید کا یہی عالم رہا تو وہ زمانہ دور نہیں کہ ملکی مصنوعات ہر گھر میں اپنے لئے جگہ نکال لیں کیونکہ گھریلو زندگی کا مدار عورت پر ہے اور عورت ہی گھر کو جنت بناتی ہے اور اس کو دوزخ بنانے کی بھی وہی ذمہ دار ہے خوش نصیب ہیں وہ بی بیاں جنھیں اپنے گھر اور اپنی مصنوعات سے دلچسپی ہے۔ ملکی مصنوعات اسی سلسلہ میں ترقی پا سکتی ہیں۔

یہ میرے تاثرات ہیں البتہ افواہیں بعض پردہ سے متعلق سُنی جاتی ہیں لیکن قابل غور یہ امر ہے کہ یہ افواہیں کہاں تک درست ہیں غور کا مقام ہے کہ ہمارے یہاں شادی بیاہ میں دو ڈھائی مہمان عورتیں اکٹھا ہوتی ہیں تو ان کا انتظام ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتا چہ جائیکہ نمائش جہاں بیک وقت پندرہ بیس ہزار عورتیں چند گھنٹوں کیلئے جمع ہوں تو اون کے انتظامات میں کارپردازان نمائش کو کتنی تکلیف اور کتنی دقت اور کتنے انتظامات کرنے پڑتے ہوں گے وہ حتی الامکان پردہ کے مکمل انتظامات کرتے ہیں جس کی نظیر شاید ہندوستان کے بڑے سے بڑے جلسوں میں ملنا مشکل ہے تاہم اگر کوئی معمولی بدانتظامی دکھائی دے تو وہ قابل گرفت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس بارہ میں

۴۴

صنعتی نمونہ گھر

اغراض و مقاصد

(۱) صنعتی نمونہ گھر (انڈسٹریل میوزیم) کے ذریعہ مملکت آصفیہ کے قدرتی و معاشی ذخائر سے استفادہ کے مختلف وسایل کو یکجا کرنے کی کوشش

(۲) صناعوں اور تاجروں کو ملکی اشیاء بہترین طریق پر تیار کرنے اور فروخت کرنے کے لئے آمادہ کرنا، اور ان کی ہمت افزائی کرنا۔

(۳) اہل ملک کو ملکی اشیاء کی خریدی و استعمال کی ترغیب دینا۔

(۴) مصنوعات سے متعلق لٹریچر شائع کرنا۔ مملکت کی خام پیداوار مصنوعات کی تیاری اور نکاسی سے متعلقہ اعداد و شمار اور معلومات فراہم کرنا۔

(۵) قابل امداد تاجروں اور صناعوں کی فہرست مرتب کرنا، اور ان کے لئے کافی طمانیت پر قرضہ یا موقتی رقمی امداد کا بندوبست۔

شعبۂ فروخت مصنوعات

صنعتی نمونہ گھر کا ایک شعبہ فروخت مصنوعات پر مشتمل ہے، اور اشیاء کے فروخت پر کم از کم پانچ فیصد کمیشن لی جاتی ہے۔ اشیائے فروخت کے لئے رکھنے پر کوئی فیس عائد نہیں کی جاتی ہے۔

مزید تفصیلات

دفتر مجلس نمائش معاشی کمیٹی احاطہ

نمائش گاہ (باغ عام) حیدرآباد

(حاصل ہو سکتے ہیں)

3238
REGD. M. NO
رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲

آٹھویں نمائش مصنوعات عامہ مملکت آصفیہ

مصنوعات کا فروغ صنعت کا صلہ

اب کی دفعہ جس وسیع پیمانہ پر نمائش کی تیاریاں عمل میں آئی ہیں ماضی میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ یوں تو کئی مرتبہ آپ نے نمائش دیکھی ہے۔ لیکن سال حال کی نمائش میں نئی نئی صنعتیں دیکھنے میں آئیں گی اور آپ اپنی صنعت اور اپنی تجارت کو کیوں کر فروغ دے سکتے ہیں اس کا حل یہیں پائیں گے۔ نمائش کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ صناع کے دماغ میں ایجاد اور اختراع کا مادہ پیدا ہو، اور وہ اپنی دماغی پیداوار کا صلہ پائے اور ملک کی ضرورتیں پوری ہوں۔ زمانہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اس کے ساتھ انسانی ضرورتیں بھی روز افزوں ہیں، نمائش ہی وہ مقام ہے جہاں ہر شخص جاکر اپنی معلومات میں اضافہ اور اپنی ضرورتوں پر قابو حاصل کرکے مستقبل کو خوش گوار بنانے کا گر سیکھتا ہے۔ اس مرتبہ برار کے بہترین مصنوعات کے اسٹال بھی قایم ہوئے ہیں۔

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون حیدرآباد سے شائع ہوا۔

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲
3238
Regd. M.

قرآن مجید

مع ترجمہ انگریزی

محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم نے قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی زبان میں مع تفسیر کیا ہے جسے خاصی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔

۱۔ اس ترجمہ کے پڑھنے والے پر قرآن کے حقائق و معانی منکشف ہو جاتے ہیں۔

۲۔ یہ ترجمہ پڑھنے والے کو اسلام کی صحیح روح سے روشناس کراتا ہے۔

ہدیہ فی سٹ	(۲۴) روپیہ
تین سٹ کے آرڈر پر	(۴۸) روپیہ

نمائش میں دارالطبع کی اسٹال سے یا راست دفتر سے نسخے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

تمہاری ہو اور تمہیں بہت پسند ہو - ننھا دل و دماغ
ایک لحظہ کے لئے متفکر ہو گیا اور پھر ایک خوشی کی لہر
اس کے ہمرنگ گلاب کے چہرے پر پھیل گئی اور وہ
تیزی سے غسلخانے کی جانب بھاگا اور دوسرے
لمحہ میں ایک کانچ کی سرخ گولی اور ایک نوٹ بک
لکھنے کی پتلی سی گھسی ہوئی پنسل میرے پھیلے ہوئے
ہاتھ پر تھی ــــ میں نے بیتاب ہو کر اس کا خوبصورت
ماتھا جس پر سنہری گھونگریالے بال لہرا رہے تھے،
چوم لئے آتاری ہوئی فکر میں سے اس نے ــــ اپنی
کل کائنات تمام متاع گرانمایہ مجھے خوشی خوشی لاکر
دے دیا کاش میں بھی کوئی دنیا کی بڑی ہستی ہوتی جو
پنسل اور رنگین گولی لے کر اس کی مستقبل کی کاوشیں
اور ذہنی ترقیاں قبل از وقت بتا سکتی ــــ
آہ! میں کیا اور میری امید کیا ــــ ارمان اور تمنائیں
بڑی مختصر عمر لائے تھے جو لطفی کے ساتھ ہی چل دیئے
دور کہیں نیلے آسمانوں اور رنگین افق کے پیچھے کوئی
حکمران ہستی کوئی برتر و بالا قوت، کسی کی نہ سننے والی
غیر معمولی طاقت میرے لطفی کو مجھ سے چھین لیگی - اور
آج عید کی رخصت ہوتی ہوئی شام کو میں سوچ
رہی ہوں - اے کاش ان دو تحفوں میں سے ایک میرا
ہوتا اور ایک لطفی کا - تب آنسو کسی [illegible] آنکھ کا حصہ
ہوتے ۔ ــــ

تمہاری یاد سے کچھ قلب بے سکون پاتا
وگرنہ زیست میں، لطف اب نہیں رہا باقی

اعتذار

دے کا پرچہ شہاب کی (۴۱) سالہ زندگی میں ایک ہفتہ کی تاخیر سے شائع ہوا کیونکہ عموماً پرچہ یکم کو ڈاک کیا جاتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ دے یعنی نومبر کا پرچہ بالکل تیار ہو چکا تھا اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ یکم دیجہ کو صنعتی نمایش حیدر آباد کا افتتاح دست ہمایونی سے ہونے والا ہے - اس لئے کیوں نہ نمایش سے متعلق خواتین کے تاثرات شائع کئے جائیں - چنانچہ مضامین کی فراہمی اور کتابت میں ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی - مگر الحمدللہ کہ پرچہ نکل چکا اور بیسیوں ستائشی خطوط اس کی کامیابی کے وصول ہوئے - خواتین کے متعدد مضامین "نمایش بلوٹین" نے اپنے یہاں شائع کئے ہیں جس سے اون کے نگارشات کے پسندیدگی کا ثبوت ملتا ہے اور شہاب کے ذرا سی تاخیر سے اس کے قارئین کتنے بے تاب ہو جاتے ہیں ہمارے لئے باعث مسرت ہے کہ پرچہ اون کے پاس عزیز ہے ؛

"عیدی"

نغمہ سہروردی

نغمہ بٹیا ذرا ہمارا صندوقچہ تو اٹھا لاؤ! ملاقات
کے کمرے سے والدین سے محروم بچوں پر شفقت کرنیوالی
خالی (خالہ امی) کی گونجتی ہوئی آواز مجھے زینے سے
اُترتے ہوئے سنائی دی۔ میں نے جلدی سے آتشدان
پر سے کنجیاں اٹھا کر الماری کھولی اور صندوقچہ لیگئی
تم دوپہر سے کہاں تھیں میری بچی۔ آج تو تم نے مجھ سے
عیدی بھی نہیں لی یہ کہتے ہوئے خالی نے صندوقچہ کھولا
جو کہ مختلف چیزوں سے (عید کے تحفوں) سے پُر تھا۔
مگر میری اداس نگاہیں نہ جانے وہاں کیا پا گئیں
اور میرے کانپتے ہوئے ہاتھ بجائے چاکلیٹ
اور ٹافی کے رنگین پیکٹوں (نیڈلون) [illegible]
کے خوبصورت ڈبوں رنگ برنگ کے رومالوں اور
عطریات کی نظر افروز شیشیوں کی طرف پڑنے کے بجائے
ایک کونے میں پڑی۔ بلور کی ایک سرخ گولی اور ایک
چھوٹی سی مستعمل پنسل پر تھی۔ میں نے جرأت آمیز اور
اجازت طلب نظروں سے خالی کو دیکھا اور بے صبری
سے دونوں چیزیں اٹھا لیں میرے کھوئے ہوئے
لطفی کی نشانیاں میری ایک یادگار عیدی ——
ایک گزری ہوئی پر مسرت گھڑی، بیتی ہوئی راتیں
چار سال قبل کا ایک امنگوں بھرا دن اور کیف زا لمحات
میرے سامنے پردۂ سیمیں کی تھرکتی ہوئی تصاویر کی مانند
رقصاں تھے۔ اف میرے خدا!! وہ عید کی کی ایک خوبصورت
اور چمکیلی سہ پہر تھی۔ موسم دلفریب اور خوشگوار تھا۔
نیلے آسمان پر جاتی ہوئی سنہری روشنیاں الوداعی نظریں
ڈال رہی تھیں، بادل کے میلے کچیلے بچے بھی قوس و قزح
کا رنگین لباس پہنے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میں
سوچ رہی تھی عید کا دن بھی اپنے اندر کتنی خوشیاں
لاتا ہے۔ ہر طرف مسرت برس رہی ہے حتیٰ کہ آسمان پر
بھی غیر معمولی رونق اور دلکشی چھائی ہوئی ہے۔

اتنے میں پیچھے سے دو ننھے ہاتھ میری
آنکھوں پر رکھے گئے۔ بوجھو تو نغمہ باجی کون ہے؟
میں لطفی میرا ننھا سا بھیا! اور کون ہے میں نے
فوراً پہچانتے ہوئے کہا اور فضا میں اس کے کھلکھلا کر
ہنسنے سے پریوں کی پائل کی مترنم آوازیں بکھر گئیں ——
تب اس نے اپنی چھوٹی باہیں میرے گلے میں حمائل کرتے
ہوئے کہا ارے نغمہ باجی! تم نے مجھ سے عیدی لی ہی نہیں
تم تو کہدو گی بڑوں سے کیا کرتے ہیں چھوٹوں سے نہیں۔
چپ کیوں ہوگئیں دیکھو تو! آج میرے پاس کتنی بہت
چیزیں ہیں۔ میں نے اس کے ملول ہو جانے کے خیال سے
کہا نہیں! نہیں! میرے بھیا! میں تم سے عیدی ضرور
لوں گی، مگر خالو ابا کے دیے ہوئے کھلونے اور خالی کی
عطا کردہ مٹھائیاں نہیں۔ مجھے تو تم وہ عیدی دو جو

[illegible]

پک نک

شاہدہ

علمی کاوشوں اور کالج کی مصروفیتوں سے تھکے دماغوں کو پک نک کی سوجھی۔ پرنسپل صاحبہ کو بہ مشکل راضی کیا۔ جمعہ کا دن عثمان ساگر میں پک نک منانے کے لئے تجویز کیا گیا کالج میں دن بھر بس پک نک کی باتیں تھیں اور ہم۔ گھر پہنچے تو پک نک خیالوں میں بسی ہوئی —— دن کسی طرح گزرتا ہی نہ تھا۔ بہ مشکل رات آئی اور پک نک کے خوابوں کو ساتھ لائی۔ یہ دیکھا وہ دیکھا بس پک نک اور کچھ نہیں۔ چار بجے ہی سے آنکھ کھل گئی۔ ابھی تو تین گھنٹے باقی ہیں۔ سونے کی کوشش کی مگر طبیعت بے چین تھی نوکر کو اٹھایا۔ ساتھ لیجانے والی چیزیں جو میرے ذمہ تھیں اس کے ساتھ مل کر تیار کیں۔ خدا خدا کرکے سات بجے۔ جلدی جلدی منھ دھو ناشتہ کیا۔ گاڑی تیار ہو چکی تھی تیار ہو کر کالج آئی تو کالج میں کسی لڑکی کا پتہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ نو بجے سب ہی آ چکی تھیں، لاری تیار تھی مگر ابھی دو ٹیچرس کا انتظار تھا۔ یہ انتظار بھی کیا مصیبت ہوتا ہے۔ قریب دس بجے کے وہ دونوں تشریف لائیں۔ سامان تو بس میں پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ ان کے آتے ہی سب جلدی جلدی بس میں بیٹھ گئے۔ جگہ ملنی مشکل ہو گئی۔ بس تو ایک لڑکیاں کوئی قریب پچیس کے چار ٹیچرس دو آیائیں۔ اب بیٹھیں تو کہاں بیٹھ جائے تنگ است مردماں بسیار کی مثل ہم پر پوری پوری صادق آتی تھی تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے اسی میں بیٹھ گئے۔ برسات کا موسم ہوا میں خنکی مگر ہماری بس میں گویا گرمی ابل پڑی تھی پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے۔ کالج سے ابھی زیادہ دور بھی نہ گئے ہوں گے کہ یکایک ایک زوردار پٹاخہ چھوٹا۔ سب اچھل پڑے۔ معلوم ہوا بس کا ایک پہیہ برسٹ ہو گیا۔ اور ہم رک گئے۔ باہر ڈرائیور پریشان جلدی جلدی پہیہ کو درست کر رہا ہے تو ہم اور گرمی سے گھبرائے بیٹھے بیت بازی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یہ درست ہو گیا اور ہم پھر سے چل پڑے۔ دھوپ میں حدت بڑھ گئی تھی۔ اور جس وقت ہم عثمان ساگر پہنچے ہیں تو آسمان پر کہیں کہیں بادل کے سفید ٹکڑے اڑتے نظر آتے تھے۔ ابھی اترنے دیر نہ ہوئی تھی کہ قریب ہی کہیں سے قہقہوں کی آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا لڑکوں کی ایک مختصر ٹولی قہقہے لگاتی جھولوں کی طرف جا رہی تھی۔ ہائے کیا مصیبت ہے ان کمبخت لڑکوں سے اب جھولا کیسے جھولیں۔ لو بدتمیزوں نے جھولے پر قبضہ جما ہی لیا اور ہم لوگ مایوس ہو کر دوسری طرف چلے گئے اور ہری ہری گھاس پر بیٹھ گئے۔ مختلف کھیل کھیلے جانے لگے ایک کھیل بہت دلچسپ رہا جس کا نام D.4.A. اس میں جس کو جو سزا ملتی وہ اسے پوری کرنی پڑتی۔ انجم سے۔

آئی —— آج کی ڈاک سے چار خط آئے تھے ——
ناہید کا خط آج بھی نہیں آیا ۔ کتنی جلد بھول گئی
ناہید مجھے کبھی نہ بھولنے کا وعدہ کر کے ۔ چھ بجے
آ گئے ۔ سینما چلنے کا وعدہ یاد دلایا ۔ میں نے کہا آج
نہ جا سکوں گی —— پوچھنے لگے کیوں ؟ —— اوہ
—— کیوں —— آخر اس "کیوں" نے دنیا کو کیوں
محیط کر لیا ہے ؟ میری سمجھ میں نہیں آتا —— خفا ہو کر
چلے گئے ۔ کتنی جلدی ناروٹھ جاتے ہیں بعض لوگ
جانے بوجھے بغیر —— ہلکے دھانی رنگ کی ساڑی پہن
کر رضی کو ساتھ لیا اور گومتی کے پاس پہنچی ۔ بیمار باپ
بستر پر پڑا کراہ رہا تھا —— سرہانے گومتی بیٹھی رو
رہی تھی —— پوچھنے پر معلوم ہوا سیٹھ جی اس کے
ننھے بھیا کو کرایہ نہ ادا کرنے پر پکڑ کر لے گئے ۔ گومتی
کے آنسو کسی کام نہ آ سکے —— آہ غریب —— ان
کی زندگی کتنی بھیانک ہے —— ان کے لئے یہ دنیا دوزخ
سے زیادہ تکلیف دہ —— اوہ —— یہ زندگی کی
الجھنیں —— کبھی سلجھیں گی بھی —— شاید ایسا نہ
ہو سکے —— رات کی تاریکیاں پھیل چکی تھیں ——
گھر واپس آئی —— رات گئے تک پلنگ پر اداس
پڑی رہی اور سوچتی رہی —— خیالات بجلی کی طرح
چمکتے اور غائب ہو جاتے —— میری روح مضطرب تھی
—— آج کا دن سکون کو لئے طلوع ہوا اور وحشت دماغی
"انتشار" بے چینیوں میں ڈوب گیا ۔
سکوں کہتے ہیں جس کو نہیں پتہ اس کا

غزل

سعیدہ مظہر ایم ۔ اے آخری

ایسے کھنچے کہ میری تو جاں کھنچ کے رہ گئی
چاہا جو کچھ کہوں تو زباں کھنچ کے رہ گئی
آنا تھا اُن کو آئے ، مگر آئے کس گھڑی
جس وقت میری چشم و زباں کھنچ کے رہ گئی
داخل ہوا جو بزم میں دیکھا کچھ اس طرح
نظروں میں ایک کالی کماں کھنچ کے رہ گئی
یاں ہم کو انتظار ہی تاثیر کا رہا
واں راہ میں ہی آہ و فغاں کھنچ کے رہ گئی
خلوت کا ایک بار جو پردہ اٹھا دیا
تصویر ایک رشک جناں کھنچ کے رہ گئی
اغیار کے خلوص کا ذکر اس طرح کیا
جیسے کہ اس کی طرز بیاں کھنچ کے رہ گئی
"تحسین ناشناس" پہ دل بجھ کے رہ گیا
چپ ہے "سخن شناس" زباں کھنچ کے رہ گئی
سرکش زمانہ کیا ہوا فطرت کے برخلاف
اسپ فلک کی اور عناں کھنچ کے رہ گئی
ایسے تڑپ کے بلبل بیکس نے کی دعا
نبض رگ حیات خزاں کھنچ کے رہ گئی
مظہر تھرک کے غزل کہنے پہ وہ اٹھے
اک وار ہی میں نوک سناں کھنچ کے رہ گئی

روزنامچہ

اختر محمودہ
سالِ سوم

آج صبح پانچ بجیں پر آنکھ کھل گئی غسل کیلئے
پانی گرم کیا۔ نہاکر دوپہر طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے چلی
گئی۔ مشرقی آسمان کی وسعتوں میں شفق کا سینہ چیر کر آفتاب
طلوع ہو رہا تھا۔ فضا میں ایک نشہ سا۔ ایک سرور سا
بکھرا ہوا تھا۔ غروب سے زیادہ مجھے طلوع کا نظارہ بہت
پسند ہے۔ کچھ دیر عبادت کرکے نیچے باغ میں آئی۔ نسیم
اٹھ گئی تھیں، ہم دونوں کچھ دیر باغ میں ٹہلتے رہے
اور وہیں سبز گھاس پر بیٹھ کر گرم گرم چائے پی۔ آفتاب
کی شعاعیں کچھ گرم ہو چلی تھیں۔ اٹھ کر اپنے
کمرہ میں چلی آئی اور نفسیات پر ایک کتاب دیکھنے
لگی۔ دس بجے سب کے ساتھ ناشتہ کیا اور صوفیہ کو
لے کر کناٹ پلیس گئی۔ کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ وہاں سے
دو بجے تھکن سے چور ادھوری چیزیں خرید کر واپس
آئی۔ طبیعت نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ کھانا کھا کر لیٹ
گئی۔ چار بجے سو کر اٹھی تو گومتی آگئی بہت دیر تک
وہ اپنا قصہ غم سناتی رہی اور روتی رہی۔ میں نے بہت
کچھ تسلی دینے کی کوشش کی کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ طبیعت
پر ایک گہری، نمناک اور بوجھل اداسی چھا گئی۔ بغیر
سوچے بلا ارادہ بلا مقصد دریچے کے دونوں پٹ کھولے
اور بند کر دئے۔ میز پر کی کتابوں کو الٹ پلٹ کیا۔ پھر
دریچے کے پٹ کھولے۔ باہر سڑک پر انسانوں کا ایک جم غفیر
—— چلا جا رہا تھا لیکن —— بلا مقصد بلا ارادہ
—— کوئی منزل ٹھیرائے بغیر —— میں سوچنے
لگی —— میری زندگی بھی تو یوں ہی بغیر کسی مقصد
کے گذر رہی ہے —— مجھے نفرت سی ہو گئی اپنی
بے مقصد اور بے ارادہ زندگی سے —— زندگی ایک
خلا کی طرح محسوس ہونے لگی۔ بھیانک اور اداس۔
—— پُر ہول زندگی —— میں نے سر کو زور سے
جھٹکا دیا —— اس تصور سے میں پریشان سی
ہو گئی تھی —— آسمان پر چاروں طرف سفید،
بھورے، کالے بادل بڑی تیزی سے چھا رہے
تھے۔ ہوا میں خنکی آچلی تھی —— دریچہ
بند کر کے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ سینہ میں ایک ہلچل
برپا تھی —— ایک عجیب قسم کی بے چینی ——
بہت دیر تک۔ دماغ میں عجیب و غریب خیالات
سیاہ بادلوں کی طرح امنڈ امنڈ کر آتے رہے ——
ہم کیوں پیدا کئے جاتے ہیں؟ کیوں جینے پر مجبور
ہیں؟ —— کیوں مرتے نہیں؟ —— یہ امیر و
غریب کا فرق کیوں؟ —— غریب پر ستم کیوں ڈھائے
جاتے ہیں؟ امیر آرام سے کیوں ہیں؟ —— کیوں ——
کیوں —— مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے میں
سوچتے سوچتے پاگل ہو جاؤں گی —— گھبرا کر اٹھی میز پر

فیروزہ نے اپنی خوبصورت آنکھوں کی کشادگی کو اور
وسیع کرتے ہوئے کہا۔ سلمیٰ تمہیں تو اس کی مطلق پروا
نہ تھی۔ پھر تم نے یہ تبدیلی کیسے محسوس کی۔ سلمیٰ کہہ کر
پچھتائی۔ بول کر گھبرائی اور جواب ٹال گئی۔ سُنی اَن
سنی کر دی جیسے اس نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ ان ہی
دنوں سلمیٰ کے والد کا تبادلہ ہو گیا۔ سلمیٰ کو بھی جانا تھا۔
اس خبر نے کلب کی فضا مکدر سی کر دی۔ بعضوں نے تو
خیر مقدم کیا اس خبر کا اور بعضوں نے ماتم۔ مس رولینڈ
کو ایک عمدہ کھلاڑی کے چھوٹ جانے کا انتہائی افسوس
تھا۔ شیطان صاحب نے تو یہ ظاہر کر دیا جیسے اثر ہی
نہیں ہوا ان پر۔ کسی قسم کا بھی۔ لیکن شیطان کے بیباک
قہقہے اور پھیکی پھیکی گپیں اس کی ترجمان تھیں تیر اتنی
اب ٹپکی نہیں پڑتی تھیں بلکہ مشکل سے تراشی جاتی
تھیں۔ کھلی اور بند کلیوں کے بے پناہ ہاروں میں کر آئے
اور سنجیدہ چہروں نے اس کو وداع کیا۔ سلمیٰ کی ابھری
ابھری آنکھیں خلوص کی نمی سے گیلی ہوئی جا رہی تھیں
فیروزہ پر نظریں گاڑ دیں سلمیٰ نے جس نے سلمیٰ میں احساس
دوستی کا بلند جذبہ سمو دیا تھا حل کر دیا تھا۔ پھر اٹھتی
ہوئی نظریں کلب کے طول و عرض کا چکر لگا گئیں اور رک
کر رہ گئیں۔ گویا نگاہوں کی منزل وہی تھی جیسے تپتے
سورج کی خیرہ کن چمک دیکھنے والی آنکھوں نے چاند کی
ٹھنڈی اور سرمدی روشنی پہلی بار دیکھی ہو۔ سلمیٰ کی آنکھیں
برف کی قاشوں کی طرح جم گئیں اور پھر اسے کسی غیر مرئی
تپش نے گداز کر دیا۔ اس نے شیطان پر سے نظر ہٹا لیا
—— ریل چل پڑی۔ حال کی بوقلمونیوں کو ماضی کی
گھٹی گھٹی یادوں میں بدلتی۔ سلمیٰ کی سطح احساس پر اس
کی یادداشت کا شعر چمک اٹھا۔ ؎

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ساتھ ہی سلمیٰ کی زندگی کے پرسکون سمندر میں بھی لہریں
اٹھنے لگیں اور وہ کسی نامعلوم احساس کی اتھاہ گہرائیوں
میں غرق ہو گئی۔

آنسو

ساجدہ۔ احمد محی الدین

آنسو انسان کے بہترین دوست ہیں۔ یہ مصیبت میں
اس کے ہمدرد ہوتے ہیں۔ تکلیف میں راحت بخشتے
ہیں۔ اس سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ دل کی
چھوٹی سی دنیا میں آنسوؤں کا ایک سمندر مدفون ہے جو
ذرا سی ٹھیس سے پھوٹ نکلتا ہے۔ یہ انسان کے سچے رفیق
بہترین غمگسار اور سچے بہی خواہ ہوتے ہیں۔ برسوں کا
غبار منٹوں میں ہلکا ہو جاتا ہے۔ گنہگار انسان کے یہ
معاون ہوتے ہیں جس کے ذریعہ وہ بلند سے بلند درجہ حاصل
کر لیتا ہے۔ غرض یہ چھوٹی سی چیز انسان کو انسانیت سے
آگاہ کر دیتی ہے۔ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اٹھایا۔ اس قدر بڑھی ان میں دوستی کہ رشک کلب بن
گئی۔ اب اور قسم کی مچھے دار خبریں گشت کرنے لگیں غرض
حیرت تھی سبھوں کو سلمیٰ اور فیروزہ کی دوستی پر۔ میاں
ساجد تو الگ کر دئے گئے سر دالے کے کانٹے کی طرح۔ رہے
شیطان صاحب۔ فیروزہ کے معتمد کی حیثیت سے سلمیٰ اور
فیروزہ کا زیادہ ساتھ دینے لگے۔ بی عقیلہ نے شیطان کی
عنایات میں زبردست کمی سی محسوس کی۔ گا گا کے [illegible]
کاڑھکے دوسرے ممبروں سے پینگیں بڑھا کر اپنا دل بہلانے
لگیں شیطان کی تمام تر توجہ سلمیٰ کی طرف مبذول ہو چکی تھی
سنجیدگی سے زیادہ سلمیٰ کی بے اعتنائی شیطان کو اذیت
پہنچا رہی تھی۔ رنگ برنگی تتلیوں کی طرح اس نے خوبصورت
لڑکیوں کو منڈلاتے دیکھا تھا۔ خود پر طواف ہوتے دیکھا
تھا۔ یہ تو اس کے لئے ناقابل برداشت تھا کہ سلمیٰ ایسی
لڑکی جس کو خوبصورت لڑکیوں میں تو قطعی نہیں گنا
جا سکتا خود کو اس قدر لئے دئے رہتی ہے۔ شیطان اپنی
توہین محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ سلمیٰ کو متوجہ کرنے کے
لئے اس نے اپنا آخری حربہ بھی استعمال کر دیا تھا۔ شیطان
نے کہا " جب کلب کے سب ممبر سینما چل رہے ہیں تو غالباً
آپ کو بھی انکار نہ کرنا چاہئے۔ سلمیٰ نے دور نظریں جمائے
ہوئے لاپروائی سے کہا۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے سینما سے
متعلق دلچسپی نہیں۔ اس لئے کہ کتابیں سینما سے زیادہ
رنگین اور پُرلطف ہوا کرتی ہیں —— وہ جز بز ہو کر رہ
گیا۔ سلمیٰ سے زیادہ گفتگو کرنا حماقت محض تھی۔ روکھے
سوکھے فلسفیانہ جوابات ہمت افزائی نہ کرتے تھے اور ایک
موقع پر شیطان نے فیروزہ کو فیروزے کی انگوٹھی دی

اور سلمیٰ کو ایک نہایت قیمتی قلم تحفتہً پیش کیا۔ سلمیٰ نے
غیر معمولی خشک بنتے ہوئے کہا۔ معاف کیجئے۔ تحفوں کے
متعلق میرا نظریہ بڑا عجیب ہے۔ شیطان نے حیرت سے
مسکراتے ہوئے کہا۔ جی وہ کیا۔ سلمیٰ نے ایک ایک لفظ پر
زور دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ خلوص اور تحفہ دو
متضاد چیزیں ہیں۔ اجنبیت زائل کرنے کے لئے تحفہ
استعمال کیا جاتا ہے۔ خلوص میں تحفہ دیا جائے تو ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے دوستی پر لگان لگا دیا گیا ہو۔
شیطان نے جاندار قہقہہ لگایا سلمیٰ کی بے تکی استدلالی
منطق پر اس کے بعد وہ نہ ہنس سکا۔ اس نے اپنی ہتک
اپنے ہاتھوں کروائی تھی۔ اس کے دل میں سلمیٰ کی بڑھتی
ہوئی وقعت کے ساتھ ساتھ ناپسندیدگی کے جذبات
بھی ابھرنے لگے۔ لیکن اس کا وہ باقاعدہ اظہار بھی نہ
کر سکتا تھا۔ شاید شیطان کی ناپسندیدگی میں پسندیدگی
کا زیادہ حصہ شامل تھا —— شیطان نے بساط الٹ کے
مہروں کا رخ بدل دیا۔ وہ عقیلہ کی طرف منعطف ہو رہا
تھا۔ اپنی تمام تر دلچسپی ایک ہی مرکز پر جمع کرنی شروع
کر دی۔ وہ اپنی اس چال کا رد عمل سلمیٰ پر محسوس کرنا
چاہتا تھا۔ کچھ دن تو سلمیٰ بدستور ٹھوس اور منجمد رہی
پتھر اور برف کی طرح شیطان کو ناکامی کا یقین ہو چلا۔
مگر وہ نہایت استقلال سے متواتر یہی کھیل کھیلتا رہا
کبھی کبھی پتھر سے بھی تو جھرنے پھوٹ نکلتے ہیں۔ برف
کی سلیں بھی تو پگھل پڑتی ہیں۔ سلمیٰ نے فیروزہ سے
رازدارانہ انداز سے کہا۔ شیطان صاحب بہت بے نیاز
ہو چلے ہیں۔ اس طرف کا رخ بھی نہیں کرتے ——

"شیطان"

(فسانہ)

سُلطانہ عزیز بی۔ اے

حسین بھی تو نہ تھا وہ معمولی صورت شکل کا
جسیم انسان۔ پھر بھی کلب کا ہر ممبر اس کا مداح تھا ایسی
نظروں سے اسے گھورا جاتا جن میں پسندیدگی کی تہیں سی
جمی ہوتیں۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ خوب انٹ
کی شنٹ اڑایا کرتا۔ ایسی سنجیدگی سے گپ ہانکا کرتا
کہ لڑکیوں کے شگفتہ چہرے اترا ترجاتے۔ لیکن اختتام
ہمیشہ فرمائشی قہقہوں پر ہوتا۔ بزرگوں کی محفل اس کے
لئے ناقابل برداشت ضرور ثابت
ہوتی لیکن وہ خود کو نہایت
منقطع انسان پیش کردیا کرتا۔ شاید
اسی وجہ سے وہ کلب کا ہیرو محض ہیرو بن کر رہ گیا تھا۔
مسٹر ساجد بھی کسی زمانہ میں کلب کے اسٹیج پر ہیرو کا
کام کرچکے تھے لیکن جب سے وہ کلب کا رکن ہوا تھا
ساجد صاحب ولن کا روپ دھیر رہے تھے گو شیطان کے
بے تکے جاندار قہقہوں میں ساجد صاحب گلا ملانے
کے عادی ہوچکے تھے مگر پھر بھی ان قہقہوں کی گہرائی
کسی لطیف طنز کی مالک ہوتی۔ کسی اندرونی خلش کی
راز داں ہوا کرتی۔ بڑی عقیدت تھی فیروزہ سے اسے۔
مخصوص ہستی تھیں نا وہ کلب کی۔ ایک خاص شخصیت کی
مالک بھی شیطان نے کبھی ان سے مذاق کرنے کی جراءت
ہی نہ کی۔ کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتی جب وہ کلب روم
میں داخل ہوتیں۔ شیطان کرسی پیش کرنے لگتا انہیں۔
وہ بڑی ہردلعزیز تھیں۔ کلب کی مختصر سی جماعت میں
مع اپنی خوبصورت کشادہ آنکھوں کے۔ شیطان کی عقیلہ
سے گاڑھی چھنتی تھی۔ سب کے آگے بھی اور سب کے پیچھے بھی۔
یہ منسوب بھی تھیں۔ منگیتر صاحب کو سمندر پار گئے
ایک عرصہ ہوگیا تھا وہ ہمیشہ آنے والے ہوتے اور
آتے آتے رک رک جاتے۔ غریب عقیلہ پہروں بیٹھی
خط کا انتظار کیا کرتی۔ انتظار کی
اذیتوں کو ریشم کے رنگین
گل بوٹوں میں ڈھالا کرتی لاتعداد
انتظار کی موشگافیوں کو خوبصورت پھول پتوں سے
پاٹا کرتی۔ بیچ بیچ جھاڑ کر پڑا رہتا شیطان ان کے پیچھے۔
خوب چھیڑا کرتا انہیں بیتی باتوں کو یاد دلا دلا کر۔
سمندر پار کے باسی تباسی خطوط چرالیا کرتا جنھیں
پڑھ کر بی عقیلہ گلاب کی پتی کی طرح سرخ ہوجایا کرتیں۔
شیطان کبھی سیون کا پٹارا لئے دوڑ پڑتا۔ یہ چیختی چلاتی
بگڑتی تلملاتی سوئی لئے دوڑا کرتیں سانس پھول پھول
جاتا بچاری کا۔ شیطان لمبی لمبی چھلانگیں مار کودتا
پھاندتا سارے کلب کا چکر لگا ڈالتا۔ یہ خفا ضرور
ہوجاتیں لیکن شیطان انہیں زیادہ دیر روٹھنے کا موقع
ہی نہ دیتا۔ ادھر ادھر کی تازہ گپ شب عقیلہ کے لئے

کہا میرا مان

رحیم النساء رفیق

میرے ساجن تم یقین مانو..... جب میں شبنم سے
بھیگی ہوئی رنگ برنگ کی ننھی ننھی سی کمسن کلیوں پر
نظر ڈالتی ہوں تو مجھے بھروسہ ہوتا ہے کہ یہ کلیاں بہت
جلد پھول بن کر اپنی معطر بیز خوشبو سے تیز و تند ہواؤں
کے ساتھ ساتھ انسانی دماغوں میں فرحت پہنچائیں گی۔
اور جب ہلالی کا پیلا چاند اٹھلاتے شرماتے
بادلوں کی اوٹ سے اپنا پرنور چہرہ دکھاتا ہے تو میں
یقین کرتی ہوں کہ ایک دن ضرور یہ اپنا پورا پورا
آب و تاب سے ضوفشانی کرے گا۔
درختوں کی کونپلوں پر مرتکز
ہو جاتی ہیں نظریں میری اور مجھے
معلوم ہے یہ شجر نونہال ایک دن ضرور بار آور ہوگا۔
رات جب ..... ایک والہانہ انگڑائی
کے ساتھ بیدار ہوکر اپنا سیاہ دوشالہ اتارتی ہے
اور سورج کی باریک سنہری و روپہلی تاریک
گھٹاؤں کو روشن دار بنا دیں گے۔ ساکت پانی کا
وجود ہی دلیل ہے اس بات کی کہ روانی ہوگی اس میں
ایک دن ضرور، اور وہ لہراتے بل کھاتے اپنے امواج
تلاطم سے پاش پاش کر دیں گے۔ پتھریلی چٹانوں کو۔
... میرے دل کی گہرائیوں میں سونے بسنے والے
بیدار ... اوٹھ اور سن۔

مجھے تجھ پر بھروسہ نہیں.... تجھ پر اطمینان نہیں
اور تجھ میں انقلاب نہیں۔
تو ایک ساکت و صامت مجسمہ پتھر کا....
..... جو..... نہ..... بڑھتا..... نہ....
گھٹتا ہو..... میں نے تجھے سوچا.... سمجھا.
.... پرکھا - اور جانا.. لیکن ہائے تجھے پا نہ سکا۔
اسلئے او میرے قلب و دماغ کو کھولنے والے...
لاج رکھ لے میری بربادیوں کی اور حوالہ نہ کر اغیار کے
..... اس لئے وہ تو بن جا جو تو
نہیں ہے۔

تاثرات

آہ جو بھی لب پہ آئی سانس بن کے رہ گئی
زندگی اپنی سراپا یاس بن کے رہ گئی
خون دل کے چند قطرے اشک بن کے بہہ گئے
ضبط کی آغوش میں سمٹے ہوئے کچھ رہ گئے
دل سکون ناآشنا، مجروح احساسات ہیں
ایک سیمابی تڑپ پوشیدہ ہے جذبات میں
یاد ماضی حال کے سینہ میں گھرائی ہوئی
آرزو کی شمع ہے خاموش و تھرائی ہوئی

بہتر پاروں سے منسوب ہیں یہ پارے ایزد تعالیٰ کی عظمت وجلال، اس کی غیر محدود قدرت، اور بے پایاں قوت کے مظہر ہیں۔ اس طرح بچہ کی کمر پر "کشتی" باندھ کر مراد یہ ہوتی ہے کہ اسے ایک محدود و مخصوص دائرہ میں پابند حق و صداقت کیا جاتا ہے اور صراط مستقیم کی وہ راہیں اس کی نگاہوں کے سامنے نمایاں کرنے کی سعی کی جاتی ہے جو مسرت حقیقی کا منبع اور حیات جاوید کا مبدأ ہیں۔ اس رسم کی غرض وغایت یہ بھی ہے کہ "سدرہ" اور "کشتی" سے ملبوس ہونے کے بعد بچہ حضرت حق رب العالمین کے احکامات کی تعمیل کے لئے کمربستہ ہو جائے اور ان کلمات الہیہ کو اپنا رہبر و ہادی مقرر کرلے جن میں پاک و برتر یزداں کی وحدانیت، اس کی غیر محیط اور غیر محدود طاقت وقوت کا اظہار کیا گیا ہے۔

"سدرہ" کے اوپر "کشتی" کی تین تہیں بچہ کی کمر کے اطراف اس طرح باندھی جاتی ہیں کہ دو گرہیں سامنے اور دو گرہیں پیچھے رہتی ہیں۔ "کشتی" کی تین تہیں کر کے باندھنے سے مراد یہ ہے کہ زرتشتی مذہب کے تین بنیادی اصولوں "ہُمَت" (نیک پندار) "ہُخت" (نیک گفتار) اور "ہُورَشت" (نیک کردار) کی طرف توجہ کامل ہو جائے اور گرہیں گویا عہد وپیمان ہیں کہ مستقبل میں بچہ اپنی زندگی انہیں تین اصولوں کے تحت بسر کرے اور اس کی زندگی کی طویل و نامعلوم "رسی" (رسیان حیات) میں یہ گرہیں ایسی پڑی ہوئی رہیں کہ کبھی نہ کھل سکیں۔ "کشتی" کو دین زرتشت کے عالم واہل خدمات شرعیہ کے گھرانوں کی خواتین مخصوص نمازیں پڑھتی ہوئیں خالص اون سے بنتی ہیں۔ "کشتی" روزانہ پانچ بار اوستا پاک کے کلمات کے اوراد کے ساتھ باندھی جاتی ہے۔ اوقات نماز حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صبح میں ... چھ اور بارہ کے درمیان
۲۔ دوپہر میں ... بارہ اور تین کے درمیان
۳۔ شام میں ... تین اور سات کے درمیان
۴۔ رات میں ... چھ اور بارہ کے درمیان
۵۔ رات میں ... بارہ اور چھ (صبح) کے درمیان

اس رسم کی ادائی کے بعد "سدرہ" اور "کشتی" بچہ کے جسم سے تاحین حیات جدا نہیں کئے جاتے حتی کہ جب زندگی کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی دنیا کے سارے رشتے ناتے ختم ہو جاتے ہیں تب بھی "سدرہ" اور "کشتی" گوشت پوست کی طرح اس بے جان جسم کے ساتھ رہتے ہیں اور نعش کو انہیں دو چیزوں کی رفاقت کے ساتھ حیات ناپائیدار کی منزل آخر تک پہنچایا جاتا ہے۔

"نوجوت"

منیزہ بانو کاؤس جی

بسم اللہ خوانی کی رسم اہل زرتشت کے یہاں "نوجوت"
کے نام سے موسوم ہے۔ اس رسم کی ادائی کے بعد ہی حقیقی
طور پر ایک بچہ کی مذہبی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ رسم
زرتشتیوں کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ
اس کا تعلق حضرت زرتشت علیہ السلام کے دور سے ہے
مزید تحقیق و جستجو سے چند مذہبی کتابیں جو میرے مطالعہ
سے گزریں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسم
حضرت زرتشت علیہ السلام سے قبل بھی
ایران میں موجود تھی، لیکن اس بیان کے
بارہ میں اختلافات ہیں، ان اختلافات کا طول طویل
تذکرہ اس موقع پر غیر ضروری ہوگا۔ لہٰذا اس رسم کی تفصیلات
جن کو میں نے حتی الامکان مختصر پیرایہ میں پیش کرنے کی
کوشش کی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

"نوجوت" پہلوی زبان کا ایک لفظ ہے، اس
سے مراد "حیات نو" یا "وجود نو" ہے جس کا آغاز مذہبی
تعلیم کے آغاز سے ہوتا ہے۔ اس لفظ کے معنی کی وضاحت
میں بھی اختلافات ہیں، کہیں پر اس کے معنی "نو، نو"
بھی بتائے گئے ہیں لیکن رسم کی غرض و غایت کو مدنظر
رکھتے ہوئے یہ دونوں الفاظ اپنا مفہوم واضح کرتے ہیں۔
یہ رسم بچہ کی عمر کے ساتویں سال میں ادا ہوتی ہے اور
اس طرح بچے میں مذہبی تعلیم کی رغبت پیدا کی جاتی ہے۔

اس رسم کی ادائی سے پہلے، لڑکا ہو یا لڑکی، "اوستا"
پاک کی وہ نمازیں حفظ کرائی جاتی ہیں جو ہماری روزمرہ
کی عبادت کا جز ہیں۔

اس رسم کے لوازمات میں "سدرہ" اور "کشتی"
داخل ہیں۔ "سدرہ" ایک نہایت سادہ کرتا ہوتا ہے
جو بالالتزام سفید اور مہین کپڑے کا بنایا جاتا ہے "سدرہ"
کا رنگ سے مبرا ہونا یا خصوصاً سفید ہونا
پاکیزگی اور سادگی کا نشان ہے۔ یہ
لفظ بھی پہلوی زبان کا ہے جس کا مفہوم
راہ راست یا صراط مستقیم ہے، گویا سات سال کی عمر میں
جب بچے میں کچھ شعور پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں برائی
بھلائی، نیکی و بدی کے امتیاز کرنے کا مادہ پیدا ہو جاتا
ہے تو اس وقت اس کو زندگی کے سچے اور سیدھے راستہ
پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس رسم کے ادا کرنے
کے دوران میں مذہبی پیشوا کے ہاتھوں جس کو "دستور"
کہتے ہیں مخصوص نمازوں کے اوراد سے یہ کرتا یعنی "سدرہ"
پہنایا جاتا ہے جسم کا "سدرہ" سے ملبوس رہنا ضروری
ہے، اسی طرح "کشتی" بھی پہلوی زبان کا لفظ ہے جس کے
معنی "حد" کے ہیں۔ یہ بہتر تار سے بنی ہوئی اون کی
ایک ڈوری ہوتی ہے جو "سدرہ" کے اوپر مخصوص نماز پڑھتے
ہوئے باندھی جاتی ہے۔ یہ بہتر تار "اوستا" پاک کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حصّہ دوم

ضمیمہ

[illegible]

دیر سے ملیں

عبرت ناک ہیں کہ بیان نہیں کیا جاتا۔ بڑے بڑے امراکتے کی سہت مرے اور آرائش بلدہ کے لوگ ان کے ذہن کا اختلام کتنی عبرت ناک اور افسوس کی بات ہے۔ شامس ہارڈی نے لکھا ہے کہ ایک آدمی۔۔ جس کے پاس لاٹری کا ٹکٹ کے لئے پیسے نہ تھے اپنی رفیقہ حیات کو چند سونے کے سکوں کی خاطر بیچ دیا۔ یہ کہنا بجا ہے کہ لاٹری میں دغا بازی ہوتی ہے اور لاٹری کمیٹی کے صدر جس کو چاہتے ہیں انعام دیتے ہیں یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ مقررہ وقت پر ٹکٹ بکنا ختم ہوتے ہیں اور تقسیم انعام بذریعہ قرعہ اندازی ہوتا ہے اس میں دغا بازی ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے ایک قسم کی لاٹری کے ٹکٹ ایسے ہوتے ہیں کہ انکے خریدنے سے ہمیں ایک پیسے کا بھی نقصان نہیں ہوتا اور اگر قسمت ساتھ دے تو کوئی ہزار کا فائدہ ہوتا ہے مثلاً آج کل ڈفنس آف انڈیا کے لئے روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس قسم کا قرض بذریعہ چندہ جمع ہونا ناممکن ہے اسی لئے لاٹری کے ٹکٹ بک رہے ہیں۔ ہر ایک کی قیمت سو روپیہ کلدار ہے اس میں ایک پچاس ہزار کا انعام ہے جو تین سال بعد ملیگا دوسرے لوگ جو ٹکٹ خریدے ہیں (انعام پانیوالے کے علاوہ) انھیں ان کی رقم واپس کردی جائیگی۔ اس سے اغراض ڈفنس پورے ہوں گے اور تین سال تک گورنمنٹ کو جو قرض لے کر سود دینا پڑتا ہے اسکی تقریباً چوتھائی حصہ کے انعام تقسیم کئے جائیں گے اس اسکیم میں گورنمنٹ اور پبلک دونوں کا فائدہ ہے۔ کتنی دانشمندانہ تدبیر ہے۔ اکثر لوگوں کو لاٹری کے ٹکٹ خریدنے کا بہت شوق ہوتا ہے چنانچہ مجھے بھی اس کی ٹکٹ خریدنے کا مرض تھا۔ خدا جانے مجھے یہ لت کیسے پڑی۔ ہر ایک ٹکٹ خریدنے کے لئے امی کی جان کھایا کرتی لیکن انعام کی حسرت ہمیشہ دل ہی میں رہی شمیم بھائی مجھ سے ہمیشہ کہتے۔ تمہاری قسمت میں "مفت" میں کوئی چیز حاصل کرنا نہیں ہے خواہ مخواہ روپیہ کیوں برباد کرتی ہو کسی غریب کو کیوں نہیں دیتیں؟ مجھے ہی دیدو بنیاد دیکھ کر تمھیں دعا دوں گا۔ ان کے منع کرنے سے میرا اشتیاق اور بڑھتا اگلے سال بابا نے ڈاربی کی ٹکٹ میرے لئے لی۔ میں سوچنے لگی کہ پہلا انعام ملے تو کیا کروں؟ ———— لاٹری۔۔۔۔ لاٹر۔۔۔ ی۔۔۔ لا۔۔۔ ٹ۔

"او ہو ہو! مبارک ہو بہن۔ ڈاربی کا انعام مفت میں مار لیا" باجی نے تار دیتے ہوئے کہا۔ بڑی خوش قسمت ہو آخر پکنک کب ہے؟" زہرہ آپا نے اپنے خاص انداز میں پوچھا۔ چلو ابھی چلیں پریم نگر۔ دو موٹریں کافی ہیں نا؟ ہم سب موٹروں میں بیٹھ گئے۔ ہماری موٹر شمیم بھائی چلا رہے تھے اور اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ یکایک موٹر کو زور سے دھکا لگا اور میرا سر چکرا یا۔ "ارے ہے یہ کیا ہوا" باجی نے پیچھے سے گردن نکال کر پوچھا۔ "ہائے اللہ خون" کسی نے کہا۔ ایک عورت ٹکر سے مر گئی۔۔۔۔ کورٹ میں شمیم بھائی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ وہ اپنے اطراف و جوانب حسرت سے نگاہیں ڈال رہے تھے۔ میں نے کہا "پیارے بھائی ہم اب آپ کے لئے کیا کریں؟" "دعائے مغفرت" جج فیصلہ سنا چکا تھا انھیں سزائے مو ـــ ـــ ت کر کر کر ررررن سرہانے گھڑی الارم بجا رہی تھی۔ میں اٹھی تو میرا تکیہ آنسوؤں سے تر تھا۔ جب یہ خوفناک خواب میں نے شمیم بھائی سے کہا تو فرمانے لگے "رات کھانا خوب کھا لیا ہوگا۔ اسی لئے ایسا زوردار سنیما دیکھا"۔ میں کراہ کر خاموش ہو رہی لیکن اس دن سے مجھے لاٹری سے نفرت اور اس کی ٹکٹ خریدنے سے عداوت ہو گئی۔

لاٹری

فریدہ بی - اے (عثمانیہ)

لاٹری ایک قسم کا جوا اور بعضوں کے لئے نہایت خوشگوار شغلہ ہے سچ پوچھئے تو آج کل دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا جو لاٹری کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔ ہر ملک، ہر شہر، اور ہر قصبہ میں عموماً آپ کو اس کی ٹکٹیں بکتی نظر آئیں گی۔ اور آج کل تو تقریباً ہر شخص کو اس کی ٹکٹ خریدنے کا خبط ہے اس خیال سے کہ چند روپیوں کے بجائے ہزاروں ملیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" دنیا کی سب سے بڑی لاٹری ڈاربی کی ہے جو ہر سال ماہ مئی کے آخری چہارشنبہ یا جون کی پہلے چہارشنبہ کو اٹھتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے پہلی لاٹری ہے جس کو ڈاربی کے بارہ ارل EARLS نے ۱۷۸۰ء میں ایجاد کی۔ اس کا پہلا انعام چوبیس ہزار پونڈ ہوتا ہے۔ لاٹری کے دو پہلو ہیں۔ ایک اچھا اور دوسرا برا۔ یہ قسمت کا کھیل ہے۔ اس سے بعض مرتبہ وہ غریب لوگ جو نان شبینہ کو محتاج تھے امیر بن گئے۔ چند ہی سال کا واقعہ ہے کہ بمبئی کی ایک غریب جھاڑو دینے والی بڑھیا کئی ہزار کی مالک بن گئی۔ لاٹری اچھی چیز ہے اور اس کی ایجاد ایک بڑے دماغ والے ہی کا کام ہے۔ اس کی ٹکٹ خریدنے پر چند روپیے صرف کرکے اگر ہم ہار بھی جائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن جس کی لاٹری نکلتی ہے وہ شخص ہزاروں کا مالک ہو جاتا ہے۔ لاٹری کا ایجاد ہونا بہت سودمند ثابت ہوا۔ اس سے ٹکٹ خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں کا فائدہ ہے۔ بیچنے والا تقریباً ٹکٹ کے روپیوں کا آدھا حصہ اپنے ذاتی اخراجات میں صرف کرتا ہے اور باقی روپیہ انعام میں دیدیتا ہے۔

مختلف چیزوں کے لئے لاٹری اٹھاتے ہیں بعض مرتبہ ذاتی فایدہ کے لئے، کبھی چندہ کی فراہمی کے واسطے، کسی وقت کسی ملک کی امداد کی غرض سے۔ اگر ہم کسی چندہ کے لئے لوگوں سے روپیہ مانگیں تو اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نہیں دیتے خواہ وہ چندہ کتنے ہی نیک کام کے لئے کیوں نہ ہو لاٹری کے کئی ٹکٹ وہ انعام کی لالچ سے ضرور خرید لیتے ہیں غور کیا جائے تو چندہ اکٹھا کرنے کے لئے اس سے اچھی چیز کوئی نہیں اور لاٹری کے ذریعہ جس قدر روپیے ملیں گے وہ "مفت" میں چندہ لینے سے کبھی نہیں مل سکتے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ لاٹری ایک جوا ہے اس پر ہرگز روپیہ خرچ نہ کرنا چاہیئے لیکن شاید وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ انسان کی زندگی خود ایک جوا ہے۔ اگر سال میں ایک دو مرتبہ لاٹری کے ٹکٹ خرید کر اپنی قسمت آزمائی کریں تو کوئی بری بات نہیں ایک انگریزی مقولہ ہے۔ NO RISK NO GAIN لیکن لاٹری کو ذریعہ معاش بنانا بہت برا ہے۔ بعض لوگ لاٹری کی لالچ میں پھنس کر اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگی تباہ و برباد کر دیتے ہیں اس لئے لاٹری کا آغاز تو اچھا ہے پر انجام برا" بہت افسوس کی بات ہے کہ آج کل کے ہونہار ہندوستانیوں کو عموماً سوائے جوے کے کچھ نہیں آتا وہ جوا صرف لاٹری ہی کی حد تک نہیں کھیلتے بلکہ ہمہ اقسام کا جوا کھیلتے ہیں مثلاً پوکر، گھوڑ دوڑ، فلش وغیرہ۔ ان کی بعض مثالیں ایسی

آنے لگی ہر بات پر رک رک کے ہنسی اب — رنگین تموج سے گراں بار ہوئے لب

کہیں رنگین تموج سے بھی لب گراں بار ہو سکتے ہیں! یہ مصرعہ تھوڑی توجہ سے اس طرح بن سکتا ہے۔

فیضان تبسم سے گہر بار ہوئے لب

کم بخت اجل تھی یہ جوانی کی قبا میں — ٹکڑے ہیں کسی دل کے بھی نقش کف پا میں

یہ "گھس کو باغ میں جانے نہ دینا" کی قسم کا شعر ہے۔ یہ شعر نہیں ہے لافنگ گیلری ہے۔

باغی ص۲ — سر پر نخوت ارباب زباں توڑوں گا — شور نالہ سے در ارض وسماں توڑوں گا

ظلم پرور روش اہل جہاں توڑوں گا — عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا

کیا جناب مخدوم کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ "سما" بمعنی آسمان، نون کے بغیر لکھا جاتا ہے اور "سماں" نون کے ساتھ منظر کے معنوں میں آتا ہے۔ جہاں۔ مکاں۔ زماں کا قافیہ "سما" نہیں ہو سکتا، اور اگر "سماں" سے شاعر کی مراد فی الواقع "منظر" ہے، تب بھی اعتراض کی دوسری شکل پیدا ہوتی ہے۔ ارض و "سماں" میں "ارض" خالص عربی لفظ ہے اور "سماں" ٹھیٹھ اردو۔ لہذا عربی لفظ کو واؤ عاطفہ کے ساتھ اردو لفظ سے ملانا قطعاً غلط ہے۔

مزید یہ کہ شاعر کی مراد یہاں زمین اور آسمان ہی ہے، زمین اور منظر نہیں ——

شور نالہ سے در ارض وسماں توڑوں گا

"شور نالہ" یہ مخدوم کی نئی ترکیبوں میں سے ایک ترکیب ہے۔ جس پر "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" والی مثل صادق آتی ہے۔ مجرد "نالہ" سے شور کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ شور نالہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے "نان کا روٹی" سنگ مرمر کا پتھر۔

ظلم پرور روش اہل جہاں توڑوں گا

"روش" توڑی نہیں جاتی، بدلی جاتی ہے۔ اس مصرعہ میں ردیف "بے کار" ہے۔

عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا

مکان توڑا نہیں جاتا۔ ڈھایا جاتا ہے۔ یہ محاورے کی موٹی غلطی ہے ——

ختم چندہ کی اطلاع ایک مہینہ قبل دیجاتی ہے کہ اس عرصہ میں آپ آئندہ خریداری کا تصفیہ کریں جب کوئی جواب نہیں آتا تو دفتر سے وی۔پی بھیجی جاتی ہے لیکن آپ اس کو واپس کر کے دفتر کو اخراجات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ غور کیجئے کہ محض آپ کی بے پروائی سے دفتر کو ہر مہینہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

جگمگاتے بدن سے نسبت دے سکتے ہیں۔ مگر کیف خلد بریں کو چمکتی جبین سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

اپنے آنچل میں منہ چھپائے ہوئے　　　آ رہا ہے قدم بڑھائے ہوئے

"اپنے" زاید ہے۔ محض وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ "آنچل میں منہ چھپائے ہوئے" کہنے سے بھی مفہوم کامل طور پر ادا ہو جاتا ہے۔ یہاں آنچل اپنے یا غیر کے آنچل کا کوئی سوال نہیں ہے ——

"پچھلے پہر کے چاند سے" صفحہ ۳۱

لذت آغوش شب سے جھک گیا ہے ماہ تاب　　　رات کی رانی نے اس سے چھین لی روح شباب

ضمیر "اس سے" کہ کر کس طرح خطاب کیا جا سکتا ہے اس کو جناب مخدوم یا سردار سلیم ہی سمجھا سکتے ہیں۔ اس مفہوم کو جب ہم نثر میں بھی کہیں گے اس طرح —— "اے ماہ تاب! تو آغوش شب کی لذت سے جھک گیا ہے اور رات کی رانی نے تجھ سے" (اس سے نہیں) روح شباب چھین لی ہے۔

"تجھ سے" کی بجائے "اس سے" یہ تو تھا غلط خطاب —— اس شعر کی ایک اور دوسری غلطی یہ ہے:-

"رات کی رانی" مشہور پھول کا نام ہے۔ اس پھول نے ماہ تاب سے کس طرح روح شباب چھین لی! اس کی تشریح سبط حسن صاحب کر سکتے ہیں! —— مگر میں سمجھتا ہوں کہ مخدوم صاحب نے یہ "لیلائے شب" کا بلیغ ترجمہ فرمایا ہے۔ یہ ہماری کوتاہی فہم ہے جو "رات کی رانی" سے پھول مراد لیں! یہ شعر تو صنعت ایہام (توریہ) میں ہے۔

"انقلاب" صفحہ ۹۸

اے جان نغمہ، جہاں سوگوار کب سے ہے　　　ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے

ہجوم شوق سر رہ گزار کب سے ہے　　　گذر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے

آخری مصرعہ میں "گزر بھی جا" گزر جانا محاورے میں مر جانے، یا عام معنوں میں چلے جانے کو کہتے ہیں۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ "اے جان نغمہ (انقلاب) آجا کہ تیرا انتظار کب سے (مدت سے) ہے۔ مگر کہہ گیا۔ گزر بھی جا (یعنے چلے بھی جا) کہ تیرا انتظار کب سے ہے! من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید — یہاں، چلے بھی آ کہ تیرا انتظار کب سے ہے۔ کہنا درست ہے۔

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک　　　سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک

"حرم کے دوش پر عقبیٰ کا دام" یہ مصرعہ ہے یا چیستان! اس مصرعہ کے معنی فی البطن الشاعر ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں دین (مذہب) کو سودائے خام کہنا۔ یہ مخدوم کی ادبی صداقت کی روشن مثال ہے۔

"جوانی" صفحہ ۱۲۰ کا یہ مصرعہ اقتضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں۔

اس مصرعہ میں "تو ہے اک" محض زاید ہیں۔ ان الفاظ کے بغیر بھی مفہوم پورا ہو سکتا ہے۔

برسنے لگیں دیدۂ تر" ہونا چاہئے۔

"آسمانی لوریاں" صد۲۲

کارچوبی شامیانے میں رچی بزم نشاط　　　سازنے انگڑائی لی بجنے لگی ہیں تالیاں

"بزم رچنا" محاورہ نہیں۔ دوسرا مصرعہ چسپت نہیں، یوں ہوتا بہتر تھا ۔

نغمے نے انگڑائی لی بجنے لگی سارنگیاں　یا　سازنے انگڑائیاں لیں جاگ اٹھی موسیقیاں

نیند سی آنکھوں میں آتی ہے جھکا جاتا ہے سر　　　سن رہا تھا دیر سے میں آسمانی لوریاں

زبان اردو کی قواعد شعرا کے کلام کی اساس پر ترتیب دی گئی ہے، اور مثال میں جا بجا فصحا کے اشعار ہی پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر مخدوم صاحب کے کلام کی بنیاد پر قواعد مرتب کریں تو زمانوں کے قاعدہ کو سرے سے ہی بدل دینا پڑے گا۔ مسطورۂ بالا شعر میں زمانوں کا تطابق نہیں ہے۔ یہ غلطی ہمالیائی قسم کی ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے۔

آرہی ہے نیند اب مجھ کو جھکا جاتا ہے سر　　　سن رہا ہوں دیر سے میں آسمانی لوریاں

"ساگر کے کنارے" صد۱۳

تاریکی شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں　　　تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے

پہلے مصرعہ میں محض "تاریکی اوڑھ کے" کہنا غلط ہے، محض شب کی تاریکی کس طرح اوڑھی جا سکتی ہے! دوسرے مصرعہ میں "تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے" ترانے جاری نہیں ہوتے۔ احکام، فرمان جاری ہوتے ہیں یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے۔

وہ چادر شب اوڑھ کے رخصت ہوا عصیاں　　　تقدیس کے چھڑنے لگے ہر سمت ترانے

ترانے چھڑنا محاورہ ہے۔ اس طرح اس اصلاح سے یہ شعر درست ہو گیا ہے۔

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی　　　ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کو جگانے

یہ شعر غلط نہیں، مگر فاعل سے افعال بہت دور جا پڑے ہیں۔ یوں ہوتا تو بہتر تھا

انگڑائیاں لیتا ہوا، ملتا ہوا آنکھیں　　　طوفان جوانی اٹھا فتنوں کو جگانے

"سجدہ" صد۲۳

موج تسنیم و کیف خلد بریں　　　جگمگاتا بدن، چمکتی جبیں!!

جگمگاتے بدن کو، موج تسنیم سے اور چمکتی جبین کو کیف خلد بریں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ احسنت ۔

فتاد ساعدہ در موج کوثر و تسنیم (عرفی) اس قسم کی "اچھوتی تشبیہات" تو صرف مخدوم ہی کا حصہ ہے۔ مگر مجھے ان دونوں تشبیہات میں کوئی وجہ شبہ نظر نہیں آتی۔ موج خلد بریں کو بعد تاویل بسیار۔ اک گونہ

فکر و نظر

"شاعری علوم کی روح رواں اور جوہر لطیف ہے" آج کل نقاد کسی شاعر کے کلام کو راہ ترقی کا ایک زینہ اور ایک منزل تصور کرکے اس کی شاعری کو وہ درجہ دیدیتے ہیں جو فی الحقیقت اس سے منسوب نہیں ہوسکتا اور تنقید کرتے وقت مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس کی حیثیت سے بڑھ کر اس کا اندازہ قایم کرلیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاعر یا اس کا کلام ہماری ذات کے لئے کوئی اہمیت رکھتا ہے یا کوئی اہمیت رکھ چکا ہے اور جس مقام پر ایک انسان ہونا چاہئے وہاں ایک مجسمہ اور ایک بت نظر آتا ہے اور شاعر کی سعی و محنت اس کی خامیوں اور غلطیوں پر پردہ ڈال کر ہم سے مطالعہ کا نہیں بلکہ تعظیم و تحسین کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ شعر و ادب کے لئے یہ قدامت پرستی ناقابل قبول ہے۔ شاعر یا اس کا کلام کے اصلی معیار اور حقیقی مرتبہ کو دیکھنا اور اگر شکوک و مشتبہ ہے تو پرکھ لینا اور خامیوں، غلطیوں کو ظاہر کرنا بھی "روح تنقید" ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی تنقید کے بجائے تنقیص سمجھے تو سمجھا کرے۔ اس کی پروا نہیں۔

جناب میر احمد علی صاحب
مجاہد

آج کی صحبت میں مخدوم محی الدین ایم۔ اے (عثمانیہ) کا مجموعہ "سرخ سویرا" پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔

مخدوم عقاید کے اعتبار سے تو اشتمالی ہیں لیکن ان کی شاعری آرٹ کے اس پار پراپگنڈا کا ہتھیار بن کر رہ جاتی ہے جو سیاسیات کے میدان میں تو کارآمد ہے لیکن ادبیات کے شبستان اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ حتی کہ بعض معروف الفاظ کی تذکیر و تانیث بھی ان کے ہاں اپنی صورت کے بگاڑ کی شکایت کرتی ہے۔ مخدوم سے اردو کے مستقبل کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، اس لئے انہیں اپنے اشعار پر نظر ثانی کرنا چاہئے۔

"سرخ سویرا" میں معائب کے کانٹے اس کثرت سے ہیں کہ اگر کہیں محاسن کا کوئی ایک آدھ "پھول" ہے بھی تو وہ ان کانٹوں میں دب کر پژمردہ ہوگیا ہے، "شاعر"، اندھیرا، سپاہی وغیرہ یہ ایسی نظمیں ہیں جو ادب عالیہ سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ بہرحال ادب کے حدود و مزاج کو سمجھنا اور اس کی افادیت کو برقرار رکھنا انتہائی ضروری چیز ہے

(اخبار میزان میں ہم نے صرف چند اغلاط پیش کئے تھے اب بقیہ اغلاط شہاب میں پیش کئے جارہے ہیں)

سنجیدہ صفحہ ۲۳ — پھر تڑپنے لگا دل مضطر — پھر برسنے لگا ہے دیدۂ تر

کیا صرف ایک ہی دیدہ برس رہا ہے! شاید دوسرے دیدہ کے "غدود اشکی" کو ہڑتال ہوگیا ہے!

ہر ایک سے لوں گا - بٹیا - اداس نہ ہو - نیا کھلونا مل جانے پر تمہارا دل بہل جائیے گا "
کندن سے ضبط نہ ہو سکا وہ کمرے سے باہر نکل آیا -
نرملا دیوی کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ نکلے
مگر آنسو ــــ پانی کے چند بے مایہ قطرے کہیں پتھر کو پگھلا سکتے ہیں +

براہ کرم

تبدیل پتہ سے دفتر کو اطلاع دیجئے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت آپ کو باقی رہے گی -

منیجر

یہ کیا ــــــ ؟

جناب آل رضا صاحب رضا (لکھنو)

دل محبت میں ہے دنیا کا تماشا - یہ کیا ؟
کیا سے کیا ہو گیا کیا ہوتا ہے کیا تھا یہ کیا ؟

میں زمانے کے لئے دل کو بدل دوں یہ کیوں ؟
میرے جذبات کو سمجھے نہ زمانا یہ کیا ؟

ہے وہی حسن ، جسے دل سے ہو فطری نسبت
لوگ اصلاح بھی فرماتے ہیں اچھا یہ کیا ؟

فلسفہ کون محبت کو بنا سکتا ہے
اک جہان متحرک کا ٹھہرنا یہ کیا ؟

موت جس درد میں آتی ہوئی معلوم ہوئی
اب وہی درد ہے جینے کا سہارا یہ کیا ؟

ان سے مل کر وہی بے تابی و تجدید خلش
ان سے ملنے کی مگر پھر بھی تمنا یہ کیا ؟

جب نجانا تھا انہیں میں تھا یہی دنیا تھی
اب بغیر ان کے کہیں جی نہیں لگتا یہ کیا ؟

خط انھیں لکھتا ہوں اور چاک کیا کرتا ہوں
کام مجھ سے نہ یہ بنتا ہے نہ رکتا یہ کیا ؟

اس کے بعد سینکڑوں بار پچھتانا پڑتا ہے"

نہیں مانتے نہ مانو۔ مگر میری خطاؤں کی سزا
میری بیٹی کو کیوں دیتے ہو"

"آج کل کی دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ کرتا کوئی
اور بھگتتا کوئی ہے"

"کملا اور کندن ایک دوسرے سے بے انتہا
محبت کرتے ہیں اگر یہ رشتہ نہ ہوا تو دونوں کے دل ٹوٹ
جائیں گے۔ کملا تو خیر ابھاگن ماں کی ابھاگن بیٹی ہے
مگر تمہارا کندن ——— اس کا کیا ہوگا؟"

"وہ محبت کے مفہوم سے اچھی طرح واقف
ہو چکا ہے"

"بنواری میں تم سے بھیک مانگتی ہوں"

"میں نے بھی تم سے محبت کی بھیک مانگی تھی مگر
یہ بھیک تم نے ایسے شخص کو دی جس کا وہ محتاج نہیں تھا"

نرملا دیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں ——— مگر یہ آنسو؟"

اس سوال نے ڈوبتے سے تنکے کا سہارا بھی
چھین لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"نرملا۔ میں جانتا ہوں آنسو شکست کا اعتراف
ہے۔ وہ آخری حربہ ہے جس سے عورت مرد کے مصمم ارادوں
کو مجروح کرنا چاہتی ہے ——— پانی کی چند بوندیں
کہیں پتھر کو پگھلا سکتی ہیں ———؟"

بنواری لعل کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ
آ گئی —

نرملا دیوی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا

"تمہارا خیال غلط ہے بنواری ——— یہ آنسو
پانی کے قطرے ہیں اور نہ تمہارا دل پتھر ہے ——— ایک بار
پھر سوچو ——— کم از کم کندن سے تو اس کی رائے معلوم
کر لو"

"کندن ——— کندن ——— یہاں آؤ"

بنواری لعل کی بھاری آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

کندن نرملا دیوی کو کمرے میں موجود پا کر کچھ محجوب
ہو گیا۔ اس کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ وہ ضرور میری شادی
کی بات چیت کرنے آئی ہوں گی۔ اب برہ کے دن رات
ختم ہو جائیں گے ——— مگر بنواری لعل کی خشمگیں نگاہوں
اور غصہ سے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسے خوف سا
محسوس ہوا۔

"پتا جی"

تم اس عورت کا نام معلوم کرنا چاہتے تھے جس نے
میری زندگی تباہ کی ——— وہ نرملا ہے جو تمہارے سامنے
بیٹھی ہوئی ہے۔

"آپ نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا"

"جان بوجھ کر ——— مجھے اس کی خبر ہو چکی تھی کہ
تم اور کملا محبت کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ میں چاہتا
تھا کہ تعلقات اور بڑھیں اور جب کملا تمہارے بغیر
اپنی زندگی کا بھی تصور نہ کر سکے اس وقت اس سے
تمہیں چھین لوں۔ تم سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے نرملا کا
انتقام کملا سے کیوں لیا ——— کندن ——— مجھے دنیا
کی ساری عورتوں سے نفرت ہو گئی ہے اور میں اپنا بدلہ

پر کندن! میں نے اپنے نفس کو مار کر تیری پرورش
کی جو کچھ کمایا تجھ پر صرف کیا۔ اس امید پر نہیں کہ جب
تو بڑا ہوگا اس کا معاوضہ لیلوں گا۔ ہرگز نہیں۔ مگر
جب ماں باپ ضعیف ہو جائیں تو ان کی خدمت کرنا
اولاد کا فرض ہے۔"
میں تجھ سے اس کا بھی طلبگار نہیں ہوں۔ میں
ایک بات کی خواہش کرتا ہوں وعدہ کر کہ اسے پورا کریگا
"میں قسم کھاتا ہوں"
"تجھے محبت کرنا ہوگا"
"محبت !! آپ نے تو کہا تھا کہ اس سنسار کی
کسی چیز سے محبت نہیں کرنی چاہئے"
"ہاں —— مگر جس عورت نے تیرے باپ کی
زندگی تباہ کی ہے اس سے تجھے انتقام لینا ہوگا"
"وہ کیسے ؟"
"اس کی لڑکی سے محبت کر اور جب وہ تیرے قدموں
میں جھک جائے تو اسے ٹھکرا دے۔ اس کی زندگی
مسکراہٹوں سے معمور ہے۔ اسے آنسوؤں میں بھگو دے
اس نے مجھے بہت رلایا ہے"
"اس کا نام کیا ہے پتا جی"
"نام ؟ —— اس کا نام آج تک میں نے کسی کو
نہیں بتایا۔ تجھے بھی نہیں بتاؤں گا۔ مگر تجھے تو بتانا ہی
پڑے گا۔ خیر! رات زیادہ ہو گئی ہے جا آرام کر"
بنواری لعل نے کندن سے کیا وعدہ لیا تھا
گویا خود اپنے ضمیر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی تباہی کا
ایک ضرور انتقام لیں گے۔ مگر —— نرملا دیوی کی تجویز

سن کر ادھیڑ بن میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ
کیا کریں۔ کیا جواب دیں۔ ان کی بات کو کس طرح ٹال
دیں۔ عورتیں جب ضد پر آتی ہیں تو کب کسی کی مانتی ہیں
عورت کو اس کی ہٹ سے باز رکھنے کی کوشش اسے
اور ہٹیلی بنا دیتی ہے۔ لیکن بعض وقت اس کی ضد ناقابل
برداشت بھی تو ہو جاتی ہے۔ بالآخر وہ تنگ آ کر بولے۔
"کندن کی شادی تمہاری بیٹی سے ہرگز نہیں ہوگی"
"کیوں ؟"
"اس لئے کہ مجھے تم سے نفرت ہے"
"نفرت ! کبھی مجھ سے تم کو محبت جو تھی"
"ہاں - مگر تم نے ثابت کر دیا کہ محبت ایک فریب ہے"
"ہونھ ! مرد عورت کی جوانی اور حسن سے محبت
کرتے ہیں"
"اور عورت مرد کی دولت سے محبت کرتی ہے
اسی لئے تم نے شنکر کو مجھ پر ترجیح دی۔ تم نے میری
آرزوؤں اور ارمانوں کا خون کیا۔
نرملا ! تم اب تک پھولوں کی سیج پر لوٹتی
رہیں اور کبھی بھولے سے بھی یہ نہ سوچا کہ بنواری کانٹوں
پر پڑا تڑپتا ہے —— اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تمہارے
عہد و پیمان پانی کے بلبلے ہیں تو ——"
"بنواری —— یہ تم کیا کہتے ہو۔ مجھے اب
بھی تم سے محبت ہے۔ لڑکیوں کی قسمت ایشور نہیں بناتا
ماتا پتا بناتے ہیں جس کے گلے باندھ دیا اسی کے ہو رہنا
ان کا دھرم ہے۔ مگر محبت عمر میں ایک بار کی جاتی ہے"
"محبت عمر میں ایک بار کی جاتی ہے" بنواری نے کہا لیکن

ہجوم ہے۔ مرد عورت سے محبت کرتا ہے۔ ہر ایسی عورت سے
جو اس کی نفسانی خواہشات کی تشنگی کو بجھا سکے۔ یہ نہیں
ہوتا کہ وہ صرف ایک ہی کا ہو کر رہے "

چند دن بعد محب و محبوب عمر بھر کیلئے جدا ہوگئے۔

ایک عرصہ تک بنواری بن بیاہے رہے مگر
بعض ناگزیر حالات نے ان کو شادی کرنے پر مجبور کر دیا
تنہائی سے وہ تنگ آگئے تھے۔ دفتر کی مصروفیات کو
ختم کر کے جب وہ گھر لوٹتے تو مکان کی خاموشی انہیں
بہت بری لگتی اور ان کے دل میں ایک موہوم سی خواہش
پیدا ہوتی۔ اے کاش۔ اس وقت میرا کوئی ساتھی
ہوتا جس کی مخمور آنکھوں کی شراب پی کر میں سب کچھ
بھول جاتا جس کی چوڑیوں کی جھنکار، جس کے لطیف
قہقہے، میری زندگی میں ارتعاش پیدا کر سکتے" اس کے
علاوہ تخلیق کی آتشیں لذت نے انہیں اور بھڑکایا اور
انھوں نے شادی کر لی۔

ان کی زندگی بہت پرمسرت بن گئی۔ چاہنے
والی بیوی، للیتا اور کندن دو تندرست اور خوبصورت
بچے ۔۔۔ وہ اپنے ماضی کو آہستہ آہستہ بھولتے جارہے
تھے۔ دراصل انسان کی فطرت میں یاد رکھنے سے زیادہ
بھول جانے کی عادت ایک نعمت ہے۔ امتداد زمانہ بڑے
سے بڑے صدمہ کے نقش کو صفحۂ دل سے مٹا دیتا ہے دنیا
کی خوشیاں عارضی سہی لیکن وہ اس طرح ہمارے احساسات
کو جگا کر جاتی ہیں کہ غموں کی یاد مدتوں خوابیدہ رہتی
ہے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا چمن سے گذر جاتا ہے مگر پھولوں
کی مہک بہت دیر تک فضاؤں میں بسی رہتی ہے۔

مگر ۔۔۔ مگر بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ
مسرتوں کی معراج میں بھولے ہوئے غم کی یاد کسک بن
کر دل میں چٹکیاں بھرنے لگتی اور ان پر خاموشی کا
زبردست دورہ پڑتا۔ وہ دنوں کسی سے مخاطب ہوتے
ایک روز انھوں نے محسوس کیا کہ کندن کو کوئی نصیحت
کرنی چاہئیے۔

" کندن ۔۔۔ بھگوان کی کرپا سے اب تم سیانے
ہو گئے ہو۔ میں زندگی کی کئی منزلیں طے کر چکا ہوں۔
چاہتا ہوں کہ تمھیں اپنے تجربات سے واقف کراؤں
میں سر شام کا سورج ہوں۔ بہت جلد غروب ہو جاؤنگا
سنو بیٹا۔ اس سنسار کی کسی چیز سے محبت نہ کرنا محبت
زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ یہ ٹھوکر کھا کر جو گرتا ہے
عمر بھر نہیں سنبھلتا۔ سمجھے ؟"

" میں سن رہا ہوں پتا جی "

" میں نے بھی محبت کی تھی۔ پرماتما نے مجھے سب
دیا۔ مگر ناکام محبت کی خلش دنیا کی ساری نعمتوں کو
ہیچ بنا دیتی ہے۔ اگر تم خوش رہنا چاہتے ہو تو عورت
کی محبت کے فریب میں نہ آؤ۔ عورت کی محبت سکوں کی
جگہ گھبراہٹ کی طرف دوڑتی ہے۔ وہ محض ایک کھلونا ہے
اس سے کھیلتے جاؤ۔ کھیلتے جاؤ اور جب تمہارے جذبات
تھک جائیں تو بقائے نسل کے لئے شادی کر لو "

کندن مبہوت بیٹھا بنواری لعل کی باتوں کو
سنتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر اس موضوع
پر گفتگو کیوں شروع ہوئی اس کو زیادہ سوچنے کا موقع
نہ ملا۔ بنواری لعل نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پریم کی ندی سوکھ جائے گی۔"
"پانی سوکھنے لگتا ہے تو ندی کے کنارے اور قریب آجاتے ہیں۔"
"کسی کا دل توڑنا پاپ ہے۔"
"ٹوٹا ہوا دل ہی دل ہوتا ہے۔"
یہ آوازیں تھیں چوٹیلے دلوں کی۔

للیتا بنواری کی بہن تھی۔ اس سازش میں اس کی بہت سی سہیلیاں شریک تھیں جن میں سمترا بھی تھی ایک روز اس سے ملنے آئی اور خواہ مخواہ بنواری کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"بنواری کی دلہن میں لاؤں گی۔"

"سمترا۔ میرا ایک ہی بھائی ہے۔ بھابی ایسی ہو کہ چاند بھی دیکھ شرمائے۔ اگر مجھ جیسی ہو تو؟"

للیتا نے اس کے گال پر پیار سے طمانچہ لگایا۔

"بیداری میں خواب دیکھنا اچھا نہیں سمترا" نہ جانے بنواری کہاں سے آدھمکے، "ایسے خواب سچے نہیں ہوتے۔"

"ہاں میں بھی تم سے یہی کہنا چاہتی تھی اب ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ زندگی سپنوں سے نہیں بنی۔ زندگی ایک حقیقت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ تم اس کی تلخیوں کو محسوس کرنے لگو۔"

بنواری ہکا بکا ہو کر اس کی صورت تکنے لگے۔

"اس زہرآب کو تمہیں حلق سے اتارنا ہی پڑے گا۔ بینی نرائن کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے۔ شنکر کو خود اس نے پسند کیا ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا "ان کا کیا ہوگا" وہ ہنس کر بولی سمترا محبت منڈلاتے ہوئے بادل کی چھاؤں ہے، جو ایک جگہ ٹھہرتی نہیں۔ اب وہ بھی وہی کریں گے جو دنیا کرتی ہے۔ ہنسیں گے کم روئیں گے زیادہ۔"

بنواری کی آنکھوں سے آنسوؤں کی نہریں بہنے لگیں۔ سمترا نے خوشبو میں بسا ہوا آنچل اس کے چہرے پر پھیلا دیا۔ وہ جھلا کر بولے
"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

"اگر کوئی آنسو پونچھنے والا نہ ہو تو یونہی رو لینے سے دل کو تسلی نہیں ہوتی۔" سمترا نے کہا۔

ادھر بینی نرائن کے گھر میں بھی سازشوں کا بازار گرم تھا۔ ان کی لڑکی کے آہستہ آہستہ کان بھرے جا رہے تھے۔ اس کو یہ یاد کرایا جا رہا تھا کہ بنواری نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ایک روز روپا نے اس سے کہا۔

"تیرا بنواری بڑا طوطا چشم نکلا۔ اب اس کی محبت کی ندیا نے اپنا دھارا بدل دیا ہے۔"

"میں نہیں مانتی۔ بنواری کی محبت چھوٹی سی ندی نہیں جو اپنا رخ بدل دے۔ ان کا پریم ایک بیکراں سمندر ہے۔"

"مگر جب سمندر میں کئی ندیاں آکر گرتی ہیں تو وہ سب کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ تم اب تک بنواری کو اپنی شمع حسن کا پروانہ سمجھتی رہیں مگر اب وہ خود شمع بن گیا ہے۔ اس کے اطراف پروانوں کا

آنسو

جناب شوکت علی خاں صاحب
ایم - اے

بنواری لعل نرملا دیوی کی تجویز سن کر ادھیڑبن میں پڑ گئے ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، کیا جواب دیں - ان کی بات کو کیسے ٹال دیں - عورتیں جب ضد پر آتی ہیں تو کب کسی کی مانتی ہیں - عورت کو اس کی ہٹ سے باز رکھنے کی کوشش اسے اور ہٹیلی بنا دیتی ہے - لیکن اس کی ضد بعض وقت ناقابل برداشت بھی ہو جاتی ہے اور پھر بات معمولی بھی نہ تھی - ان کے لڑکے کندن کی شادی کا سوال تھا - کندن جوان تھا - یہی زمانہ ہوتا ہے شادی بیاہ کا - ورنہ لڑکے بے بہرہ ہو جاتے ہیں، ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں - یہ سب کچھ صحیح تھا — مگر — جب کوئی سر ہو جاتا تو وہ بڑی ترکیب سے گریز کر جاتے - سنجیدگی سے کہتے -

" جلدی کاہے کی ہے - آج نہیں تو کل ہو ہی جائیگی - اسے ذرا پڑھ لینے دو " عذر معقول تھا مگر کوئی ان کا پیچھا بھی تو چھوڑے - رات دن ان کی جان کھاتے - طرح طرح کے استدلال پیش کئے جاتے - شادی سے پڑھائی کیوں رکنے چلی - اجی اس سے تو اور شوق ذوق بڑھیگا - نئی دلہن کو دکھانے کے لئے اور زیادہ محنت کرنے کی امنگ پیدا ہوگی — اور بنواری بھیا کوئی بیوی کے کولہے سے کوٹھا لگا کر عمر گزارتا ہے؟ آخر ہماری بھی تو شادیاں ہوئیں - عیش بھی کیا - دنیا کے کام بھی کئے - ہمارا تو عقیدہ بلکہ تجربہ ہے کہ شادی نہ ہونے ہی سے تعلیم میں خلل پڑتا ہے - خیالات پراگندہ رہتے ہیں - تصورات میں پریاں ناچتی رہتی ہیں اور ایسی ترنگیں اٹھتی ہیں کہ کتابوں پر دھیان نہیں جمتا — سمجھے؟ — کیا سمجھے؟؟ —

" بھئی کیوں زچ کرتے ہو - ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں، ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہے "

بنواری لعل کے ان روکھے پھیکے جوابوں سے ان کے دوست بیزار ہو گئے تھے، کسی نے کہا وہ جائے بھاڑ میں ہمیں کیا - کسی نے کہا اندھے کے آگے روئے اپنی بھی آنکھیں کھوئے - اونہہ!! کوئی کب تک کتے کی دم سیدھی کرتا رہے گا - بنواری لعل کی ان کو جلی کٹی باتوں کی پرواہ نہ تھی وہ دوستوں سے رفتہ رفتہ کنارہ کش ہوتے جا رہے تھے - دوستوں کی آمد و رفت بند ہونے سے ان کے گھر کی خاموشی میں اور اضافہ ہو گیا تھا - دن بھر وہ حقہ گڑگڑاتے رہتے اور رات میں کروٹیں بدل کر اپنے ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے -

جوانی کی یاد کس کے دل کو نہیں مسلتی - اگر جوانی

شہاب

سمندر میں گرتا ہے۔ مدینہ سدونیہ (سڈونیہ)
کے میدان میں جھیل لاگو نادی لا جنڈا (جسے البحیرہ
کہتے ہیں) کے کنارے ہر دو لشکروں نے ڈیرے
ڈالے۔ ۹ جولائی کی صبح جب طلوع ہوئی تو مسلمانوں
کی فوج صف بستہ خدا کے حضور میں خشوع و خضوع
سے جھکی ہوئی نماز ادا کر رہی تھی کسے معلوم کہ ۹
جولائی کا سورج تاریخ اندلس میں ایک نیا ورق
اُلٹے گا اور ایک ایسا باب شروع ہوگا جب
اندلس کی سرزمین کے ذرے ذرے خدائے واحد
کے پرستاروں کی آذانوں سے گونج اٹھیں گے
اور انہیں وادیوں سے ۹ سو سال تک خدائے
واحد کے نام کی منادی کی جائے گی۔

نماز سے فارغ ہو کر طارق نے تقریر کی۔

اے لوگو اب کوئی جائے قرار نہیں ہے
سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن سامنے۔ بخدا
اب سوائے صبر اور صداقت پر قائم رہنے کے
اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ تم کو معلوم ہونا چاہئے
کہ تم اس جزیرہ میں ان خستہ حال یتیموں کی مانند
ہو جو کمینہ رئیسوں کے دسترخوان پر کسی طرح
پہنچ گئے ہوں۔ تمہارا دشمن اپنے کثیر لشکر۔ اسلحہ اور
بے حساب غلہ کے ذخیروں سے مقابلہ کر رہا ہے
جبکہ تمہارے پاس ہتھیاروں میں سے صرف
تلواریں ہیں اور صرف اتنی دیر تک کام آنے والا
غلہ ہے۔ جو تمہیں بمشکل دشمن سے نجات دلا سکے۔
اگر اس محتاجی کی مدت دراز ہو گئی اور تم نے اپنا
کام سرانجام دیا۔ تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور
تمہارے رعب کی بجائے دشمن کی جرأت مسلط
ہو جائے گی۔ تم اپنے دلوں سے جنگ کی کشاکش
سے پیدا ہونے والی محرومی کو دور کر دو۔ دیکھو تمہارے
سامنے ایک مضبوط قلعہ والا شہر ہے۔ اگر تم نے اس
فرصت کو بوجہ غفلت کھو دیا۔ تو یہ عین ممکن ہے کہ تم
اپنے نفوس کو موت کا تحفہ پیش کرو۔ میں تم کو ایسے
خطرہ سے نہیں ڈرا رہا ہوں کہ جس سے میں خود بچا
ہوا ہوں بلکہ ایک ایسے خطرہ کا سامنا ہے جس میں
مجھے اور تمہیں متاع زندگی کو ارزاں کرنا پڑے گا
خوب سمجھ لو کہ اگر تم نے سختی اور تکلیف پر تھوڑا سا
بھی صبر کیا تو لطیف اور دیرپا آرام سے مستفید
ہو گے۔ لہٰذا اب تمہیں میری جان کو چھوڑ کر صرف
اپنی زندگی کی رغبت نہ کرنی چاہئے۔ اس متاع
زندگی میں تمہارا حصہ میرے حصے سے زیادہ نہیں
ہے۔ یہ تمہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اس جزیرہ میں عمدہ
اشیاء کی عام پیداوار ہے اور امیر المومنین ولید
بن عبد الملک نے تم کو یہاں کے لئے زبردست
بہادروں میں سے منتخب کیا ہے۔ اور تم بھی اس
جزیرہ کے حاکموں کی دامادی کے لئے راضی ہو گئے
تھے۔

(باقی دارد)

(MILICIA)

(TORRE DEL ROCADILLA)

کا وقت جولین سیدھا موسیٰ بن نصیر کے
پاس پہنچا۔ موسیٰ اس وقت قیروان میں مقیم تھا۔
موسیٰ نے دوبار پہلے سبتہ پر فوج کشی کی تھی مگر ہربار
ناکام رہا۔ جولین کی بہادری کا وہ مداح تھا۔ اُس
نے جولین کی مناسب حال عزت و توقیر کی اور
اپنے ہاں مہمان رکھا۔

جولین نے موسیٰ سے گاتھک سلاطین کی
بدعنوانیوں اور بدچلنیوں کا تذکرہ کیا۔ دربار کی
عشرت افروز اور حیا سوز داستانوں کو دُہرایا۔
اڈرک شاہی خاندان سے نہ تھا۔ بلکہ غیر ملکی اور
کم درجہ کا انسان تھا۔ شاہی خاندان کے افراد ایک
ایسے آدمی کے سریرآرا ہونے پر بہت پیچ و تاب
میں تھے۔ پھر سرزمین اندلس کے باغات سرسبز
وادیوں اور دیگر کششوں کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اگر
اس وقت مسلمان حملہ کردیں تو یقیناً فتحیاب ہونگے
عیش پرستی و شہوت رانی نے سلطنت کو بالکل کھوکھلا
کر رکھا ہے۔ اور اس وقت کو ہاتھ سے گنوانا
حماقت ہوگی۔

موسیٰ نے خلیفہ دمشق سے اجازت چاہی
اور جولین کی آمد کا تذکرہ مفصل لکھا۔ ولید بن
عبدالمالک خلیفہ تھے انہوں نے منظوری دیدی۔
اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے طریف کو روانہ کیا
مگر طریف کے بھیجنے سے پہلے جولین کی ایمانداری کا
امتحان ضروری تھا۔ اس لئے موسیٰ نے جولین کو
شرط پیش کی۔ پہلے وہ اپنی افواج لے کر اندلس پر
حملہ کرے۔ جولین نے اسے بخوشی منظور کیا۔ [illegible]
فصلات کو تباہ کردیا۔ گرجے اور معابد جلا ڈالے
سدونیہ کے قرب و جوار کو خوب لوٹا۔ موسیٰ کو اپنے
حلیف کی دیانت کا یقین ہوگیا اور اس نے دیکھ
لیا کہ اب لذریق جولین کے قصوروں کو کبھی معاف
نہ کرے گا۔ سبتہ (سیوٹہ) کی کنجی موسیٰ کے حوالے
کی گئی۔ اور جولین نے خلیفہ ولید کی وفاداری کا
حلف اٹھایا۔ اب طریف کو ایک سو سوار اور
تین سو پیادے سے جولائی ۷۱۰ء کو جزیرہ الخضرا
(جواب الجزیرہ کہلاتا ہے) پر بھیجا۔ طریف حالات
کا جائزہ لے کر واپس آیا تو موسیٰ نے طارق بن
زیاد ایک بربری غلام کو ایک مہم کا سپہ سالار
کر کے بھیجا۔ طارق کے سر کے بال سرخ اور رنگ
بہت نکھرا ہوا تھا۔ بہت بلند حوصلہ بہادر تجربہ کار
اور بے انتہا شفقت پسند جرنیل تھا۔ اور موسیٰ کا
آزاد کردہ غلام تھا۔ طارق کی فوج صرف سات ہزار
تھی جس میں سوار بہت تھوڑے تھے۔ یہ فوج
مخلوط اقوام کی تھی۔ قبائل غمرہ۔ مسقونہ۔ زناتہ کے
بربری لوگ۔ حجاز کے بدو۔ یہودی جو اسپین سے
بھاگ کر مسلمانوں کے پاس پناہ گزیں ہوئے تھے
شامی وغیرہ سب اس میں شریک تھے۔ سکاٹ

توہاں فتح اندلس کا ذکر تھا۔ جب موسیٰ بن
نصیر گورنر افریقہ تھے تو اُس وقت اندلس پر گاتھک
قوم کا بادشاہ (لزریق یا رازرق) راڈرک تھا وہ
۹۰ سال کا تھا مگر تنومند اور چست و چالاک۔ قوم
وزیگاتھ میں یہ رسم تھی کہ معزز خاندان اور بارسوخ
اُمرا کے لڑکے اور لڑکیاں شاہی محل میں تعلیم و تربیت
کے بہانہ سے رکھے جاتے تھے۔ مگر اصل مقصود یہ تھا
کہ وہ بطور یرغمال رہیں تاکہ وہ اُمرا سرکش نہ ہوسکیں
سن بلوغ تک یہ لڑکے بادشاہ کے غلام اور خدمتگار
کا کام کرتے اور انہیں آداب شاہی اور تعلیم حربیہ
دی جاتی اور لڑکیاں محل سرا میں ملکہ کی خدمت گزار
ہوتیں۔

کاونٹ جولین قلعہ سبتہ کا قلعہ دار تھا اور
سلطنت بیزنطینی کا باجگذار تھا۔ جب مسلمانوں نے
افریقہ کے تمام مقبوضات کو فتح کرلیا۔ تو کاونٹ
جولین تنہا رہ گیا۔ اور بوقت ضرورت بیزنطینی
سلطنت اس قدر دور رہ گئی کہ امداد بہم نہ پہنچا سکتی
تھی اس لئے اُس نے خود کو کسی قریبی مسیحی سلطنت
کی حمایت میں دینا پسند کیا۔ چنانچہ اُس نے خود کو
لزریق والی طلیطلہ کے سپرد کردیا۔ اور اپنی لڑکی
شاہ لذریق کے حرم سرا میں قانون کے مطابق
بھیج کر خود کو اندلسی سلطنت کے سپرد کردیا۔

اگر دنیا کے تمام فتنوں اور شورشوں کی اصل
دریافت کی جائے تو اس میں نزدیک یا دور سے
اماں حوا کی اولاد کا ضرور کوئی نہ کوئی ہاتھ ہوگا
گاتھک سلطنت کی بیخ کنی کا موجب بھی اس لڑکی
کا حسن طلسم بند اور بوڑھے لذریق کی ہوس و
گلچینی تھی۔ یا اپنے عہد کی قلوبطرہ حبیب منت
نوشادہ سے راضی نہ ہوئی۔ تو بڈھے لذریق نے ایک
دن موقع پاکر ؎

جام ہے اور کنجِ لالہ و گُل
ہائے عادت دراز دستی کی

کاونٹ جولین بہت باعزت انسان تھا۔ اُسے
جب اپنی دختر کے ننگ و ناموس کی اس تباہی کا
علم ہوا تو وہ سخت آندھیوں اور طوفان ابر و باد کی
پرواہ نہ کرتے ہوئے دارالسلطنت پہنچا اور خدع و
فریب سے لذریق کے سامنے رنج و غم کا اظہار
نہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کی شدید علالت کا بہانہ
کرکے اپنی لڑکی کو لے گیا۔ اور قلعہ سبتہ پہنچ کر
راڈرک سے انتقام کی تجویزیں سوچنے لگا۔

قلعہ سبتہ یورپ کی کلید تھا اور ناقابل فتح
مضبوط قلعہ تھا۔ اسپین کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ
تھی۔ شاہی محل کی رنگینیوں کا تذکرہ تو آپ سن ہی
چکے۔ راہبوں اور پادریوں کے اسرار و خفایا کو اگر
بے نقاب کروں تو تہذیب کا دامن ہاتھ سے
جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ اپنی خفت کے مداوا کی
جستجو میں تھے اور اس کی تلافی کسی اہم جنگی
کارنامہ سے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے حضرت
عثمان غنیؓ سے افریکیہ پر حملہ کی اجازت چاہی۔ اس زمانہ
میں افریکیہ نام کی ایک ریاست تھی جس کا دار السلطنت
قرطاجنہ تھا۔ یہ طرابلس اور طنجہ کے درمیان پھیلی
ہوئی تھی۔ یہ وہی طنجہ ہے جہاں پر ان دنوں
کانفرنس ہو رہی ہے کہ طنجہ کو اسپین کے اقتدار
سے بلکہ بین الاقوامی اقتدار میں لایا جائے اور
یہی طنجہ ابن بطوطہ کا مسکن و مولد تھا۔ افریکہ۔
طرابلس۔ الجیریا۔ ٹیونس اور مراکو کی ریاستوں کے
مجموعہ کا نام تھا۔ یہ داستان طویل ہوتی جا رہی
ہے۔ غرض یہ کہ حضرت عبداللہ بن سعد نے افریکیہ
کو فتح کرایا۔ عقبہ بن نافع بانی قیروان اور فاتح
افریکیہ نے اسی طنجہ سے میل کے فاصلے پر ساحل
شرف العقب پر اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا تھا
اور اپنا خنجر نکال کر بارگاہ ارض و سما میں بصد
حسرت و یاس کہا تھا کہ خداوندا! اگر زمین یہاں پر
ختم نہ ہوتی۔ تو اسی طرح دیگر ممالک کو زیر و زبر
کرتا۔ اور تیرے نام کی منادی کرتا۔ ؎

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

۶۸۲ء نافع بن عقبہ کی فوج کشی پر
بلیان نامی نصرانی قلعہ دار طنجہ نے حاضر ہو کر ہتھیار
ڈال دیے۔ اور نذر پیش کی۔ چارلس دوئم کے
جہیز میں طنجہ اور بمبئی ۱۶۶۱ء میں سلطنت پرتگالی
سے انگلستان کو مل گئے۔ اس وقت طنجہ میں عبداللہ
غیلان نامی صاحب اقتدار مولائے رشید سلطان
مراکش سے برسر پرخاش تھے۔ انگریزوں نے رشید کا
ساتھ دیا۔ اس پر عبداللہ نے انگریزوں پر چھاپہ
مارا۔ اور لارڈ پٹربرو نے ۴۰۰ پونڈ رشوت دے کر
صلح کر لی۔ طلائے سرخ سے عارضی صلح تو ہو گئی
مگر دیرپا نہ تھی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جنگ ہوئی
اور اس دفعہ مولائے اسمٰعیل سلطان مراکش (برادر
سلطان رشید مرحوم) انگریزوں کے خلاف میدان
میں اترا اور شکست فاش دیکر نکال بھگایا۔ اس شکست
پر لارڈ میکالے لکھتا ہے کہ ایسی منحوس ساعت
اس سے پیشتر انگریزوں کو نہ دیکھنی پڑی تھی۔ اسمٰعیل
نے ۵۵ سال حکومت کی اور اس کے لڑکوں کی تعداد
سات سو سے اوپر تھی۔ اس کے حرم میں ایک اندلسی
اور ایک انگریز کنیز تھیں۔ آپس میں اس درجہ رشک
و حسد تھا کہ ایک روز اندلسی عورت نے موقع پاکر
میم صاحبہ کا سینہ جلا ڈالا۔ تاکہ سلطان کا التفات
کم ہو۔ افسانہ سے افسانہ نکل آتا ہے۔ طنجہ کے
نام سے کہاں جا پہنچا۔ ع

عجب بود حکایت دراز تر گفتم

سپہ سالار افواج رہنے دیا۔ مگر عامل اور
سپہ سالار کی آپس میں نہ نبھ سکی۔ چنانچہ ۲۶ھ
میں جب امیر المومنین کو اس نزاع کا علم ہوا تو آپ نے
عمرو بن العاص کو قطعاً معزول کر کے جملہ اختیارات
مصر حضرت عبداللہ کو تفویض کر دیے۔ عمرو
بن العاص ایک تجربہ کار سپہ سالار تھا اور نہایت ہر
دلعزیز گورنر۔ اُن کی معزولی سے مصر کی رعایا نہایت
برافروختہ ہوئی۔ عبداللہ تہور۔ بہادری اور شہسواری
میں بہت مشہور تھے مگر تالیف القلوب کے فن سے
قطعاً عاری۔ اہالی مصر عمرو کے حق میں عبداللہ کے
خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

جب ملک کی اس اندرونی شورش کا حال
قیصر قسطنطین کو ہوا تو اُس نے سکندریہ پر حملہ کیلئے
ایک لشکر بھیج دیا۔ سکندریہ کے بہت سے لوگ
حملہ آوروں سے مل گئے۔ اور سکندریہ رومی افواج
کے تصرف میں آگیا۔ یہ خبر پاکر حضرت عثمانؓ نے
دوبارہ حضرت عمرو کو گورنر مقرر کر کے بھیجا۔ عمرو
بہادر۔ تجربہ کار اور باتدبیر جرنیل تھا۔ اُس نے سکندریہ
پر حملہ کر کے رومیوں کو ناقابل فراموش شکست دی۔
اہالی سکندریہ کا باغیانہ طرز عمل اس کا متقضی تھا کہ
اُن کے ساتھ نہایت سختی کا سلوک کیا جاتا اور
عمرو نے حملہ سے پہلے تمام شہر کو ویران اور کھنڈر
کر دینے کی قسم کھائی تھی مگر فتح کر لینے کے بعد عفو
اور درگزر کے جذبات غالب آئے اور آپ نے
افواج کو انتقامی احکام جاری کرنے اور غارت
سے روک دیا۔ جس مقام پر یہ احکام جاری ہوئے
تھے۔ وہاں پر بطور یادگار ایک مسجد تعمیر کرائی۔
جس کا نام مسجد رحمت رکھا۔ حضرت عمرو نے جب
تمام شورش مٹادی اور مصر میں امن و امان قائم ہو گیا
تو امیر المومنین نے پھر عمرو کو معزول کر کے عبداللہ
بن سعد کو گورنر مقرر کر دیا۔

عبداللہ بن سعد کی خودداری کو ٹھیس تھی۔
کہ جس بغاوت کو وہ فرو نہ کر سکے۔ عمرو بن العاص
نے فرو کر دیا۔ اور رومیوں کو شکست دی۔ بسا
اوقات بعض بظاہر ناگوار اور تلخ واقعات نہایت
اہم اور دوررس نتائج کا پیش خیمہ بن جاتے
ہیں۔ عمرو بن العاص کی معزولی یوں تو تاریخ
کے لئے ایک ناخوشگوار واقعہ تھی مگر کسے معلوم تھا
کہ اس قربانی پر ایک عظیم الشان سلطنت کی تاسیس
ہوتی ہے۔ جس کی سطوت اور جبروت سے روما کبرا
یونان۔ فرانس اور قسطنطنیہ کے سلاطین لرزہ
براندام رہیں گے۔ اور آنے والی آٹھ صدیوں
تک یورپ کی بساط سیاست مسلمانوں کے
چشم و ابرو کے ایک ادنیٰ اشارہ پر تہ و بالا ہوگی
قرطاجنہ (کارتھیج) کی ہزار سالہ عظمت و ہیبت
والی سلطنت کا پرچم ہمیشہ کو سرنگوں ہو جائیگا۔

[illegible] بعمر [illegible] سال تخت نشین ہوا
[illegible] نے حاضر ہو کر قفل لگانے کی
درخواست کی۔ پھر کو لذریق طلسمی برج پہنچا۔
وہاں اس کے دل میں خیال آیا کہ قفل کھلوا کر
اندر دیکھنا چاہیے کہ کیا طلسم ہے جس میں قوطی نسل
کی سلطنت کے بقا کا راز ہے۔ ہر چند دربانوں
نے بادشاہ کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش
کی۔ مگر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ آخر زنگ خوردہ قفلوں
کو بادشاہ کے حکم سے کھولا گیا۔ بادشاہ نے اندر
قدم رکھا تو دیوار میں ایک آہنی بت ہاتھ میں
ایک گرز لئے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ لذریق ڈرا
مگر پھر ہمت کر کے بت سے کہا کہ میں برج کی
توہین کرنا ہرگز نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف
اس طلسم کے راز سے آگاہی ہے جس پر ہماری
سلطنت کے تحفظ کا دار و مدار سمجھا جاتا ہے۔ بت
خاموش ہو گیا۔ اور لذریق اندر گیا تو دیکھا کہ ایک کمرہ
میں ایک تخت بچھا ہے جس پر ایک قیمتی صندوقچہ
دھرا ہے۔ صندوقچہ پر لکھا تھا کہ اس کو صرف
بادشاہ وقت کھول سکتا ہے مگر اس کے کھولنے
سے وہ اپنی بربادی کو قریب لائے گا۔ لذریق
نے ہمت کر کے صندوقچہ کھولا تو اس میں سے
ایک جھلی نکلی جس پر متحرک تصاویر تھیں۔ بادشا
نے دیکھا کہ میدان جنگ کا نقشہ ہے۔ لذریق
اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہے اور ایک عمامہ
باندھنے والی قوم کا مقابلہ کر رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے
اس پر اجنبی قوم نے حملہ کر دیا۔ ایک آدمی نے اسے
قتل کر دیا۔ خود کو مقتول دیکھ کر لذریق زرد پڑ گیا۔ کاغذ
ہاتھ سے گر گیا۔ کمرہ سے بھاگا تو دیکھا کہ آہنی بت
غائب ہے۔ دربان مرے پڑے ہیں اور برج
کو آگ لگ گئی ہے۔ محل میں واپس آیا تو اسے
شہزادہ اطلغو کا خط ملا کہ ایک عمامہ پوش اجنبی
قوم نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ لذریق ایک لشکر
جرار لے کر وادی لکہ پہنچا۔ جہاں دس روز گھمسان
کا رن رہا۔ اور آخر لذریق حضرت طارقؒ کے ہاتھ
سے قتل ہوا۔ یہ تو روایتی قصہ ہے اب مصدقہ
تاریخی واقعہ بھی سن لیجئے۔

امیر المومنین حضرت عثمانؓ کی طبیعت میں
درگذر۔ نرمی متعلقین کے ساتھ نیک سلوک کا
مادہ بہت زیادہ تھا۔ ۲۶ھ میں خلافت عثمانی
کا دوسرا سال تھا۔ مصر میں حضرت عمرو بن العاص
گورنر تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے عمرو بن العاصؓ
کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد المعروف ابن ابی
سرح کو گورنر مقرر کر دیا۔ عبداللہ بن سعد حضرت
عثمانؓ کے رضاعی بھائی تھے اور حضور سرور کائنات
کے عہد مبارک میں ایک بار مرتد ہو کر پھر مسلمان ہوئے
تھے۔ پہلے آپ نے عبداللہ کو مصر کا عامل اور
افسر خزانہ مقرر کر کے بھیجا۔ اور عمرو بن العاص کو

(TOLEDO)

(GOTHIC)

رہے اور بالآخر اسٹیشن پر رخصت کر کے وداع
ہوئے۔ فاروق عمر میں مجھ سے ۵۔۶ سال چھوٹا ہے
مگر کروڑوں روپیہ کا کاروبار سنبھال رکھا ہے۔
ان کے والد صاحب خان بہادر میاں مہر بخش صاحب
بمبئی کے ممتاز ترین تاجر اور مخیر ترین بزرگ تھے۔
بمبئی کے مشہور تاجر سیٹھ چھٹانی کی ساری جائداد
کروڑوں میں خرید کر کے اُس کا دیوالیہ کر دیا تھا
اور پھر کئی لاکھ روپے ازراہِ مروت اُسے معاف
کر دیے تھے کہ وہ پھر اپنا کاروبار ازسرِنو شروع
کرے۔ ان کے چچا خان بہادر میاں فضل الٰہی کلکتہ
میں (EX-SHARIF) ہیں اور ایک امرتسر
کے چمڑے کے چوٹی کے تاجر۔

پنجاب اور بمبئی کے لوگوں کا اس قدر
تفاوت اخلاق دیکھ کر وہاں سے طبیعت ایسی برگشتہ
ہوئی کہ عباس کے ملنے کے بعد مجھے بمبئی کی کوئی چیز
بھلی معلوم نہ ہو سکی۔

آفیسر کمانڈنگ مسٹر ہیم ایک روز ہمیں
بندرگاہ کے اُس مقام پر لے گئے جہاں جہازوں
کی مرمت ہوتی ہے اس جگہ کو جہاں پر جہاز مرمت
ہوتے ہیں۔ "آرسنل" کہتے ہیں (ARSENABLE)
یہ لفظ دراصل عربی کے لفظ دار الصناعۃ سے مشتق
ہے۔ جب ۹۲ھ میں عربوں نے اندلس پر حملہ کیا۔
اور ایک علیحدہ خلافت کی بنا ڈالی تو یہ لفظ ساحل
عرب سے یورپ پہنچا۔ پہلے پہل اطالیوں نے
یہ لفظ سُنا تو انھوں نے اپنے لب و لہجہ میں اسے
(DARSENA) کے طور پر ادا کیا۔ اور
اہلِ اسپین اور اہلِ پرتگال بھی اسے "ڈارسینا"
کہتے تھے۔ مگر جوں جوں یہ لفظ اپنے وطن سے
دور ہوتا گیا لب و لہجہ کی تفریق سے یہ بگڑتا گیا
ڈارسینا سے یہ (TARZANA) "طارزانا"
اور پھر (ARZANA) بنا اور اب "آرسنل"
بن گیا۔ اس لفظ سے معاً یہ خیال اسلام کے
اُس متاعِ برباد کی طرف منتقل ہو گیا۔ جس میں
ہم نے قریباً ۹ سو سال حکومت کی۔ سب سے
پہلے ۷۱۰ء مطابق ۹۱ھ میں طریف بن ابو زرعہ
کو موسیٰ بن نصیر گورنر شمالی افریقہ نے ولید بن
مالک خلیفہ دمشق کی اجازت سے ۴ سو جانبازوں
کے ساتھ ساحلِ اندلس پر بھیجا۔ ان میں ۳۰۰
پیدل اور ۱۰۰ سوار تھے۔ وہ جس مقام پر اُترا
وہاں پر اب ایک گاؤں طریفہ نام سے آباد ہے
ماہِ رمضان ۹۱ھ میں وہ واپس چلا آیا۔ دوسرے
سال ماہ رمضان میں حضرت طارق رحمۃ اللہ علیہ
نے بحر زقاق عبور کر کے موسیٰ کے حکم سے
سات ہزار فوج ساحلِ اندلس پر اتاری۔ جس مقام
پر حضرت طارقؒ اُترے وہاں پر سب سے
پہلے مسجد تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ اور پھر ان جہازوں کو

اور سردار ہیں۔ سردار صاحب امیر محمد یعقوب خاں صاحب والیٔ کابل کے سگے نواسے اور گورنر گونبد کے صاحبزادے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک دوست ابوبکر صاحب کو تار دیا کہ میرے لئے کسی ہوٹل میں رہائش کا انتظام کر چھوڑیں۔ اُن کے یہ دوست چنیوٹ ضلع جھنگ (پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ بمبئی میں چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور اُن دنوں منصوری تفریح کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہوٹل کی بجائے مجھے اپنے پاس ٹھیرایا۔ یہ چند روز اس قدر خلوص سے تواضع کی کہ مجھے زندگی بھر کے لئے شرمندۂ احسان کر دیا۔

بمبئی میں میں نے انہیں ٹیلیفون کر دیا۔ ابوبکر صاحب کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی فاروق صاحب موجود تھے۔ وہ تشریف لائے اور وہاں جس مہربانی کا سلوک انہوں نے میرے ساتھ روا رکھا اُسے عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔ پہلے تو اپنے پاس ہی ٹھیرنے کو مجبور کیا اور سارے وفد کے وہاں پر ٹھیرنے کا انتظام کر دیا مگر میں نے منظور نہ کیا۔ میں زمانہ طالب علمی میں ایک ہفتہ وار مجلہ "ادا کار" لاہور میں آنریری مدیر ہوا کرتا تھا اب اس اخبار کو اس قدر وسعت اشاعت حاصل ہو گئی کہ انہوں نے اپنا ایک برانچ آفس بمبئی کھول دیا۔ انہوں نے اپنی موٹر مجھے بمبئی کے قیام کے دوران میں عنایت کر دی تھی۔ اپنی ایک موٹر فاروق صاحب نے میری تحویل میں دیدی کہ جب تک بمبئی میں رہوں وہ میرے پاس رہے اور مجھے مجبور کیا کہ جتنے روز بمبئی میں قیام رہے میں ہر روز صبح شام کا کھانا اُن کے پاس کھایا کروں۔ تاہم بمبئی اپالو بندر سے ۸ میل پرے ہے۔ پٹرول کی دقت کو دور کرنے کے لئے ہر روز اپنی ایک نئی موٹر ارسال کرتے اور ہم ایک دن کے گشت میں اُس کے سارے کوٹہ کا پٹرول ختم کر دیتے۔

وفد کے اعزاز میں انہوں نے ایک نہایت پُرتکلف دعوت دی۔ جس میں بمبئی کے جملہ اخبار نویس اور سوداگران چرم کے علاوہ اپنے دوستوں کو بھی مدعو کیا۔ ان چند دنوں میں بمبئی کا کوئی ایسا ہوٹل ہوگا جس میں وہ ہمیں کسی تواضع یا ضیافت کی تقریب پر نہ لے گئے اور کوئی تفریح گاہ یا سینما ایسا نہ تھا جہاں پر انھوں نے ہمیں مدعو نہ کیا ہو۔ اس پیکر خلوص اور ہیکل محبت انسان کا اگر شکریہ ادا کروں تو الفاظ بااندازہ تاثر کہاں سے لاؤں۔ ایک سرسری تعارف پر انہوں نے میری اس قدر تواضع کی اور اس اخلاص اور محبت سے پیش آئے کہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ میں جتنے روز بمبئی رہا فاروق صاحب اپنا کاروبار چھوڑ کر میرے ساتھ

بمبئی ایک کاروباری شہر ہے اور یہاں
کے لوگوں کی ذہنیت بھی کاروباری ہے ہر شخص
سڑک پر دوڑتا نظر آتا۔ یہاں پر بچپن میں چلنا سکھلایا
ہی نہیں جاتا۔ میرے خیال میں یہاں پر باپ بیٹے
اور بہن بھائی کے تعلقات بھی کاروباری قسم کے
ہوں گے۔ اخلاص اور مہمان نوازی تو ان لوگوں کو
دور سے بھی نہیں چھو گئی۔ یہاں پہ میرے ایک
بچپن کے قلمی دوست مسٹر عباس ناخدا تھے۔
عباس صاحب ۱۹۲۷ سے میرے دوست تھے
اور متواتر ۱۹۳۹ تک ہم سینکڑوں نہیں ہزاروں
خطوط تبدیل ہوئے۔ اب وہ ۔ ۔ جے ہسپتال میں
اسسٹنٹ سرجن ہیں۔ مجھے ان کے تلاش کرنے
میں بڑی دقت ہوئی۔ ملا کبری ایک بمبئی کے مشہور
جراح لاہور سے ہمارے ہم سفر تھے۔ انہوں نے
کمال مہربانی مجھے اُن تک پہنچایا۔ میں نے عباس
صاحب سے جب اپنا تعارف کرایا تو نہایت انداز
ملوکانہ میں فرمایا کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں
میرے پاس صرف ۵ منٹ وقت ہے۔ میں اُن کے
اس تپاک پذیرائی سے بہت مایوس ہوا اور میں نے
کہا کہ آپ مجھ پر یہ کرم فرمائی کریں کہ کل دوپہر کا کھانا
میرے ہاں کھائیں۔ فرمایا کہ نہیں، مجھے کل بالکل
فرصت نہیں میں نے عرض کی کہ خیر پرسوں سہی انہوں
نے میرا اڈریس لیا اور پرسوں ۱۔۳۰ بعد دوپہر کا
وعدہ کر کے مجھے رخصت فرمایا نسل انسانی کے
اس شریف پیکر نے اتنا بھی تو نہ پوچھا کہ کیونکر آنا
ہوا کب جاؤ گے۔ اور نہ ہی مجھے بیٹھ جانے کیلئے
کہا۔ خیر پرسوں آئی۔ مجھے اسی صبح کو وفد کو لے کر
ایک جہاز کے عرشہ پر جو کئی میل سمندر میں ساحل
سے دور کھڑا تھا جانا تھا۔ اپنے چپراسی کو ہدایات
دیں اور اُسے عباس صاحب کی پذیرائی کیلئے
اپنے کمرہ میں چھوڑا اور چلا گیا۔ واپسی پر ہماری لانچ
لوٹ فیل ہو گئی۔ اور مجھے ہوٹل واپس آنے میں
پندرہ منٹ دیر ہو گئی۔ آنے پر معلوم ہوا کہ عباس
صاحب تشریف لائے تھے۔ تین منٹ میرا انتظار
فرمایا اور ملازم کو یہ کہکر کہ میرا انہوں نے بہت
انتظار کر لیا ہے چلے گئے۔ یہ ۱۳ سالہ دیرینہ دوستی
اور تعلق کا سلوک تھا جو مجھ ایسے بندۂ خلوص سے
روا رکھا گیا۔

برسبیل تذکرہ اب پنجاب کے دوستوں کا
بھی ذرا حال سن لیجئے۔ پچھلے سال میں ۵ ایوم کیلئے
گرمیوں میں تبدیل آب و ہوا کے لئے شملہ جا رہا تھا
راستہ میں امرتسر کے اسٹیشن پر مجھے میرے عزیز
دوست سردار تیمور شاہ صاحب مل گئے اور ایک
دن کے لئے اپنے پاس ٹھہرانے پر مجبور کر لیا۔ تیمور شاہ
صاحب کے لئے میں نے دوست کا لفظ استعمال
کیا حالانکہ ہم پٹھانوں کے لئے وہ ہمارے آقا

شاید غالب نے "ہائے اُس چارہ گر کپڑے کی قسمت
غالب" اسی باتھ کاسٹیوم کے متعلق کہا تھا۔

ہمارے قیام کا بندوبست "تاج" میں
جگہ نہ مل سکنے کے باعث اپالو بندر پر دوسرے
تیسرے نمبر کے ہوٹل میجسٹک میں تھا۔ ہوٹل کے
سامنے ٹرام ٹرمینس اور دائیں طرف بحیرۂ عرب کی
بسیط سطح اپنے نظارہ کے اعتبار سے بہت اچھی
جگہ تھی۔ مگر ان انگریزی ہوٹلوں میں جس وضع قطع
کے لوگ میرے ساتھ تھے۔ اُن کا قطعاً گذارا
نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ یہاں کے دیہاتی
زمیندار لوگ تھے جن کی وضع قطع اس ہوٹل میں
ایک عجوبہ تھی اور بارہا جب ہم کھانا کھانے کیلئے
کھانے کے کمرے میں جاتے تھے تو سب فوجی افسر
بہت حیرت اور تعجب سے سارا وقت ہمیں تکتے
تھے۔ ان صاحبان نے چھری کانٹے سے شاید
کبھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اس لئے سب کے ہاتھ
میں کانٹا دائیں ہاتھ میں اور چھری بائیں ہاتھ میں
رہتی تھی۔ پہلے دن میں نے انہیں سمجھایا مگر وہ کہتے
تھے کہ بائیں ہاتھ سے کھانا شرع شریف کے خلاف
ہے اور پھر فتویٰ دیا کہ چھری کانٹے سے کھانا بھی
خلاف شریعت ہے۔ چنانچہ بعد میں ہاتھوں سے
کھانا شروع کر دیا۔ ایک روز ایک صاحب کا کانٹا
اس زور سے اُچھلا کہ دور کی ایک میز صاحب کی
کھانے کی پلیٹ میں جا پڑا۔ اور پھر یہ صاحب
اٹھ کر گئے۔ اور اس کی پلیٹ میں ہاتھ ڈال کر
اپنا کانٹا اٹھا لائے۔ اور پھوٹے منہ معذرت
تک نہ کی۔ یہاں پر پنجاب میں چونکہ دودھ، مکھن
بافراط ہوتا ہے اس لئے زمیندار لوگ خالی مکھن
بغیر کسی چیز پر لگائے کھا لیتے ہیں۔ چنانچہ پہلے
روز کھانے کے ساتھ ٹوسٹ پر لگانے کے
لئے جب مکھن کی طشتری لائی گئی تو ایک صاحب
نے انگلیوں سے ڈیڑھ چھٹانک مکھن نکال کر
منہ میں ڈال لیا۔ اور انگلیاں چاٹنی شروع کر دیں
بیچارے ہوٹل کے بیرے ششدر رہ گئے۔

دودھ چائے میں اس قدر ڈالتے تھے کہ ہم سب
کا دودھ صرف ایک صاحب کے لئے بمشکل مکتفی
ہوتا تھا اس۔ لئے ہوٹل کے منتظمین کو ہمارے لئے
ایک بڑا جگ دودھ کا بھر کر رکھ دینا پڑتا۔ ایک
صاحب ایک روز صبح کے ناشتے پر ڈیڑھ سیر دودھ
پی گئے۔ ہوٹل والوں نے بھی دودھ میں خوب پانی
ملا کر دینا شروع کیا۔ وفد کے اعزاز میں نیوی کے
کئی جہازوں پر دعوت کی گئی۔ اور مجھے ہر بار
کہنا پڑتا تھا کہ ان صاحبان کے لئے پنجابی کھانا
تیار کیا جائے۔ مگر یوں ہر لحاظ سے ممبران وفد کا
رویہ قابل تعریف رہا۔ اور اعزاز کی سب تقریبوں کو
انہوں نے بہت اچھی طرح نبھایا۔

گرخرام ناز کی مستانہ لغزشوں کا ہجوم اور "شریر آنکھوں میں سوبجلیاں بسائے ہوئے" اور یہ

وہ ہر نظر میں کوئی ماجرا طرازادا
وہ ہر ادا میں کوئی راز ہے چھپائے ہوئے

کی شان، تنوع بھی درخور تماشا تھیں۔ "باغ معلق" کو جب میں نے پہلے پہل ۱۹۳۶ میں دیکھا تھا تو میں سمجھتا تھا کہ غالباً ہندوستان میں یہ باغ نادر سے ہوگا۔ مگر زندگی کی پُرشور منزلیں طے کرنے کے بعد اب کے جو دیکھا تو میری رائے میں کسی دیہات کی پُرسکون آبادی کے کونہ پر درختوں کے جھنڈ کی گھنیری چھاؤں اس سے کئی گنا زیادہ جذبات آفریں اور طمانیت بخش ہے۔

"چوپاٹی" اور "میرین ڈرائیو" پر بجلی کے قمقموں کی بہار کسی زمانے میں اس قدر دامن کش نظارہ تھی کہ میں گھنٹوں دیوانوں کی طرح یہاں پر پھرا کرتا تھا۔ اب کی بار جب کبھی یہاں سے گذر ہوا آنکھیں بند کر لینے کو جی چاہتا تھا۔

"جوہو بیچ" اور "اپالو بندر" سمندر کے نظارے کے لئے ایک زمانہ میں مجھے اس قدر پسند تھے کہ میں انھیں "فردوس بر روئے زمین" تصور کرتا تھا مگر اب کے مجھے ان جگہوں سے گھن آتی تھی۔

بمبئی ایک ساحلی شہر ہے اور دساور کی ہر رسم قبیح سب سے پہلے یہاں پر پہنچتی ہے اور پھر یہ جراثیم ہندوستان بھر میں سرایت کر جاتے ہیں۔

موجودہ جنگ کے تباہ کن اثرات جہاں اور سینکڑوں ہیں وہاں اخلاق باختگی کے جراثیم سب سے زیادہ مہلک ہیں اور موجودہ بمبئی میں تو یہ وبا اتنی زوروں پر تھی کہ اللھم احفظنا۔

بمبئی کا شہر اس زمانہ کا بابل ہے جہاں پر ہر ملک۔ ہر مذہب۔ اور ہر رنگ اور ہر ملت کے لوگ ملتے ہیں۔ وہ اپنے اپنے ممالک کی برائیاں اور بھلائیاں ساتھ لاتے ہیں۔ انسانی فطرت برائی کے لئے بہت اثر پذیر ہے سڑکوں اور شاہ راہوں پر اس قدر عریاں اور ناموس رُبا نظارے دیکھنے میں آتے تھے۔ کہ باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ہندوستانی شرم وحیا کی ردا کی کوئی دھجی بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ جوہو بیچ پر فوجی سپاہیوں سے لنگیا ایک "باتھ کاسٹیوم" کے چارہ گرکپڑے میں اپنی ساری متاع شرم وحیا کو سمیٹے سینکڑوں میں ہزاروں ہندی خواتین داد عشرت دے رہی تھیں۔ پانی میں بھیگ کر اور جسم سے چمٹ کر یہ کپڑا جسم کے نشیب و فراز کو اور اجاگر کرتا تھا۔ پہلے زمانہ کے شعرا تو بند قبا کے اتفاقی کھل جانے پر یا ساعد وساق کی حکایت تخئیل پر مزے لیتے تھے۔ اور یہاں پر ساعد و ساق نہیں بغل اور رانوں تک عریاں تھیں۔

غرناطہ پر چند آنسو

جناب سردار کریم نواز خاں صاحب ایم۔ اے مجسٹریٹ (شیخوپورہ)

میں نے گزشتہ خط آپ کو مئی میں بمبئی سے
لکھا تھا۔ انڈین نیوی کی دعوت پر میں پنجاب سے ایک
وفد کا لیڈر بن کر آیا ہوں۔ اس سفر کی سرگزشت
شہاب کے لئے لکھوں گا۔ اور چنانچہ میں نے ساری
سرگزشت لکھ بھی ڈالی مگر حکومت کی طرف سے
اس کی اشاعت کی اجازت نہ مل سکی۔ اس لئے ایفائے
عہد کی معذوری کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔

رہا بمبئی کے شہر کا تذکرہ تو ناظرین شہاب
میں بہتوں نے اس "رہزن تمکین و ہوش" شہر کو بچشم
خود دیکھا ہوگا۔ اور پھر ایک شہر کے متعلق کسی رائے
کے اظہار میں انسان کے وقتی قلبی تاثرات کو بہت
کچھ دخل ہے۔ ممکن ہے کہ مجھے جو چیز "دشمن ایمان و آگہی"
معلوم ہو رہی ہو کسی دوسرے کو اُس کے وقتی تاثرات
کے زیر اثر ذرا بھی جاذب توجہ معلوم نہ دے۔ اس
لئے بعض حکماء کا خیال ہے کہ زشت و خوب فی نفسہ
اپنے اندر نہ کسی خوبی اور نہ ہی کسی قباحت کا احساس
رکھتے ہیں۔ یہ سب انسان کے اپنے تخیل کی
تخلیق ہیں۔

بمبئی چند روز سیر کرنے کے لئے اچھا شہر ہے
اس کی فلک بوس عمارتیں اور کشادہ سڑکیں "بیبو رلے
نکولاس" کے لئے اپنے اندر کوئی آرٹ نہ رکھتی
ہوں مگر میرے ایسے دیہاتی آدمی کے لئے ضرور
دلچسپ تھیں۔ وہاں کے سفید بھرے بھرے چہرے
ہر چند اپنے اندر مناسب جسمی کی کوئی خوبی نہ رکھتے ہوں

شہاب

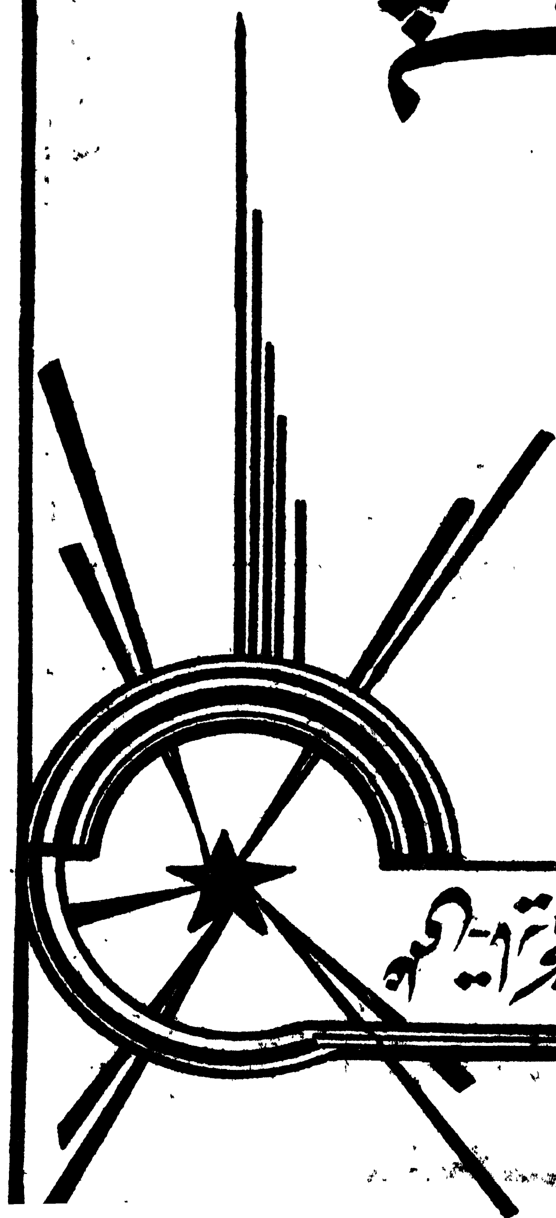
جلد (۱۴) بہمن ۱۳۵۵ف م دسمبر ۱۹۴۵ء نمبر (۳)

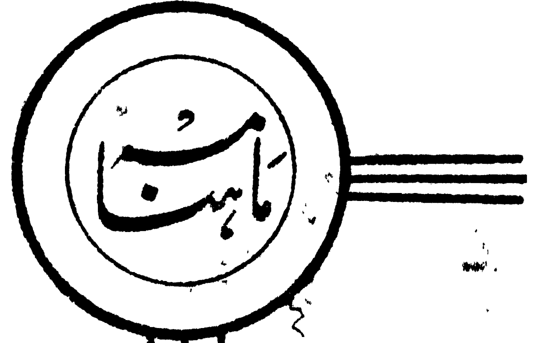
سالانہ چندہ (ص)

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

نمبر شمار	عنوان	نام مضمون نگار	صفحہ
۱	غرناطہ پر سپید آنسو	جناب سردار کریم نواز خاں صاحب ایم اے مجسٹریٹ شیخوپورہ	۱
۲	آنسو	″ شوکت علی خاں صاحب ایم۔ اے	۱۷
۳	یہ کیا	″ آل رضا صاحب رضا لکھنو	۲۴
۴	فکر و نظر	″ میر احمد علی صاحب مجاہد	۲۵
۵	لاٹری	″ فریدہ۔ بی۔ اے	۳۱
	ناہید		
۶	نو جوت	نیرہ بانو کاوس جی	۳۵
۷	تاثرات	شمع سحر	۳۷
۸	کہا میرا مان	رحیم النساء رفیق	″
۹	شیطان	سلطانہ عزیز بی۔ اے	۳۸
۱۰	آنسو	ساجدہ احمد محی الدین	۴۱
۱۱	روزنامچہ	[illegible]	۴۲
۱۲	غزل	سیدہ مظہری۔ اے	۴۳
۱۳	پک نک	شاہدہ	۴۴
۱۴	ترغیب	[illegible]	۴۵
۱۵	عیسیٰ	نغمہ سہروردی	۴۶





شہاب

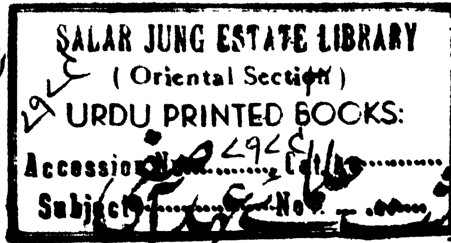
شہاب

جلد ۳ اسفندار ۱۳۵۴ف م جنوری ۱۹۴۵ء نمبر ۴

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے چندہ سالانہ للعہ — گورنمنٹ سے غ



سرگذشت علمائے عہد آصفی

جناب محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی

یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ سلاطین، امراء، اولیاء اور شعراء کے متعلق تاریخیں، سوانح عمریاں، سیر اور تذکرے ہر زمانہ میں لکھے جاتے رہے ہیں، اس لئے ان میں سے جب کسی کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں زیادہ دقت اور دشواری نہیں ہوتی، مگر اس کے برخلاف جب نثر نگار یا علماء کے حالات کی جستجو ہو تو بڑی پریشانی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے مکمل حالات دستیاب نہیں ہوتے، اپنے سلف کے حالات سے باخبر رہنا ہر متمدن قوم کا فریضہ ہے، اس لئے ہمارا ارادہ ہے کہ "علماء عہد آصفیؒ" کے حالات قلمبند کریں۔

آصفی عہد کے علماء کو ہم حسب ذیل پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:۔

۱- پہلا دور قیام سلطنت آصفیہ سے آصفجاہ ثانی کے انتقال تک (۱۱۳۶ھ تا ۱۲۱۶ھ)

۲- دوسرا دور آصفجاہ ثالث کی حکمرانی سے آصفجاہ خامس کے انتقال تک (۱۲۱۸ھ تا ۱۲۸۴ھ)۔

۳- تیسرا دور آصفجاہ سادس کی مسند نشینی سے انتقال تک (۱۲۸۴ھ تا ۱۳۲۹ھ)۔

۴- چوتھا دور عہد عثمانی میں انتقال کردہ علماء۔

۵- پانچواں دور عہد عثمانی کے موجودہ علماء

اگرچہ ان ادوار کے پورے علماء کے تفصیلی حالات کی ہمیں اچھی طرح اطلاع نہیں ہے لیکن بیسیوں علماء کے ناموں سے ہم واقف ہیں سردست ہم صرف ہر دور کے دس دس علماء کے حالات قلمبند کریں گے۔ اس طرح ہمارا یہ مضمون پچاس علماء کے حالات پر مشتمل ہوگا۔

اس موقع پر ہم ان ارباب کمال کو نظر انداز کردیں گے جو شان امارت کے ساتھ ساتھ علم و فن سے بھی پوری طرح آراستہ تھے، اگر وہ ایک طرف عالم متبحر تھے تو دوسری طرف تدبر و سیاست کے لحاظ سے بھی سرآمد روزگار تھے۔ اور انہوں نے اپنے علمی حیثیت کے قطع نظر سیاسی حیثیت سے زیادہ شہرت اور نام آوری حاصل کی تھی۔ مثلاً عبد الرزاق خاں صمصام الملک

غلام سید خان ارسطو جاہ، ابوالقاسم میر عالم وغیرہ، لیکن ان علماء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو شاہی قربت یا شہزادگان شاہی کی اتالیقی وغیرہ کی حیثیت سے دولت علم وفضل کے ساتھ شان امارت بھی رکھتے تھے اور بعض خطابات سے بھی سربلند ہوگئے تھے مثلاً شیخ الاسلام خان، مولینا غلام علی آزاد، مولوی انوار اللہ خان فضیلت جنگ علامہ شوستر سناد الملک وغیرہ۔

امید ہے کہ علماء عہد آصفی کے حالات کی یہ کوشش جو نقش اوّل کی حیثیت رکھتی ہے، دلچسپی سے دیکھی جائے گی۔

پہلا دور

۱۱۳۶ھ تا ۱۲۱۵ھ

یہ دور اسی سال کے طویل زمانہ پر مشتمل ہے، اس عرصہ میں خانوادہ آصفی کے پانچ افراد یکے بعد دیگرے مسند حکومت آصفی پر جلوہ گر ہوئے۔ گو ان میں سے نواب ناصر جنگ اور مظفر جنگ کا زمانہ حکومت مختصر ہے۔ اس طویل عرصہ میں نہ معلوم کتنے علماء اور فضلا، ہندوستان کے اطراف وجوانب سے دکن میں آکر بود وباش اختیار کرلی اور کتنے علماء ایسے تھے جن کو سرزمین دکن نے پیدا کیا۔

حضرت آصفجاہ اول ایک صاحب علم و فضل خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کے اجداد میں کئی ایک افراد اپنے تبحر علمی کے باعث ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بانی خاندان سہروردیہ اپنے زمانہ کے صاحب ارشاد وہدایت تھے، آپ کے اولاد میں "عالم شیخ" جو خواجہ عابد خاں کے والد ماجد تھے۔ سمرقند کے مشہور عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ بادشاہ توران نے آپ کو "علم العلماء" کے خطاب سے سربلند کیا تھا[1]۔

عالم شیخ کے فرزند خواجہ عابد خاں نے اپنے والد اور علماء سمرقند سے اکتساب علم کیا اور بخارا تشریف لے گئے وہاں "قاضی القضاۃ" کے خدمت سے سربلند ہوئے اور پھر عہدہ شیخ الاسلامی پر فائز ہوئے، اس کے بعد شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوستان آکر منصب شش ہزاری سے سرفراز ہوئے۔ شہزادہ اورنگ زیب کے پاس متعین کئے گئے، اور عالمگیری عہد میں عہدہ صدارت کل پر ممتاز ہوئے،

---

[1] حدیقۃ العالم جلد ۲ ص ۱۳

جو علمی حیثیت سے بہت بڑی خدمت سمجھی جاتی تھی، اور انہی اصحاب کو یہ عہدہ دیا جاتا تھا جو تبحر علمی کے لحاظ سے سرآمد روزگار رہوتے تھے۔[۱]

خواجہ عابد خاں کے فرزند میر شہاب الدین خاں بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح زیور علم و ہنر سے آراستہ تھے۔ اپنے چچا بہاؤ الدین خان سے آپ نے اکتساب علم کیا تھا، اور ہندوستان آنے کے پیشتر سمرقند کے قاضی بن چکے تھے،[۲] آپ ۱۰۸۰ھ میں سمرقند سے ہندوستان آئے۔[۳]

عالمگیری عہد میں خدمات جلیلہ کو انجام دے کر نام آوری حاصل کی، غازی الدین خان فیروز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ عالمگیر خلد آشیانی کو آپ کے مراتب کا خاص لحاظ تھا چنانچہ آپ کی بیماری میں جو عنایت نامہ صادر ہوا تھا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے عالمگیر کو آپ کا کتنا لحاظ تھا۔

من میخواستم کہ برائے عیادت آں دولتخواہ خود	میں نے چاہا خود آپ کی عیادت کو آؤں
بیایم، امّا بچہ امروکدام نظر مشاہدہ نمایم۔ لہذا سیادت خاں را فرستادیم	لیکن میں آپ کو کس طرح اور کس نظر سے دیکھ سکتا ہوں۔ اس لئے سیادت خاں کو روانہ کر رہا ہوں
تاکہ بہ چشم ما بہ بیند، و اظہار مافی الضمیر ما کند۔ و از میوہ ہائے نورس انچہ بہم رسید انگور است، ما اطبائے یونانی برائے آں عمدہ مخلصان مزاج ان مضر میگویند، لہذا ما ہم برخود ناگوار کردیم۔ انشاءاللہ تعالیٰ بعد صحت کامل و شفا عاجل یکجائی خوریم	تاکہ میری آنکھوں سے دیکھے اور اظہار حال کرے جو تازہ میوہ مل رہا ہے وہ انگور ہے لیکن یونانی اطباء اس کو عمدہ مخلصاں کے لئے مضر بتاتے ہیں۔ لہذا میں نے بھی اس کو ترک کر دیا ہے، انشاءاللہ تعالیٰ آپ کے اچھے ہونے کے بعد ساتھ مل کر کھائیں گے۔ اے
یارب ایں آرزوئے من چہ خوشست تو بدیں آرزو مرا برساں[۱]	خدا میری آرزو کتنی اچھی ہے تو میری اس خواہش کو پوری کر۔

فیروز جنگ کو شعر گوئی میں بھی مہارت تھی کبھی کبھی مشق سخن فرماتے تھے۔[۲]

[۱] حدیقۃ العالم جلد ۲ صـ۳۱-۳۲
[۲] مقالہ سید علی محسن صاحب
[۳] حدیقۃ العالم جلد ۲ صـ۳۳

[۱] حدیقۃ العالم جلد ۲ صـ۱۱۷
[۲] حدیقۃ العالم جلد ۲ صـ۱۲۲

حضرت آصفجاہ کے نانا سعد اللہ خان وزیر اعظم شاہجہاں تھے، جو اپنے علم و فضل، رسائی عقل، راستی و دیانت اور امانت کے باعث مشہور و معروف تھے اور اپنے فضل کمال کے باعث ترقی کرتے ہوئے خدمت جلیلہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تھے[1]

اس طرح آصفجاہ اول نے اپنے ددھیال اور ننھیال دونوں جانب سے علم و فضل کو ورثہ میں پایا تھا۔ بچپن سے آپ کی تعلیم کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ اس تعلیم اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ آپ اپنے زمانہ کے ایک نامور حکمران ہی نہیں بلکہ صاحب علم و فضل اور علم پرور و علم نواز حکمران کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ آپ اپنے خاندانی روایات کے بموجب مختلف علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے، فارسی اور عربی کے ساتھ ترکی زبان میں بھی عبور حاصل تھا[2]۔ فارسی میں شعر بھی موزوں کرتے تھے اور شاکر تخلص تھا پھر آصف تخلص فرمالیا[3]

حکمرانی کے بعد بھی آپ کو علم و فن سے پوری دلچسپی رہی مہمات سلطنت کے ساتھ ساتھ علمی مشاغل برقرار رہے، چنانچہ آپ کے روزانہ مشاغل میں اہل علم و فضل کے ساتھ مصروف کلام رہنے کا ایک خاص وقت مقرر تھا۔ عموماً صبح کی نماز تلاوت کلام مجید اور سماعت حدیث کے بعد علما، صلحا، فقراء و مشائخین سے ہم کلام رہتے تھے۔ اسی وقت کبھی کبھی شعر و سخن سے بھی دلچسپی لیا کرتے۔ آپ مدحیہ قصائد سے خوش نہیں ہوتے تھے، لیکن اشعار قابل قدر ہوں تو ضرور صلہ عطا فرماتے، اہل علم و فضل کو دوست رکھتے اور ان کو اپنے مجلس میں ہمیشہ باریاب رکھتے تھے[1]۔ آپ کے دربار میں جو علما اکثر باریاب رہا کرتے ان میں سے بعض یہ ہیں، سید رضی شوشتری المتخلص بہ اقدس (میر عالم کے والد) موسوی خان جرات جو آپ کے دار الانشاء کے انچارج تھے۔ مولوی قمرالدین جو بہت بڑے عالم تھے۔ شیخ اسلام خان، نعمت علی خان ایجاد، قاضی خلیل وغیرہ۔ آپ کی علم دوستی اور شغف علمی کا پتہ اس سے بھی ملتا ہے کہ آپ نے اپنے فرزندوں کے تعلیم کے لئے قابل قابل اشخاص کو مقرر فرمایا تھا[2]

۱- حدیقۃ العالم جلد ۲ ص ۱۱
۲- مقالہ سید علی محسن صاحب
۳- حدیقۃ العالم جلد ۲ ص ۱۸۱

۱- حدیقۃ العالم جلد ۲ ص ۱۸۱، ۱۴۲
۲- ۵ تا ۶ حدیقۃ العالم ج ۲ ص ۱۸۱

حضرت آصفجاہ کے جانشیں نواب ناصر جنگ بھی اپنے باپ دادا کی طرح صاحب علم و فضل تھے بچپن سے آپ کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ قابل قابل اشخاص آپ کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے تھے جس کی وجہ سے آپ نے ان تمام علوم سے آگاہی حاصل کرلی جن کی ضرورت رؤسا کے لئے لازمی تھی[1]۔ آپ کی علم دوستی کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی ہمیشہ سفر و حضر میں آپ کے ہمراہ رکاب رہا کرتے تھے، صمصام الملک مولوی عبد الرزاق جیسا فاضل شخص آپ کی دیوانی پر فائز تھا[2]۔ حافظ محمد اسعد مکی جو علم حدیث اور فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کے حاشیہ نشیں تھے[3]۔ مولانا آزاد نے آپ کی قابلیت علم و فضل کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔ اور آپ کی شاعری کی بڑی داد دی ہے[4]۔ لالہ سارام بھی آپ کے استادوں میں شامل تھے[5]۔

نواب صلابت جنگ اور نواب نظام علی خان آصفجاہ ثانی جو یکے بعد دیگر دکن کی مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے حضرت آصفجاہ اول کے فرزند تھے، حضرت آصفجاہ نے ناصر جنگ کی طرح اپنے دوسرے صاحبزادوں کی تعلیم کے لئے خاص انتظام فرمایا تھا۔ چنانچہ حافظ عبد الرحیم صلابت جنگ کی تعلیم کے لئے[1] اور شیخ محمد جمیل اور خوش حال بیگ خان بدخشانی آصفجاہ ثانی کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ محمد جعفر خطاطی کی مشق کراتے تھے[2]۔

نواب نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے زمانہ حکومت ۱۱۷۵ھ سے شروع ہوتا اور ۱۲۱۸ھ پر ختم ہوتا ہے[1]۔ اس (۴۳) سال کے عرصہ میں بیسیوں علماء اور فضلاء، اورنگ آباد اور حیدرآباد میں مسند علم و فضل پر متمکن ہوئے۔ چونکہ آپ نے اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد کو اپنا دار الحکومت قرار دیا تھا، اس لئے اب حیدرآباد میں ارباب علم و ہنر جمع ہونے لگے، مصنف گلزار آصفی نے کئی ایک علماء اور مشائخین کے حالات قلمبند کئے ہیں، جن میں سے کئی مسند ارشاد اور ہدایت پر متمکن تھے، سلوک[3] اور طریقت کے مدارج طے کر چکے تھے اور کئی علماء

---

[1] تا [3] حدیقۃ العالم ج ۲ ص۱۸۵

[4] تا [5] حدیقہ ج ۲ صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷ و سرو آزاد و ناصر جنگ

[1] مقالہ سید علی محسن صاحب بحوالہ ماثر نظامی

[2] گلزار آصفی ص۳۶۹ تا ص۲۲۵

ایسے تھے جو علوم دینی سے آراستہ تفسیر، حدیث اور فقہ کے امام وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ بیسوں ارباب کمال ایسے تھے جو علوم معقول اور منقول میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ فلسفہ، منطق ریاضی اور ہئیت سے بخوبی واقف تھے، بیسوں اصحاب خوش نویسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، کئی حکما اپنے فن کی یکتائی کے ساتھ طب کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے[1]۔ اس زمانہ میں مصوری، موسیقی سے بھی لوگوں کو شغف تھا۔ اور اس طرح فنون لطیفہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی[2]۔

بہرحال دور اولی میں اصحاب علم وفن اور ارباب فضل وکمال کی کمی نہیں تھی، ہم اپنے محدود معلومات کے لحاظ سے بھی سوسوا سو اصحاب کے نام پیش کرسکتے ہیں مگر سردست اس کا موقع نہیں ہے۔ لہذا ہم حسب صراحت بالا صرف اس علما، کے حالات پیش کریں گے ۔

[1] گلزار آصفی صفحہ ۳۶۸ تا ۴۴۵

[2] محبوب الزمن صفحہ ۱۱۸

غزل

جناب مسلم صاحب

بسکہ محوئے جلوۂ آں شوخ دلداریم ما
عذر بیکاری بدنیائے عمل آریم ما

نقش حیرت کرد ما را نقشۂ دنیائے دوں
تختہ بند نیک بد با حالت زاریم ما

فیض وحشت ہیں کہ با وصف گرفتار خودی
زندگی با زلف او وابستہ میداریم ما

قرب و بعد یار را تشریح دو حرف است بس
گاہ مست جام دوئے او گاہ بیداریم ما

چشم نکشائیم غیر از جلوۂ تمکین یار
سادگی ہا را چہ پرسی سادہ پرکاریم ما

ننگ بدمستی ما در پاکبازاں تازہ نیست
از ازل وارفتہ و بدمست سرشاریم ما

رحمت آمرزگار عاصیاں را مژدہ باد
مسلما در ظاہر و باطن گنہ گاریم ما

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

اخبار میزان مورخہ ۳ آذر ۱۳۵۴ف میں عبدالقیوم خاں باقی کے نام سے ایک نظم طبع ہوئی ہے جس کا عنوان "ناکامی۔ گاندھی جناح ملاقات کے خاتمہ پر" اس نظم کو بغور پڑھنے کے بعد میں یہ بدگمانی کرکے گنہ گار ہونا نہیں چاہتا کہ اس کے مصنف درحقیقت مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی یم۔اے اردو لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی ہی ہیں بہت ممکن ہے کہ ہم نام کوئی اور نوجوان شاعر ہوں، بہرحال اس نظم میں جو شبہات ناشی ہو رہے ہیں اور جو عیوب نظر آرہے ہیں اون کو محض ادب اردو کی خدمت سمجھ کر ناظرین رسالہ شہاب کے ملاحظہ میں پیش کرتا ہوں اس امید پر کہ وہ خود اس کا اندازہ کرسکیں گے کہ اس کا مصنف کون ہے اور میرے خیالات و شبہات کس حد تک مبنی بر صحت ہیں۔

سودا نے اپنے زمانہ کے بعض خود ساختہ شاعروں کی نسبت کہا ہے ؎

یاں تلک رتبہ سخن پہنچا ۔۔۔ معنی لفظوں سے ہوتے ہیں رُوپوش

مگر بیسویں صدی عیسوی کے ترقی یافتہ زمانہ میں ادب و شعر کی یہ حالت بھی خواہان زبان اردو کی توجہ کے لائق ہے۔

سن لیا؟ ہنگامہ الفاظ کا حاصل ہے کیا ۔۔۔ سن لیا؟ انجام یک پیکار عقل و دل ہے کیا

دیکھا ارباب سیاست کی کوئی منزل ہے کیا ۔۔۔ دیکھا شمشیر محبت کا کوئی گھایل ہے کیا

قایدین قوم فتنہ زا کی دشواری ہے یہ ۔۔۔ ایک دو افراد کا انجام بیداری ہے یہ

ہنگامہ بمعنی مجمع و جمعیت مردم و معرکہ بازیگراں و قصہ خوانان و خواص گویان و امثال آن (برہان قاطع) ہنگامہ کا اطلاق صرف آدمیوں کے اجتماع پر ہوتا ہے۔ "ہنگامہ الفاظ" کہنا صحیح نہیں۔ مصرعہ ثانی میں "یک" حشو قبیح ہے۔ "پیکار عقل و دل" بھی یہاں بے محل ہے پیکار کے معنی ہیں جنگ لڑائی بحث تو گاندھی جناح ملاقات سے ہے "عقل و دل" مسٹر گاندھی اور جناح کے لئے نہ استعارہ ہے اور نہ ان دو قایدین کی ملاقات کو "پیکار" قرار دیا جا سکتا ہے۔ تیسرے مصرعہ میں استفہام

انکاری ہے "کوئی منزل ہے کیا" یعنی کوئی منزل نہیں ہے - ارباب سیاست کی منزل یعنی ارباب سیاست کا نصب العین نہ ہونا خلاف عقل اور لفظ منزل کا یہاں استعمال بے محل ہے حالانکہ اس ملاقات کا مقصد راز میں نہ تھا - "فتنہ زا" اسم فاعل ترکیبی - شر و فساد یا عشق و فریفتگی پیدا کرنے والا - معشوق کی آنکھ چال ڈھال اور ناز و ادا کے واسطے بھی بطور صفت اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے -

چشم است بخواب رفتہ گردوں　　باشوخی چشم فتنہ زا ئیش　　(صائب)

مگر شاعر نے قوم کو "فتنہ زا" کہا ہے یعنی ایسی قوم جو شر و فساد پیدا کرتی ہے - دو قابل احترام قائدین کی طرف اوس کی اضافت افسوس ناک جسارت ہے - "دشواری ہے یہ" سے کونسی دشواری مراد ہے شاعر کے ذہن میں اس دشواری کا وجود ہو تو ہو خارج میں اس کا نہ کہیں ذکر ہے نہ اشارہ -

ہائے کیوں اہل وطن خود ایک ہو جاتے نہیں　　اپنے انجام وفا سے آپ شرماتے نہیں
ہائے کیوں ارباب غم اب ہوش میں آتے نہیں　　ہائے کیوں سب مل کے اپنا آپ غم کھاتے نہیں
مدعی کیوں سست ہیں اور چست ہیں کیوں دو گواہ　　کیا ملے گی ہند کو اس طرح آزادی کی راہ

"ایک ہو جانا" متفق ہونے کے معنی میں فصحا کی زبان نہیں - مصرعہ ثانی میں بھی ایک لفظ "کیوں" کی ضرورت ہے جس کے بغیر استفہام کے معنی پیدا نہیں ہوتے - "وفا" کے معنی ہیں وعدہ پورا کرنا آخر وعدہ کیا تھا اوس کا انجام کیا ہے وعدہ وفا کر کے کوئی کیوں شرمائے یہ کیا معمہ ہے کچھ سمجھ میں نہ آیا "ارباب غم" یہاں بے محل لفظ ہے ارباب غم کو ہوش میں آنے سے کیا واسطہ ارباب غم بیہوش تو نہیں رہتے -

"ہوش میں آنا" کے دو معنی ہیں ایک بیہوشی رفع ہونا دوسرے معنی ہیں غفلت دور کرنا - ع

ہوش میں آتا ہے انساں مرگ انساں دیکھ کر　　یاد آتا ہے وطن گور غریباں دیکھ کر　　(ناسخ)

ارباب غم کے عوض ارباب غفلت کہتے تو مصرعہ با محاورہ ہونے کے علاوہ صنعت تضاد کا لطف بھی حاصل ہوتا - رع - ہائے کیوں ارباب غفلت ہوش میں آتے نہیں -

چوتھے مصرعہ میں "اپنا غم آپ کھانا" درست نہیں غم کھانے کے معنی ہیں صبر اور ضبط کرنا -

عجب نعمت عطا کی ہے خدا نے اہل عزت کو　　عجب یہ لوگ غم کھا کھا کے دل کو شاد کرتے ہیں　　(آتش)

ٹیپ کا شعر دو لخت اور مہمل ہے - واحد اور جمع ہر دو حالت میں مدعی کہیں گے اس لئے فعل بھی واحد ہونا چاہئے خصوصاً جب کہ بطور اسم جمع استعمال ہو - اس ملاقات میں مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح کی

حیثیت گواہ کی نہ تھی لہٰذا گواہ چست مدعی سست کا مقولہ بے محل استعمال کیا گیا۔

کہنہ سالوں نے جوانی کی امانت چھین لی تجربوں نے جوش وہمت کی قیادت چھین لی
بحث اور گفتار نے مرنے کی ہمت چھین لی قوم سے اک جہد آزادی کی عادت چھین لی
بار ڈالا دو دلوں پر اہل ہندوستان نے کیا کیا یہ اس طرح انسان سے انسان نے

کہن اور کہنہ مرادف الفاظ ہیں جس کے معنی ہیں پرانا۔ کہن مقابل نو گاہے برائے تعظیم چیز نیز استعمال کنند چوں نخل کہن سال (بہار عجم) اس سے ظاہر ہے کہ یہ لفظ بطور صفت یا حال استعمال ہوتا ہے مردم کہن سال کہہ سکتے ہیں صرف کہن سال نہیں کہتے۔۔ کہنہ سال" غلط اور اس کی جمع" کہنہ سالوں" اغلط ہے، "جوانی کی امانت" سے مصنف کی کیا مراد ہے یہ استعارہ یا کنایہ ہی نہیں فی الذہن شاعر اس کے کچھ معنی ہوں تو ہوں بظاہر مصرعہ ہی مہمل اور بے معنی ہے۔ واحد اور جمع ہر دو حالت میں تجربہ کہیں گے " تجربوں" کہنا صحیح نہیں۔ جوش اور ہمت کی قیادت تجربہ کرتا ہے تو یہ فعل لائق ستایش ہے نہ کہ قابل شکایت۔ تیسرے مصرعہ کی رکاکت محتاج صراحت نہیں صرف اس قدر عرض کرنا ضرور ہے کہ" بحث اور گفتار" مہمل ہے بحث اور تکرار یا بحث اور تمحیص کہنا چاہئے تھا مصرعہ کے وزن میں بھی فرق پیدا نہ ہوتا۔ چوتھے مصرعہ میں لفظ" اک" حشو قبیح وزن شعر کی خاطر ہے معنی اور مطلب میں اس کو کچھ دخل نہیں۔" جہد" یعنی کوشش جہد کی عادت مہمل۔ ہمت چھین لینا عادت چھین لینا دونوں غلط ہمت اور عادت کا نہ سرقہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ کسی سے چھین لینے کی چیز ہے۔ آخری شعر کی لغویت محتاج تصریح نہیں۔

اس طرح اہل وطن یہ بیدلی اچھی نہیں فصل آزادی کی یہ بے حاصلی اچھی نہیں
منطق اور قانون کی یہ سائلی اچھی نہیں بے لبسی اچھی نہیں یہ کاہلی اچھی نہیں
آؤ پھر اک اتحاد عقل و دل پیدا کریں آؤ پھر سینہ میں درد جاں گسل پیدا کریں

مصرعہ اولی میں" اس طرح اور یہ" کا اجتماع بے معنی ہے مگر کیا کیا جائے وزن شعر کی خاطر جا بیجا یہ۔ اس طرح۔ اک وغیرہ الفاظ کے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ آخر اشعار موزوں کیسے ہو سکیں گے۔
" فصل آزادی" کا اگر وجود نہیں ہے تو" بے حاصلی" کا شکوہ ہی بیجا ہے اور اگر فصل آزادی کا وجود ہے تو بے حاصلی کا ماتم غلط ہو جاتا ہے۔ سایل یعنی سوال کرنے والا اسم فاعل لیکن

یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کس قاعدے سے اسم فاعل کے ساتھ یائے معروف کا الحاق جائز ہے معلوم ایسا ہوتا ہے مصنف علام اس سے مصدری معنی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور مقصد یہ کہنا ہے کہ منطق اور قانون کے رُو سے سوال کرنا اچھا نہیں مگر شعر موزوں کرنے کی دُھن میں یہ یاد نہ رہا کہ یائے مصدری کا الحاق اسم صفت کے ساتھ ہو سکتا ہے اسم فاعل کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اک اتحاد عقل و دل" میں "اک" تو بھرتی کا لفظ ہے مگر "درد جان گسل" پیدا کرنے کے صلائے عام سے خدا جانے میدان سیاست سے کتنے بھاگ جائیں گے۔ "اگر درد جان گسل" یعنی جان لینے والا درد یا درد جان ستاں پیدا کرنا اختیاری امر ہے تو یہ دعوت مرگ ہے۔

زخم کاری یاس کا دل نے ابھی کھایا نہیں حشر مایوسی کا اب بھی ہند میں آیا نہیں
وقت نے جذبات انسانی کو سلجھایا نہیں اس لئے کوشش نے پھل امید کا پایا نہیں
آؤ صف آرائیوں کے ساتھ منزل پر چلیں آؤ میر کارواں کے ہمقدم ہو کر چلیں

دل نے یاس کا ابھی زخم نہیں کھایا یعنی ابھی امید باقی ہے۔ حشر کے معنی ہیں اٹھنا قیامت میں مردے قبر سے زندہ اٹھائے جائیں گے اس لئے مجازاً قیامت کے معنی میں بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے مجاز در مجاز فتنہ و فساد کے معنی میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے مگر اس کے ساتھ مصدر آنا کا استعمال نہیں ہوتا پس "حشر آیا نہیں" غلط ہے۔ حشر ہونا یا حشر برپا ہونا محاورہ ہے۔ ع تو نہیں ساقی تو میخانہ میں اک برپا ہو حشر (ناسخ) یعنی فتنہ و فساد برپا ہو۔

سبزہ خط کو دکھا کر تو نے مارا ہے جنہیں حشر اون لوگوں کا ہوگا خضر پیغمبر کیسا (آتش)

غرض "مایوسی کا حشر" اور "حشر آنا" دونوں غلط۔ تیسرے مصرعہ میں "جذبات انسانی" کو سلجھانے کا فاعل وقت کو قرار دینا غلط در غلط ہے۔ اُلجھے ہوئے دھاگے یا بالوں کے کھولنے کو سلجھانا کہتے ہیں مجازاً پیچیدہ اور دقیق مسائل کے حل کرنے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لیکن "جذبات انسانی" نہ دھاگا نہ بال نہ پیچیدہ دقیق مسایل پھر "جذبات انسانی کو سلجھانا" کیا معنی یہ تو سراسر مہمل ہے۔ چوتھا مصرعہ بھی بے معنی مجموعہ الفاظ ہے۔ امید ہوتی ہے تو کوشش کیجاتی ہے امید بر آنا ہی کوشش کا پھل ہے مگر یہ کہنا کہ "کوشش نے امید کا پھل پایا نہیں" مہمل ہے۔ "صف آرائیوں" غلط ہے۔ "آرائی" فارسی کا ایک مستقل لفظ ہے جو معنی حاصل بالمصدر آرائش مستعمل ہے۔

آرزو خوش گرم آئین بندی دل کشتہ است جز چراغ حسرتم در سینہ آرائی مباد (ظہوری)

اور مصدر آراستن سے آرائی صیغہ واحد حاضر بھی ہے (آصف اللغات) پس صف آرائی کے معنی صف کو آراستہ کرنا یا ترتیب دینا ہے بصیغہ جمع صف آرائیوں کہنا غلط فاحش ہے۔ منزل کے لفظی معنی ہیں اترنے کی جگہ مجازاً اوس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں مسافرین قیام کریں۔

نالہ از دل تا زباں صد جائے منزل بیش کرد از زباں تا لب رسید از ضعف بالا تر نہ شد (باقر کاشی)

لہٰذا منزل پر پہنچنا منزل پر اترنا۔ منزل طے کرنا تو کہتے ہیں لیکن منزل پر چلنا مہمل ہے۔ "میر کارواں" سے مراد قائد ہے ابھی اوپر قائد کی اتباع کی مذمت کیگئی اب میر کارواں (قائد) کے ہمقدم چلنے کی ہدایت ہو رہی ہے ایک ہی سانس میں یہ متضاد ہدایت خلاف بلاغت ہے۔

غیر ہنستے ہیں مگر اون کی ہنسی مٹ جائیگی زندگی کے جوش سے یہ بیکسی مٹ جائیگی
دل کے ہنگاموں سے ساری خامشی مٹ جائیگی درد کے ضربوں سے جان کی بیہوشی مٹ جائیگی
ایک ہو جائیں اگر اہل جفا کے سامنے آسماں بھی سر جھکائے گا وفا کے سامنے

معاف فرمائیے یہ آخری بند تو مجموعہ مہملات ہے "مٹنا" کے معنی ہیں نشان یا علامت کا نیست و نابود ہو جانا اردو میں ہنسی خامشی بیکسی اور بے ہوشی کے ساتھ مصدر مٹنا کا استعمال درست نہیں۔ بیکسی کا داغ مٹ جائیگا یا بیہوشی کی علامت مٹ جائیگی کہہ سکتے ہیں۔ جوش کے معنی ہیں اُبال مجازاً ہجوم کثرت اور ولولہ کی معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف اڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغ چمن کے پانو (غالب)
پھرتے ہیں بیقرار بہت تیری راہ میں کہتا ہے صاف صاف یہی جوش نقش پا (داغ)
کیا کیا نہ رنگ تیرے طلبگار لا چکے! مستوں کو جوش صوفیوں کو حال آچکے (آتش)
فصل گل آئی ہوا پھر جوش پر سودائے دل موج ہی ہو ساقیا زنجیر بہر پائے دل (ناسخ)

ان اشعار سے واضح ہوگا کہ لفظ جوش کن کن معنی میں کسطرح استعمال کیا جاتا ہے پس معنئ ہائے متذکرہ کے لحاظ سے "جوش زندگی" بے معنی ہے۔ "دل کا ہنگامہ" بھی صحیح نہیں جیسا کہ اوپر صراحت کیگئی ہے۔ "درد کی ضرب" لغو ہے ضرب کے معنی ہیں چوٹ مار۔ ضرب سے درد پیدا ہوتا ہے مگر درد کی وجہ ضرب عالم وجود میں نہیں آتی۔ "جان کی بیہوشی" بھی مہمل ہے۔ کیا جان کبھی ہوش میں اور کبھی بیہوش رہتی ہے۔ اس مصرعہ میں لفظ جان کی نون غنہ بھی کراہت سے خالی نہیں۔ "وفا کے سامنے آسمان کا سر جھکانا" مضحکہ خیز جملہ ہے۔

ایام جاہلیت

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے (امرتسری)

(بہ سلسلہ پیوستہ)

عمرو بن عدی کا ماتھا ابھی ٹھنکا کہ قیصر بلا وجہ جذیمہ کو منع نہیں کر رہا، وہ بھیس بدل کر ملکہ الزباء کے محل کی طرف چل کھڑا ہوا، ملکہ کے محل کے قریب ایک باغ تھا، وہ اس میں بے تکلف داخل ہو گیا۔ ملکہ اس وقت یہاں سیر کو آئی ہوئی تھی، لیکن اس کے ساتھ اس کے وزیر امیر بھی تھے، جب ایک اجنبی کو باغ میں بے تکلف آتے دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور عمرو کو پکڑ کر ملکہ کے پاس لائے پہلی ہی نگاہ میں ملکہ کا نسوانی دل دھڑکنے لگا، عمرو نے بھی الزباء کو نظر بھر کر دیکھا، اور خاموش ہو رہا۔ ایک امیر نے عمرو سے اس جگہ آنے کی وجہ دریافت کی اور حسب نسب پوچھا، عمرو خوب ہنسا اور دیوانوں کی طرح واہی باتیں کرنے لگا، ملکہ نے کہا کہ افسوس یہ آسیب زدہ ہے، وزیر نے کہا کہ ایسا حسین نوجوان ضرور کسی جن یا پری کے زیر سایہ ہونا چاہیئے، عمرو نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو، میں باغ کی سیر کروں گا۔ ملکہ نے کہا کہ جانے دو، عمرو بے تکلف پھر باغ میں پھرنے لگا اور ملکہ اپنے مشیروں کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہو گئی، لیکن کبھی کبھی عمرو کی طرف بھی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتی۔ ملکہ نے اپنے مشیروں کو کہا کہ شکار اب ہاتھ سے نہ جائے، وہ ابھی ایک منزل پر ہے اور اس کے ساتھ اس کا لشکر بھی ہے، اگر نوبت لڑائی پر آئی تو ممکن ہے کہ وہ بچ کر نکل جائے۔" ایک مشیر نے کہا کہ "آپ کی طرف سے تحایف لے کر ہمارے آدمی وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن مناسب ہے کہ آپ خود اس کے استقبال کے لئے جائیں، اور اس کو تنہا اپنے ساتھ محل میں لے آئیں، ہمارا لشکر گھات میں بیٹھا ہے رات کے وقت اس کے لشکر کا خاطر خواہ قلع و قمع کر دیگا۔" کچھ دیر ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ آخر ملکہ اٹھی اور کہا کہ کل علی الصباح جذیمہ کے استقبال کو روانہ ہونا ہے آپ سب تیار رہیں۔ مشیر ہمراہ ہو کر چل دئے، ملکہ نے اِدھر اُدھر عمرو کو دیکھا۔ لیکن وہ غائب ہو چکا تھا، عمرو باغ میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا ملکہ کے محل کے دروازہ کی طرف آنکلا۔ اس کے سامنے باغ کی جانب ایک زمین دوز دروازہ دیکھا، پہلے تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ جب غور سے دیکھا تو اس دروازہ کے اندر ایک سرنگ نظر آئی، عمرو

بے دھڑک اس میں داخل ہوگیا، وہ اس سرنگ میں کوئی نصف میل کے قریب گیا ہوگا کہ اسے پھر ایک دروازہ سرنگ کے منہ پر نظر آیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ دریائے فرات کے کنارے پر کھڑا ہے، جہاں چند کشتیاں بندھی ہوئی تھیں، عمرو نے خیال کیا کہ کسی فوری خطرہ سے بچنے کے لئے ملکہ نے یہ تدبیر کر رکھی ہے، اب وہ سوچنے لگا کہ الٹے پاؤں پھر جاؤں یا اپنے لشکر سے جا ملوں، اسے اتنا تو معلوم ہوگیا تھا کہ ملکہ کی نیت بخیر نہیں، اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو جذیمہ کو اطلاع دیجائے، آفتاب غروب ہو رہا تھا، اسے راستہ معلوم نہ تھا، لیکن قیاساً وہ ایک طرف روانہ ہوگیا، رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی۔ اس نے ارادۃً دریا کا کنارہ چھوڑ دیا، وہ کچھ مسافت طے کرچکا تھا کہ اسے دُور سے آگ دکھائی دی، وہ اسی طرف چل پڑا۔

ایام جاہلیت میں عرب کے فیاض لوگ بلند مقامات پر رات کے وقت آگ روشن کرتے تاکہ بھولے بھٹکے مسافروں کی اس طرف رہنمائی ہو، اسے "نار القریٰ" اور "نار الضیافۃ" بھی کہتے، اس پر ان کے فخریہ اشعار بہت ہیں، عمرو نے خیال کیا کہ اس جگہ "عرب بادیہ" کا کوئی خاندان ہوگا، ممکن ہے کہ یہ لوگ مجھے سیدھے راستہ پر ڈال دیں، اسے اب کچھ خیمے نظر آئے، اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آئیں خیموں سے کچھ لوگ باہر نکل کر عمرو کا انتظار کرنے لگے۔ رات کے وقت کتوں کے بھونکنے کا مطلب یہ بادیہ نورد یہی سمجھتے کہ کوئی مسافر ان کی طرف آرہا ہے۔ اس لئے استقبال کے لئے خود باہر نکل آتے جب عمرو ان کے نزدیک گیا تو انھوں نے سلام میں سبقت کی اور کہا "انعم ظلامًا۔ اہلًا وسہلًا" عمرو نے سلام کا جواب دیا، ان لوگوں میں قدیم الایام سے سلام کا وہی طریقہ رائج تھا جو اب یورپ میں ہے، یعنی صبح کا سلام انعم صباحاً، شام کا سلام "انعم مساءً" عربوں میں اب بھی یہی سلام رائج ہے، رات کا سلام "لیلتکم سعیدہ" بھی کہتے، اور "صباحکم اللہ بالخیر" اور "مساءکم اللہ بالخیر" صبح وشام میں کہتے ہیں۔

ان لوگوں نے عمرو کی رہنمائی مضیف کی طرف کی، اور دریافت کیا کہ کھانے کے لئے کس چیز کو پسند کرتے ہو، عمرو نے کہا کہ صرف دودھ، اس کے بعد عمرو نے کہا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں، اگر تم میں سے کوئی شخص سیدھا راستہ جو حیرہ سے شطِ فرات کو آتا ہے بتا دے تو بڑی عنایت ہوگی۔ ان لوگوں نے اصرار کیا کہ رات یہیں ٹھیرو، رات کے وقت سفر کرنا خطرہ سے خالی نہیں، اور اگر اسی وقت سانڈنیوں پر

روانہ بھی ہوں تو صبح سے پہلے تم منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ راستہ بہت بکھڑا ہے، اور فرات کا پانی بہت چڑھ آیا ہے اور یہ بھی خطرہ ہے کہ کہیں ہم بھی نہ بھٹک جائیں، عمرو نے کہا کہ خواہ کچھ ہو، مجھے آپ راستہ پر ڈال دیں، ناچار ان لوگوں نے مہمان کی خاطر تیز رفتار سانڈنیاں لیں اور حیرہ کی طرف چل پڑے، رات اندھیری تھی، مگر ستاروں کی رہنمائی میں یہ لوگ آگے بڑھتے چلے گئے راستہ میں کئی مقامات پر دُور سے آگ دکھائی دیتی لیکن یہ لوگ راستہ کاٹ کر نکل جاتے، راستہ کچھ تو حدی خوانی میں اور کچھ جاہلیت کے افسانوں میں کٹ گیا۔ جب پَو پھٹی تو عمرو نے دیکھا کہ حیرہ کی عمارتیں سامنے دکھائی دیتی ہیں، وہ ماتھا پیٹ کر رہ گیا، اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ مہمانوں کو جو گذشتہ رات اس کے میزبان تھے اپنے گھر لائے، وہ سیدھا گھر پر آیا۔ والدہ سے ملا۔ اور اپنی کہانی سنائی اور کہا کہ میں ابھی ابھی پھر واپس جا رہا ہوں، اگرچہ میرا جانا بالکل بیفائدہ ہے کیونکہ اس عرصہ میں جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہوگا، لیکن میرا یہاں ٹھہرنا بھی بے سود ہے، میں لشکر کے ساتھ یلغار کرتا ہوا وہاں پہنچ جاؤں گا۔

صبح ملکہ الزباء جذیمہ کے استقبال کے لئے ایک منزل تک آئی اور قرارداد کے مطابق جذیمہ کو محل میں آنے کی دعوت دی، جذیمہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر وہ تمام احتیاط بھول گیا جو قصیر نے سمجھا رکھی تھی۔ قصیر نے پھر کان میں کہا کہ ملکہ کے ساتھ اس کے محل میں تنہا جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس وقت سفر کی کوفت کا بہانہ کرو۔ آج میں مناسب انتظام کئے دیتا ہوں، ملکہ یہاں موجود ہے نکاح کی رسم یہیں ادا ہو جائے، جذیمہ اپنے ارادہ کا پکّا تھا، اور اس وقت تو اس پر محویت طاری تھی، کچھ سنا بھولا۔ قصیر نے جراٴت سے کام لیا اور ملکہ کے مشیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج اس جگہ آپ سب صاحبان اور ملکہ رہیں، سفر کی کوفت آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ملکہ نے جذیمہ کو کہا کہ آپ کا مشیر سچ کہتا ہے، آپ کا لشکر تھکا ہوا ہے، وہ اسی جگہ آج آرام کرلے آپ آرام سے محل تک پہنچ سکتے ہیں، میں گوارا نہیں کر سکتی کہ آپ جب کہ میرے گھر پر آگئے ہیں۔ اپنے آپ کو مسافر ہی سمجھیں، قصیر تاڑ گیا کہ ملکہ چلتا پرزہ ہے، میری ہی تجویز کو اپنے مطلب میں ڈھال لیا، وہ کچھ اور کہتا مگر جذیمہ اٹھ کھڑا ہوا اور ملکہ کا ہاتھ پکڑ کر خیمہ سے باہر آگیا۔ ملکہ نے چلتے ہوئے ایک مشیر کو ہدایت کی لشکر کے آرام و آسائش کا سب سامان مہیا ہونا چاہئے۔" (باقی)

"رہائی"

جناب شوکت علی خان صاحب (ایم۔اے)

رشید کی شادی کے بہت دنوں بعد جب پہلی مرتبہ اس سے میری ملاقات ہوئی تو اس کا خیال تھا کہ میں اس پر مبارکباد کے لنگا جمنی پھول نچھاور کروں گا۔ بے اختیار گلے سے لپٹ جاؤں گا اور جب وہ شادی کے "پرلطف حادثے" بیان کرے گا تو میں اس کو رشک و حسد سے اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہوں گا، جیسے ایک مریض مرغن غذائیں کھانے والے تندرست آدمی کے منہ کو تکتا رہتا ہے۔ لیکن توبہ ہے! میں شادی کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا۔

میں نے کہا،

"یار تجھے کیا سوجھی؟ ناحق قید و بند میں پھنس گیا"

رشید بولا

"تم اسے قید و بند سمجھتے ہو، اور میں شادی کو رہائی سمجھتا ہوں"

"وہ کیسے؟"

میرا سوال ادھورا ہی رہا

میں نے پہلی بار جب اسے دیکھا تو وہ ایک گل نوشگفتہ تھی۔ شباب فتحمندانہ مسکراہٹ کے ساتھ بچپن کو پیچھے ڈھکیل رہا تھا۔ اس کا نام قیصر تھا۔ وہ ریڈیو اسٹیشن میں نظم سنانے کے لئے آئی تھی۔ سبز اطلس کی شلوار، ململ کا سفید کرتہ، سبز اوڑھنی اور کانوں میں جھلمل کرتے ہوئے بندے۔ سہمی ہوئی۔ شرمائی ہوئی۔

"آج آپ کی کوئی تقریر ہے؟"

"جی نہیں! میں ایک نظم سنا رہی ہوں"

اس کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ کرسی کے ہاتھوں کو سہلانے لگی۔

"شاید پہلی مرتبہ آپ مائیکروفون پر جا رہی ہیں"

"جی ہاں۔ اسی لئے گھبرائی ہوئی سی ہوں۔ سہیلیوں کی خاطر مجھے یہ مصیبت جھیلنی پڑ رہی ہے۔ ہمیشہ کہتی ہیں قیصر تیری آواز بہت سریلی ہے۔ ایک مرتبہ ریڈیو پر سنا دے۔

"آپ کی آواز ہے بھی رسیلی۔ جیسے ساغر کی کھنک، پائل کی جھنکار۔ مندر کی گھنٹوں کی

گونج اور ——"

"جی ——" اس نے ذرا کھینچ کر کہا۔ گویا مطلب تھا۔ جان نہ پہچان آپ کیوں حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں خاموش ہو گیا۔ مجھے اپنی بیباکی پر ندامت بھی ہوئی۔ ایک اجنبی لڑکی سے اس طرح کھل کر باتیں کرنا واقعی بیجا جسارت تھی۔ لیکن میں مجبور تھا۔ آج کل کی شوخ لڑکیوں کی اٹھان خود بخود چھیڑ چھاڑ کی دعوت دیتی ہے، اور پھر نئی تہذیب کے آئین میں کسی لڑکی کی موجودگی میں چپ چاپ بیٹھے رہنا انتہائی بدتمیزی سمجھی جاتی ہے۔ اس کو بات چیت میں مصروف رکھنا اخلاقی فرض ہوتا ہے۔

"آپ یکایک خاموش کیوں ہو گئے؟" اس نے خواہ مخواہ پھر مجھے اکسایا۔

"جی ——" میں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

قیصر دوپٹہ کو انگلی پر لپیٹے ہوئے بولی "لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا"

گھنی پلکیں اٹھیں اور ان کے پیچھے سے دو جگمگاتی ہوئی آنکھوں نے میرے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹ مسکرائے اور مجھے دنیا کی ہر چیز مسکراتی ہوئی نظر آئی۔

آہستہ آہستہ تعلقات گہرے ہوتے گئے تکلف اور حجاب کے پردے اٹھے۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور چرچے بن کی آگ کی طرح پھیلنے لگے مجھے اس سے واقعی محبت ہو گئی۔ کیوں؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ وہ ایک غریب خاندان کی لڑکی تھی۔ ماں نے اسے پیٹ کاٹ کر تعلیم اس لئے دلوائی کہ وہ پڑھ لکھ کر خاندان کا سہارا بن جائے جب وہ ذرا سیانی ہوئی تو یہ محسوس کرنے لگی کہ گھر کے محدود ذرائع آمدنی میں کسی صورت اضافہ کرنا ہی چاہیئے۔ ریڈیو پر تقریریں کرنے اور نظمیں سنانے سے جو قلیل معاوضہ ملتا وہ اس کے لئے بہت زیادہ قیمتی تھا۔ امیروں کے خزانوں میں دس بیس روپیوں کی کوئی حقیقت نہیں لیکن ان سے مفلس کی پونجی کافی وزنی ہو جاتی ہے۔

ایک شام کو جب میں قیصر کے گھر پہنچا تو مجھے دھکا سا لگا۔ ایک موٹر اس کے مکان کے سامنے کھڑی ہوئی تھی —— قیدیاں بھر کر لیجانے والی موٹر —— پولیس کی موٹر نہیں بلکہ شہر کے ایک نامور امیر کی موٹر تھی جس میں ہر مہینے رات کے گھپ اندھیرے میں دو چار عورتیں قیدیوں کی طرح کسی نامعلوم مقام کو پہنچا دی جاتی تھیں۔ یہاں ان آزاد چڑیوں کو سنہری پنجروں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ میں الٹے پیر قیصر کے

گھر سے لوٹ آیا اور دل میں ٹھان لی کہ پھر کبھی نہ جاؤں گا۔ دو ہی چار دن بعد میں سوچنے لگا۔ ممکن ہے ابھی پانی سر سے اونچا نہ ہوا ہو مجھے ایک معصوم پھول کو گلچیں کے بے رحم ہاتھوں سے بچانا ہی چاہئے جس سے میں والہانہ محبت کرتا ہوں اس کو ایک عیاش، سرمایہ دار کی ہوسناکی اور نفس پرستی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔ میں اس کو بدکاری اور بدنامی کے گرداب میں پھنسنے نہ دوں گا۔

ایک روز قیصر نے ہنستے ہوئے کہا۔

" میں شادی کر رہی ہوں اس بڈھے نواب سے جس کے پیٹ میں آنت ہیں نہ منھ میں دانت۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے جب سے ریڈیو پر آواز سنی ہے تم پر فریفتہ ہو گیا ہوں۔ تمہاری سحر انگیز آواز سے تمہاری ہوش ربا حسن کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ کیا اچھا ہو۔ اگر ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔

" پھر تم نے کیا جواب دیا" میں غصہ سے مغلوب ہو کر بولا۔

" دیوانوں سے کوئی کیا سوال جواب کرے میں خاموش ہی رہی۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتی ہوں کہ اس میں ہرج بھی کیا ہے "

" تمہارا مطلب ؟"

" یہی کہ نواب صاحب کی دولت سے ہماری حالت سدھر جائے گی۔"

" قیصر" میں چلایا۔" جس کے پاس حسن اور جوانی ہوتی ہے اس کو دولت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

" حسن اور جوانی لے کر کیا کروں جب کہ میرا افلاس دولت کے لئے تڑپتا رہتا ہے "

" لیکن تم نے انجام پر بھی غور کیا ہے "

" انجام پر ؟ ـــــ زندگی کر گزرنے کا نام ہے۔ سوچتے رہنے کا نہیں "

" قیصر میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

" خودکشی !! جو لوگ زندہ رہنا نہیں چاہتے ان کے لئے یہی ایک راستہ ہے "

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے میرا گلا گھونٹ دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے مگر اس کے ہونٹوں پر ظالمانہ تبسم کھیلتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اور میری خاموش التجائیں جل کر راکھ ہو گئیں۔

میں نے اس کو بھول جانا چاہا لیکن ماضی کی پُرلطف صحبتوں کے نقوش اُبھرتے گئے انتقام کے شعلے اور بھڑک اٹھے جس کی یاد میں میں نے کئی راتیں بے خواب گزاری تھیں۔ جس کی خاطر دنیا بھر کے طعنے سہے تھے جس کیلئے

خاندان بھر سے قطع تعلق کیا تھا اس کی یہ طوطا چشمی میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ طرح طرح کے مجرمانہ خیالات بگولے بن کر اٹھنے لگے۔ میں چاہتا تھا کہ اس پھول کو نواب کی سیج پر جانے سے پہلے مسل دوں، جب میں اس کے گھر پہنچا تو اس کی ماں نے کہا۔

"وہ چلی گئی!"

"کہاں؟" میں بھونچکا سا رہ گیا۔

"جہاں تمہاری رسائی دشوار ہے۔ آسمان کے تارے توڑ لانا محال ہے۔"

"مگر بعض وقت تارے خود آسمان سے ٹوٹ کر زمین کی گود میں آگرتے ہیں۔"

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے" بوڑھیا گرگ جہاں دیدہ کی طرح آنکھیں گھما کر بولی۔

مجھے قیصر سے نفرت ہوگئی۔ اس کی بیوفائی نے میری نظروں میں عورت کو بے وفا بنا دیا لیکن یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ مرد کسی عورت سے خواہ کتنی ہی نفرت کرے۔ زندگی کے بعض تلخ لمحات میں، تنہائیوں کی کٹھن گھڑیوں میں اس کو چاہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مور اپنے بھدے پیروں سے نفرت کرتا ہے لیکن ان کے بغیر وہ ناچ نہیں سکتا۔ قیصر سے انتہائی نفرت کے باوجود اس کے بغیر مجھے دنیا کی ہر چیز بے کیف معلوم ہوتی تھی۔ میرے سامنے کوئی خوشی سے قہقہے لگاتا تو میرا دل چاہتا کہ اس کے منہ پر تھپڑ رسید کروں۔ جب میں خوش نہیں تو دوسروں کو خوش ہونے کا کیا حق ہے۔ میرے ساتھ دنیا کو بھی رونا چاہئے جذبات کے اس غلیان سے میری صحت متاثر ہونے لگی۔ آخر کار میں نے شادی کر لینے کا تصفیہ کیا۔ مگر جب مجھے قیصر کا ایک خط ملا تو سارے ارادے کافور ہو گئے۔ اور محبت کے خوابیدہ جذبات پھر جاگ اٹھے۔ اس میں اس نے لکھا تھا "میرے سندر سپنے پریشان ہو گئے ہیں۔ میں محلوں کی زندگی سے بیزار ہوں۔ یہاں کی حیا سوز حرکتیں دیکھی نہیں جاتیں۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں لیکن میرے جھنجھوڑے ہوئے دست و بازو میں اتنی طاقت نہیں کہ قفس کا دروازہ کھول سکوں۔ اگر تم نے میری مدد نہ کی تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

خودکشی ———

"خودکشی! جو لوگ زندہ نہیں رہنا چاہتے ان کے لئے یہی ایک راستہ ہے۔"

وہ رات مجھے اچھی طرح یاد تھی جب قیصر نے بڑی سفاکی سے یہ الفاظ کہے تھے میں چاہتا تھا کہ اس کے خط کے جواب میں صرف انہی الفاظ کو دہرا دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اگر وہ واقعی خودکشی کر لے تو میں انتقام نہ لے سکوں گا۔ اس

کی زندگی کا ہر ہر لمحہ میرے لئے قیمتی تھا کیونکہ میں اس سے اپنی بربادیوں کا پورا معاوضہ وصول کرنا چاہتا تھا۔ میں خاموش رہا مگر اس کے خطوط کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ایک خط میں اس نے کھانے کی دعوت دی تھی۔ کچھ ایسے دردمندانہ پیرایہ میں درخواست کی تھی کہ میں جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ نواب صاحب چند دنوں کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ بے تکلف چلے آیئے۔ یہاں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ جب میں وہاں پہنچا تو عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ قیصر بالکل بدل گئی تھی۔ اس کے لباس اور وضع قطع میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں وہ نور نہیں تھا۔ گلابی ہونٹوں کا رنگ رس باقی نہ تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے ویشاؤں کے سے تھے۔ اس کی ہمجولیاں بھی تقریباً اسی سج دھج کی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"چچا میاں آپ آ گئے — آپ کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئی تھیں۔"

چچا جان کا نام سنتے ہی عورتیں پردے کے پیچھے جا چھپیں۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے کہا۔

"بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔ چچا جان کہتے لاج نہ آئی۔"

عورتوں کی مصلحت کو مرد نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے یہ ناطہ اس لئے جوڑا کہ اگر نواب صاحب کو تمہارے یہاں آنے کی اطلاع بھی ہو جائے تو وہ شبہ نہ کریں گے۔"

"خیر — یاد فرمائی کا سبب دریافت کر سکتا ہوں؟" میں نے طنزاً کہا۔

"صرف یہی پوچھنے بلائی تھی کہ آپ اداس کیوں رہتے ہیں۔ اگر آپ کو مجھ سے نفرت ہے تو آپ میرے لئے آہیں کیوں بھرتے ہیں۔ آپ کی میں رتی رتی کی خبر رکھتی ہوں۔"

"قیصر! میں بھی تم سے صرف اتنا کہنے آیا تھا کہ جب تک میں تم سے انتقام نہ لے لوں مجھے سکھ چین نصیب نہ ہوگا۔"

"انتقام؟ اوہ! میں سمجھی۔ آپ کے نزدیک بھی نفسانی خواہشات کی پیاس بجھانے کا نام محبت ہے۔ آپ کی خاطر مجھے یہ بھی منظور ہے۔ جب تک جسم میں جان ہوتی ہے انسان سب کچھ کرتا ہے۔ لاشے کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اسے گدھ کھائیں یا گیدڑ۔"

قیصر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے دو چھوٹی چھوٹی ندیاں ابل پڑیں اور ان کے تیز دھارے نے میرے [illegible]

شروع کیا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آنے لگا۔ وہ اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے جان بوجھ کر تم سے بیوفائی نہیں کی۔ حالات نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ تم جانتے ہی ہو میرا خاندان کس قدر نادار ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں آنے کے بعد اس کو فاقوں سے بچاؤں گی۔ اس کی مالی مدد کر سکوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ تمہارے پاس اتنی دولت نہیں کہ تم میرے کنبہ کی پرورش کر سکو۔ اس لئے میں اپنی تمناؤں اور ارمانوں کو قربان کرکے اس حرم سرائے میں داخل ہوگئی۔ عزیز و اقارب سمجھتے ہیں کہ میں جنت میں ہوں۔ لیکن اس آگ میں میں یہاں دن رات جلتی ہوں وہ دوزخ کی آگ سے بہت زیادہ بھیانک ہے۔ میں تو صرف تمہارے بھروسہ پر جی رہی تھی۔ اب تو میں اس سے بھی محروم ہوگئی۔"

وہ میرے پیروں پر گر پڑی۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو" میں نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ تم مجھ سے عمر بھر محبت کرتے رہو"

"خوب کتنی انوکھی خواہش"

"تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تمہیں مجھ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو۔ اب تم میرے سوا کسی اور سے محبت نہ کر سکو گے"

قیصر کی آنکھوں میں ایسا طلسم سامری تھا۔ کہ میرا غصہ سرد پڑ گیا۔ میں نے اسے بھینچ کر سینہ سے لگا لیا اور راز دانہ انداز میں کہا۔

"چلو۔ یہاں سے کہیں بھاگ چلیں"

"آج رات کی رات یہاں سو جاؤ۔ کل صبح دیکھا جائیگا" وہ گھسیٹ کر مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور سارے برقی قمقمے گل ہو گئے۔

جب میری آنکھ کھلی تو قیصر گہری نیند میں تھی۔ پَو پھٹ رہی تھی۔ سورج کی کرنیں ترچھی لگا ہوں کے تیروں کی طرح آسمان کے سینہ میں دھنسی جا رہی تھیں۔ میں چوروں کی طرح چھپتا چھپاتا گھر پہنچا۔

میں عرصہ تک قیصر کے حالات سے بیخبر رہا بہت دن بعد مجھے قیصر کا ایک خط ملا جو کشمیر سے لکھا گیا تھا۔ اس میں سری نگر، جمو۔ پہلگام اور گلمرگ کی سیاحت کا ذکر تھا۔ آخر میں لکھا تھا۔ "اس خط کو نواب صاحب نے جبراً مجھ سے چھین کر پڑھ لیا۔ ان کی قہر آلود آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے ہمالیہ کی بلند چوٹیوں پر لیجا کر نیچے دھکیل دیں گے۔ وہ دیر تک گھورتے رہے ـــــ گھورتے رہے۔ لفافہ پر تمہارا

نام دیکھکر بولے۔میں اس لڑکے کے ابا سے خوب واقف ہوں۔شہر لوٹنے کے بعد تیری شادی کروا دوں گا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یکایک گھٹائیں غائب ہوگئیں اور آس پاس کے پہاڑ سنہری دھوپ میں جگمگانے لگے۔ وادیوں میں کلیاں چٹک کر پھول بن گئیں اور آبشار دھیمے سروں میں مسرت کے گیت گانے لگے۔"

اس خط کو پڑھ کر میرے ہوش اکھڑ گئے قیصر سے شادی کر کے میں اپنے خاندان پر کلنک کا ٹیکہ لگانا نہ چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نواب صاحب واپس ہوتے ہی مجھے اس طرح جکڑ دیں گے کہ پھر زبان ہلانا مشکل ہوگا۔اس لئے حفظ ماتقدم ضروری تھا۔میں نے گھر میں ادھم مچادی کہ مجھ سے اب صبر نہیں ہوتا۔میں اب شادی کر ہی لوں گا۔اگر آپ کے معیار پر کوئی لڑکی پوری نہیں اترتی تو کسی راہ چلتے کو گلہ باندھ دیجئے۔ یہ برہمچاریوں کی زندگی آخر کب تک؟ میری تدبیر کارگر ہوئی۔پیامات آنے جانے لگے اور چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔گھر والے حیران ہیں کہ شادی کے نام سے دُور بھاگنے والا کیسے شادی کرنے پر تیار ہوگیا، اور وہ بھی یوں گر پڑ کر؟ عزیزوں کو تعجب ہے کہ مجھ جیسے اجڈ اور غریب کو ایک با اثر اور متمول عہدہ دار نے اپنی دامادی میں کیسے قبول کیا۔جوہری نے ہیرے کے بجائے پتھر کیسے چن لیا ——— اب میں انہیں کیوں کر سمجھاؤں۔

رشید کی شادی کے بعد جب پہلی مرتبہ اس سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔

"یار! تجھے کیا سوجھی۔ناحق قید و بند میں پھنس گیا۔"

"تم اسے قید سمجھتے ہو، اور میں رہائی سمجھتا ہوں۔"

"کیوں؟"

وہ مسکرانے لگا۔میز کا خانہ کھول کر کاغذوں کا پلندہ میری طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

"میں نے ایک افسانہ لکھا ہے۔فرصت ملے تو ایک نظر دیکھ لو تمھیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔"

اس افسانہ کا عنوان تھا "رہائی"۔

براہ کرم اندرون ۱۵ تاریخ مکرر پرچہ طلب کرلیں اور تبدیل پتہ سے دفتر کو مطلع فرمائیں ورنہ اس کے بعد دفتر ارسال پرچہ سے مجبور ہے۔

اُردو زبان

جناب مرزا سلیم بیگ صاحب وکیل ماہر فن شناخت (تحریرات)

میں نے ہمیشہ سے اپنی مادری زبان کا نام اردو سنا ہے، اور اب بھی میں اس کو اردو نام ہی سے سمجھتا آیا ہوں۔ جو زبان میں بولتا ہوں اور اپنے بیگانوں کو بولتے ہوئے سنتا ہوں۔ وہ ہی اردو ہے جس کو میں اپنی مادری زبان بھی کہتا اور سمجھتا ہوں بعض دوستوں نے مجھے بتایا کہ اب اردو کا نام اُردو نہیں رہا، بلکہ اس کو "ہندی ہندستانی" کہنا چاہیئے، کیونکہ ملک کی ضرورت اس کا نام بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔ بعض نے یہ بھی فرمایا کہ "ہندی اتھوا ہندستانی" نام ہو گیا ہے۔ ان مختلف روائیتوں سے اتنا تو ضرور معلوم ہو گیا کہ ابھی کوئی قطعی رائے اس نام کو بدلنے کی طے نہیں پائی۔ اور نہ قطعی فیصلہ کہ اُردو نام نہیں رہا۔ میں نے اس ضرورت کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان امور پر غور بھی کیا مگر سچ تو یوں ہے کہ میری سمجھ سے باہر ہے کہ اردو کا نام بدل کر زبان کو کیا فائدہ پہنچایا جائے گا۔ اس نئے مرکب اردو کے مریض کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ البتہ اتنا ضرور ہوگا کہ کہنے والے کو کہنے کیلئے مواد مل جائے گا۔ اگر اردو کا نام بدلنے میں اس کا لحاظ رکھا جا رہا ہے کہ اس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ شامل ہیں تو اس کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا کہ اردو میں عربی و فارسی کے الفاظ بھی ہیں۔ ان زبانوں میں سے کسی زبان کے لفظ اب اردو سے جُدا نہیں ہو سکتے۔ اور اگر کئے جائیں تو وہ اردو نہیں کچھ ایسی زبان ہو جائے گی جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ایک دو صدیوں کی اور ضرورت پڑے گی۔ اور ایسی ایسی کٹھن منزلیں طے کرنی پڑیں گی جس کو موجودہ زمانہ کی مصروفیتیں شاید ہی برداشت کر سکیں۔ نتیجہ یہی ہوگا کہ کوششیں جاری رہیں گی اور اردو کے چند الفاظ اِدھر سے اُدھر ہو کر زبان وہی کی وہی رہ جائیگی۔ پنچ مل کیجئے کاج۔ جیتے ہارے نہ آوے لاج۔

اردو زبان کا نام بدلنے کی اگر اس لئے ضرورت ہو رہی ہے کہ اوس میں الفاظ کی کمی ہے تو اس کے لئے کیا ضرور ہے کہ نام بدلا جائے۔ اب تک مختلف زبانوں کے الفاظ سے جو اُردو زبان میں چاشنی ہے اور ہندی، سنسکرت۔ بھاشا وغیرہ کے الفاظ ملے جُلے ہیں۔ اوس میں

اور اضافہ کر دیجئے۔ یہ چاشنی اور زیادہ خوشگوار
اور نورتن ہو جائیگی۔ مگر بات کو تبنگر بنانا اور
میل کو بیل کرنا جو آج کل ہم لوگوں کا داؤں ہے
اس سے کچھ ترقی تو ہوگی نہیں بلکہ اور زیادہ رکاوٹیں
پیدا ہوں گی جتنے الفاظ بھی ہماری زبان میں غیر
زبانوں کے آئیں اون کو آنے دیجئے۔ اور کوشش
کیجئے کہ اون کو ہم اپنا لیں۔ اب تک بھی سینکڑوں
اور ہزاروں ہی الفاظ ہم نے اپنی ضرورت پورا
کرنے کے لئے اپنی زبان میں شریک کر لئے۔ اور یقین
جانئے ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ آپ نے اسٹیشن۔
لالٹین۔ ریل۔ ٹکٹ وغیرہ الفاظ اپنی زبان میں
شریک کر کے اپنی ضرورت کو پورا کر لیا۔ اور جب
کبھی بھی جس طرح بھی آپ کو ضرورت پڑے ایسا
ہی کیجئے۔ نام بدل کر آپ کو کیا مل جائیگا۔ جو کرنا
ہے وہی کرنا۔ جو کر چکے اوس کو کیوں ملیا میٹ
کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کیا جائے۔
اگر اور کوئی کام کرنے کو نہیں ہے تو خالی سے بیگار
بھلی۔ ہمت کیجئے محنت اور قابلیت سے کام
لیجئے۔ ضرورت کے الفاظ کا ترجمہ کر کے اپنی اردو
میں شریک کیجئے اور اس کا اس طرح پرچار کیجئے
کہ ادنیٰ اور اعلیٰ کو زبان پر آپ کے بنائے ہوئے
یا چرائے ہوئے الفاظ زبانوں پر چڑھ جائیں۔
اور ان الفاظ سے غیریت جاتی رہے۔

یہ بات بڑے دُکھ کی ہے کہ اردو کا نام
بدل کر اوس کو کسی اور نام سے پکارا جائے۔ اوس
پر کسی کو اعتراض ہوگا، کوئی ناخوش ہوگا۔ کوئی اُس
کو قبول نہ کرے گا اور کوئی بات چھوڑ لاتوں پر
آجائے گا۔ نتیجہ کیا ہوگا وہ ظاہر ہے ایک طرف
تو بدعملی ہوگی۔ بددلی پھیلے گی۔ چلتی گاڑی میں
روڑہ اٹکیگا۔ کام کچھ ہوگا نہیں اور زبان جو آگے
بڑھ رہی ہے وہ اپنے قدموں پیچھے ہٹنے لگے گی۔
اردو کا نام بدلنا کیا ہوا۔ خواہ مخواہ کا جھگڑا مول
لیا۔ زبان پیاری اور زبان سے نام سے دشمنی۔
یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ باپ سے بیر پوت سے
پیار۔ بھلا یہ کتنے دن کی بات ہے کہ اردو زبان
کو سرکاری دفتروں میں ۱۸۳۵ء میں پہلی دفعہ
جگہ ملی، اور اوس نے ملکی خدمات انجام دینی شروع
کی۔ اس کا حساب اگر آپ انگلیوں پر کریں تو
معلوم ہو جائیگا کہ اردو کو زندگی کا قدم اٹھائے
کتنے دن اور کتنی گھڑیاں ہوئیں۔ ابھی تو اردو
بیچاری جوان بھی نہیں ہوئی کہ زندگی کے دن پہاڑ
ہو کر سامنے آگئے۔ لوگ باگ اس کو ابھی تو بنانے
اور سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں بھی بعض
کو تو یہ دکھ ہے کہ اردو علمی زبان نہیں ہے۔ بہت سے
یہ کہتے ہیں کہ غیر زبانوں کا ترجمہ کرنے کے لئے اردو
بہت کم مایہ زبان ہے۔ اس کم مائیگی اور بے علمی کا

شکایت کو آپ اس طرح تو رفع نہیں کر سکتے کہ چلو اس کا نام ہی بدل ڈالو۔ سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ بلکہ اب تو زمانہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کا بچار کر رہا ہے۔ اس میں جو کمی ہے اوس کی تکمیل ہم سب پر ملک کی ضرورت کی اہمیت کا خیال کر کے لازمی ہے۔ زبان میں نیا نیا اسلوب بیان پیدا کیجئے یا نئے نئے الفاظ بنا کر اس کمی کو پورا کیجئے۔ کسی زبان کے الفاظ کا ترجمہ کیجئے یا اون کو بجنسہ لیجئے۔ نقل کیجئے یا صورت بدل کر اپنا لیجئے۔ جو کچھ بھی کیجئے وہ اپنی زبان کیلئے کیجئے اور اوس کو اردو ہی کہکر بنائیے۔ میرا تیرا کرنا ایک تھڑولا خیال ہے موجودہ زمانہ کو نہ میرے کی ضرورت ہے اور نہ تیرے کی۔ وہ تو اپنا سواگت چاہتا ہے۔ اس لئے اللہ نے جو دیا ہے اوس کو سنبھال کر رکھئے اور جس کی ضرورت ہے اوس کو حاصل کرنے کی فکر کیجئے۔ انہماک اور شفقت سے کام کیجئے۔ پرچار اور ترقی کی دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ دونوں میں قدم ماریئے مگر دونوں ہاتھوں سے پگڑی سنبھالے رہیئے۔ نئی بات پیدا کرنے میں جگ ہنسائی ہے۔ زبان گھر کی رہے گی نہ گھاٹ کی۔ تیتر بٹیر ہو کر خدا جانے کیا حشر ہوگا اور پھر کون جانتا ہے کہ کون ہوگا۔ اور کس کی زبان ہوگی۔ کون پرچار کرے گا۔ اور کون دہائی دے گا۔

"مشعل راہ"

جناب نخشب جارجوی

معنیِ بے لفظ کی صورت پیام آ ہی گیا
جب نگاہیں مل گئیں ان کا سلام آ ہی گیا

عرضِ غم پر چپ رہے لیکن لبِ غماز پر
اک تبسم بر بنائے انتقام آ ہی گیا

بے تعلق سا رہا میں لاکھ بیگانہ بنا
میری بربادی میں پھر بھی تیرا نام آ ہی گیا

اس تلون کیش کا دن بھر یقین مجھ کو رہا
وہم سا کچھ دل میں لیکن وقتِ شام آ ہی گیا

پرسشِ غم پر ہم آہِ سرد بھر کر رہ گئے
تا بلب شکوہ بحدِ احترام آ ہی گیا

کیا اثر ہوتا کہ ہر فقرے پہ یہ کہنا پڑا
بس یہی سن لیجئے بس اختتام آ ہی گیا

گفتگو میں جب ملیں نظریں تو وہ شرما گئے
مدعا چہرے پہ کچھ وقتِ کلام آ ہی گیا

یہ دل بیگانہ فطرت - یہ دلِ وحشی مزاج
ان کے کام آیا تو نخشب میرے کام آ ہی گیا

ذسکا

جناب سید نور الحسن صاحب بی۔ اے

(بسلسلۂ گذشتہ)

ہوٹل کے مالک نے اپنے مہمانوں کی تفریح طبع کے لئے اس ناچ کا انتظام کیا تھا۔ اس ناچ کی وجہ سے .LOUNGE میں سوائے سر چٹونڈ اور ان کے چند مخصوص دوستوں کے کوئی نہیں تھا۔ سر چٹونڈ عربوں اور مصریوں کی بابت اپنے زرین خیالات کا اظہار فرما رہے تھے۔ عرب بیشک دراز قد ہوتے ہیں یعنی ان میں سے اکثریت دراز قد ہوتی ہے لیکن میں نے اُن میں بونے قد کے آدمی بھی دیکھے ہیں۔ خود خدیو مجھ سے زیادہ لمبا نہیں ہے۔ مصریوں کا چہرہ مہرہ دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ اُن کے خد و خال نمایاں ہوتے ہیں لیکن ذہانت کا دُور دُور پتہ نہیں ہوتا۔ یہ کہتے کہتے اُس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ مجھ جیسا بھاری بھرکم جبڑا، موٹی ناک جس کی نوک پر ایک چھولا سا کالا آبلہ ہو، اور چوڑے منہ میں کالے کالے دانت جو سر موصوف کی خصوصیات جسمانی تھیں، ذہانت اور فراست کی خاص نشانیاں ہیں اور جو متناسب سے متناسب مشرقی گندمی آدمی میں پائی جانا غیر ممکن ہیں۔

معاف کیجئے گا میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا، ایک آدمی نے جو صوفہ پر دراز تھا کہا۔ ان کمبختوں کی غضب کی آنکھیں ہوتی ہیں اور ان میں ذہانت اور ذکاوت کی کمی نہیں ہوتی۔ اِس سے مجھے یاد آیا آج یہاں ایک آدمی آیا ہے جو مصریوں کا بہترین نمونہ ہے۔ گو وہ فرانسیسی ہے۔ ہر شخص اس کو جانتا ہے وہ ایک مشہور مصور ہے۔ اس کا نام آرمنڈ جرویس ہے۔

سر چٹونڈ گویا چونک سے پڑا "کیا کہا؟ ارمنڈ جرویس؟ ہاں وہی جدت پسند جرویس۔ وہ یہاں مشرقی عورتوں کی تصویریں کھینچنے کے لئے آیا ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن میں اس کا خوب وقت گزرے گا۔ اس کو چاہئے کہ شہزادی "ذسکا" کی تصویر اُتارے۔

"ہاں بھائی میں تم سے اس خاتون کے متعلق دریافت کرنا چاہتا تھا۔ کیا کوئی جانتا ہے کہ وہ کون ہے؟ میری بیوی کو بڑی فکر ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ آیا وہ موزوں ہستی ہیں تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔ جب بن بیاہی

ساتھ ہوتی ہیں تو آدمی کو دوست بنانے یا ملنے جلنے میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔"

راس کوٹنے جو صوفہ پر دراز تھا آہستہ آہستہ اٹھا اور اُس نے اپنے ورزشی ہاتھ پاؤں کو کاہلی کے ساتھ مزے لیتے ہوئے پھیلایا۔ وہ ایک ورزشی کھلاڑی قسم کا کھاتا پیتا آدمی تھا اسکاٹلینڈ میں اس کی کافی جائیداد تھی۔ اس نے اپنی تمام عمر خوش باشی، لاپروائی میں بسر کی تھی۔ وہ رومان کی تلاش میں تمام دنیا میں چکر لگاتا تھا اور ظاہری تہذیبی قیود سے اس کو نفرت تھی اخباروں اور اُن کے مدیروں سے تو خاص طور پر وہ چڑتا تھا۔ سر چپو نڈ جب اپنی کمسن لڑکیوں کا ذکر کرتا تھا تو راس کورٹنے زیرلب مسکراتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چھوٹی لڑکی کی عمر کم از کم تیس سال تھی۔ لڑکیوں کی ماں یعنی لیڈی موصوفہ نے اس کو گانٹھنے کی کوشش اٹھا نہیں رکھی تھی لیکن وہ نہایت ترکیب سے بچ بچ کر نکل جاتا تھا۔ تصور نے ذسکا اوران دو لڑکیوں کے مابین اُس کے سامنے نقشہ کھینچ دیا۔ وہ مسکرایا اور سرخی تمام چہرہ پر دوڑ گئی۔

"قسم ہے مجھے اس کی پروا نہیں کہ قاہرہ میں کون کیا ہے" اس نے لاپروائی سے کہا "وہ جن کے خاندان شریف سمجھے جاتے ہیں زیادہ آوارہ طبیعت ہوتے ہیں بہ نسبت اُن کے جن کے خاندان کی بابت لوگ کچھ نہیں جانتے۔ جہاں تک شہزادی ذسکا کا تعلق ہے۔ اس کا حسن اور غیر معمولی ذکاوت اُس کو ہر مجلس اور محفل میں ہردلعزیز بنانے کے لئے کافی ہیں۔ چاہے اس کے پاس دولت ہو یا نہ ہو"

لارڈ فاک درڈ نے اپنی ندارد مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں نے سُنا ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔ میری ماں سمجھتی ہے کہ وہ طلاق شدہ ہے"

سر چپو نڈ نے اپنا کدو جیسا سر ہلایا لیکن سرکورٹنے فوراً ہنس کر بولا "طلاق میں حرج ہی کیا ہے۔ آج کل شادی کا قدرتی اور فطرتی نتیجہ طلاق ہے"

سر چپو نڈ منہ پھولائے ہوئے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اِس بحث میں حصہ نہیں لیتا چاہتا تھا کیونکہ اس کی متاہل زندگی خوشی سے گذر رہی تھی اور اُس کو ایسی اکثریت سے کوئی دلچسپی اور ہمدردی نہیں تھی جن کی شادی شدہ زندگیاں جہنم بنی ہوئی ہیں۔ آخرش سر چپو نڈ نے کہا تو یہ کہو کہ شہزادی ذسکا کنواری نہیں ہیں نام تو روسیوں جیسا معلوم ہوتا ہے۔ میری بیگم کا خیال ہے کہ ان کے میاں روس میں ہیں اور وہ خود

صحت کی خاطر مصر تشریف لائی ہوئی ہیں کیونکہ روس کی سردی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

لارڈ فاک ورڈ نے جماہی لیتے ہوئے کہا "کیا اچھا سمجھوتہ ہے ؟ لیکن میری والدہ ماجدہ سمجھتی ہیں کہ ڈسکا کا نہ کوئی شوہر ہے نہ کبھی کوئی شوہر تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میری ماں کے پاس اس کے متعلق واثق ثبوت ہیں۔ لیکن وہ ڈسکا سے ملاقات کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں "

سر جیونڈ نے اپنے پیٹ کو غبارہ کی طرح پھیلاتے ہوئے کہا " اگر ایسا ہے اور لیڈی فاک وارڈ واقعی ڈسکا سے ملاقات کی متمنی ہیں تو میری محترم اہلیہ کو بھی اس بارے میں مزید عذر نہ ہوگا کیونکہ لیڈی فاک وارڈ کا کسی خاتون سے ملنا اس خاتون کی خاندانی مرتبہ اور ذاتی وجاہت کا بین ثبوت ہے "

لارڈ فاک وارڈ نے اپنے نچلے ہونٹ سے کھیلتے ہوئے کہا " یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میری والدہ محترمہ مشتثنیات سے ہیں۔ جب گورنر زندہ تھے تو وہ شاید ہی کہیں جاتی آتی ہوں اور اُن سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے بھی جو کوئی ہمارے گھر پر یارک شائر میں حاضر ہوتا تھا تو اس کو اپنے ساتھ اپنا شجرہ لانا پڑتا تھا۔ کیا غیر دلچسپ بات تھی ؟ لیکن اب میری ماں مختلف کریکٹروں کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ ہر قماش کے آدمی سے ملتی ہیں اور جتنا زیادہ دائرہ ملاقات وسیع ہوتا جاتا ہے اتنا ہی ان کی مسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب سے میرے والد کا انتقال ہوا ہے میری ماں میں ایک تبدیلی پیدا ہوگئی ہے "

راس کو رٹنے مسکرایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لیڈی فاک ورڈ میں تبدیلی یقیناً پیدا ہوگئی ہے اس کے خاندانی اور اعلیٰ شریف طبقہ کے دوست بخوبی جانتے تھے کہ شوہر کی زندگی میں لیڈی فاک ورڈ کے بال نرم روپہلے تھے، اُس کا رنگ زردی مائل تھا، جسم بھرا ہوا تھا اور قدم سنجیدگی سے پڑتے تھے لیکن جس شوہر نے اس کو آنکھوں کا نور دل کا سرور بنا کر رکھا تھا اور زندگی کے آخری لمحات تک اُس کا سوجان سے فریفتہ اور شیدا تھا اور اس کو انگلستان کی حسین ترین عورت تصور کرتا تھا ایسے شوہر کے مرنے کے دو ہی سال بعد وہی لیڈی فاک ورڈ سنہرے زلف پیچاں، انار جیسے رنگ اور مالش شدہ جسم کے ساتھ انتہائی حسن کارانہ جامہ زیبی کا مجسمہ بنی ایک حور تھا اور پری کی مانند سماجی محفلوں میں ضوفشاں ہوتی - وہ جو کبھی بوڑھی خاتون کہلاتی تھی اب پریوں کی طرح ناچتی تھی۔ وہ سگریٹ

پیتی تھی اور بچوں کی طرح معمولی معمولی باتوں پر ہنستی تھی؟ کتنا ہی بدمزہ، پرانا اور بیکار مذاق ہو اس کے قہقہوں کا موجب ہوتا تھا۔ وہ عشق و عاشقی بھی کرتی تھی۔ اُس کی عشق و عاشقی میں سلیقہ، ندرت اور تجربہ شامل رہتا تھا۔ مورل اور ڈالی اس کو دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹتی تھیں۔ وہ کیوں نہ جلتیں کیونکہ فاک یہ بڈ اپنے خاص انداز اور بڑی چڑھی ہوشیاری سے اُن کا رنگ ہی نہ جمنے دیتی تھی اسی لئے وہ اس کو بوڑھی چڑیل کہتی تھیں اور اصل یہ ہے کہ غازہ اُڑ جانے اور چست کپڑے اتر جانے کے بعد وہ تھی بھی بوڑھی چڑیل۔ وہ قاہرہ میں انتہائی خوش باشی کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ وہ اپنے لڑکے کو جس کی عمر گو اٹھائیس سال کی تھی اور جو اکثر بیمار رہتا تھا، میرا بیچارہ چھوٹا سا بچہ کہا کرتی تھی اور اس غریب بچہ کی خستہ حالی کی یہ حالت تھی کہ ماں کی ہر بات کو الہام سمجھتا تھا اور ہر امر میں ماں کا حوالہ دیتا تھا۔ لفظ ماں اس کے لئے کھونٹی کا کام دیتا تھا جس پر وہ اپنی اور دوسروں کی رائے اور جذبات ہر لمحہ ٹانگتا رہتا تھا۔

"لیڈی فاک ورڈ شہزادی دسکا کو معلوم ہوتا ہے بہت پسند فرماتی ہیں۔" ایک سیاح نے جو اب تک خاموش لیٹا ہوا تھا کہا۔

لارڈ فاک وارڈ نے کچھ اٹھتے ہوئے اور خفیف سا جوش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کون شہزادی کو پسند نہیں کرے گا؟ میں بتاؤں کیا ہے؟ اس کی آنکھوں میں جادو ہے مجھے اُس کی آنکھیں پسند نہیں۔

کورٹنے نے تڑپ کر کہا " فاک چپ رہو خرافات مت بکو۔ اُس کی آنکھیں غضب کی ہیں۔ یہ کہتے کہتے اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ اپنے ہونٹوں کو چبا کر خاموش ہو گیا۔

اس اثناء میں کسی نے نہایت ملائم لہجہ میں کہا "کسی کی آنکھیں خوبصورت ہیں" یہ دبلا پتلا شریف آدمی پروفیسر کا لبادہ اور ٹوپی پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

لارڈ فاک چیخ اٹھا۔ اوہو! آپ ہیں واللہ آج کے ناچ کے لئے کیا اچھا سوانگ بھرا ہے۔ تم غضب ڈھا رہے ہو۔ جس شخص کی تعریف کی گئی تھی اس نے اپنے ناک کے بانسے پر عینک کو ٹھیک جماتے ہوئے حضار محفل کا جائزہ لیا۔ وہ مطمئن تھا اور اصل تو یہ ہے کہ ڈاکٹر "میکھویل" ڈین کو مطمئن ہونے کی وجہ بھی تھی۔ اگر یورپ میں سب سے زیادہ قابل آدمی کو غرور کرنے کا حق تھا تو اس کو مفتخر

ہونے کا جانو حق تھا۔ اصل تو یہ ہے کہ اُس عالیشان
ہوٹل میں وہی ایک ایسی شخصیت تھی جو کسی کارآمد
کام کے لئے مصر آکر وہاں قیام پذیر تھی، اُس کے
مصر آنے کی وجہ اس کو معلوم تھی اور جس کا اُس نے
کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔ خاموش، اکثر اوجڈ
اور بیشتر معموں میں باتوں کرنے کا وہ عادی تھا۔
اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ کسی خاص کھوج
میں تھا اور ہر چیز چاہے وہ اہم ہو یا غیر اہم کی
تہہ کو وہ پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس نے مصریوں
کا اس قدر غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا کہ وہ ان
کے خفیف سے خفیف رنگ کے اختلافات میں
امتیاز کر سکتا تھا وہ سر جیوٹونڈ کی بابت جانتا تھا
کہ وہ رشوت لے کر اپنے اخبار میں لوگوں کی بابت
خبریں شائع کرتا ہے۔ اُس کو خوب معلوم تھا کہ ڈالی
اور میوبل کبھی بر حاصل کرنے میں کامیاب نہیں
ہوں گی۔ وہ اس سے بھی واقف تھا کہ کورٹنے
سوائے شکار کھیلنے کے تمام عمر کچھ نہیں کرے گا۔
وہ اس حقیقت سے بھی ناواقف نہیں تھا کہ مالکان
ہوٹل خوب روپئے کما رہے ہیں۔ ان سطحی چیزوں کے
علاوہ وہ پیدائشی طبیعتوں کے اختلاف کو سمجھتا
تھا۔ واقعات اور حادثات کی وجوہ سے واقف
رہتا تھا۔ گو وہ ہمیشہ مصروف بیکار تھا لیکن اس
کی صحبت کبھی تکلیف دہ نہیں ہوتی تھی۔ آج

شب کے ناچ سے بھی وہ کچھ نہ کچھ تجربے حاصل
کرنا چاہتا تھا۔

میکمویل ڈین نے کہا "میرے خیال میں
میرے عمر کے آدمی پر یہ لبادہ اور ٹوپی سجتی ہے۔
پہلے میں نے سوچا تھا کہ ایک پرانے مصری
پادری کا لباس زیب تن کروں لیکن مجھے لباس
مل نہ سکا اور جب تک لباس قطعی تاریخی نہ ہو میں
پہننا پسند نہیں کرتا۔ خیر اس جھگڑے کو جانے دو۔
مسٹر کورٹنے ابھی کسی کی خوبصورت آنکھوں کی بابت
گل فشانی فرما رہے تھے۔ ہم بھی تو سنیں کہ وہ کون
مہوش ہے۔

لارڈ فاک وارڈ نے جواب دیا "شہزادی
ذسکا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ مجھے اس کی آنکھیں
پسند نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا "کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟
آخر اس کی آنکھوں میں کیا برائی ہے؟

راس کورٹنے نے ہنس کر کہا "صباحت تو
بہت ہے۔ ذسکا کی آنکھیں غضب کی رسیلی اور
ہوا س باختہ کر دینے والی ہیں جن کی تاب فاک
وارڈ نہیں لا سکتا۔ اس کو تو پھیکی آسمانی انگریزوں
جیسی آنکھیں زیادہ پسند ہیں۔ بہ نسبت مصری
غزالی آنکھوں کے۔

لارڈ فاک وارڈ نے بگڑ کر جواب دیا
"یہ بہتان ہے۔ مجھے تو ہلکی ہری آنکھیں بس ویسی

آنکھوں کی طرح پسند ہیں۔"

ڈین نے کہا "مس ہیلن میوری واقعی نہایت خوبصورت ہیں لیکن ان کا حسن معمولی ہے برعکس اس کے ذسکا کا حسن ......

کورٹنے نے لقمہ دیتے ہوئے کہا "غیر معمولی یہی میں اتنی دیر سے کہنا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں ذسکا سے زیادہ دلفریب صورت میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈینزل میوری کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک شریف خاندان کا حسین نوجوان تھا۔ وہ شدت سے محبت اور نفرت کر سکتا تھا۔

فاک وارڈ نے اس کو دیکھتے ہی کہا "غضب کا لباس ہے۔ واہ! واہ! واہ!

ڈنزل نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور کہا "اب آپ حضرات کیوں تیار نہیں ہوتے۔ دس بج رہے ہیں اور گیارہ بجے شہزادی ذسکا تشریف لائیں گی۔

مسٹر جسٹو نڈ نے چڑ کر کہا "شہزادی ذسکا کے علاوہ دیگر خواتین بھی تو آ رہی ہیں۔"

ڈنزل نے اُس پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا کہ ہاں ناچ میں دیگر خواتین تشریف فرما تو ضرور ہوں گی ورنہ ناچ کا حج کیسے نکلے گا مگر کیونکہ آج کل قاہرہ میں ذسکا سے زیادہ خوب رُو اور دلفریب دوسری ہستی نہیں ہے اور فطرتی امر یہ ہے کہ وہی مرکز توجہ خلائق ہوگی لہٰذا میں نے اس کا نام لیا کہ وہ گیارہ بجے تشریف لائیں گی۔

کورٹنے نے کہا "کیا انہوں نے آپ سے کہا ہے؟"

ہاں!

کورٹنے نے پہلے اوپر دیکھا، پھر نیچے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر اپنے آپ کو روک لیا۔ اور آخر ش فاک وارڈ کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر ڈین نے ڈنزل کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا "میں نے سنا ہے کہ اس ہوٹل میں مشہور و معروف مصور ارمنڈ جرولیس فروکش ہوا ہے"

ایک مسرت افزا مسکراہٹ کے ساتھ ڈنزل کا چہرہ چمک اٹھا۔ دنیا میں میرا سب سے گہرا دوست ہاں۔ وہ آیا ہوا ہے۔ آج ہی سہ پہر میں مجھ سے اس سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں لنگوٹیا ہیں اس کا پیرس میں مہمان رہ چکا ہوں اور وہ میرا اسکاٹ لینڈ میں مہمان رہ چکا ہے۔ نہایت دلچسپ آدمی خیالات میں فرانسیسی ہے لیکن وہ انگلستان سے بھی خوب واقف ہے اور انگریزی روانی سے بولتا ہے۔ (باقی)

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر

سرہی

صدرالمہام تعلیمات

شہاب

ناهید

ناہید

جلد ۸ | اسفندار ۱۳۵۴ ف م جنوری ۱۹۴۵ء | نمبر ۴

۱ - شعاع مہر - ایک عرصہ بعد نزہت سلطانہ تشریف لاتی ہیں، ان کی طرز نگارش سے آپ واقف ہیں - ایک مرتبہ اور پڑھیئے -

۲ - ویرانیاں - ساجدہ کا مختصر افسانہ ہے، غور کیجئے ڈگری ملنے کے بعد کیا کیا تخیلات ہوتے رہتے ہیں اور عموماً نتیجہ کیا نکلتا ہے -

۳ - غلط سلط - صغرا جنگ بہادر نے اچھا سرمایہ جمع کیا ہے مناسب یہ ہے کہ وہ ایک کتابی صورت میں اس کو طبع کرائیں -

۴ - احساس - نامکمل سہی مگر دیکھئے کہ ایک عورت کے ذمہ کتنے گھریلو ذمہ داریاں ہوتی ہیں، ورنہ شیرازہ ہی بگڑ جائے - ۵ - بیدار - آپ سے اپیل کیگئی ہے کہ خدا کی یہ نازک مخلوق اپنے فرائض کو پہچانے -

۶ - پریم پجارن - کا بقیہ فسایہ ہے شاید یہ آئندہ چل کر ختم ہو - ۷ - آپ مختصر مضامین کیوں نہیں بھیجتیں جو بیک وقت پڑھ لئے جائیں - نہ جانے طوالت میں کیا لطف آتا ہے -　　" ب "

شعاعِ مہر

نزہت سلطانہ

سکون انگیز یوں سے گزرتا ہوا متبرک مہینہ آخر کار ختم ہونے لگا۔ چاند کی بڑھتی ہوئی گولائی روز بروز کم ہوتے ہوتے ایک دن افق مشرق میں جذب ہو کر رہ گئی۔

اسی دوران میں اواخر بہار کی دلچسپ بارش کی ہلکی پھواریں اپنے قطرات سے فضا کی گرد کو دھوتی رہیں۔ سفید گلاب کے شگوفوں نے سبز پودوں کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ نرگس بیمار خاموش روش کے اداس کناروں میں کہیں سے جھانکتا، لالہ کے دل کے تازہ داغ نمایاں ہو چلے تھے۔ پانی کے خاموش قطرے آپ سے آپ سرخ بجریوں میں جذب ہو رہے تھے۔ آفتاب کی نرم چمکیلی کرنیں نارنگی کی کلیوں سے گزر کر چپ چاپ افق کے اس پار چلی جاتی تھیں۔ دریائے ژرون کے وسط میں تیرنے والی کشتیوں کے ملاح سست رفتار پانیوں میں ایسی تیزی سے گزر جاتے جیسے کوئی نامعلوم خوف ان کا پیچھا کر رہا ہو۔ میری خواب گاہ کے کھلے ہوئے دریچے افق پر چھائے ہوئے سبز گون آسمانوں پر اڑ نیوالے پرندوں کو اپنی مایوس نگاہوں سے تاکتے رہ جاتے۔ کائنات جیسے کسی کیف پرور دلنواز صبح کے انتظار میں بیتاب سی نظر آتی تھی۔ انتظار کے دامنوں میں چھپی ہوئی خوشیاں کہیں چپ چاپ مسکرا رہی تھیں۔ باغ کے دروازہ پر لہراتے ہوئے خوشنما پردوں میں نرم رَو ہواؤں کی خوشبودار جھونکے کھیلتے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتے اور یاسمن کے شگفتہ پھولوں کی جان نواز بو سے کمرہ مہک اٹھتا۔ لیکن میرا اداس اور کمزور دل اسی طرح ریشمی لحافوں کے سایہ میں دھک دھک کرتا رہتا۔

رات کی تاریکی میں چمکنے والے تاروں کی ہلکی ہلکی روشنیاں میرے بستر پر بکھرے ہوئے پھولوں کی طرح چمک اٹھتیں۔ چھوٹی سبز چڑیاں اڑتی ہوئی اپنے نشیمن میں جا چھپتیں اور ملیح میں خاموش تاریکی چھا جاتی۔ کھلے ہوئے دریچے سے۔ اونچے پہاڑ لہراتے ہوئے پانی اور ساکن درختوں کے سوا افق کی تاریکی تک

کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں افسردگی سے اپنی بے خواب آنکھوں
کو بند کر لیتی اور پھولدار تکیوں کو نرم بستر میں
اکٹھا کر کے اس میں اپنا تیز گرم چہرہ چھپا لیتی۔
زینے کی اونچائیوں پر کھلی ہوئی عشق
پیچاں میں ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ لہراتے
رہتے۔ اور ساتھ ہی نارنگی کی تیز بو کمرے میں
پھیل جاتی۔

چھوٹے بلب کی نیلی روشنی میں گھرے
رنگوں کی شیشیاں اپنی خوفناکیوں کے ساتھ
چمک چمک کر رہ جاتیں۔ رات کی خاموشیوں
میں کوئی چھپی ہوئی نامعلوم حرارت میرے
کمزور جسم کو آہستہ آہستہ جلاتی رہتی۔ یہاں
تک کہ ہلکی سیاہی میں سنہری ستارے رفتہ رفتہ
گم ہونے لگتے۔ اور رات کے آخری کناروں پر
سرخی ملی ہوئی سفیدی کا عکس سنہری تلواروں
کے سایہ میں تڑپتا ہوا نکل آتا۔ آبادیاں
جاگ اٹھتیں اور کائنات کا دامن نقرئی
آوازوں اور سنہری قہقہوں سے جگمگا اٹھتا۔
بغیر چاند کی اداس رات میں گذرتے ہوئے
ستاروں کا ہلکا عکس پانی کی خاموش لہروں پر
جھلک رہا تھا۔ دور کہیں دنیا اپنی آبادیوں
کے ساتھ مسرت خیز نغمے گا رہی تھی۔ نہ جانے
کس روز مقدس کی خوشی چپ چاپ دلوں کو
گدگدانے لگی تھی۔ نہ معلوم کس کیف پرور صبح
کا جان بخش تصور لوگوں کو بیتاب کئے ہوئے
تھا۔ خواب انگیز دنیا جاگ اٹھی تھی۔ یہ معلوم
ہو رہا تھا جیسے دن نکلنے سے پہلے ہی ناقابل
برداشت مسرتوں کے بوجھ سے دبے ہوئے
لوگ بستروں سے نکل آئے ہیں۔ معبود جانے
کس طرح یہ بیتابیوں سے بھری ہوئی ساکن
رات ختم ہو کر زبردستی کوئی مسکراتا ہوا سنہرا
آفتاب افق مشرق پر طلوع ہونے کے لئے
مچلنے لگا تھا۔ گنبد نیلگوں کے آخری کناروں
پر چمکدار اور رنگین کرنوں کے سایہ میں یہ
کونسی دلفریب صبح آپ ہی آپ چلی آ رہی
تھی۔ جس کے خیر مقدم کے لئے کائنات کا زرہ
زرہ بیتاب تھا۔ دلفریب روشنیوں کے
سایہ میں چھپا ہوا سنہرا آفتاب افق کی گہرائیوں
سے نکل آیا۔ کائنات خود بخود جاگ اٹھی۔
دریا کے قریب اُگے ہوئے سرخ پھولدار
درختوں میں صبح کے پرند کوئی بعید از فہم راگ
الاپ رہے تھے۔ سرمئی سڑک کے سایہ دار
کناروں پر خوشنما لباسوں میں مسکراتے ہوئے
ننھے بچے چہک رہے تھے۔ اداۓ فرض سے
سبکدوش ہو جانے والے جوق جوق عبادت گاہوں

کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ عبادت گزار چہروں پر اطمینان بخش مسرتوں کے نشان چمک رہے تھے۔ سورج کی تیز کرنیں سفید پانیوں پر مسکرا رہی تھیں۔ کنول کے پودوں میں رنگین مچھلیاں نہا رہی تھیں۔ عشق پیچاں کے آتشیں پھولوں میں سنہری مکھیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ کائنات خوشیوں کے دامن میں لپٹی ہوئی آپ سے آپ جگمگا رہی تھی۔

فکر و غم کے دیوتا نے شرما کر نہ جانے کس کونے میں اپنا منہ چھپا لیا۔ نیچے باغ میں کچھ اداس ہوا کے جھونکے چل رہے تھے پھولوں کی تیز خوشبوئیں کمرے میں مہک رہی تھیں روز مقدس کے اعزاز میں میری مسہری کے قریب رکھی ہوئی سفید مرمر کی چھوٹی تپائیوں پر مالی جا بجا پھولوں سے بھری ہوئی رنگین ٹوکریوں سے خوشبو نکل نکل کر فضا کو معطر کر رہی تھی۔ شیراز نے کئی خوشنما لباس روز سعید کے موقع پر استعمال کے لئے میرے پاس لا رکھے تھے۔ دروازوں کے پھول دار پردوں پر خوبصورت تیتریاں رقصاں تھیں۔ باغ کی کھلی ہوئی کھڑکی میں میری شریک افسردگی کے ساتھ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے دبائے بیٹھی تھی۔

دُور باغ کے روشوں پر بلبل کوئی اداس گیت گا رہی تھی۔ یاسمن کے سفید پھولوں میں سیاہ بھونرے بھنبھنا رہے تھے۔ میں نے ایک یاس انگیز نگاہ خوشنما لباسوں پر ڈالی اور چپ چاپ حوض کے درمیان فوارے سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی طرف تاکنے لگی۔ دفعتہً مجھے محسوس ہوا جیسے میرا ٹوٹا ہوا بیمار دل بھی کہیں اسی طرح چھپا ہوا آنسو بہا رہا ہے۔ اسے ایسے سرور انگیز دن کی مسرتوں سے کوئی سروکار نہیں۔

میری کتاب زندگی کے خاموش اور بیمار ورق الٹتے رہتے ہیں اپنی صحت کا خواب دیکھنے کی امید میں نہ جانے کب سے ایک نرم اور سفید بستر پر لیٹی ہوئی کائنات کی مسرت خیز مسکراہٹوں کو یاس انگیز نگاہوں سے تکتی رہتی ہوں۔

اندرون ۱۵ تاریخ پرچہ نہ پہنچے تو مکرر طلب کرلیں، کیونکہ اس کے بعد دفتر میں بدقت کوئی پرچہ نکل سکیگا۔

ویرانیاں

آنسہ ساجدہ - احمد محی الدین

سرور کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ جسے وہ بار بار دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ بی۔ اے کی ڈگری تھی جس کی تمنا میں وہ مرمٹا تھا۔ بی۔ اے کی ڈگری اف کتنا میٹھا لفظ تھا اس کے لئے۔ ہاں ہر لمحہ وہ اپنے نتیجہ کا منتظر رہتا تھا جب وہ گریجویٹ بن جائیگا تو پھر اس کی سوسائٹی میں کتنی قدر ہوگی۔ دن ورات کی گردشوں میں یہ بھی گردش کر رہا تھا امتحان کی تیاری کے لئے...... ! غرض نتیجہ نکلا۔ اخبار کے صفحات نے اس کے بھی گریجوئٹ ہونے کا اعلان کیا...... ! اس کا سر غرور سے بلند ہونے لگا۔ گھر والے سب شاداں وفرحاں تھے۔

اب وہ اس کاغذی ڈگری کو ہر محکمہ میں لیجا سکتا ہے۔ محکمہ والے اس کی طرف جلد متوجہ ہوں گے۔ اس کی صورت سے نہیں بلکہ اس کاغذ میں نہ جانے وہ کونسی جاذبیت ہوگی جو ایک معمولی انسان کو عزو افتخار سے ہمکنار کر دیتی ہے، وہ اپنے تصور میں کھویا ہوا تھا ——— !

" ایک بڑا بنگلہ ہے جس میں ایک شاندار باغ بھی ہے - اعلیٰ درجہ کا فرنیچر، حسین بیوی، خوبصورت بچے اس کے باغ کے پودوں کی طرح خوبصورت آباؤں کے گود کی زینت ہیں - گیرج میں ایک موٹر کھڑی ہے - چپراسی ہیں، نوکر چاکر ہیں - غرض ہر سُو ایک شادمانی ہے - عجیب نیرنگیاں ہیں زمانے کی، گریجویٹ بننے کے بعد وہ تحصیلدار ہو چکا ہے تحصیلداری سے ترقی پاکر تعلقدار بنے ہوئے سرور اپنی شان وآن سے اکڑ رہے ہیں - خاندان اس کی عزت کرتا ہے - منتظمین اس کا ادب کرتے ہیں - عہدہ داروں کی فہرست میں اس کا نام درج ہے " غرض وہ اپنی روانی میں بہا جا رہا تھا - انہی خیالات میں محو وہ آغوش خواب میں نیند کے مزے لینے لگا -

والدین خوش تھے حد درجہ خوش - ان کے لگائے ہوئے پودے نے آج درخت کی شکل اختیار کرلی جس کے ثمر سے وہ بھی بہرہ ور ہوں گے سرور کے والد صیغہ دار تھے ان کی اس قلیل آمدنی کے باوجود وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ایک عہدہ دار دیکھنا چاہتے تھے ——— وہ جو چاہتے تھے اس کیلئے

انہیں کافی قربانی کرنی پڑتی تھی۔ اور انہوں نے کی۔ اپنی اس قلیل آمدنی کے باوجود انہوں نے سرور کی تعلیم جاری رکھی۔ اس کے لئے انہیں کتنی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ ان کا دل جانتا تھا۔ خیر۔ گذرے زمانے یاد نہ آ۔ کے بہ مصداق وہ اب بیحد خوش تھے۔ اپنی منتوں مرادوں اور پیری مریدی کے نذرانوں میں مصروف۔ کیونکہ ان کی واحد امیدوں کا سہارا۔ ان کے بڑھاپے کا آسرا۔ ان کی نیکنامی اور شہرت کا ستارا بن کر چمکنے والا سرور اب گریجویٹ ہوگیا۔ ۱۲-۱۴ سال کی محنتوں کا پھل ـــــ ایک کاغذی ڈگری تھی جو ان کی غریبانہ زندگی سے بھی قیمتی تھی۔ وہ انہیں حاصل ہوگئی

سرور کے گریجویٹ ہوتے ہی ان کی خالہ آئیں اور اپنی بیٹی کا پیام لائیں۔ بہنا یہ تھا۔ لڑکی اچھی تھی۔ غربت سامانی کے ساتھ غریبانہ طبیعت پائی تھی۔ اس لئے رشتہ منظور ہوگیا۔ خالہ خوش خوش گھر گئیں۔ ان کا داماد گریجویٹ ہے۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ بیچارے گریجویٹ کو اس ڈگری کے چاٹتے ہوئے دن تھوڑے گزارنے ہیں۔ لیکن یہ ان پڑھ اور جاہل لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس سرداری مل گئی۔ جہاں کسی نے اس کاغذ کو دیکھا اور تعظیم کرنے لگے۔ سرور سعادت مند تھا۔ والدین کی بات رد نہ کرسکا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں نہ تھا جو چادر ملتے ہی پھاڑنے لگتے ہیں۔ اس کے خیالات عمدہ اور پاکیزہ تھے اور وہ اعلیٰ کردار کا حامل تھا۔

سرور کو گریجویٹ ہوئے (۶) ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کی ڈگری اس کے پاس ہی ہے وہ دم رفیق تو اب سانس کے ساتھ ہی رہیگی اس کے باوجود بھی وہ اب تک فکر معاش میں سرگرداں ہے۔ وجہ یہ بھی کہ ہر محکمہ میں اسے تیسرے درجہ کا گریڈ دیا جاتا تھا اور وہ اس کا خواہشمند نہ تھا۔ اتنی پابندیاں اور قیود تھے کہ سرور بیدل ہوگیا۔ والدین کے پاس اتنا اثاثہ نہ تھا کہ کچھ دھندا کرکے اپنی فکر دور کرتا۔ وہ تو اس کی تعلیم پر اتنا خرچ کرچکے تھے کہ ایک دنیا حیرت کرتی تھی۔ اگر بجائے خرچ کے جمع کرتے تو آج آزادانہ گذرتی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ تعلیم انسان کو حیوان بناتی ہے۔ سچ میں کلام ہونے کے باوجود وہ حیران تھا کہ کیوں تعلیم حاصل کرنے والوں پر اتنی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ عمر کی قید ہے۔ ڈگریوں کی قید ہے۔ علاوہ ان سب کے سرور کے پاس اثرات کی قید تھی۔ بس وہ اسی ڈگری سے محروم تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے وہ ناکام ہوتا گیا۔ دماغ پاشی کے سواء اس کے پاس اور کیا چیز تھی جو کام آتی۔ اس کی شادی بھی کیجا چکی تھی۔ آئندہ کی امیدوں پر خاندان

والوں کی ناعاقبت اندیشی نے اسے ایسے بندھن
میں گرفتار کردیا کہ وہ حالات سے مجبور ہو کر ۳۰
تا ۶۰ (تیس تا ساٹھ) پر نوکر ہو ہی گیا۔
اب سرور کو نوکر ہوئے (۶) سال گزر چکے
ہیں۔ اس کے (۵) بچے ہیں۔ ایک چھوٹا بند مکان
ہے۔ اس کی بیوی ہے بچے ہیں۔ بوڑھے ماں باپ
ہیں۔ وہ ہے اور ساری ویرانیاں ہیں۔ اس
۳۰ روپلی پر وہ اپنی زندگی صبر و شکر سے گزار
رہا ہے۔ البتہ اب اس کی صحت ویسی نہ رہی جیسی
پہلے تھی۔ وہ اب لاغر اور کمزور ہے۔ برسوں کا بیمار
نظر آتا ہے۔ دن بھر کی دفتری محنت کے بعد جب
گھر پہنچتا ہے تو گھریلو جھگڑے اور الجھنوں کو سلجھانے
کی تدبیریں ہوتی ہیں۔ وہ رہتا ہے اور اس کی
ناکام کوششیں۔ وہ ہے اور اس کی شکستہ تمنائیں۔
وہ ہر وقت سوچتا ہے کہ نوکری کو خیرباد کہہ کر کسی
گاؤں میں چلا جائے گا۔ کچھ قرض لے کر کاشتکاری
کرے گا۔ اس میں صرف جسمانی محنت رہے گی دماغی
الجھنوں سے تو نجات ملجائیگی جو اس کی صحت پر
بری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ بوڑھے ماں باپ
بھی اس کے سہارے جی رہے ہیں وہ جب یہ سوچتا
ہے کہ اس کی صحت جب بگڑے گی تو بیوی بچوں کو
الٹی خدمت کرنی پڑے گی۔ خدمت رہی الگ انہیں
دال روٹی دینے والا کون ہوگا؟ یہ سوچ کر سرد
آہیں نکل جاتی ہیں۔ ایک جان لاکھوں ارمان والا
معاملہ ہے۔ نہ جانے مجھ جیسی کتنی ہستیاں ہوں گی۔
کہتے ہیں آزاد قوموں میں زندہ دلی ہوتی ہے
کیوں نہ ہو وہ ہر فکر سے آزاد بھی تو ہوتے ہیں
مفلس ہندوستان میں افلاس کے یہ ڈھانچے
ہندوستان کو آزاد کرائیں گے؟ میری صحت اس
قابل نہ رہی کہ میں جسمانی محنت کرسکوں۔ فکر نے
سارے قویٰ کو مضمحل اور کھوکھلا بنا دیا ہے صحت سے
ہمت قایم رہتی ہے۔ ہر وقت کی پریشانی انسان
کے استقلال کو بھی کمزور بنا دیتی ہے" غرض اسی
طرح وہ اپنی ناکام آرزو لئے ہوئے رہ جاتا ہے
کوئی سرمایہ ایسا نہیں کہ اس کے بل بوتے پر
وہ اپنی تمنا پوری کرسکے۔ بس وہ جی رہا ہے روٹی
کی خاطر۔ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے خاندان کے
لئے۔ خاندان کی روٹی کے لئے۔ وطن کی ناموس
لئے ہوئے ——— !
اس کے پرانے دوست ملتے ہیں تو کہتے
ہیں۔ سرور یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے
کھاؤ پیو۔ ہنسو ہنساؤ۔ میاں زندگی ہنسنے ہنسانے
کا نام ہے۔ زندہ دل زندگی کا نام مسکراہٹ
دیتے ہیں" یہ بھی مسکرا دیتا ہے۔ ایک پھیکی سی
زرد ہونٹوں کی مسکراہٹ۔ ایک حقارت آمیز
مسکراہٹ۔ اس کے دوست سب صاحب جائداد

ہیں، وہ پریشانی سے ناآشنا بہلا رونا کیا جانیں ٹوٹے ہوئے دل کی ہنسی چہرہ پر تو ظاہر ہوتی ہے مگر ٹوٹی تمناؤں کے ساتھ۔ وہ مسکرا کر صرف اتنا جواب دیتا ہے۔

"دوست جی رہا ہوں۔ اپنی رفیق زندگی ڈگری کو لئے ہوئے"

بیدار رہو!

آنسہ محمودہ رضویہ (کراچی)

"بیدار رہو! خواتین ہند!! وطن کی مایۂ ناز دختران!!! بیدار رہو! کہ کئی اہم کام ابھی تک رکے ہوئے ہیں۔ تمہاری خوابیدگی کی وجہ سے بند ہو چکے ہیں! ......

سحر ہو چکی! اذاں کی آواز اندھیرے کے سینہ پر بہتی ہوئی آرہی ہے۔ مندروں میں ناقوس بج رہے ہیں۔ اور گرجاؤں سے آتی ہوئی گھنٹوں کی آواز سکوت شب کو توڑ رہی ہے۔ آزادی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ خوش نصیبی تمھیں ببانگ دہل پکارتی ہے۔ اور ترقی کا زینہ سامنے ہی نظر آرہا ہے۔ اٹھو! اور ان برکات خداوندی سے مستفید ہونے کی کوشش کرو!

انقلاب کی آندھیاں تمہارے احکام کی منتظر ہیں۔ غلامی کی زنجیریں بیک جنبش دست ٹوٹ جانے کو تیار ہیں۔ اور جور و استبداد تمہاری غصیلی نگاہوں سے سہما سہما!

اب بیدار بھی ہو کہ کئی ضروری کام تمہاری وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ کئی قافلے راہ میں ٹھہر گئے اور سینکڑوں مسافر منزل مقصود بھول گئے۔

اٹھو!!! ان تمام امور کو تکمیل پر پہنچا دو! ان قافلوں کو جرس آزادی سنا دو۔ اور گم کردہ راہ مسافروں کو راہ آزادی دکھا دو!

تم طاقت و عزم لے کر اٹھو! اور دہر کو درس حریت و آزادی پڑھا دو۔ دنیا کی نگاہیں تمہاری طرف اوٹھ رہی ہیں۔ خواتین ہند! اب وقت ہے کہ اپنی اہمیت کا کوئی ثبوت پیش کیا جائے۔ اپنی ہستی کو پہچانا جائے۔ اور اپنی قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔

اٹھو! اور برکات الٰہی بن کر دہر پر چھا جاؤ۔ اس کی رحمتوں کا مظاہرہ کرو۔ اور شفقتوں کا اعلان...... بیدار رہو۔ دختران ہند! کہ ایک دنیا کو تمہارا انتظار ہے۔

تبدیل پتہ سے دفتر کو ضرور مطلع کیجئے۔

"غلط سلط"

آنسہ صغرا جنگ بہادر

ہر ایک کو کچھ نہ کچھ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ ٹکٹ۔ مانو گرامس۔ میاچ لیبل وغیرہ لیکن میرا شوق کچھ عجیب قسم کا ہے یعنی جہاں کسی کی زبان سے غلط یا الٹا پلٹا لفظ نکلا اور میں نے فوراً اس کو اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ اس طرح سے کافی ذخیرہ ان الفاظ کا جمع ہو گیا ہے۔ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔ ایک دفعہ رات میں خوب زور کا مینہ برس رہا تھا۔ اس کے ساتھ گرج اور چمک اس قیامت کی تھی کہ دل دہلا جاتا تھا۔ ہم سب اپنے بستروں پر دبکے پڑے تھے، نیند تو کسی کو بھی نہیں آرہی تھی اور نہ ایسے طوفان میں باتیں کرنے کا ہی ہوش تھا۔ کہ خدا بھلا کرے ہماری بڑھی ماما کا کہ اس نے اس خاموشی کو توڑا، وہ بھی لیٹے لیٹے ایک دم اٹھ بیٹھی اور آسمان کی طرف منھ کر کے زور سے کہنے لگی "اٹی کیا کچ کیا جرگ ہے ماں۔ نینداچ نیں آری ہے" اس کا یہ کہنا تھا کہ ہم لوگوں کا ڈر و رسب ایکدم غائب ہو گیا پھر ہنسی کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو دو گھنٹہ تک یہی ہوتا رہا۔ اور ایک مرتبہ انہی بڑی بی صاحبہ کے چیخنے کی آواز آنے لگی، ہم نے دریافت کیا، کیا ہے۔ کیوں چیخ رہی ہو" بڑی فصاحت سے کہنے لگیں۔ " اٹی بی بی دیکھو نا چھوٹے بابو کو لڑکے گڈو کھاتے ہیں" ہیں یہ لڑکے گڈو کیا۔ میں نے پوچھا۔ تو کہنے لگیں۔ نہیں ماں۔ گڑ کے لڈو زبان پھسل گئی۔ اب مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ بھاگ کر اپنے کمرہ میں چلی آئی اور فوراً اس قابل قدر لفظ کا اضافہ اپنے نوٹ بک میں کر لیا۔ اچھا ایک اور واقعہ سنئے۔ ایک دفعہ ہم سب بہن بھائی بیٹھے گراموفون سن رہے تھے، اتنے میں بھائی جان نے کہا کہ "بھئی فریدہ! وہ ریکارڈ لگاؤ نا سہگل کا میں بھاگے گا ج سلا دوں گا" ارے باپ رے اس روز تو ہنستے ہنستے ہم لوگوں کا برا حال ہو گیا تھا۔ اس پر بھائی جان کا چڑنا اور لطف آرہا تھا۔ اور ایک مرتبہ آپا کہنے لگیں" فریدہ جلدی سے وہ ٹھوس کیس تو منگوالو" اچھا میں نے کہا ذرا ٹھیرئے۔ پہلے اپنے نوٹ بک میں ٹھوس کیس تو لکھ لوں۔ آپا جھلا گئیں کہنے لگیں" بس تمہیں تو ہر وقت یہی رہتا ہے" دیکھئے تو ذرا اگر ہیں یہ الفاظ جمع کرنے

تو پھر یہ مضمون کیسے بنتا ۔ ایک دفعہ کلاس میں حساب کا گھنٹہ ہو رہا تھا ۔ میری کاپی غائب تھی ۔ میں نے اپنی سہیلی سے پوچھا " میری کاپی کہاں ہے ؟" بڑی سنجیدگی سے جواب ملا " تمہاری آپا کا پا کے پاس ہے " یعنی تمہاری کاپی آپا کے پاس ہے ۔ اب بتایئے اس کے بعد ہم لوگوں نے کیسا حساب کیا ہوگا ۔ ہماری کلاس کی ایک اور محترمہ نے ایک دفعہ فرمایا ۔ دیکھو یہ میری دو ماہ کی فیس ہے مہر لو اور اسے شہر کی " اب بھئی ذرا بڑے بڑے لوگوں کا ذکر ہے اس لئے نام کسی کا نہیں بتاؤں گی ۔ ہاں الفاظ لکھدوں گی ۔ ورنہ آپ کا کیا جائیگا ۔ مفت میں ہماری مرمت ہوگی ۔ ایک موقع پر ہم کو اور ہماری سہیلیوں کو . . . . نے فرمایا تھا کہ بھئی آج کل کی لڑکیوں کو ناحرم ہے ناشیا " اور ایک دفعہ . . . . . . بڑے جوش سے اپنے سفر کا حال بیان فرما رہے تھے ۔ دوران گفتگو میں کہنے لگے ۔ " ایک سکنڈ کلاس کا ڈبہ سامنے ہی تھا ۔ بس میں الدی سے جندر چلا گیا " جب سب کے متعلق لکھ چکی تو اپنی بات کیوں چھپاؤں ۔ ایک دن میرے سر میں درد تھا ۔ بچے بہت گڑ بڑ کر رہے تھے ۔ میں نے ان سے کہا " بھئی باہر جا کر کھیلو نا " کیوں ؟" بچوں نے سوال کیا " اسلئے کہ میرے در میں سرد ہے " کہاں تک لکھوں ابھی میری نوٹ بک کا ایک صفحہ بھی ختم نہیں ہوا ۔ اچھا پھر کبھی سناؤں گی ۔ آقی بائیندہ ۔ ارے توبہ یعنی باقی آئندہ ۔

اقوال حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

جب کبھی میں نے حق اور حجت پیش کی اور اوس نے اوسے قبول کر لیا تو میرے دل میں اس کی ہمیشہ ہیبت اور مودت بیٹھی اور جس نے مجھے حق پر مکابرہ اور مجادلہ کیا وہ ضرور میری آنکھوں سے گر گیا ۔ تین کام بڑے ہی مشکل ہیں قلت میں سخاوت خلوت میں تقوی ، اور بیم و رجا کی جگہ سچ بات کہدینی ۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ ٹھنڈا پانی پینے سے انسانیت پر بٹا لگتا ہے تو میں کبھی پانی نہ پیئوں ، ناکردہ گناہ کا عذر کرنا اپنے ذمے گناہ لینا ہے ۔ بیوقوف آدمی اپنے مخالفین کی عزت اپنے اہل مذہب سے بھی زیادہ کرتا ہے وہ ریاکاری کے ساتھ دشمنوں کو دوست بنانا چاہتا ہے اور یہ ہو نہیں سکتا ۔ اپنے بھائی کو علٰحدگی میں سمجھانا نصیحت و زینت ہے اور علانیہ نصیحت کرنی رسوائی و بدنامی ہے جو قناعت پر راضی ہوا عجز اس سے زائل ہوا علم کی فضیلت میں یہ کافی ہے کہ بے علم اس کے مدعی ہیں اور جہالت کی برائی میں یہ کافی ہے کہ جاہل اپنے جہل کا منکر ہے ، جاہل کہلانے سے غصہ ہوتا ہے ۔

احساس

آنسہ معصومہ جنگ بہادر

جب میں چھوٹی سی تھی تو اکثر سوچا کرتی کہ یا اللہ امی کو کون سے ایسے کام کرنے پڑتے ہیں کہ جب دیکھو ہر ایک سے یہی کہتی ہیں کہ بہن کیا کروں فرصت ہی نہیں ہوتی، حالانکہ مجھ کو تو امی کا کوئی کام کرنا نظر نہ آتا تھا۔ ہاں صبح میں امی ماماجی کو غلہ ضرور دیتی تھیں، مگر وہ بھی خود مودی خانہ کے دروازہ پر کھڑی ہو جاتیں اور ماما غلہ تول کر لیتی اور کبھی سیتی ضرور تھیں۔ سینا بھی کوئی مشکل کام ہے اور وہ بھی مشین پر۔ اللہ کتنا اچھا لگتا تھا مشین پر سیتے وقت۔ کپڑا ہے کہ خود بخود کھسکتا چلا جا رہا ہے اور ہم بیٹھے آرام سے مشین چلا رہے ہیں۔ آخر امی مجھ کو کیوں نہیں دیتیں کپڑے سینے کے لئے۔ میں تو بہت اچھی طرح سے سی کر دوں گی۔

غرض کہ ہمیشہ یہی سوچتی رہتی لیکن عمر کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ اور اب سمجھ میں آ گیا کہ امی کیوں ہر چھوٹے بڑے کام کو بڑی فکر سے کرتی ہیں۔ عورت گھر کی ملکہ ہے۔ لہٰذا گھر میں ذرا بھی بدنظمی ہو گئی تو عورت ہی اس کی ذمہ دار ٹھہرائی جائیگی۔

امی جب کبھی بھی ایک دن بیمار پڑ جاتی ہیں تو ہم کو کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اور ہم کو گھرداری کے کام کی عادت نہ ہونے کی وجہ وہ وہ مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ ایک مرتبہ امی کو بخار آ گیا۔ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا تو تھا نہیں جو امی کا کام کچھ دنوں کے لئے سنبھال لے۔ لہٰذا ہمارے ہی کمزور کندھوں پر یہ بوجھ آ پڑا۔

صبح میں بستر سے اٹھتے ہی یہ خبر ملی کہ امی کو رات سے بخار آ گیا ہے۔ یہ سن کر میں جھٹ امی پاس پہنچی۔ مجھ کو دیکھتے ہی امی نے کہا کہ بھئی اتنی دیر سے اٹھتی ہو۔ جاؤ ناشتہ وغیرہ کا انتظام کرو۔ ورنہ تمہارے ابا کے دفتر کو دیر ہو جائیگی۔ میں وہاں سے سیدھی باورچی خانے کی طرف چلی۔ تاکہ دیکھوں کہ ماماجی نے کیا تیار کیا ہے۔ مجھ کو دیکھ کر ماما نے کہا بی بی" سرکار کیلئے انڈا تلوں؟ میں نے کہا کہ بھئی روز جیسا ابا کھاتے ہیں ویسا ہی تلو۔ جواب ملا کہ پانی ہیں

تلا ہوا انڈا کہاتے۔ گویا پانی میں بھی انڈا تلا جاتا ہے۔ اب کون ان کو سمجھائے۔ میں نے کہا کہ اچھا پھر جلدی کرو۔ ابا ناشتہ کے لئے آرہے ہیں۔ اتنے میں ابا کی آواز آئی۔ معصومہ! میں جی کر کے پہونچی تو ابا نے کہا تمہاری امی کو دودھ یا چائے کچھ دیگئی۔ میں نے کہا ابھی دیتی ہوں۔ میں نے دودھ کیلئے امی کے پاس پہنچی، امی نے پوچھا کہ تمہارے ابا کیا ناشتہ کر رہے ہیں۔ اور کوئی ہے بھی وہاں جی ہاں، صغرا وہیں ہیں۔ یہ کہکر میں سوچنے لگی کہ کیا ابا کے ناشتہ کے وقت کسی کا رہنا ضروری ہے خیر پھر کھانے کے کمرہ میں پہنچی تو ابا کہہ رہے تھے کہ آج انڈے میں نمک کیوں نہ ڈالا گیا۔ مجھ کو ماماجی پر بہت غصہ آیا کہ دیکھو تو آج امی ذرا پڑ گئیں ہیں تو ان لوگوں نے بھی لاپروائی شروع کر دی۔ خدا خدا کر کے ناشتہ سے فراغت ہوئی۔ میں نے ایک اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ کریم بی ماما نے کہا کہ منشی صاحب اور ڈرائیور کا ناشتہ دیدیجئے میں نے کہا تم لیلو نا؟ اوئی بی بی بیگم صاحبہ اپنے ہاتھوں سے دیتے ہیں۔ میں ان لوگوں کا ناشتہ دے کر ابھی اپنے کمرہ میں بیٹھی غور کر رہی تھی کہ روز امی کو کتنے کام کرنا پڑتے ہوں گے۔ میں اتنے ہی میں بولا کہلا گئی۔ اتنے میں ابا نے پکار کر کہا کہ جلدی سے بابا میرے پان تو بنا دو۔ پانوں کا نام سُن کر تو میرے حواس غائب ہو گئے۔ کیونکہ نہ معلوم کیا بات ہے کبھی بھی یہ پان کی گلوریاں میرے قبضہ میں نہ آئیں۔ کبھی تو یہ لمبی بانسری سی گلوری بنتی ہے اور کبھی بیچ میں سے ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ اور پھر ابا کے پان جو خاص طور کے ہوتے ہیں۔ پان بنانے کا کام تو میں نے صغرا کے سپرد کیا، اور میں واجد بابو کے کپڑے نکالنے چلی۔ جو بڑی دیر سے تقاضہ کر رہا تھا کہ آپا جان اسکول کا وقت ہو رہا ہے کپڑے دیجئے نا؟ پھر یہ آیا کیوں رکھی گئی ہے۔ بہنی کیا کپڑے بھی نہیں نکال سکتی پھر امی پاس بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی جو اس وقت درد سے بہت بے چین تھیں۔

امی نے کہا کہ گوشت کے لئے پیسے دیدو ورنہ کھانے کو دیر ہو جائے گی۔ میں نے کہا امی کیا منگواؤں۔ امی نے کہا بہنی کچھ بھی پکوالو۔ خیر جناب چلے سودے کے پیسے دینے پیسے نکالنے کے بعد جلدی میں کنجیاں صندوقچہ ہی میں ڈال کر بند کر دیں۔ اب سُنئے ہماری مصیبت۔ تھوڑی دیر میں آبا نے آکر کہا معصومہ ذرا اپنی امی کے صندوقچہ میں سے پانچ روپیہ تو نکال دو۔ اب میں گھبرائی یا اللہ کیا کروں کنجیاں تو اندر بند پڑی ہیں۔ اب کھولوں کیسے؟		(باقی)

محبّت

آنسہ پریم پجارن

(بسلسلہ سابقہ)

امی نے ہنس کر کہا۔ ارے تم دونوں شرما کیوں گئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آیا تم نے اپنی بہن کو سمجھایا یا نہیں؟

میں۔ جی ہاں اچھی طرح!

اوشا۔ ما دیکھئے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انٹرویو میں نہیں کرایا۔

امی۔ ارے میں بھول گئی تھی تم نے ایک دوسرے کو سلام پیام نہیں کیا۔ وینود یہ ہے میری لڑکی یعنی تمہاری بہن اوشا رانی۔ بیٹی یہ تیرے ایک رشتہ کے بھائی وینود کمار ہیں۔ اوشا نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

امی۔ ہاں تو وینود تم نے اوشا کو کس طرح پہچانا۔

میں۔ کس طرح سونچکر۔ بچپن کا بھولا پن ابھی ان میں پایا جاتا ہے۔ میں نے پہلی دفعہ اس کی طرف دیکھنے کی جسارت کی وہ مسکرائی ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے موتی بکھیر دیئے۔

تھوڑی دیر رسمی گفتگو کے بعد اوشا نے کہا۔ بھیا کالج کو دیر ہو رہی ہے۔ اب اجازت دیجئے۔ اس نے پھر پرنام کیا اور چلی گئی۔ آہ وہ کالج کو اکیلی نہیں گئی بلکہ اپنے ہمراہ میرا دل بھی لیتی گئی۔ میں تھوڑی دیر ٹھیر کر گھر چلا آیا۔ پھر امتحانات سر پر آگئے۔ مصروفیتیں بڑھ گئیں۔ میں ایک ماہ تک نہ جا سکا۔ جب کبھی فرصت ملتی تو اوشا کے تصور سے باتیں کرتا۔ کبھی سونچتا کہ اگر اوشا کو مجھ سے محبت نہ ہوئی تو ——! امتحانات ختم ہو گئے۔ ایک دن ماتاجی نے پھر مجھے ماما کرشن کے ہاں بھیجا، اور کچھ کہنے کو بھی کہا۔ میں سیدھا ہوا کی طرح وہاں پہنچا۔ دستک دی۔ اس آواز کو سُن کر میرے خوابوں کی دیوی خود ہاتھ میں قلم لئے آگئی۔

وہ — اوہو آپ نمستے!

میں — نمستے اوشا رانی کہو اچھی تو ہو۔

وہ — کرپا ہے آپ کی ——

میں — مامی اور ماما کہاں ہیں مجھے ماتاجی سے بہت ضروری کام ہے۔

وہ — دونوں باہر گئے ہوئے ہیں اس لئے
یہاں بیٹھیں۔ہم دونوں بیٹھ گئے۔پھر وہ کہنے لگی
فرمائیے پپا کو کیا کہنا ہے ہنس کر شاید کچھ ہونیوالا
ہو۔اچھا ٹھیرئیے میں کاغذ لے آتی ہوں آپ چھٹی
لکھ دیجئے پہنچا دوں گی۔وہ بجلی کی تیزی کی طرح
دوڑی گئی اور لے آئی میں سوچ سوچ کر لکھنے
لگا وہ مجھے برابر دیکھتی رہی۔ہاں چوری چوری
جب کبھی ہماری نظریں ملیتں تو وہ شرما جاتی۔خیر
خط لکھکر دیدیا وہ پھر مسکرائی اور دھیرے سے
کہا۔بہیا ایک بات کہوں ہنسوگے تو نہیں۔
میں — ہرگز نہیں، کہو۔
وہ — آپ نے فیض محمد صاحب کی انور
ہوں۔میں نے سر ہلا کر ہاں کہی۔تب معاف
کیجئے۔فیض صاحب نے آپ کو دیکھ کر ہی انور کے
فیچرز بیان کئے ہیں۔کیوں ٹھیک ہے نا۔میں
مسکرا دیا۔ہاں اپنی تعریف سن کر پھولا نہ سمایا
فیض صاحب نے اپنی ناول کے ہیرو کو ایک بہت
ہی خوبصورت نوجوان کے رُوپ میں پیش کیا۔
میں آخر پوچھ بیٹھا۔ اوشا رانی کیا واقعی میں
اتنا حسین ہوں۔آپ نے مبالغہ سے کام لیا اگر
سچ پوچھو تو انور کی ہیروئن کشور اوشا رانی کے
روپ میں وینود کے سامنے موجود ہے۔
وہ — پھر مسکرا کر۔بہیا یہ آپ اوشا
رانی کیوں کہتے ہیں صرف اوشا کہئے اور یہ آپ
آپ کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔تم کہئے
میں۔اچھا اوشا بس سمجھ میں آگیا —
دن گزرتے گئے۔ہم دونوں ایک دوسرے سے
کرتے تھے۔ہاں [illegible]۔اب میں ہفتہ میں ایک
دن ضرور اس سے ملنے جاتا۔ہماری محبت میں دن
دونی ترقی ہوتی گئی۔بی۔اے کے بعد تحصیلدار
ہوگیا — میں نے امی کو کہہ دیا کہ وینود ضرور
اوشا سے بیاہ کرے گا — میں نے اوشا سے
بھی کہہ دیا۔وہ خوش تھی۔بے انتہا۔ہم اپنے
مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے روز نئی نئی
باتیں سوچتے۔کبھی اوشا کہتی۔وینود ہمارا مستقبل
کتنا شاندار ہوگا۔میں اسے ستانے کے لئے کہتا تھا۔
ایک دن میں نے اوشا کے ستانے کے لئے کہا۔
میں — اوشا فرض کرو اگر سماج ہمارے
درمیان حائل ہو جائے اور ہم ایک دوسرے سے
ہمیشہ کے لئے الگ کردئے جائیں تو کیا ہوگا۔
میرے منھ سے یہ الفاظ سن کر وہ کانپ اٹھی اور
تڑپ کر کہنے لگی۔آہ وینود ایشور کے لئے یہ نہ کہو
میں بن موت مر جاؤں گی۔میں خوب ہنستا اور
کہتا۔پگلی۔میں تو تجھے ستا رہا تھا۔
(باقی)

3238
REGD. M. N. O

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر (۱۲۲)

نئی کتابیں

۱۔ فتراک ۲۔ چیخ

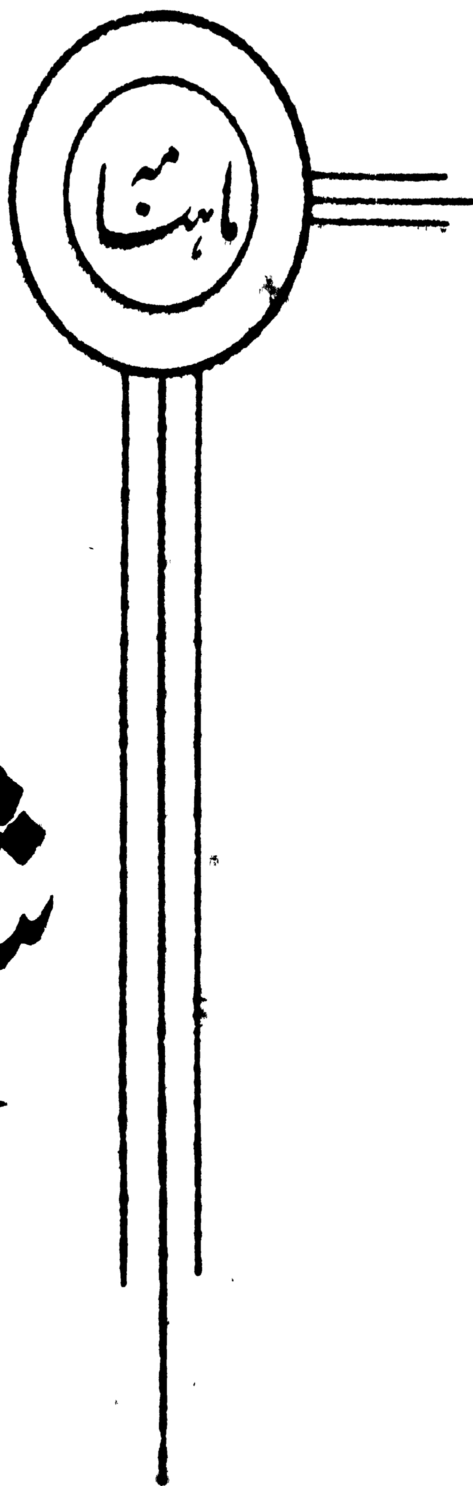
افسانے اور مضامین

مُصنفہ جہاں بانو ایم۔ اے

قیمت اور مقام کا انتظار کیجئے۔

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب بیرونِ حیدرآباد سے شائع ہوا

فروری



شہاب

شہاب

جلد ۳ فروردی ۱۳۵۴ف م فبروری ۱۹۴۵ء نمبر ۵

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے چندہ سالانہ (للعہ) گورنمنٹ سے (عمہ)

"ایّام جاہلیت"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی اے (امرتسری)

(بسلسلہ سابقہ)

اس نے کہا کہ پہلے ہی فراہم ہو چکا ہے۔ آپ فکر نہ کریں سب آرام کی نیند سوئیں گے" قصیر تو اپنا سامنہ لے کر رہ گیا، اور جذیمہ ملکہ کے ساتھ محل کی طرف روانہ ہو گیا، شام کے وقت یہ لوگ وہاں پہنچے، اور جذیمہ کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ محل میں اتارا گیا، جذیمہ کو اپنی تنہائی کا خیال رہ رہ کر آتا رہا لیکن اسے یقین ہو گیا کہ قصیر کا ڈر بالکل بے بنیاد تھا، ملکہ کتنی حسین ہے خیالات کا ہجوم اس کے دل و دماغ پر ہو رہا تھا کہ اتنے میں ایک لونڈی آئی اور جذیمہ کو جشن مہمانی میں شمولیت کی دعوت دی، جذیمہ اس کے ساتھ اوٹھ کر دوسرے وسیع کمرہ میں گیا۔ جہاں حسن اپنی پوری شان میں جلوہ افروز تھا، ملکہ اوٹھ کر استقبال کے لئے بڑھی اور جذیمہ کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر اپنے پہلو میں جگہ دی، ملکہ کے اشارہ پر راگ رنگ کی محفل گرم ہو گئی، اس کے ساتھ خوبصورت عورتوں کا رقص اور دور شراب نے جلدی ہی جذیمہ کو مدہوشی کے عالم میں پہنچا دیا لیکن خون اس کی رگ سے فوارہ کی طرح اٹھ رہا تھا

اس نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھولیں تڑپا اور وہیں سرد ہو کر رہ گیا۔

قصیر جذیمہ کی ناعاقبت اندیشی پر افسوس کر رہا تھا لیکن اب بھی احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، تمام لشکر میں اعلان کیا گیا کہ کوئی سپاہی ہتھیار کھول کر نہ سوئے، طلایہ پر سخت پہرہ بٹھا دیا۔ اور خود بھی چند جوانوں کے ساتھ گشت کرتا رہا، ایک تو سفر کی کوفت دوسرے نشہ شراب جو فیاض میزبان ملکہ نے کافی سے زیادہ بہم پہنچا رکھی تھی۔ یہ لوگ ایسی لمبی تانے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئے، آدھی رات کا وقت تھا کہ حسب قرارداد ملکہ کی سپاہ نے ان پر شبخون مارا، سب کا نشہ ہرن ہو گیا، حملہ ایسا اچانک اور زبردست تھا کہ اگر سپاہی ہتھیار بند نہ ہوتے تو وہیں کھیت رہتے قصیر نے دیکھا کہ مقابلہ بے سود ہے اس لئے لڑتا بھڑتا پیچھے کی طرف ہٹا۔ ملکہ کا لشکر تعاقب میں تھا۔ کچھ شک نہیں کہ سپاہ کا ایک حصہ غفلت میں مارا گیا لیکن قصیر بقیۃ السیف کو بچا کر نکل آیا۔ دشمن کی تعداد زیادہ تھی اور تعاقب

سرگرمی سے ہو رہا تھا۔ کچھ تو اندھیری رات نے پردہ داری کی اور کچھ قصیر کے حزم و احتیاط نے مدد دی۔ صبح ہوئی تو قصیر نے دیکھا کہ دشمن ابھی تک تعاقب میں ہے، بھاگ کر جانیں بچانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا آفتاب بلند ہو رہا تھا اور اس وقت ایک دوڑ تھی جو فریقین میں بازی کی صورت میں تھی، وفادار عربی گھوڑے اور اونٹ سواروں کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے قصیر نے دیکھا کہ اس کے سامنے حیرہ کی جانب گرد اوٹھ رہی ہے۔ پہلے تو اسے پریشانی ہوئی کہ چالاک دشمن نے انہیں سب طرف سے گھیر لیا ہے، لیکن جب پرچہ لگا کہ عمرو بن عدی حیرہ کی فوج کے ساتھ یلغار کرتا ہوا آ رہا ہے تو جان میں جان آئی، اور ہمراہیوں کو ٹھیرنے اور صفوف آراستہ کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں دشمن بھی قریب آ لگا۔ اور مقابلہ پر قصیر کو آمادہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اتنے میں عمرو بھی قصیر کے ساتھ مل ہو گیا۔ اب دشمن نے خیر پسپائی میں دیکھی، عمرو اسی جوش و خروش میں حملہ کرنا چاہتا تھا، لیکن قصیر نے روک دیا اور کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تم بیشک جذیمہ کے جائز وارث ہو لیکن آخر متبنیٰ ہو۔ تمہارا حریف اور ہمنام عمرو بن الجن حیرہ میں ہے، جذیمہ مارا گیا۔ اور یہ خبر ہم سے پہلے وہاں پہنچیگی۔ اور تم جانتے ہو کہ جذیمہ کا قبیلہ عمرو بن الجن کی حمایت کرے گا، اور اس وقت دشمن سے لڑنا بھی خطرہ سے خالی نہیں عمرو نے کہا کہ کیا تمہاری غیرت گوارا کرتی ہے کہ میں اپنے ماموں کے خون کا بدلہ نہ لوں قصیر نے کہا کہ جذیمہ کے خون کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ لیکن اگر ملکہ لڑائی میں کام آئی تو یہ کوئی بدلہ نہیں۔ بدلہ کے لئے وہی حیلہ کام میں لانا چاہیئے جو ملکہ نے استعمال کیا ہے، اور اگر ہم لڑیں اور ملکہ بچ کر نکل جائے تو بدلہ کی حسرت ہمارے دلوں میں رہ جائے گی۔ عمرو تمہیں معلوم نہیں کہ الزباء معمولی دل و دماغ کی عورت نہیں اس کا تجربہ کر چکا ہوں، یاد رکھو کہ شمشیر وہ کام نہیں کر سکتی جو تدبیر سے بغیر خون ریزی کے نکل سکتا ہے، غرض قصیر نے سمجھا بجھا کر عمرو کی حیرہ کی طرف رہنمائی کی، یہاں پہنچے تو جذیمہ کی موت کی خبر مشتہر ہو چکی تھی، اور اس کی قوم ابن الجن کی طرف مایل پائی گئی مگر قصیر کی حکمت عملی سے بگڑا ہوا کھیل پھر بن گیا اور عمرو بن عدی اپنے ماموں کی جگہ بادشاہ تسلیم کیا گیا۔

جذیمہ کی بہن رقاش نے بھائی کے مرنے پر کچھ جزع و فزع کی اس کا تذکرہ فضول ہے، ایسے وقت میں عمرو نے اسے "عدی" کی آمد کا مژدہ سنایا اور چند روز کے بعد خود عدی اس سے آملا۔ اس لئے وہ جلدی ہی بھائی کے غم مفارقت کو بھول گئی،

اب قصیر اور عمرو ملک کے اندرونی انتظام اور بالخصوص لشکر کی تربیت میں لگ گئے۔ حیرہ کی حدود کو وسعت دی گئی اور نو آباد بھی وقتاً فوقتاً اس میں آکر آباد ہوتے گئے، ان کے تجارتی قافلے اب ملک شام وفارس میں آنے جانے لگے اور حیرہ ایک متمول شہر بن گیا۔

ادھر ملکہ الزباء بھی غافل نہ تھی۔ اس نے بھی اپنے لشکر کی تربیت شروع کردی، اس کے بھی تجارتی قافلے دُور ونزدیک جاتے اور مالا مال ہو کر آتے، اگرچہ جذیمہ کے واقعہ قتل کو ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا، اور ملک کے امن میں کوئی خلل واقع نہ ہوا لیکن الزباء کی آنکھوں کے سامنے ابھی تک وہ صورت پھر رہی تھی جو اس نے اپنے باغ میں دیکھی تھی۔ اور صرف تھوڑی دیر کے لئے لیکن اس صورت کا نقش اس کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ اس نے اپنی مملکت کے طول وعرض میں تلاش کی اور آپ بھی کونہ کونہ کا دورہ کیا۔ مگر کہیں نظر نہ آئی، آخر وہ کاہنہ کے پاس گئی اور اس سے دریافت کیا کہ وہ کون تھا اور کیا اس کے ملنے کی امید ہے؟ کاہنہ نے کہا کہ اس کا جواب سُننے کی ضرورت نہیں تم خود دیکھ سکتی ہو۔ اتنا کہہ کر وہ اٹھی وہ الزباء کو ایک تختہ کی طرف متوجہ کیا جو مربع لبصورت کا تھا اس ۳ پر سفید ی تھی جس کے مرکز میں ایک سیاہ دائرہ تھا۔ کاہنہ نے کہا کہ تھوڑی دیر اس سیاہی پر نظر جماؤ پھر جو کچھ دیکھو مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گی، الزباء نے اس سیاہ گول داغ پر نگاہ جمائی۔ اس نے دیکھا کہ یہ روشن ہو رہا ہے، اس پر بیہوشی سی طاری ہوگئی۔ پہلے تو یہ سیاہ دائرہ روشنی کے چکروں میں مبدل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے وہی صورت اسی لباس اور اسی وضع قطع میں باغ کی روشوں پر چلتے پھرتے دیکھی، وہ چلا اٹھی "یہی ہے یہی ہے" اور پکڑنے کے لئے اٹھی لیکن کاہنہ نے اسے بٹھا دیا، اب اس کے سامنے وہی تختہ اپنی پہلی حالت پر تھا۔ الزباء نے کہا کہ "نہیں نہیں وہی صورت پھر دکھاؤ"، کاہنہ نے کہا کہ ملکہ اگر تم اس طرح بے صبری سے کام لوگی تو تمھیں کچھ بھی معلوم نہ ہوگا" ملکہ نے کہا کہ اچھا میں اب نہ بولوں گی تم مجھے اس سے ملادو، میں اس کے سر پر تاج شاہانہ رکھ دوں گی، اور خود اس کی ملکہ بنوں گی" کاہنہ نے کہا کہ اپنے خیالات کو اسی سیاہ گولہ کے مرکز پر جمع کردو" الزباء نے دوبارہ اس سیاہی میں اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اب اس نے دیکھا کہ وہی خوبصورت چہرہ سامنے ہے لیکن اب اس کے سر پر تاج ہے" ملکہ پھر اس کی طرف لپکی۔ اور پھر وہ طلسمی کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ اور وہی تختہ سامنے پہلی حالت پر

نظر آیا۔ کاہنہ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے لیکن آپ نے اسے دیکھ لیا، وہ زندہ ہے اگر زندہ نہ ہوتا تو آپ کو دکھائی نہ دیتا۔ وہ ضرور آپ سے ملے گا اور جیسا کہ آپ نے کہا ہے اس کے سر پر تاج ہوگا۔ ملکہ نے پوچھا کہ تم نے یہ نہ بتایا کہ وہ کون ہے کاہنہ نے کہا کہ میں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ یا تو بادشاہ ہے یا کوئی شہزادہ یا بہت بڑا امیر، اور اگر آپ معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ وہ کون ہے تو اپنے مشیروں سے بادشاہوں اور شہزادوں کا حلیہ پوچھیں جو اس صورت کے مطابق ہوگا وہی ہوگا۔" ملکہ کی تسلی ہوگئی۔ جب اس نے بڑے بڑے آدمیوں کا حلیہ مشیروں سے دریافت کیا تو اسے معلوم ہوگیا کہ وہ صورت جس کے دیکھنے کو وہ تڑپتی ہے جذیمہ کا بھانجہ اور جانشین ہے۔

الزباء نے کاہنہ سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ "وہ تمہارا قاتل ہے۔" لیکن الزباء پہلے ہی قتیل عشق تھی۔ اس نے کاہنہ کے مشورہ کو کچھ اہمیت نہ دی، وہ خود بھی ایک سیاسی چال سے واقف تھی اس نے ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو عمرو بن عدی کو ضرور اپنے قبضہ میں لاؤں گی، اس نے اپنے سفیر عمرو کے دربار میں تحائف کے ساتھ بھیجے قصیر کے مشورہ کے مطابق عمرو نے تحائف قبول کرلئے اور پھر سفیروں کے ذریعہ بیش قیمت تحائف روانہ کئے،

دونوں حریف سلطنتوں میں تجارتی معاہدہ ہوگیا۔ اور اب دونوں طرف کے تجار مال و اسباب لے کر آنے جانے لگے۔ کچھ عرصہ اسی طرح گذر گیا۔ ایک دفعہ الزباء کا قافلہ تجارت حیرہ میں وارد ہوا قصیر نے دعوت دی، جب سب لوگ جمع ہوگئے تو آسانی سے سب کو گرفتار کر لیا۔ یہ کام اس سرعت اور خاموشی سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی چند دنوں کے بعد قصیر نے ایک قافلہ تیار کیا۔ اور مال و اسباب لاد کر الزباء کے دارالحکومت کی طرف روانہ ہوگیا۔ عمرو بھی ہمراہ تھا۔ جب یہ قافلہ منزل مقصود پر بوقت شام پہنچا ملکۂ الزباء خود دیکھنے کے لئے آئی۔ لیکن اس کی حیرت اور پریشانی کا اندازہ کرنا مشکل ہے جب اس نے دیکھا کہ یہ قافلہ اس کا اپنا نہیں ہے۔ وہ اس وقت عمرو بن عدی کے لشکر کے نرغہ میں تھی۔

شط فرات پر چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔ ملکہ کے ہمرکاب جو سپاہی تھے مارے گئے۔ مگر الزباء نرغہ سے نکل آئی اور سیدھی اپنے محل میں داخل ہوگئی۔ عمرو کا لشکر تعاقب میں تھا۔ اس نے محل کا محاصرہ کر لیا اور معمولی مزاحمت کے بعد محل میں داخل ہوگیا قصیر نے محل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن الزباء کہیں نظر آئی قصیر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ الزباء سرنگ میں

داخل ہوکر جب دریا کے کنارے آئی تو ایک حسین نوجوان کو اپنے سامنے خنجر بکف دیکھا، ملکہ ٹھٹک کر رہ گئی، وہ سمجھ گئی کہ قضا سر پر کھیل رہی ہے کاہنہ نے سچ کہا تھا کہ عمرو تیرا قاتل ہے ۔ دونوں کچھ عرصہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، چاند ان کے حسین چہروں پر نور برسا رہا تھا۔ آخر عمرو نے کہا "نائلہ تمہارا آخری وقت تمہاری شہ رگ کے قریب ہے، اور آج میں اپنے ماموں کے خون کا بدلہ لے رہا ہوں، جسے تم نے اپنے دام فریب میں پھنسا کر قتل کیا، تمہاری سیاہ لمبی زلفیں تمہارے چہرہ پر پریشان ہو رہی ہیں، اور اس پریشانی کا پتہ دیتے ہیں جو تمہارے دل میں ہے، تم جانتی ہو کہ خون کا بدلہ خون ہے، میری تلوار کسی بے گناہ کے خون میں کبھی رنگین نہیں ہوئی تمہارا جرم ثابت ہے، بولو تم نے میرے ماموں کو کس طرح مارا۔ آج تم کو اسی طرح مرنا ہے" الزبا نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا "عمرو، میری بات کا یقین کرو، میں نے تمہارے ماموں کو قتل نہیں کیا" عمرو چلا اوٹھا اور کہا "دغا باز عورت تو جھوٹ بولتی ہے" الزبا نے کہا کہ "سنو، اس وقت میں تمہارے قبضہ میں ہوں اور تم مجھے قتل کر سکتے ہو، میں مرنا جانتی ہوں، میں بزدل نہیں، بات یہی سچ ہے جو میں نے کہی

بلا شبہ میری نیت بخیر نہ تھی۔ میں جذیمہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ برص میں مبتلا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے احترام کے ساتھ اپنے ہاں قید میں رکھوں اس وقت تک کہ وہ پختہ عہد آئندہ لڑائی موقوف کرنے کا کرلے۔ رات اس نے شراب اس کثرت سے پی کہ خون ہو کر بہہ گئی، اب میرا خوف وخطر دور ہو چکا تھا۔ میں نے یہی کچھ کیا جو تمہیں معلوم ہے تمہارے لشکر پر شبخون مارا۔ لیکن ۔ لیکن عمرو تم سچ کہو۔ تمہارا دل اجازت دیتا ہے کہ تم مجھے ایک جھوٹی افواہ پر اعتبار کرتے ہوئے قتل کرو۔ بے رحم عمرو، کیا تیرا دل گواہی نہیں دیتا کہ ۔ کہ تیرے سامنے ایک ۔ ایک عورت کھڑی ہے ۔ جس کے پہلو میں نسوانی دل ہے کیا تیرا دل گواہی نہیں دیتا کہ یہ دل تیری نذر اس وقت سے ہو چکا ہے جب تو میرے باغ میں دیوانہ وار گھس آیا تھا۔ اور اگر یہ کیفیت نہ ہوتی تو تو میرے باغ سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا" عمرو کا ہاتھ آہستہ خنجر کے ساتھ نیچے ہوتا گیا۔ ملکہ نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "بے رحم قاتل، مجھے نہایت خوشی ہے، ہاں اس وقت اپنے آخری لمحوں کو خوش ہو کر الوداع کہہ رہی ہوں کہ تو میرا قاتل ہے کوئی اور نہیں، لے اب اپنا کام کر" ملکہ نے

اپنا سینہ کھول دیا جس پر چاند پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ "تو کس لئے رک گیا ہے، میں سچ کہتی ہوں کہ تیرے ہاتھ سے قتل ہونا تیرے بغیر زندگی بسر کرنے سے خوشتر ہے۔" عمرو نے کہا کہ "ملکہ، میں تیری بات کا یقین کرتا ہوں کہ تو میرے ماموں کی قاتل نہیں، لیکن لوگوں میں یہ مشہور ہو چکا ہے کہ تو نے اس کی رگ ہفت اندام کاٹی، اور جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ تو میرے قبضہ میں تھی اور میں نے تجھے یوں ہی چھوڑ دیا تو اپنی قوم کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔" الزباء نے کہا کہ بہتر ہے کہ تم مجھے قتل کرو، اور اپنی قوم کے سامنے سرخرو ہو جاؤ۔" عمرو نے کہا کہ نہیں، جب مجھے تمہاری عصمت کا یقین ہے تو میں تمہیں قتل نہیں کروں گا، ملکہ، تم آزاد ہو، جہاں جی چاہے جاؤ۔" اتنا کہہ کر عمرو نے منہ پھیر لیا۔ اور چند قدم گیا تھا کہ الزباء نے دوڑ کر دامن پکڑ لیا اور گھٹنے کے بل ہو کر کہا کہ بے رحم عمرو، اب مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے میں نے اپنا سینہ تیرے خنجر کے لئے کھول دیا، ممکن تھا کہ اس کی نوک پر میرا دل شہید محبت کی خونی داستان آئندہ نسلوں کو سناتا لیکن تو نے مجھے اس ابدی مسرت سے محروم رکھا۔ اور اب دامن چھڑا کر جا رہا ہے۔ نہیں، نہیں، تو نہیں جا سکتا۔ میں نے اتنے سال تیری تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی۔ اتنے سال کس طرح بسر کئے کچھ میرا ہی جی جانتا ہے، بے رحم عمرو، اگر تو مجھے قتل نہیں کرتا، تو ایک لمحہ کے لئے ٹھیر جا میں خود اپنا سینہ چاک کر کے اپنا دل تجھے دکھاتی ہوں" اتنا کہہ کر ملکہ نے خنجر نکالا۔ لیکن عمرو نے پیش دستی کر کے خنجر چھین لیا۔ ملکہ نے کہا کہ اگر تو مجھے قتل نہیں کرتا اور نہ مجھے خودکشی کی اجازت دیتا ہے تو یہ فرات ہے، عمرو جاؤ، جاؤ، میں تمہیں نہیں روکتی، بھلا میرے کمزور ہاتھ جسے محبت نے اور کمزور کر دیا ہے تمہیں کیسے روک سکتے ہیں، جاؤ اور مجھے فرات میں ڈوبنے دو، اپنی قوم کو کہہ دینا کہ میں نے نائلہ کو مار کر دریا میں لاش بہا دی۔" عمرو نے دونوں ہاتھوں سے ملکہ کو اٹھایا اور کہا "نائلہ تمہیں معلوم ہے کہ باغ میں جب ہماری آنکھیں چار ہوئی تھیں تو تم کہا ہوں نے دونوں کا پیغام جو کچھ دیا، وہ پیغام تم نے صاف صاف لفظوں میں سنا دیا، اب میری باری ہے، نائلہ اٹھو، اٹھو، دیکھو دیوانگی چھوڑو۔ ابھی مجھے قوم کو منہ دکھانا ہے، آؤ میرے ساتھ چلو۔" ملکہ نے کہا کہ مجھ میں چلنے کی سکت نہیں، تم جاؤ، میں یہیں تمہارا انتظار کروں گی، اور مناسب ہے کہ تم نہ آؤ، میری محبت تمہاری عزت پر قربان ہو رہی ہے۔" ملکہ کے

منہ سے یہ الفاظ نہایت نحیف آواز میں نکلے، اور وہ عمرو کے کاندھے سے لگی بیہوش ہوگئی، عمرو نے اسے اٹھالیا اور سرنگ کے دھانے میں داخل ہوگیا۔

قصیر نے جب محل میں ملکہ کو نہ پایا تو باغ میں نکل آیا اور اِدھر اُدھر آدمی باہر بھی تلاش کے لئے بھیج دئے، وہ ایک درخت کے نیچے تھک کر بیٹھ گیا۔ چاند کا نور چھن چھن کر برس رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک بیہوش عورت کو اٹھائے زمین سے برآمد ہورہا ہے وہ گھبرا کر اٹھا، لیکن اوس نے جلدی ہی عمرو کو پہچان لیا جو اب محل کے دروازہ میں داخل ہورہا تھا، قصیر پیچھے پیچھے آیا۔ عمرو نے ملکہ کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اتنے میں قصیر پہنچ گیا، عمرو نے کہا کہ یہ ملکہ الزباء ہے؛ قصیر نے حیران ہو کر کہا کہ "ابھی تک زندہ ہے؟" عمرو نے کہا کہ بیہوش ہے، شاید بچ رہے، قصیر نے کہا "کیا کہا! شاید بچ رہے؟" عمرو نے کہا کہ جب تم تمام ماجرا سنوگے تو تمہاری بھی یہی خواہش ہوگی، تم مجھے یہیں چھوڑ دو، اب لوگوں میں اس کا اعلان کردو؛ قصیر سر جھکائے ہوئے باہر نکل آیا۔ اور عام امن کا اعلان کردیا۔

چند روز توقف کے بعد عمرو معہ ملکہ الزباء حیرہ میں واپس آیا، قوم اور رقاش کو جب تمام واقعات کی اصلیت معلوم ہوئی تو قوم اور مصاہبہ قبائل عمرو کی جوانمردی کے گرویدہ ہوگئے اور رقاش کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی کہ ایسی حسین و جمیل ملکہ اس کے بیٹے کی زوجہ تھی؛ ایسے بیٹے کی جو والدین کو مفارقت کے بعد مل چکا تھا۔ ایام جاہلیت کی خصوصیات ابھی تک عالم انسانی کی اکثریت میں نمایاں ہیں، لیکن ایک بات نہیں، یعنی صداقت، شجاعت، سخاوت، ضیافت کا وہ مفہوم جو ان ایام میں زندگی کو "رومانی" بنا رہا تھا۔

رُباعی

قدموں میں ترے گڑی ہیں لاکھوں آنکھیں
رستہ میں ترے پڑی ہیں لاکھوں آنکھیں
پیوند سمجھ رہا ہے تو۔ آکے تو دیکھ
گدڑی میں مری جڑی ہیں لاکھوں آنکھیں

امجد حیدرآبادی

نقد و نظر

جناب عطا رضا صاحب

ایک روز کسی کام پر دل نہ لگا تو وقت گزارنے کے خیال سے پرانے رسالہ جات و کاغذات کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے رسالہ پیام ادب بابتہ ماہ مارچ ۱۹۴۴ء میرے ہاتھ لگا۔ اس کو حسن اتفاق کہئے یا سوء اتفاق کہ کتاب کھولتے ہی صفحہ ۳۷ میں ایک نظم پر نظر پڑی عنوان "آہ جوانی" دیکھ کر طبیعت للچائی یہ سمجھ کر کہ ضرور دلچسپ اشعار ہوں گے ایک بار دوبارہ تین بار غرض اس کو کئی بار پڑھا بدقسمتی سے ہر بار میرے شکوک و شبہات میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ہرچند سوچتا رہا کہ اس نظم کے مصنف مولوی علی اختر صاحب تخلص اختر پرانے مشاق شعرا میں مقبول و مشہور شاعر ہیں ان کے اشعار میں سہو یا غلطی کیسے ہوسکتی ہے لیکن کسی طرح دل کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔ یہ تمام شکوک واللہ اعلم میری اپنی کج فہمی کے نتائج ہیں یا فی الاصل کوئی غلطی بھی ہے۔ بہرحال جو کچھ میرے شبہات ہیں اون کو عرض کرتا ہوں۔

(آہ جوانی)

یاد ہیں اختر مجھے اب بھی جوانی کے مزے		وہ جوانی کے مزے تھے زندگانی کے مزے

"جوانی کے مزے اب بھی یاد ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ اب جوانی باقی نہ رہی۔ "جوانی کے مزے" کی تکرار نے شعر کو بے مزہ کردیا میرے ایک دوست نے سنا تو فوراً مصرعہ ثانی کو اس طرح بدل دیا۔ ع جس سے حاصل تھے سراسر زندگانی کے مزے۔" اب دونوں مصرعوں میں ربط پیدا ہوگیا لفظی تکرار کی بے لطفی بھی رفع ہوگئی۔

زندگی افسانہ ہے عہد جوانی شام عیش		ہیں اسی شب کی فضا میں اس کہانی کے مزے

"زندگی کو افسانہ اور عہد جوانی کو شام عیش کہنا مہمل ہے۔" اوس کہانی کے مزے" اشارہ ہے افسانہ کی طرف۔ مگر شاعر نے خود زندگی کو افسانہ قرار دیا ہے۔ افسانہ کے معنی ہیں حکایات گزشتہ و مشہور و چیزے بے اصل (بہار عجم)

مکر دی گوش بر گفت کسے اکنون کہ شد عاشق		پئے خواب از فغانی ہر شبے افسانہ می جوید (فغانی شیرازی)

زندگی کے معنی ہیں جینا یا گزران ؎

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی		کیوں تیرا راہ گزر یاد آیا! (غالب)

پس ظاہر ہے کہ "زندگی افسانہ ہے" کے معنی احوال زندگی افسانہ ہے کے نہیں ہوتے اس لئے دوسرا مصرعہ بے ربط ہو جاتا ہے مصرعہ ثانی کے اعتبار سے زندگی کا افسانہ یا افسانہ زندگی کہنا چاہئے تھا کیونکہ زندگی افسانہ ہے کے معنی ہوں گے زندگی بے اصل و بے حقیقت چیز ہے۔ فَضَا اُردو اور فارسی میں بمعنے بہار یا کیفیت مستعمل ہے "شب کی فَضَا" بے معنی ہے۔

عشق اور اوس کے لطائف خواب سے کر رہ گئے		بجھ گئے وہ ولولوں کی پرفشانی کے مزے

لطائف جمع ہے لطیفہ کی۔ ہر اچھی چیز کو لطیفہ کہتے ہیں اردو اور فارسی میں اس کا استعمال پسندیدہ باتوں کے معنی میں ہوتا ہے۔ ؎

لطیفۂ زسر صدق گو ہمیت عرفی!		بسنج اگر بدونیک متاع میدانی! (عرفی شیرازی)

"عشق اور اوس کے لطائف" درست نہیں لطائف عاشقی یا عاشقی اور اوس کے لطائف کہنا چاہئے۔ بجھنا علاوہ معنی معروف کے افسردگی طبیعت کے واسطے کنایہ بھی ہے دونوں معنی اس شعر سے واضح ہوں گے ؎

پانی طبیب دے ہے ہمیں کیوں بجھا ہوا		ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا (ذوق)

پس "مزے بجھنا" اردو میں نہیں بولتے "پرفشانی" بمعنی ریختن پر۔ پر جھاڑنا ؎

دراں حریم کہ صائب چراغ کلک افروخت		ز پرفشانی پروانہ یک چراغ نماند (صائب اصفہانی)

"ولولوں کی پرفشانی" بے معنی ہے۔ بفرض غلط ولولہ اگر کسی پرندے کا نام ہے تو اوس سے اور اوس کی "پرفشانی کے مزے" سے ہم ناواقف ہیں۔

اُف کسی کا خندۂ پنہاں وہ ہنگام سکوت		ہائے وہ تقریر میں گوہرفشانی کے مزے

"خندۂ پنہاں" کے ساتھ "ہنگام سکوت" کا جوڑ بے جوڑ اور بے لطف ہے۔ تقریر و تکلم کی صفت گوہرفشانی تو صحیح مگر حرف ظرف "میں" کے استعمال سے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔

احتیاط حسن پر اکثر گمانی اجتناب		وہ ہجوم شوق اور وہ بدگمانی کے مزے

احتیاط بمعنی استوار کردن گرد چیزے برآمدن و بہوش کارے کردن (منتخب اللغات) احدواد

فارسی میں اس کا استعمال بُرے کام اور بُری باتوں سے بچنے اور پرہیز کرنے کے معنی میں بھی ہوتا ہے لہذا "احتیاط حسن" مہمل ہے گمان بہ معنی شک تو ظاہر ہے گمانی رام ایک مارواڑی کا نام بھی سنا مگر "گمانی اجتناب" نہ سنا نہ کسی کے کلام میں دیکھا۔

اب کہاں وہ عیش کی راتیں بہاروں کے وہ دن
بادہ نوشی کے لطیفے بارخوانی کے مزے

لفظ "بار" کے اہل لغت نے اٹھائیس۲۸ معنی بتائے ہیں شعرائے متقدمین ومتاخرین نے بائیس۲۲ مصادر کے ساتھ اس کا استعمال کیا ہے مثلاً بار آمدن - بار آوردن - بار انداختن - بار بردن - بار برداشتن - بار خواستن - بار گرفتن وغیرہ مگر مصدر خواندن کے ساتھ کسی نے اس کا استعمال نہیں کیا ؟ آخر یہ "بارخوانی" کیا چیز ہے جس کے مزے جوانی کے ساتھ ختم ہو گئے۔

وہ کمال غم میں ہونٹوں پر تبسم کی جھلک
نامرادی میں وہ حسن کامرانی کے مزے

"کمال غم" یعنی شدید اور انتہائی غم - کیا "کمال غم" میں کوئی ہنستا یا مسکراتا بھی ہے یہ تو بالکل فطرت انسانی کے خلاف ہے - جھلک کے معنی ہیں عکس یا پرتو یا کچھ کچھ روشنی ؎

دور سے دیکھی جھلک جو عارض پُرنور کی
بام جاناں پر نظر آئی تجلی طور کی (ناسخ)

عارض تاباں کی جھلک یا تبسم میں در دنداں کی جھلک تو کہتے ہیں مگر "ہونٹوں پر تبسم کی جھلک" مہمل ہے - مصرعۂ ثانی کی ابتدا میں "وہ" کا اضافہ سہو کتابت ہے - "نامرادی میں کامرانی کے مزے" اجتماع ضدین اور بے معنی ہے لفظ حسن محض وزن شعر کی خاطر ہے ورنہ "حسن کامرانی" کے مہمل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

درد پنہاں میں سکون زندگی کی لذتیں
زہر غم میں وہ شراب ارغوانی کے مزے

"درد پنہاں" اگر عشق ومحبت کے لئے کنایہ ہے تو اوس سے سکون زندگی کی لذت حاصل ہونے کا دعویٰ لغو ہے ہجراں نصیب عاشق ہی درد پنہاں میں مبتلا رہتا ہے بغیر وصل سکون زندگی کی لذت اوسے کہاں نصیب۔

وہ نظر ملتے ہی دل میں بجلیوں کا اک ہجوم
دل فروشی کے زمانے جاں فشانی کے مزے

"دل میں بجلیوں کا ہجوم" مہمل - "دل فروشی" بے معنی - دل فروختن فارسی کا کوئی محاورہ نہیں - بصیغہ جمع "دل فروشی کے زمانے" غلط در غلط - جاں فشاندن بہ معنی مردن مستعمل ہے۔

ع در ہوائے کام دنیامی فشانی جان چرا (صائب)

البتہ جان برکسے فشاندن کے معنی ہیں کسی پر جان فدا کرنا۔

ع ہمہ تن جان شوم وبرتو فشانم چوں شمع (کاتبی نیشاپوری)

پس "جان فشانی کے مزے" لغو ہے۔

ہائے وہ بے تابیاں وہ اہتمام شام وصل میزبانی کی وہ خوشیاں میہمانی کے مزے

"میزبانی کی خوشیاں" بصیغۂ جمع فصحا کی زبان نہیں "میہمانی کے مزے" کا تعلق میزبان سے ہوسکتا ہے نہ کہ خود میہمان سے۔

وہ حدیث شوق سن سن کر کسی کی شوخیاں مسکراتی۔ جھومتی۔ گاتی جوانی کے مزے

یہ عجیب وغریب جوانی ہے جو مسکراتی بھی ہے اور جھومتی گاتی بھی ہے۔ ایسی نادر الوجود جوانی کا کیوں نہ ماتم کیا جائے۔

خاک ہو کر رہ گئیں عہد طرب کی لذتیں خواب فکر چھن گئے وہ شادمانی کے مزے

خاک ہونا کے معنی ہیں کسی شئی کا سڑ گل کر مٹی ہو جانا ؎

خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار ایک ساعت مثل ریگ شیشہ ساعت نہیں (ذوق)

تلف یا ضائع ہونے کے معنی ہیں خاک میں ملنا یا خاک میں مل جانا کہتے ہیں۔

خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئے اٹھ گئی دنیا سے راہ ورسم یاری ہائے ہائے (غالب)

لہٰذا "عہد طرب کی لذتیں خاک ہو کر رہ گئیں" غلط اور بے معنی ہے "لذتیں" مادی چیز نہیں جو خاک ہو کر رہ جائیں۔ مصرعہ ثانی کے وزن میں جو خرابی پیدا ہے اوس سے قطع نظر "خواب فکر" بے معنی اور "مزے چھن جانا" غلط ہے۔ مزہ چھین لینے کی چیز نہیں۔

حسن بھی اختر نہیں اب مژدۂ ذوق حیات اب کہاں وہ زخم قلب خونچکانی کے مزے

مصرعہ اول بے معنی ہے۔ ذوق کے معنی ہیں لذت۔ نشاط اور چاشنی ؎

غیر کئے لذت درد من محزوں داند ذوق ایں بادہ کسے تا نچشد چوں داند (امیرخسرو)

مژدہ کے معنی ہیں خبر خوش پس حسن کو لذت حیات کی خبر خوش قرار دینا سراسر مہمل ہے حسن بھی اب باعث ذوق حیات نہیں ہے کہتے تو مصرعہ بامعنی ہوتا۔ زخم دل زخم جگر تو کہتے ہیں مگر "زخم قلب"

اُردو یا فارسی میں مستعمل نہیں۔ "خونچکانی" میں یائے معروف کا الحاق غور طلب ہے خونچکان اسمِ مفعول یا صفت مشبہ ہے جس کے معنی ہیں خون چکیدہ ؎

خنجر سے سینہ چیر اگر دل نہ ہو دو نیم دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہ ہو (غالب)

پس لفظ "خونچکانی" کی صحت میں کلام ہے۔ بالفرض "خونچکانی" کو صحیح مان بھی لیا جائے تو "خونچکانی کے مزے" مہمل ہے۔

نظم تو یہاں ختم ہو گئی مگر اس کے بعض خصوصیات قابل اظہار ہیں۔ یہ نظم گزری ہوئی جوانی کی یاد میں ایک مرثیہ ہے اسی مناسبت سے عنوان "آہ جوانی" تجویز فرمایا گیا ہے۔ اشعار بھی تعداد میں تیرہ ہیں۔ بجز شعر نمبر ۲ کے باقی بارہ اشعار میں کہیں ایک مصرعہ میں کہیں دونوں مصرعوں میں اور کہیں ایک ہی مصرعہ میں دو جگہ حرف اشارہ (وہ) کا استعمال بالا لحاظ ضرورت معنوی کیا گیا ہے عجب نہیں کہ قدامت پسند اصحاب اس کو حشو و زوائد کہہ کر ناپسند کریں اور عیب لگائیں مگر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دور تجدد ہے زبان و بیان اور ادب و شعر کا ذکر ہی کیا تہذیب و تمدن مذہب و ملت اور احکام شریعت میں بھی آئے دن نت نئے اختراعات ایجادات اور بدعات ہوتی رہتی ہیں پھر کیا قباحت ہے اگر اس کو صنائع لفظی کی ایک جدید صنعت قرار دیا جائے۔

غزل

جناب تُراب علی خاں صاحب بازؔ

زخمِ دل کا دکھا نہیں سکتا
آپ کا دل دکھا نہیں سکتا

خود تو میں دیکھتا ہوں جلوۂ دوست
پر کسی کو دکھا نہیں سکتا

ترے احسان اس قدر ہیں دوست
بار سے سر اٹھا نہیں سکتا

درد ان کو دکھائیے کیوں کر
ہاتھ دل سے اٹھا نہیں سکتا

دوستوں سے تو جھک کے ملتا ہوں
سرکسی سے جھکا نہیں سکتا

عشق نے یہ ادب سکھایا ہے۔
خوف سے لب ہلا نہیں سکتا

میری مجبوریاں معاذ اللہ
درد ہے اور دکھا نہیں سکتا

اِن حسینوں کے دام ہیں بیکار
بازؔ قابو میں آ نہیں سکتا

ڈسکا

جناب سید نورالحسن صاحب بی۔ اے

(بسلسلۂ سابقہ)

سرچٹوونڈ نے کہا "خدا پناہ میں رکھے!

خیالات میں فرانسیسی ہے سے کیا مطلب؟

ڈاکٹر ڈین نے جواب دیا "جرویس فرانسیسی نژاد ہے تو اس کے خیالات اگر فرانسیسیوں کی طرح ہوں تو اس میں متعجب ہونے کی کیا بات ہے۔

سرچٹوونڈ نے منھ بناتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس جیسے قابل مدیر کا مذاق اڑایا جارہا ہے کہا فرانسیس ہو یا نہ ہو۔ فرانس میں آج کل جن اصولوں اور نظریوں کا پرچار کیا جارہا ہے وہ اخلاق سے گری ہوئی باتیں ہیں۔ فرانس کے جرائد اور اخبارات کی ذہنیت نہایت پست ہوگئی ہے۔ ڈنزل نے ہنس کر کہا" اور انگلستان کے رسائل اور اخباروں کا کیا حال ہے۔ اُن کی حالت تو اور بھی تکلیف دہ ہے" سرچٹوونڈ ایسی باتیں خصوصاً انگلستان کے خلاف حملے برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اب کمرے میں سوائے ڈین اور ڈنزل اور کوئی نہیں تھا۔ یہ عجب جوڑا تھا۔ ایک دبلا پتلا، منحنی سا آدمی پروفیسر کے ہلکے پھلکے لباس میں، دوسرا نہایت وجیہہ خوبصورت متناسب الاعضاء نوجوان فلورنس کے شرفاء کے فوق البھڑک لباس میں۔ ڈاکٹر نے نہایت ملائم لہجہ میں ڈنزل کو یوں مخاطب کیا۔

" میرے پیارے بچے، جو کھیل تم کھیل رہے ہو، نہایت خطرناک ہے۔ اس کا انجام بخیر نہیں ہوگا۔ تم ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہو، ایک خواب کو حقیقت سمجھے ہوئے ہو۔ تمہارا دل اس خواب کی تعبیر نہ پاکر ٹوٹ جائے گا۔ تمہیں سوائے تکلیف اور آزار قلب کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ تم نے غالباً یہ نہیں سوچا کہ تم اپنی بہن کا بھی دل توڑ دو گے۔

ڈنزل اس کرسی پر بیٹھ گیا جس کو سرچٹوونڈ خالی کرکے ابھی ابھی کمرے کے باہر گئے تھے۔ اس نے دل کی گہرائی سے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور کہا" ہیلن کو ابتک کچھ نہیں معلوم۔ مجھے خود کچھ معلوم نہیں اور کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ جو کچھ میرے دل میں ہے اگر میں اُس سے سب کچھ کہہ دوں تو مجھے یقین ہے کہ وہ میری وارفتگی اور دیوانگی پر قہقہے

لگانے لگی۔ تم اکیلے ہی ہو جس پر میرا راز فاش ہوا ہے۔ پچھلی شب جب میں اُس کو اس کے دولتکدہ پر چھوڑنے گیا تھا تم نے مجھ کو دیکھ لیا۔ لیکن میں اُس کے محل کے پھاٹک کے اندر نہیں گیا۔ اس نے مجھ کو پھاٹک میں داخل ہی نہیں ہونے دیا اُس نے مجھے باہر ہی سے خدا حافظ کہہ دیا۔ ایک نوکر نے اُس کے لئے دروازہ کھولا اور وہ شب بخیر کہہ کر اس طرح نظروں سے مستور ہو گئی جیسے کوئی جادو گرنی یا بھوت غائب ہو جاتا ہے۔ بعض وقت مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھوت ہے۔ وہ اس قدر سفید، اس قدر ہلکی اور اس قدر خوبصورت ہے کہ فوق البشر معلوم ہوتی ہے اور چلتے وقت پاؤں کی چاپ بھی سنائی نہیں دیتی۔

اُس نے شدت جذبات سے شرماتے ہوئے اپنی آنکھیں دوسری طرف پھیر لیں۔ ڈاکٹر ڈین نے کہا " ہاں اکثر میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فوجی بینڈ بجنے لگا اور بیسیوں مرد اور عورتیں طرح طرح کے لباس میں بھانت بھانت کے بہروپ اور سوانگ میں ہنستے کھیلتے خوش گپیاں کرتے ناچ کے کمرے میں جانے لگے۔ اس جم غفیر میں ایک نوجوان نمایاں نظر آتا تھا۔ اس کا قد بالا۔ اکھڑی اکھڑی طبیعت، اُلھڑ اُلھڑ انداز۔ قدرے حیوانی قدرے انسانی حسن مختصر یہ کہ دوسروں سے خد و خال، انداز و اطوار میں بالا و برتر، متقضائے طبیعت کا یہ عالم کہ ہر شخص اس کی طرف دیکھتا اور محو حیرت ہو جاتا اور لوگ اس کی خصوصیات کے متعلق چپکے چپکے تبادلہ خیالات کرنے لگتے وہ اس موقع پر ایک بدوی سردار کا لباس پہنے ہوئے تھا، اس کی تیز سیاہ آنکھیں گھونگھریالے سیاہ بال، گندمی رنگت صافے اور عربی ہوا میں لہراتے ہوئے سفید لباس سے خوب میل کھاتے تھے۔ صرف کمر میں پیازی رنگ کا کمر پٹہ تھا جس میں خنجر اور کٹار لٹکے ہوئے تھے وہ کمرے میں تیزی سے داخل ہوا۔ اور ڈونزل میبورن کے پاس پہنچا۔

اس نے فرانسیسی لہجہ میں انگریزی بولتے ہوئے ڈونزل کو یوں مخاطب کیا " اوہو ڈونزل تم یہاں ہو یار کیا غضب کا لباس پہنا ہے۔ تمھیں اپنے حُسن کا ایسا ہی احساس ہے جیسا کسی پری چہرہ دوشیزہ کو ہوتا ہے۔ میری طرف دیکھو کس قدر سیاہ لباس پہن رکھا ہے۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور مزے سے اپنی کرسی سے اوچھل کر اوٹھ کھڑا ہوا۔

آؤ یار آؤ۔ میں تمہارے سادہ لباس کو پسند کرتا ہوں۔

(باقی)

نجومی

جناب شوکت علی خان صاحب ایم۔ اے (حیدر آباد)

میرا ہوٹل تاج محل جیسا عالیشان تو نہیں البتہ سمندر کے کنارے ضرور واقع ہے۔ یہاں کا منظر نہایت حسین اور روح پرور ہے۔ بالکل سامنے بحر بیکراں ہے جس کی جوانی کے ارمانوں کی طرح کوئی حد نہیں۔ جس کا سینہ چیرتے ہوئے دن رات جہاز گزر جاتے ہیں، جس کے وسط میں ایک روشنی گھر زبردست امواج کے تھپیڑوں کو سہتا ہوا یوں کھڑا ہے جیسے عزم استقلال رکھنے والا انسان طوفان حوادث میں گھر کر بھی پریشان نہ ہو۔ ساحل پر اونچے اونچے تاڑ کے درخت ہیں جن پر برسات میں گھنگھور گھٹائیں منڈلاتی رہتی ہیں۔ اطراف گھنے جنگل ہیں جن کے خاموش گوشوں میں چھپ کر ابھاگن کوئل ساون میں من کی رام کہانی سناتی ہے۔ جو لوگ شہر کے ہنگامہ آرائیاں پسند نہیں کرتے وہ سکون اور سکوت کی تلاش میں یہاں آجاتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں خوب دھما چوکڑی مچتی ہے۔ حسینوں کا جمگھٹ رہتا ہے۔ شراب کے دور پر دور چلتے ہیں شرم وحیا کے پردے اٹھتے ہیں اور عصیاں کے چھینٹے پاک دامنوں کو داغدار کرتے ہیں۔ اس گناہ آلود زندگی کی یہ پرچھائیاں ممکن ہے آپ کے لئے قابل نفرت ہوں لیکن میری آنکھیں تو ایسے نظاروں کی عادی ہو چکی ہیں میرے کان اب شرابیوں کی ہذیان گوئی سے پریشان نہیں ہوتے۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر یہ زندگی ایک سفر ہے اور اس سفر کی ایک ہی منزل ہے تو پھر یہ مسافر اس قدر بھٹکے ہوئے کیوں پھرتے ہیں۔ ایک ہی راستہ پر کیوں نہیں چلتے۔ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا اور میں پھر ہوٹل کے کاروبار میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

چاندنی راتیں مجھے بیحد پسند ہیں شاید آپ کو بھی ہوں۔ لیکن مجھے آپ کی طرح اس لئے پسند نہیں کہ ان کے وسیع پھیلاؤ میں پھولوں کی سیجیں، دو گورے گورے حنا بستہ ہاتھ اور افشردۂ انگور سے زیادہ کیف آور شراب سے لبریز دو متوالی آنکھیں

کے پیمانے بہت بھلے لگتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ایسی راتوں میں ہوٹل کی آمدنی دوگنی چوگنی ہو جاتی ہے۔ میں تجارت پیشہ ہوں اور ہر کاروباری آدمی کی طرح مجھے دولت جمع کرنے کی ہوس ہے۔

گرمیوں کی ایک حسین چاندنی رات تھی۔ میں اپنے آفس میں سگریٹ کا دھواں اڑا رہا بیٹھا تھا۔ بال روم سے آرکسٹرا کے مست انگیز نغمے آبشار کے سرمدی گیت بن کر نکل رہے تھے اور ساحل سے ٹکرا کر لوٹنے والی موجیں انھیں گھسیٹ کر افق کی طرف لیجا رہی تھیں دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا — دراز قامت، گورا رنگ، کشادہ پیشانی، جذباتی ہونٹ، پتلی ناک، — پریشان بال، داڑھی اور مونچھوں کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے بہت زیادہ معمر معلوم ہوتا تھا۔

کیا میں اندر آسکتا ہوں۔

"ضرور تشریف لائیے۔" میں اس کی وجاہت سے مرعوب ہو گیا۔

وہ ایک کرسی گھسیٹ کر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ ہوا کا تیز جھونکا اندر آیا اور اس کے خوبصورت بال جھوم کر پیشانی پر آگئے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا

"یہاں کوئی کمرہ مل سکیگا — چار آٹھ روز کے لئے۔"

میں سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے۔

"ارادہ فرمایئے۔ میں ابھی آپ کی رہائش کا انتظام کئے دیتا ہوں۔"

میں نے کال بل بجائی۔ بیرر کو ضروری ہدایات دیں اور پھر اس مسافر سے مخاطب ہوا۔

"شاید آپ بمبئی پہلی مرتبہ آئے ہیں؟"

"جی نہیں — بمبئی میں تو ایک عرصہ سے مقیم ہوں۔ البتہ آپ کے ہوٹل میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ میں کاروبار سے تھک گیا ہوں۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔"

"آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"جی نہیں۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا کوئی ساتھی نہیں۔"

نوجوان یکایک بہت متاثر ہو گیا۔ دستی سے عینک کے شیشوں کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے امید ہے آپ مزید سوالات نہ کریں گے۔"

میں ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ہرنش آ گیا۔ ہرنش میرے ساتھ الفنسٹن کالج میں

بڑ رہتا تھا۔ بہت آزاد منش تھا۔ پینے پلانے کا شوقین۔ گانے بجانے کا دلدادہ۔ سیر سپاٹوں کا دیوانہ —— بہت رنگین زندگی تھی اس کی۔ وہ نہایت شکیل بھی تھا۔ کالج کی اکثر لڑکیوں نے اس کے قدموں پر محبت کے پھول بچھائے تھے۔ مگر وہ ان کو روندتا ہوا نکل گیا۔ کسی ایک کا ہو جانا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا۔ پھول کا جوبن جلد ختم ہو جاتا ہے۔ جب وہ مرجھا جائے تو میں یہ نہیں سوچتا کہ اس کا رس میری ہوسناکیوں نے چوسا ہے۔ میں ایسے شاعرانہ خیالات میں اپنا وقت صرف نہیں کرتا۔ میں فوراً کسی دوسرے نوشگفتہ پھول کا انتخاب کر لیتا ہوں۔ گلزار ہستی میں پھولوں کی کمی نہیں۔

"ہلو شیو دیال" وہ مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا "رات بسر کرنے کے لئے کوئی کمرہ مل سکیگا۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ ہوٹل کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صرف ایک کمرہ خالی تھا اور میں اس میں نو وارد مسافر کا سامان رکھوا چکا تھا۔ میرے لئے ممکن نہ تھا کہ ہریش کی دوستی کی خاطر کمرے میں رکھا ہوا سامان باہر نکال کر پھینک دوں۔ میرے لئے یہ بھی دشوار تھا کہ ہریش کو ٹکا سا جواب دیدوں۔

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کمرہ تمہارے لئے چاہیئے؟"

"ہاں میرے اور سوشیلا کے لئے"

"تو گویا تم نے شادی بھی کر لی"

"نہیں!"

"پھر یہ سوشیلا کون ہے؟"

"ایک تیتری —— میں اسے ابھی اندر لاتا ہوں"

ہریش باہر گیا اور نوجوان سگریٹ کو آش ٹرے میں رگڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے آپ کی پرائیوسی میں مخل نہ ہونا چاہیئے" وہ بولا

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔ آپ یہیں بیٹھیں —— ایک سوال کی اجازت"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کا نام؟"

"نریندر"

اس کے ہونٹ پھر اس طرح بند ہو گئے جیسے کچھ کہنے کے لئے کھلے ہی نہ تھے۔ ہریش سوشیلا کو ساتھ لے آیا۔ اس کا تعارف مجھ سے ہوا، اور میں نے ان دونوں کا تعارف نریندر سے کروایا۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں

ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ بات چیت میں پہل کوئی دوسرا کرے۔ آخر نریندر سے مخاطب ہو کر سوشیلا بولی۔

"یاد پڑتا ہے کہیں آپ کو دیکھا ہے۔"

"مجھے یاد نہیں۔"

"شاید پونہ میں"

"ممکن ہے!"

"لیکن اس وقت آپ کے چہرے پر داڑھی مونچھ نہ تھے۔"

"تب تو آپ نے کسی اور کو دیکھا ہوگا۔"

"میری ایک سہیلی منورما پونہ میں رہتی ہے۔ اس کے پاس بالکل آپ سے ہم شبیہ نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"جی ——"

نریندر اٹھ کر باہر چلا گیا اور ہم سب اس کی بد اخلاقی پر دنگ رہ گئے۔ بظاہر وہ بہت سنجیدہ اور مہذب معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی باتوں میں حد درجہ کی تلخی اور روکھا پن تھا۔ پھر بھی اس کے متعلق میں کوئی قطعی رائے قایم نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ دس پندرہ منٹ کی ملاقات کے بعد ہی کسی کی طبیعت اور فطرت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ آدمی کو پہچانتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر دھوکا ہوتا ہے۔

سوشیلا فتنہ ساز ہنگاموں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"آج رات گزارنے کے لئے آپ کے ہوٹل میں کوئی کمرہ مل سکیگا۔"

"مجھے افسوس ہے اس وقت کوئی کمرہ خالی نہیں۔"

ہریش کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"اب کہاں جائیں گے سوشی"

"گھر"

"لیکن ——"

"پھر کسی دن"

سوشیلا نے ہریش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کمرے کے سبز ریشمی پردے آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ نچلی منزل میں آرکسٹرا بند ہو گیا اور گھڑیال نے بارہ کی گجر سنائی میں دونوں کو تنہا چھوڑ کر گیلری میں چلا آیا

"مسٹر شیو دیال۔ آپ کے ہوٹل میں نریندر کب تک قیام کریں گے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سوشیلا اپنی مہین ساڑی کے پلو سے کھیلتی ہوئی میرے پاس ہی کھڑی تھی۔

"آٹھ روز"

"میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔آج ہریش ساتھ تھے۔اس لئے میں ان سے کچھ پوچھ نہ سکی۔ان کی طویل خاموشی میں مجھے کوئی لمبی کہانی چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے ان کی آنکھیں کسی کے تصور سے بوجھل ہیں"

"لیکن سوشیلا دیوی۔آپ کو اس کی کھوج کیوں ہے۔"

"دیکھئے" وہ میرے آفس کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "ہریش باہر آگئے۔اب میں جاتی ہوں پرنام۔پھر کسی روز بتاؤں گی"

نریندر سے میری کافی دوستی ہوگئی اور ہم ایک دوسرے کو نام سے پکارنے لگے۔وہ دن بھر اپنے کمرے میں بند رہتا۔اس کا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا۔شام ہوتے ہی وہ ڈائننگ روم میں سب سے آخر کونہ کی نشست پر بیٹھ جاتا۔بیئر کی بوتلیں خالی ہونے لگتیں، میں سوچتا تھا اس شخص کو اور بھی کوئی کام ہے۔یہ اتنا زیادہ پیتا اور پڑھتا کیوں ہے کبھی کبھی باتیں کرتے اس کے منہ پر چپ کیوں لگ جاتی ہے۔ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں آجاتے ہیں۔پھر سوشیلا کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگتے۔"نریندر کی طویل خاموشی میں کوئی لمبی کہانی چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔اس کی آنکھیں کسی کے تصور سے بوجھل ہیں"

"تم اتنی زیادہ کیوں پیتے ہو؟"

"شرابی سے یہ سوال فضول ہے۔میں اس لئے پیتا ہوں کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤں۔شیودیال! میں بہت دکھی ہوں۔بہت ستایا گیا ہوں۔اگر خودکشی پاپ نہ ہوتی ——" جملہ ختم کئے بغیر اس نے پگ ہونٹوں سے لگالیا۔

"تم بمبئی میں کیا کرتے تھے۔"

"میں؟ —— نجومی تھا۔"

"نجومی؟"

"ہاں۔اس پیٹ کی دوزخ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔میرا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں میں خانہ بدوش ہوں۔میرا یہی ایک ذریعہ آمدنی ہے شیودیال! انسان کی زندگی کا ایک چھوٹا سا واقعہ بھی بعد کو اس کے لئے کتنا اہم ہوجاتا ہے میں نجومی کیسے بن گیا۔تمہیں بتاؤں؟"

"ضرور" میں نے اشتیاق سے کہا۔

"جوانی دیوانی ہوتی ہے۔اس میں ہم سے بیشمار لغزشیں اور حماقتیں ہوتی ہیں۔ہروقت بہکنے اور بھٹکنے کو دل چاہتا ہے۔مجھے ایک لڑکی سے بے انتہا محبت تھی۔پہلی مرتبہ جب میں نے اس کے خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھوں

میں لئے تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھ سے خفا نہ ہو جائے اس لئے میں بات بناتے ہوئے بولا۔

" لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھیں "

" تم نجومی ہو" وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی " دل کی بات بتاؤ تو جانیں"

" تمہیں کسی سے پریم ہو گیا ہے "

" جھوٹ " اس نے اِس انداز سے کہا گویا مطلب تھا تم سچ کہتے ہو"

" مگر تمہارا بیاہ اس سے نہ ہو گا" میں نے شرارت سے کہا۔

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔

" لیکن یہ لکیریں آئے دن بدلتی رہتی ہیں" میں نے اس کو تسلی دی۔

وہ چلی گئی۔ اس کے بعد نہ جانے میرے دل میں کیا سمائی کہ میں نے نجوم کی بہت سی کتابیں خریدیں اور مستعار لیں اور اس علم کا باضابطہ مطالعہ شروع کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے کہیں دیکھا کہ دل کی لکیر کے نیچے یا اوپر کوئی چھوٹی لکیر پھوٹ نکلے تو وہ محبت میں ناکامی کی نشانی ہوتی ہے۔ میں نے کہنے کو تو اس سے وہ بات کہدی لیکن بعد میں یہ فکر ہوئی کہ اس کے ہاتھ میں واقعی ایسی لکیر نہ ہو۔ جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو میں نے اس کے ہاتھ کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ دبی زبان سے بولی۔

" آپ نے کہا تھا نا کہ یہ لکیریں آئے دن بدلتی رہتی ہیں۔

" ہاں۔ مگر آپ کی ہتھیلی میں وہ لکیر باقی ہے" اس مرتبہ میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔

سچ مچ اس کے ہاتھ میں وہ لکیر موجود تھی دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے پلٹا کھایا اور میری زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ میں گھر سے بھاگ نکلا، اور بمبئی میں آن کر بس گیا۔ یہاں میرا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ ملازمت کی خواہش نہ تھی۔ مگر میں بھوکوں مرنا نہ چاہتا تھا۔ اسی لئے نجومی بن کر میں نے ایک ہوٹل میں مستقل سکونت اختیار کی۔ میرے معتقدین میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ دوست تم اس بکواس سے تھک تو نہیں گئے۔"

" تم کہے جاؤ نریندر۔ میں بیحد دلچسپی سے سُن رہا ہوں "

" معاف کرنا شیو دیال! میں نے تمہیں دوست پکار کر سخت غلطی کی۔ مجھے اس لفظ سے نفرت ہے۔ میری تباہی کا باعث میرا عزیز ترین دوست ہوا۔ کمبخت آستین کا

سانپ نکلا - خیر جو بیت چکی سو بیت چکی -
ہاں :- میں تم سے کہہ رہا تھا کہ نجوم سچا علم ہو یا
جھوٹا - چار پیسے کمانے کے لئے اچھا گر ہے -
ستاروں کی گردش وغیرہ سب لغویات ہیں -
مجھ جیسے نجومی ستاروں کے کھیل سے تو واقف
نہیں ہوتے - ان میں اتنی ہشیاری ہوتی
ہے کہ وہ آدمی کی بات چیت اور اس کے
بشرے سے اس کا اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کے
دل میں کیا ہے - کوئی اَنبیاہی لڑکی آئے
تو اس سے کہدو کہ تم اپنی پسند سے شادی
کروگی اور کسی دولتمند گھرانے میں - کوئی نوجوان
آئے تو صرف اتنا کہنا کہ تم بیروزگار ہو -
محبت میں ناکام ہو - کوئی شادی شدہ
آئے تو کہدو کہ تمھیں کئی بچے ہوں گے - کوئی
ضعیف آئے تو کہنا کہ تم بہت دن جیوگے -
تم میری باتیں سن کر ہنسو گے لیکن سوچو تو
یہ حقیقت ہے کہ نہیں - آج کل کی فیشن زدہ
لڑکیاں اپنی پسند کا سودا ڈھونڈتی ہیں -
نوجوانوں کی اکثریت کو محبت اور ملازمت
کی ناکامیوں کا رونا رہتا ہے - ملک کی معاشی
حالت کچھ بھی ہو شادی شدہ حضرات کو
آبادی بڑھانے کی بڑی فکر رہتی ہے -
ضعیفوں کی عمر خضری چاہیئے - یہ موٹی موٹی

پتہ کی باتیں سناؤ - اسّی فیصد صحیح نکلیں گی -
ہم نجومی یہی کرتے ہیں اور ہماری جیبیں گرم
ہوتی ہیں - اس کے علاوہ جدید سوسائٹی کی
عورت کو پھانسنے کے لئے یہ بہترین جال ہے -
اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں عورتوں کو پسند
کرتا ہوں - مجھے ان سے انتہائی نفرت ہے -
میری زندگی ایک عورت نے تباہ کی اس لئے
میں ہر عورت سے انتقام لینا چاہتا ہوں "
" کیا یہ عورت وہی لڑکی ہے جس نے
تمھیں نجومی بنایا "
" خیر شیو دیال ! چلو اب برخواست
کریں - اب نیند آرہی ہے "
صبح سویرے میں ناشتہ کرکے آفس میں
ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سوشیلا آگئی -
" نریندر ہیں یا چلے گئے "
" وہ تو کبھی کے جا چکے "
" آپ نے کہا تھا کہ وہ آٹھ روز ٹھیریں گے "
" انھوں نے اپنا پروگرام بدل دیا " اس
کے اضطراب کو دیکھ کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ
کرسکا -
" آپ دلگی کر رہے ہیں مجھے ان کے کمرے
پر لے چلئے - میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں "
" لیکن وقت بے وقت وہ کسی سے ملتے

نہیں - عورتوں سے تو وہ نفرت کرتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"کہتے تھے ایک عورت نے میری زندگی تباہ کی - اس لئے میں ہر عورت سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"مجھے یقین ہے وہ پونہ کے ہیں۔ میں ان کی داستان سے اچھی طرح واقف ہوں - وہ واڈیہ کالج میں پڑھتے تھے۔ دو سال ہوئے اپنے گھر سے بھاگ نکلے۔ ان کے والدین نے ان کی تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی - مگر وہ لاپتہ ہی رہے - صرف انہیں اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بمبئی میں ہیں۔ بمبئی جیسے بڑے شہر میں کسی آوارہ گرد کا سراغ لگانا محال ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ کبھی ٹرام میں، کبھی ہوٹل میں، کبھی مارین ڈرائیف پر مدتوں کے بچھڑے مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد برسوں ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی - چار چھ روز قبل نریندر اور رینیٹ میں نظر آئے تھے - مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو گھبرا گئے - تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف چل دئے۔ دوسرے روز جب اور رینیٹ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے - اسی شام کو میں ہریش کے ساتھ آپ پاس آئی تو وہ یہاں موجود تھے۔ میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ان سے دوبارہ ملاقات ہو سکے گی۔"

"آپ اس بیچارے کا تعاقب کیوں کر رہی ہیں - ممکن ہے یہ نریندر کوئی اور ہو" میں نے سوال کیا۔

"آپ کو یاد ہے جب میں نے پونہ اور منورما کا نام لیا تو وہ کس قدر بوکھلا گئے تھے - بھلا کسی اور شخص کو یوں پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی - اب رہا یہ سوال کہ میں ان کا تعاقب کیوں کر رہی ہوں۔ تو اس کا جواب بھی سن لیجئے - منورما میری جان سے زیادہ پیاری سہیلی ہے - میں ہر ہفتہ اس سے ملنے کے لئے پونہ آیا جایا کرتی ہوں۔ جب سے نریندر فرار ہوئے ہیں اس کے آنسوؤں کا تار نہیں ٹوٹا۔"

"کیا ان کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہے؟"

"اس نے تو ابتک شادی ہی نہیں کی"

"نریندر کی باتوں سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منورما کی شادی ہو گئی۔"

"یہی تو رونا ہے - منورما کے پڑوس میں

ایک لڑکا کیلاش رہتا تھا۔ وہ اس پر بُری طرح لٹو تھا۔ لیکن منورما کو اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ وہ تو نرمیندر کی ہو چکی تھی۔ اس کے خیال وخواب، کی دنیا میں وہی براجمان تھے۔ اس نے کیلاش کی تمام التجائیں ٹھکرا دیں۔ کئی مرتبہ ذلیل کرکے اس کو گھر سے نکلوا دیا۔ مگر وہ ایک وفادار کتے کی طرح مکان کے چکر کاٹتا رہا۔ جب کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آئی تو اس نے نرمیندر سے دوستی گانٹھی۔ کیلاش جانتا تھا کہ نرمیندر کچے کان کا آدمی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے چند دوستوں کو سازش میں شریک کرکے ان سے یہ کہلوانا شروع کیا کہ منورما کیلاش سے محبت کرتی ہے۔ نرمیندر کے دل میں یہ بات آہستہ آہستہ اترتی گئی۔ ایک روز اُس نے اِس کا ثبوت چاہا۔ کیلاش نے کہا۔ کل رات کے دس بجے تم میرے گھر آؤ۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لوگے۔ مقررہ وقت سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے کیلاش منورما کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ آج نرمیندر مجھے اپنے ساتھ پکچر زلیجانے آئے تھے۔ میرے گھر آتے ہی یکایک ان کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ بیہوش ہوگئے۔ انھیں ابتک ہوش نہیں۔ یہ سُنتے ہی منورما حواس باختہ ہوگئی کیلاش کے ساتھ ہولی۔ کیلاش کے گھر پہنچنے پر اس کے نوکروں نے دھاڑیں مار مار کر کہا نرمیندر بابو سورگ باش ہوگئے۔ منورما غش کھاکر گر پڑی۔ نرمیندر جب وہاں پہنچے تو کیلاش منورما کو گود میں اٹھاکر پلنگ پر لیجا رہا تھا۔ وہ الٹے پاؤں واپس ہوگئے۔ اس کے بعد کسی نے انہیں پونہ میں نہیں دیکھا۔ منورما کو جب ہوش آیا تو چور ڈھور کا پتہ لگ گیا مگر وہ یہی سمجھتی ہے کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انہوں نے خودکشی کرلی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ نرمیندر زندہ ہوں گے۔ خودکشی کا شبہ غلط تھا۔ کیونکہ نرمیندر کے خیالات بڑے مذہبی تھے۔ میں نرمیندر سے صرف یہی کہنا چاہتی ہوں کہ منورما نے ان سے بیوفائی نہیں کی ہے۔

یہ کہانی سُن کر میں مبہوت رہ گیا۔ عورت کی بیوفائی مشہور ہے۔ دراصل وہ بیوفا نہیں ہوتی۔ بیتشکی ہوتے ہیں یہ مرد۔ وہ اپنی تمام حماقتوں کو عورتوں کے سر منڈھ دیتے ہیں اور دنیا کے سامنے خود کو نردوش بناکر پیش کرتے ہیں۔ عورتوں میں فریب نہیں ہوتا۔ مرد فریبی ہوتے ہیں۔ ان کو فریب دینا بھی آتا ہے، فریب کھانا بھی۔

" سوشیلا۔ میں یہ رائے نہیں دوں گا کہ

اس وقت آپ نریندر سے ملیں۔"

"کیوں؟"

"اگر یہ سچ ہے کہ یہ وہی نریندر ہے جس سے منورما کے پاس آپ کی ملاقات ہوئی تھی تو وہ آپ کو دیکھ کر چوک جائیگا۔ آپ جو کچھ کہیں گی وہ منورما کی طرف سے جھوٹی صفائی سمجھے گا۔ ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ ہرن پتے کی کھڑک سے چوکڑیاں بھرنے لگتا ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں اس بھٹکے ہوئے مسافر کو سیدھے راستہ پر لگا دوں گا۔"

شوشیلا کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک غور کرتا رہا کہ اس معمہ کو کیونکر حل کیا جائے آخر ایک تدبیر سوجھ گئی۔

شام کو حسب معمول نریندر پینے کے لئے ڈائننگ روم کے اسی مخصوص گوشہ میں آبیٹھا اس نے میرا ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"شیو دیال! آج میں تمہارا ہاتھ دیکھونگا۔"

"میں ان چیزوں کا قایل نہیں۔ اور اس روز جو تم نے پتہ کی باتیں بتائی تھیں۔ اس کے بعد میرا عقیدہ تو اور بھی کمزور ہو گیا۔"

"وہ ہتھکنڈے اوروں کے لئے ہیں، تمہارے لئے نہیں۔"

جب وہ میرا ہاتھ دیکھ چکا تو میں نے کہا۔

"اب تم اپنی لکیریں دیکھ کر مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا مستقبل کیا ہے۔"

"نجومی دوسروں کی زندگی کے حالات بتا سکتا ہے۔ اپنے نہیں" نریندر بولا۔

"اچھا تو میں تمھیں بتاؤں"

"خوب! آپ بھی ہنس کی چال چلنے لگے۔"

"یہ بات نہیں۔ میں خود نجومی ہوں۔"

"نجومی!"

"ہاں"

"اچھا جی!! شروع کرو اپنی کتھا۔"

"پہلے ایک سوال کا جواب سچ سچ دینا۔ تم پونہ کے رہنے والے ہو۔"

"ہاں"

"تم محبت میں ناکام ہوئے اور اپنے گھر سے بھاگ نکلے۔"

"کیوں ہمارا جادو ہمارے ہی سر چڑھ کر بولنے لگا۔ یہ تو میں نے تم سے خود کہا تھا۔"

"تم نے جس لڑکی سے محبت کی اس کا نام منورما تھا۔ محض شک کی بنا پر تم نے اپنی زندگی تباہ کی اور اس کی بھی۔ تمہارا ایک رقیب کیلاش تھا۔ اس نے یہ جُل دے کر منورما کو گھر لایا کہ نریندر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یکایک اس کی حالت

بگڑ گئی۔ وہ اب نب پر ہے۔ چل کر دیکھ لو۔
جب وہ وہاں پہنچی تو کیلاش کے نوکروں نے دھاڑیں مار کر کہا، نریندر چل بسے۔ یہ سنتے ہی منورما بیہوش ہو گئی۔ کیلاش اسے گود میں اٹھا کر پلنگ پر لیجا رہا تھا کہ تم نے دیکھ لیا اور پونہ سے غائب ہو گئے —— کیوں ہے نا؟"

نریندر کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ کی گرفت میں اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ قصہ تم سے سوشیلا نے تو نہیں کہا؟"

"تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں —— میرا سر چکرا رہا ہے شیودیال۔ تھوڑی سی شراب اور۔"

صبح جب نریندر سے ملنے گیا تو اس کا کمرہ خالی تھا۔ ایک لفافہ میز پر پڑا ہوا تھا۔ اس میں ہوٹل کا آٹھ روز کا کرایہ اور ایک خط تھا۔

شیودیال میں جا رہا ہوں۔ کہاں، نہیں معلوم۔ شاید تمہیں اس کا علم ہو۔ تم بھی نجومی ہو اور میں بھی نجومی ہوں۔ ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔"

نریندر

پاگل کہیں کا! دنیا کا سب سے بڑا نجومی محبت کے بیتے ہوئے جھمیلوں کی ایک موہوم سی جھلک دکھا سکتا ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ نریندر نے منورما سے محبت کی اور اس کی راہ میں کانٹے بچھانے والا ابلیس کیلاش تھا۔ نام بتانا کیسے ممکن ہے۔ اگر اس میں اتنی عقل ہوتی تو وہ اپنا جیون اجیرن ہی کیوں کرتا۔ نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔ ممکن ہے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں موت کی نیند سو رہا ہو۔ ممکن ہے بمبئی میں بھٹک رہا ہو یا شاید منورما کی کشش نے اسے پونہ کھینچ لیا ہو۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ سوشیلا آ گئی۔ ساتھ اس کی ایک سہیلی بھی تھی۔

"نریندر سے آپ نے اس بارے میں بات چیت کی؟" سوشیلا بولی۔

"ہاں!"

"کیا نتیجہ نکلا؟"

"وہ یہاں سے بھاگ گیا۔"

"آپ مذاق کرتے ہیں"

"یہ اس کا خط ہے۔ پڑھ لیجئے۔"

دونوں سہیلیوں نے خط پڑھا۔اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

"تمہیں اس کا تو یقین ہو گیا کہ نریندر زندہ ہیں" سوشیلا بولی۔

"ہاں سوشی! مگر اب میں زندہ رہ کر کیا کروں۔پیا ملن کی آس ٹوٹ جائے تو جینا کس کام کا"

"تو گویا آپ کا نام منورما ہے"۔میں نے تعجب سے پوچھا۔

"جی۔آپ نجومی ہیں۔بتائیے اب میں کیا کروں"

میں نے منورما کا ہاتھ دیکھ کر فنکارانہ انداز میں کہا۔

"منورما دیوی۔دو ہی چار روز میں بچھڑے مل جائیں گے"

"نریندر میرے ——" الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔

"جی ہاں"

"برسوں ہوئے ایک نجومی نے مجھ سے کہا کہ تم جس سے پریم کرتی ہو اس سے شادی نہ ہو سکیگی"۔

"آئے دن لکیریں بدلتی رہتی ہیں"

"اس نے یہ بھی کہا تھا —— میری دنیا بدل گئی پر یہ لکیریں نہ بدلیں"

"نریندر بیوقوف تھا۔اس کو ایسی اول جلول باتیں کرنے کی عادت تھی۔"

"لیکن میں نے آپ سے کب کہا تھا کہ وہ نجومی نریندر ہی تھے۔

"اجی سچے نجومیوں سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی منورما"

وہ میری طرف پُر عقیدت نگاہوں سے دیکھنے لگی۔اس کی خوبصورت آنکھوں کے آبگینے چھلک گئے۔

"اگر میرا کہا سچ ہو گیا تو کیا دو گی"

"ہزار روپے"

منورما اور سوشیلا کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا عورتیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں۔ان میں جھوٹ سچ کی پرکھ نہیں ہوتی۔—— مجھے یہ گپیں ہانکنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔پھر خیال آیا تیر نشانے پر بیٹھے اور مفت میں ہزار روپیے مل جائیں تو بُرا کیا ہے،

چار روز بعد منورما کا ایک خط اور منی آرڈر ملا۔خط میں اس نے لکھا تھا۔آپ بمبئی کے سب سے بڑے نجومی ہیں آپ کی پیشین گوئی سچ نکلی۔عنقریب نریندر سے میرا بیاہ ہو جائے گا۔پھر ہم دونوں آپ کے ہوٹل میں ہی مون منائیں گے۔

خط پڑھ کر میں بہت دیر تک ہنستا رہا۔
میں بمبئی کا سب سے بڑا نجومی ہوں!!! پر ماتما —— یہ دنیا اس قدر دیوانی کیوں ہوتی جارہی ہے؟

"آپ کے ہوٹل میں کوئی کمرہ مل سکیگا۔ میرا نام پرتاب سنگھ ہے۔ میں نجومی ہوں"

"کمرے تو بہت خالی ہیں۔ لیکن آپ ٹھیر نہ سکیں گے"

"کیوں؟"

"آپ کے قیام سے میری آمدنی پر اثر پڑے گا"

"وہ کیسے؟ اگر آپ چاہیں تو میں پیشگی کرایہ دیدوں"

"میرا یہ مطلب نہ تھا۔ سردار جی گزارش یہ تھی کہ میں بھی نجومی ہوں اور ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے"

سردار جی کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ لمبی داڑھی پنکھے کی جھالر کی طرح ہلنے لگے جھلا کر بولے۔

"واہ رے میرے نجومی —— واہ رے میرے مٹی کے شیر"

میں نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور دریچہ میں بیٹھی ہوئی چڑیاں گھبرا کر اڑ گئیں۔

مکتوبات جمیل

جہاں بانو ایم اے (حیدرآباد)

تصور کا اصرار اللہ و اکبر! کہ تنہائیوں کو بھی محفل بنالو! اب تمہیں کچھ القاب بھی لکھنے کو طبیعت نہیں چاہتی کسی نام سے بھی مخاطب کرتے پس و پیش ہوتا ہے۔ بہر کیف خط بھی کون چاہتا ہے تمہیں لکھنے۔ تمہیں کچھ لکھنا ہی نری تضیع اوقات ہے۔ پھر پتہ نہیں کیوں لکھے جارہی ہوں۔

خط لکھیں گے گرچہ کچھ مطلب نہ ہو

ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ پھر نجانے وہ کون سا جذبہ ہے جو لکھوانے پر مجبور ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ اظہار خیال کو جی چاہا اور تمہیں مخاطب بنا کر تمہاری پرسکون دنیا میں تھوڑی دیر کو ہلچل مچادی۔

یوں بھی ہم ایک دوسرے کے کافی قریب رہ چکے ہیں۔ اب کچھ کہنے یا سننے کی ضرورت نہیں ہی۔ کہتے سنتے تو جب ہیں جب کہ کوئی کسی کو جانتا نہ ہو۔ ایک دوسرے کو آن جانے طریقہ سے دیکھنا۔ کچھ سمجھنا۔ کچھ نہ سمجھ کر بھی سمجھنے کی کوشش۔ کچھ کہنے پر مجبور۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس مجبوری کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں بہلا دینا۔ کبھی جذبات کی سوزشوں کو پھیکی بے معنی ہنسی میں

گم کر دینا۔ کبھی قہقہوں کی زد میں احساسات کے جھکڑوں کو اڑا دینا۔ بس اب یہی ایک جیون کا کھیل ہے۔

تم ہی کچھ سوچو اس پر۔ میرے پاس تو اتنا فالتو وقت نہیں۔ بس ایک بات ذہن میں آئی۔ اور لکھ ماری۔ اس محرومی و ناکامی کا سبب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہے۔ میری زندگی میں یہ الٹ پلٹ خدا جانے کب اور کیسے ہو گئی۔ اچانک ہونیوالی باتیں حادثہ کہلاتی ہیں نا؟ ایسی باتیں "ہو جاتی" ہیں۔ دانستہ "کی نہیں جاتیں"۔ میری زندگی، میری پیدائش غرض یہ سب ایک حادثہ سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ زبان سے کہے ہوئے اپنے ہی بول بعض وقت سمجھنے مشکل معلوم ہوتے ہیں۔ جو بات ابھی دماغ کے پردوں ہی میں گھوم رہی ہے اس کا سمجھنا بھی دشوار سا لگتا ہے۔ کم از کم یقین تو نہیں ہوتا کہ اس کا یہی مطلب ہے۔ بقول شخصے "بات کی لاکھوں زبانیں ہوتی ہیں"——— تو اب اس طرح

کبھی درد کی تمنا، کبھی خواہش مداوا
کبھی بجلیوں کی حسرت، کبھی فکر آشیانہ
یہ جیون بیتا جائے ہے۔

زندگی میں بعض حادثات ایسے پیش آتے ہیں کہ ان پر فوری غور کرتے ہوئے دل کی حرکت بند ہوتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ سانس جیسے رکنے لگتی ہے۔ رگ رگ میں ٹیسیں سی اٹھتی ہے۔ نہ جانے یہ سب کیا ہے۔

ہاں تو اب آمدم برسر مطلب۔ یہ سن سال کی کیا بار بار تم نے رٹ لگائی ہے۔ سن کسی کا بھی بھولے سے مت پوچھو۔ یہ یاد رکھو۔ کوئی صحیح سن نہیں بتاتا۔ اور کسی کو سن و عمر کے قصوں پر بحث کرنے کی ضرورت ہی کیا۔ سالگرہ تو کرنی ہے نہیں۔ پھر یہ خواہ مخواہ کی حرارت کیوں؟ یہ نفسیات ذرا سمجھ میں نہیں آتی کہ لوگوں کو ہماری تمہاری عمروں کی کیوں پڑی رہتی ہے۔ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ دو تین مثالیں دے کر تمہارا دماغ ٹھیک کروں گی۔ تمہاری سمجھ میں بات ذرا کم آتی ہے نا۔ سب سے پہلے تو تم ان "اپنوں" کو ٹٹولو۔ نہ جانے ان سے متعلق تمہارا نظریہ کتنا وسیع ہے۔ تم نے "اپنوں" کو "اپنا" سمجھا ہے یا "غیر" سے بدتر۔ سلمیٰ کا سن ۲۳ برس کہیں لکھا دیکھ کر۔ غیروں کو تو کیا پڑی تھی کہ کچھ کہتے سنتے۔ کیوں کہ غیر سن سال وغیرہ جیسی غیر دلچسپ الجھنوں میں تو نہیں الجھتے۔ وہ تو سلمیٰ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کی ذات و صفات سے انھیں دلچسپی ہے۔ لیکن سلمیٰ کی حقیقی خالہ زاد بہن چراغ پا ہو گئیں۔ پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔ آئے گئے

سے کہنے لگیں کہ سنا تم نے سلمیٰ نے اپنی عمر کتنی کم
لکھوائی ہے ۔ ذرا تو شرم آنا چاہئے تھا اس کو۔
وہ تو مجھ سے بھی عمر میں کتنی کچھ بڑی ہے وغیرہ
وغیرہ۔ ذرا اس لفظ "لکھوائی" کی منطق
پر غور کرو ۔ پہلے تو ان محترمہ کو یہ تحقیق کرنی
تھی کہ خود سلمیٰ نے اپنا سن لکھوایا ہے یا کسی نے
یونہیں اپنی طرف سے لکھدیا ہے ۔ بغیر سوچے
سمجھے ۔ اور اب ان محترمہ سے اتنا بھی کوئی کہنے
والا نہیں کہ تم جیسی حاسد عورتیں جب تک
زندہ ہیں سلمیٰ کی زیست کے تو لالے ہی پڑتے
رہیں گے ۔ سلمیٰ متاہل ہے ۔ اب اس کو شادی
بھی تو کہیں کرنی نہیں ہے ۔ پھر یہ حسد و کینہ
کینوں ہے اس کی ذات سے ۔ مگر کون کہے
سُنے یہ سب ان سے ۔ قلم سے لکھی ہوئی باتیں
پکڑی بھی جا سکتی ہیں ۔ زبان کے بول قائم نہیں
رہ سکتے ۔ انسان کہہ کر بھی مکر جاتا ہے جتنی
باتیں انھوں نے اس کے پیٹھ پیچھے کہی ہیں وہ
اگر سامنے کہدیں تو ان کی اس اخلاقی جراءت
پر ایمان لانا پڑے گا ۔ مگر کہاں ہے ایسے
لوگوں میں اتنی ہمت ۔ پیچھے بیٹھ کر تو لوگ
کیا کچھ نہیں کہہ جاتے ۔ تو یہ ہیں یہ آج کل کے
"اپنے" سانپ کے سنپولوں سے بدتر ہیں
یہ دو منھ کے ناگ ۔ اُف ! زندگی کی تلخیاں
کتنی جلد جلد بدگمانیوں سے بدل جاتی ہیں ۔
غیر کی محبت بے لوث ہوتی ہے ۔ اس کی نفرت
بھی بے غرض ۔ لیکن یہ عزیز ——— اقارب
نہیں عقارب ہیں ۔ جن کے کاٹے کا منتر نہیں ۔
جو تمہاری ترقی نہیں دیکھ سکتے ۔ تمہاری ہر
دلعزیزی انھیں کھلتی ہے ۔ تمہاری شہرت تو
ان کی جان پر بنا دیتی ہے ۔

سن و سال کی الجھنوں میں بالعموم وہی
گرفتار رہتے ہیں جنھیں خود کو بہت کمسن منوانا
ہوتا ہے ۔ کسی سے ملے ۔ اور پہلی ہی ملاقات میں
اس کو جھٹ "آپا" سے مخاطب کر دیا ۔ اس کو
یہ احساس بزرگی دلاتے ہوئے کہ وہ ہم سے
بہت ہی بڑی ہیں ۔ خواہ خود کا سن شریف
اس مخاطب "بننے والی آپا" سے کہیں بڑا ہو ۔
یا برابر برابر کی عمریں ہوں ۔ لیکن اس طرح کے
تخاطب سے ان کے دل مطمئن ہو جاتے ہیں ۔
کہ اب ہم ان سے جھک مار کر بھی چھوٹے ہیں ۔
یہ نفسیاتی اثر ان پر اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ
ان سے حرکات بھی اس قسم کے ہونے لگتے ہیں
جیسا کہ کوئی بہت ہی چھوٹا بھائی یا چھوٹی بہن
ہے ۔ یہ کیسی غیر سنجیدہ حرکتیں ہیں ۔ کیسے
سمجھوں بتاؤ میں زندگی کو جب کہ میں خود اب
تک اس کی سمجھ میں نہ آ سکی ۔ ان دو متضاد

مثالوں سے بھی پتہ نہیں تم کچھ سمجھیں یا پھر میں
کسی کا یہ شعر تمہاری سمجھ کی تعریف میں پڑھ
دوں ؎

سمجھ، سمجھ کر، سمجھ کو سمجھو، سمجھ سمجھنا بھی اک سمجھ ہے
جو لاکھ سمجھائے سے نہ سمجھے، میری سمجھ میں وہ ناسمجھ ہے

نہ لکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے بھی تمھیں آج
اتنا کچھ لکھدی۔ اب آئندہ بھی زندگی کے اسی
قسم کے تلخ تجربے لکھا کروں گی۔ بہت قریب سے
دیکھو زندگی کو۔ تو بہت سی باتیں تمھیں بھی
معلوم ہوسکتی ہیں۔ ایک چیز علم ہے دوسرا احساس
صرف علم کی حد تک کوئی چیز صرف ہوسکتی ہے۔
لیکن احساس کے ذریعہ ہم اس کو سمجھ کر محسوس
کرتے ہیں۔ زندگی کی الجھنوں کو اب ہمیں محسوس
کرنا ہے۔ معلوم کرنے کا زمانہ ماضی کے کھنڈروں
میں دفن ہوگیا۔ کسی افسانہ کا یہ فقرہ سوچتے
سوچتے کبھی اونگھنے لگتی ہوں :-

"عمر رفتہ پیچھے مڑکر نہیں دیکھتی۔ میں نے
بھی ماضی کو بنئے کے ڈوبے ہوئے سود کی طرح
بھلا دیا۔"

آج مالک جانے یہ کہاں کی سرد سرد
ہوائیں چل رہی ہیں کہ ہڈیوں تک دھنسی
جاتی ہیں۔ یہ سرد سرد موجیں۔ معلوم تو ایسا
ہوتا ہے موسم نے کسی کے مزاج کی سردی
چپکے سے چرالی ہے۔ اور یہ شعر صبح سے بہت
تکلیف دے رہا ہے۔ ؎

کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں، اور آدمی افسانہ ہوجائے۔

رُباعیات

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر

(۱)

ذرّوں کا تصادم ہے یہ صحرا کیا ہے
قطروں کا تلاطم ہے یہ دریا کیا ہے
ہر رنگ میں ہے رنگ تحیر رقصاں
اے دیدۂ بینا یہ تماشا کیا ہے۔

(۲)

دل باختۂ طرۂ جاناں میں ہوں
جاں سوختۂ عارض تاباں میں ہوں
تفصیل غم فراق کیونکر ہو بیاں
القصہ اسیر درد ہجراں میں ہوں

(۳)

صدمات غم فراق سہنا معلوم
احوال جگر خراش کہنا معلوم
مرہم نہ زخم تھی جوانی اے دل
جب وہ نہ رہی تو اپنا رہنا معلوم

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام تعلیمات

شہاب





ناہید

جلد ۸ | فروردی ۱۳۵۴ف م فبروری ۱۹۴۵ء | نمبر ۵

۱- تعلیم اور عورت پر ثریا پروین کا سلجھا ہوا مضمون ہے۔

۲- احساس- بقیہ حصہ ہے معصومہ کے مضمون کا۔ لڑکیوں کو تعلیم کے ساتھ گھریلو تعلیم بھی ضروری ہے۔ ورنہ وہ اپنے مستقبل میں گھر کے کاروبار سے پریشان ہو جاتی ہیں۔

۳- محبت- پریم پجارن کی آخری قسط ہے، شکر ہے ختم ہو چکی۔

۴- کھلاڑی- کھلاڑی کو آپ افسانہ سمجھئے یا ایک کھلاڑی جو دلوں سے کھیلتا ہے اور آخر میں ہار کر بھی [illegible] رہ جاتی ہے۔

۵- شادی، زہرا رضویہ نے لکھا ہے۔ بہتر ہوتا کہ شادی بیاہ کے تمام رسوم وضاحت سے بیان کیے جاتے۔

"ب"

تعلیم اور عورت

ثریا پروین بی۔اے (پشاور)

"تعلیم اور عورت" کے عنوان سے ماہ نومبر کے پرچہ میں مس منیزہ بانو کاؤس جی نے مدلل پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور آپ نے اپنے مضمون میں موجودہ ضرورت تعلیم کی تائید میں عورت کے لئے اس زیور کا حاصل کرنا لازمی قرار دیا۔ میں اپنے مضمون میں بھی تعلیم نسواں کے چند ضروری اصول بیان کروں گی امید ہے نہیں نہ صرف اس میں دلچسپی ہی لیں گی بلکہ جہاں تک ممکن ہو گا عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گی۔

"تعلیم نسواں" ایک پرانا مباحثہ کسی خاص تسلی بخش جواب پر نہیں پہنچتا۔ جس سے سب مطمئن ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی تحریروں اور کوششوں کے علاوہ بھی جو وقتاً فوقتاً عورت کی تعلیم کے متعلق ہوتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں اس کا چرچہ بہت سست رفتار پہ گامزن ہے۔ آپ کو فی زمانہ بھی ہزاروں خاندان ایسے ملیں گے جن میں لڑکیوں کو تعلیم دلوانا گناہ کے مترادف ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ امر مسلم ہے کہ لڑکی تعلیم حاصل کر کے اپنی اصلی نسوانیت کھو دیتی ہے۔ وہ عام طور پر خود سر ہو جاتی ہے۔ مرد کی محتاجی محسوس نہیں کرتی اور اپنی زندگی کی بنیادیں خود کھودنا چاہتی ہے جو ہرگز ہرگز عورت کے لئے موزوں نہیں۔ دوسری طرف ایسے بھی لوگ ہیں جنھوں نے سمجھا کہ عورت کو گھر سے باہر قدم رکھنے کا موقع دینا چاہئے تاکہ وہ زندگی کے میدان میں اپنا راستہ تلاش کر سکے تو انہوں نے بیٹے کے ساتھ ساتھ بیٹی کی تعلیم کو بھی فرض سمجھا۔ دقیانوسی خیالات کو نظر انداز کر دیا۔ اور لڑکی کو تعلیم کی روشنی سے منور کیا۔ لیکن اس دوسری قسم کے لوگوں کی تعداد ابھی تک رائی کے برابر بھی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تعلیم یافتہ عورت کی تعداد بمشکل دو فیصدی ہو گی جو تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس سست رفتاری کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

بعض لوگ تو فی الحال تعلیم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ ان کے ہاں عورت کی وہی حالت ہے جو جانور کی ہوتی ہے جس گاڑی کے ساتھ چاہا جوت دیا جس طرح چاہا اسے استعمال کیا۔ ایسے خاندانوں میں تو نہ جانے یہ جاہلیت کا پردہ کب اٹھے گا لیکن بعض خاندان ایسے بھی ہیں اور بعض کیا لاتعداد

خاندان ایسے ہیں جو تعلیم تو دلوانا چاہتے ہیں، لیکن ایسی تعلیم جو کچھ مقصد رکھے۔ یعنی ان کا یہ خیال ہے کہ موجودہ تعلیم کا کچھ مقصد نہیں۔ کیونکہ لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کا مواقع پا کر اپنے آپ کو اس زیور سے آراستہ تو کر لیتی ہیں۔ لیکن اس کا ناجائز اور برا استعمال کر کے یہ امر روشناس کرتی ہیں کہ تعلیم کا نصب العین ہے فیشن کرنا۔ اپنے کو "سوسائٹی گرل" بنانا۔ یا دوسروں کے ایٹی کیٹ سے واقفیت حاصل کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم ہندوستان میں عام نہیں ہونے پاتی۔ اس قسم کی فیشن پرست لڑکیوں کو دیکھ کر ہماری بڑی بوڑھیاں یہی کہتی ہیں کہ ایسی تعلیم سے تو جاہل ہی بھلی ہیں۔ انہیں نہ تو بڑے کا لحاظ ہے اور نہ چھوٹے کا پیار۔ صرف لگاؤ ہے تو مصنوعی سنگھار سے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس بیجا آزادی اور بے راہ روی کی اصلی وجہ تعلیم ہی ہے۔ تو بالکل نامناسب ہوگا۔ دوسری طرف ہم تعلیم کو قطعی طور پر برا بھی نہیں ٹھہرا سکتے۔ کیونکہ کئی ایسی زندہ مثالیں آئے دن ہمیں ملتی رہتی ہیں جنھوں نے اپنی کمزوری اور تعلیم کے غلط استعمال سے تعلیم کا نام بدنام کر رکھا ہے۔

تعلیم کا اصلی معنی ہے علم حاصل کرنا۔ اور علم چاہے کسی قسم کا بھی ہو کبھی ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور یہ ہماری خاصیت اور ذہنیت پر مبنی ہوگا۔ اگر ہم اس سے فائدہ اٹھائیں۔ برعکس اس کے اگر تعلیم یافتہ ہو کر ہم اپنے کو ایسی خامیوں کا آلہ کار بنا لیں جس سے اہل نظر ہمیں اور ساتھ ہی ہماری تعلیم کو کوسیں۔ تو اس کا تمام تر الزام خود ہمارے سر آنا چاہئے۔ موجودہ زمانہ میں جو یہ عام شکایت سننے میں آتی ہے کہ تعلیم صرف ذریعہ ہے فیشن سیکھنے کا اور اسے حاصل کر کے ہم صرف مغربی روش اختیار کرنا چاہتی ہیں بیشک کسی حد تک اپنے میں حقیقت رکھتا ہی ہوگا لیکن صرف اسی ڈر سے اپنی عورتوں کو تعلیم سے بے بہرہ رکھنا کہ کہیں وہ سچ مچ ہی اپنے ہندوستانی رجحان اور معاشرت سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ بھی تو دانشمندی کی دلیل نہیں۔ کنوئیں کے کنارے کھڑے ہو کر ہم اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور اگر اس میں چھلانگ لگا کر اپنی جان گنوا دیں تو یہ کہاں تک کنوئیں کا قصور ہے۔ یہ اہل نظر پر چھوڑتی ہوں۔

درحقیقت مغربی تقلید تعلیم کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ہمارے ماحول میں تبدیلی کی وجہ ہے کئی تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنے حسن اخلاق۔ سادگی طبیعت کی وجہ سے تعلیم کا اصلی مقصد پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ برعکس کئی ایسی لڑکیاں بھی ہیں جنھیں الف کا نام ب تو آتا نہیں لیکن زمانے کے فیشن کرتی ہیں۔ بلکہ میرے خیال میں

تو گھر بیٹھنے والی لڑکی کو اس قسم کی باتوں میں دلچسپی
لینے کا زیادہ وقت ملتا ہے۔ تعلیم کے دوران میں
لڑکی عموماً اپنی پڑھائی کی طرف متوجہ رہتی ہے اور
اگر سو میں سے ایک لڑکی واقعی ایسی نکل بھی
آئے جو مصنوعی آرائش وغیرہ کی دلدادہ ہے تو ہم
صرف اسی ایک کی مثال پیش کر کے تعلیم کو بدنام
کرنے میں ہرگز انصاف سے کام نہیں لیتے۔

دوسری شکایت یہ بھی ہے کہ تعلیم حاصل کر کے
عورت زیادہ تر کلبوں پارٹیوں وغیرہ میں جانے
لگتی ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے گھر کی فضا تنگ
تنگ سی ہو جاتی ہے۔ کلبوں اور محفلوں کی سرے
سے مخالفت کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں
اگر یہ کلب اور محفلیں ایسی ہوں جو مذہبی اصول
کی بنا پر قابل اعتراض نہ ہوں۔ ایک دوسرے
سے میل جول۔ اور ملاپ کا بہترین طریقہ بھی یہی
ہو سکتا ہے کہ ہم اکٹھی ہو کر ایک دوسرے کے
خیالات کا تبادلہ کریں۔ سوسائٹی میں ملنے جلنے کی
اہلیت پیدا کریں تاکہ ہم میں جراءت کا کچھ مادہ پیدا
ہو جائے جس کو بہ موقع استعمال کر سکیں۔ اس سے
میرا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ ہم سوسائٹی کی دلچسپیوں ہی
میں زیادہ وقت صرف کریں اور اپنے آپ کو محض ایک
چلتا پرزہ ہی بنا کر رکھ دیں۔ یا یہ کہ اپنے گھریلو فرائض
ادا کرنے سے پہلے سوسائٹی کا فکر کریں۔ نہیں ــــ !
میں صرف یہی بات عرض کرنا چاہتی ہوں کہ عورت
کو اس قدر ڈرپوک اور دب کر بھی نہیں رہنا چاہئے
کہ چاہے وہ کتنی ہی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کیوں نہ ہو
پھر بھی اگر دو چار انسانوں میں اسے بیٹھنے کا موقع
ملے تو اس کے اوسان ہی خطا ہو جائیں۔ برعکس
ازیں حد سے تجاوز آزادی اور چالاکی بھی ہرگز
ہمیں زیب نہیں دیتی۔

اب ہمیں وہ اعتدال کا راستہ ڈھونڈنا ہے
جس کو اختیار کرتے نہ تو ہندوستانی تمدن پر بٹا
لگے اور نہ ہی عورت بالکل جاہلیت کی تاریکی میں
بند رہے۔ یعنی اُسے ایسی تعلیم دی جائے جس سے
آئندہ تربیت کی ترقی کی بھی کچھ امید ہو سکے۔
کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم ہمیں ڈگریاں
تو ضرور دلوا دیتی ہے۔ لیکن ان ڈگریوں سے
فائدہ اٹھانے والیاں ہم میں بہت ہی کم ہوتی
ہیں۔ اس لئے تعلیم نسواں کا اصلی مقصد ڈگری حاصل
کرنا نہیں ہونا چاہئے۔ اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ
ہندوستانی لڑکی چاہے کتنی ہی تعلیم کیوں حاصل
کرے پھر بھی شادی کے بندھن میں ضرور بندھ
جاتی ہے۔ اور شادی کے بعد ان ڈگریوں کی قیمت
کچھ بھی نہیں رہتی۔ ایسی لڑکیاں بھی بعض ہوتی
ہیں جو تمام عمر خدمت خلق میں گزارنے کا تہیہ
کر لیتی ہیں، اور پھر اپنی اعلیٰ تعلیم کی بنا پر بھارتی

رہتی ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ابھی اتنی بھی نہیں کہ ہم انگلیوں پر گن سکیں۔ اس لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ لڑکی کو خانہ داری کے اصولوں سے بھی آموختہ کرایا جائے۔ ہمارے نصاب تعلیم میں خانہ داری کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اور تعلیمی اداروں کا یہی خیال ہے کہ تعلیم کے دوران میں انسان کا دماغ ایک ہی طرف مبذول ہونا چاہئے۔ اور وہ ہے صرف کتابی علم حاصل کرنا۔ بیشک عورت کی اصلی منزل تو وہی ہے جب وہ اپنا گھر بناتی اور سنبھالتی ہے۔ اس لئے خانہ داری کا کام اسے کسی نہ کسی وقت ضرور کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن میں تو یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتی ہوں کہ چونکہ تعلیمی دوران میں لڑکی خانہ داری سے بالکل بری ہوتی ہے اس لئے خانہ داری کے اصولوں اور گھر کے کاموں سے وہ متنفر سی ہو جاتی ہے۔ بچپن سے لیکر جوانی تک یعنی اختتام تعلیم تک وہ ایسے ماحول میں چلتی پھرتی ہے کہ اسے خانہ داری کی طرف رجوع کرنے کا بہت کم وقت ملتا ہے۔ تمام دن سکول یا کالج میں صرف ہوتا ہے۔ باقی کا وقت جو گھر میں کٹتا ہے اس کا بھی بیشتر حصہ سکول اور کالج کا کام کرنے میں گزر جاتا ہے جس سے لڑکی کو موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ گھر کے کام میں کچھ مہارت حاصل کر سکے۔ تعلیم ختم ہونے پر بعض اوقات لڑکی کی ایک دم شادی کر دی جاتی ہے۔ اس طرح گھر کا سب کام اور ذمہ داری اس کے کاندھوں پر آن پڑتی ہے۔ وہ قدرتی طور پر گھبرا جاتی ہے اور اپنے فرائض اچھی طرح سے سرانجام دینے میں قاصر رہتی ہے تو پھر دنیا والے اسے پھوہڑ۔ بے پرواہ فیشن ایبل اور نہ جانے کن کن ناموں سے منسوب کرتے ہیں۔ اور تعلیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا جاتا ہے کہ جب تعلیم نے ہمیں گھریلو کام سے ناکارہ کر دیا تو ایسی تعلیم کا پھر کیا فائدہ؟ اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ یہ طعن و تشنیع کس حد تک حقیقت ظاہر کرتے ہیں جس کام کرنے کا کبھی موقع نہ ملا ہو اس کا تمام بوجھ کاندھوں پر گرنے سے لڑکی کا گھبرا جانا فطرتی امر ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے تعلیمی اداروں میں موزوں تبدیلی رونما ہونی چاہئے۔ اور کتابوں کے علاوہ خانہ داری کی بھی خاص تعلیم کا کورس مقرر ہونا چاہئے۔ جب معلمات کے سر پر خانہ داری کی تعلیم فرض ہو جائے گی تو وہ یقینی طور پر طالبات کی رہبری اور رہنمائی کے فرائض سرانجام دیں گی اور پھر لڑکیاں بیوی اور ماں بننے کی حیثیت سے کبھی اپنی زندگی میں گھبرائیں گی نہیں۔ آئندہ نسل کی تربیت کی بنیاد بھی ایسے اصولوں کے ماتحت قائم ہو گی جس میں لڑکی کو گھر کا اہل کار اور ذمہ دار

بننے کی ترغیب دیجائیگی۔

اس سلسلہ میں میں پھر بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتی ہوں کہ تعلیم حاصل کر کے ہمیں چاہئے کہ حریت نسواں حاصل کرنے کی بھی کوشش کریں۔ لیکن ایسی آزادی جس پر ہمارا حق ہے۔ بعض عورتوں کا خیال کہ زمانہ کی ترقی کے دوش بدوش اب عورت ایسی منزل پر پہنچ جاتی ہے کہ وہ مرد کی کسی بات میں بھی محتاجی محسوس نہیں کرے گی۔ میرے نزدیک ہماری آزادی کا اصلی مقصد نہیں۔ عورت اور مرد کو قدرت نے لازم و ملزوم بنالیا ہے۔ اور ایک کی مدد کے بغیر دوسرے کی زندگی ادھوری رہ جاتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم تعلیم حاصل کریں تو اس سے پہلے اپنے آپ کو بہتر بنائیں پہلے اپنا علاج شروع کر دیں کیونکہ جو شخص خود بیمار ہے وہ دوسرے کا کیسے علاج کرے گا اپنی حالت بہتر بنانے پر ہماری سوسائٹی کی حالت خود ہی سدھر جائے گی۔ کیونکہ سوسائٹی کا وجود بھی ہم سب کو ملا کر پیدا ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ میں اتنا اور عرض کروں گی کہ سکولوں کالجوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورت کے لئے مذہبی تعلیم کا حاصل کرنا بھی فرض ہے کیونکہ اگر ماں بھی مذہب کے اصولوں سے واقف نہ ہوگی تو اپنے بچوں کو مذہب کی کیا تعلیم دلائیگی۔ بلکہ میرے خیال میں تو مذہبی تعلیم کے فرض کی ادائیگی سب سے پہلے ہونی چاہئے کیونکہ سکولوں کالجوں میں تو اس کا چرچا ڈھیلا پڑ رہا ہے اس لئے مذہبی تعلیم ہمیں سب گھر ہی سے سیکھنی پڑتی ہے گھر میں اس کا تمام تر فرض ماں کے کاندھے پر ہوتا ہے۔ اور وہ اگر بچپن ہی سے بچوں کے دماغ میں مذہبی اصول ذہن نشین نہ کرائے گی تو بڑے ہو کر بھی بچے مذہب سے بالکل بیگانے نظر آئیں گے۔

تعلیم حاصل کر کے ہم دیکھیں کہ آیا ہم نے اس سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ اور اگر واقعی اس نے ہماری لڑکھڑاتی دیوار کو برقرار رکھنے میں مدد کی ہے تو یقیناً ہم نے حصول تعلیم کا صحیح مطلب حاصل کر لیا ہے۔

احساس

معصومہ بانو جنگ بہادر

(بسلسلہ گزشتہ)

خیر، ڈرتے ڈرتے ابا سے تو ملیں، البتہ امی سے اپنی کارگزاری بیان کی، امی غصہ میں کہنے لگیں ایک دن میرا پڑجانا آفت ہو جاتی ہے۔ کیا ہوا؟ ابا نے دریافت کیا اور اپنی ہونہار صاحبزادی کی اس کارروائی پر مسکرا دئے۔ غرض کہ بڑی مشکل سے صندوقچہ کھولا گیا۔ اس گڑبڑ میں سودا نہیں منگوایا گیا۔ جب یاد آیا مجھ میں اور صغرا میں (کیا منگوائیں) پر بحث شروع ہوئی میں نے کہا کہ قیمہ منگوایا جائے (کیونکہ قیمہ مجھ کو بہت بھاتا ہے) اور قیمہ کے ساتھ دہی کی کڑی کا لطف ہے۔ صغرا نے کہا (کیونکہ وہ کڑی کو بہت پسند کرتی ہے) پھر خیال آیا کہ ابا کو تو یہ دونوں چیزیں پسند نہیں وہ ترکاری کے شائق ہیں۔ اچھا تو ٹماٹو کے کٹلس ابا کے لئے بنائے جائیں صغرا نے کہا کہ پھر نوکروں کے لئے کیا پکوایا جائے، خیر ہم نے اپنی پسندیدہ چیزوں کو برقرار رکھکر ایک آدھ چیز کا اور اضافہ کر دیا۔ اس جھگڑے سے فارغ ہوکر ایک لمبی چوڑی سانس ہم نے اطمینان کی لی۔ صغرا نے پکار کے کہا آپا حیدرآباد سے اچھے اچھے فلمی گانے ہو رہے ہیں تو پھر چلو، مگر آواز کم رکھو کیونکہ امی کے سر میں درد ہے، ہم بڑی بے فکری سے بیٹھے فلمی گانے سن رہے تھے کہ پھر ماماجی صاحبہ کھسر پھسر کرتے ہوئے پہنچی کہ "اوئی بی بی" یاں آپ لیڈو (ریڈیو) سن رہی ہیں غلہ نہیں دیتے کیا؟ ہائے ری آفت، سودا آنے کے بعد ماما نے یہ عذر پیش کیا کہ بی بی ٹماٹو کے کٹلس بنانا مجھے نہیں آتے آپ بناکر دیں تو میں تل دوں گی۔ اب ان کو کیا خبر کہ بی بی کو تو اور بھی نہیں آتے۔ میں نے کہا جیسے بھی تمہیں آتے ہیں تل دو۔ آخر کئی دفعہ امی نے بتایا ہے تم نے دیکھا تو ضرور ہوگا۔ اس طرح سے اپنی کمزوری میں نے ماما سے چھپائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوپہر کو کھانے کے وقت ابا نے کٹلس بالکل نہ کھائے۔ جوں توں کرکے دوپہر کے کھانے سے بھی فراغت ہوگئی۔ اب رہی شام کی چائے تو اس کی زیادہ فکر نہ تھی۔ کیونکہ یہ کام ہم نے کئی دفعہ اچھی طرح انجام دیا ہے۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ آج ہماری قسمت میں خانہ داری کے پورے

کاموں کا تجربہ لکھا ہے۔ ابا چار بجے دفتر سے آنے کے بعد کہنے لگے کہ بابا! میں نے دو چار لوگوں کو آج چائے پر بلوایا ہے ناشتہ وغیرہ کا انتظام کر لینا۔ یہ سن کر میں امی پاس گئی تو امی نے کہا کہ ہاں اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے بسکٹ جیسلی اور انناس کا مربہ تو گھر میں موجود ہی ہے۔ اور تھوڑے سے سینڈوچس تیار کر لو۔ تم کو تو بنانا آتے ہیں نا؟ میں بڑی خوش ہوئی۔ کیونکہ سینڈوچس بہت اچھے بنا سکتی ہوں ان کو اسکول میں سیکھا تھا۔ چلو ایک چیز تو اس وقت اسکول کی بھی کام آگئی۔ غرض میں اور صغرا نے مل کر ناشتہ اور چائے وغیرہ تیار کر لی جب میز پر سب چیزیں چن دی گئیں تو اس کی اطلاع میں نے ابا کو دیدی۔ ابا نے آکر ایک تنقیدی نظر میز پر ڈالی۔ کچھ اعتراضات بھی کئے بہر حال ابا کے تیور سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت کے صاحبزادیوں کے سلیقہ نے ابا کو کچھ خوش کر دیا ہے، ورنہ صبح سے تو مسلسل ہمارے بے ڈھنگے پن کا ہی ثبوت انہیں ملتا رہا۔ غرض کہ آج پورا دن ہمارا ایسا ہی گزر گیا، اور رات میں جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو سوچنے لگی کہ۔ افوہ، تو اتنے کام کرنے پڑتے ہیں روز آنہ بیچاری امی کو اور پھر کس خاموشی کے ساتھ سب کام ہو جاتا ہے

سچ ہے ہماری تعلیم بالکل ادھوری ہے اگر ہم میں خانہ داری کا سلیقہ نہ ہو تو۔ اور اب تو بھئی میں بھی گھر کے کاموں میں دخل دینے لگی ہوں اور میرا مشورہ ان سب بہنوں کے لئے بھی ہے جو صرف مدرسہ کی پڑھائی ہی کو سب سے بڑا کام سمجھتی ہیں وہ گھر کا کام کاج بھی کیا کریں۔ کیونکہ یہی ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔

پرچہ نہایت احتیاط سے ڈاک کیا جاتا ہے تاہم اگر اندرون ۱۵ تاریخ پرچہ نہ ملے تو مکرر طلب کر لیا جائے ورنہ اس کے بعد دفتر میں بدقت کوئی پرچہ نکل سکیگا۔ باوجود بارہا لکھنے کے عموماً دیکھا گیا ہے کہ دو دو تین تین مہینوں کے بعد پرچہ طلب کیا جاتا ہے اور ہمیں ندامت ہوتی ہے کہ آپ تک پرچہ نہیں پہنچا۔ آپ اطمینان رکھیں چندہ وصول ہونے کے بعد پرچہ کا نہ بھیجنا بڑی اخلاقی کمزوری ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ آپ پاس لائق نکوہش ثابت ہوں۔ اس میں کچھ آپ کی بھی غفلت ہے۔ تبدیل پتہ کی دفتر کو اطلاع نہیں دیجاتی اور یوں بھی پرچہ تلف ہو جاتا ہے اور مورد الزام پرچہ ٹھہرتا ہے۔ براہ کرم ان امور کا خیال رکھئے تو آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملیگا۔

مُحبّت

آنسہ پریم پجارن

(بسلسلۂ گذشتہ)

اوشا دنیا کی کوئی طاقت نہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ دن گزرنے لگے۔ ایک دن میرے چاچا کے پاس سے تار آیا۔ "فوراً چلے آؤ" میں نے جوں توں کر کے ایک ماہ کی رخصت لی اور سیلم پہنچا۔ میرے چاچا بالکل تپاجی کے ہو بہو تھے وہ بستر مرگ پر پڑے تھے ان کی پتری رادھا ان کے سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا چہرہ اداس تھا اس نے مجھے دیکھا اداس چہرے پر مسرت کی سرخی آگئی میں سیدھا بستر کے قریب پہنچا۔ چاچاجی کے حلق میں گھنگرو بج رہے تھے۔ میری آنکھیں اپنے مسافر چاچا کو دیکھ کر بھر آئیں۔ میں نے پکارا۔ چاچا — چاچاجی دیکھئے آپ کا ونود آگیا۔ اس آواز کو سن کر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ۔ (کمزور اور سسکتی ہوئی آواز میں) کون ونود میرے لال۔ تجھے دیکھ کر میری آتما کو شانتی ملی۔

بیٹا۔ اب میں خوشی سے مروں گا۔ لیکن مرنے سے پیشتر تجھ سے ایک وچن لوں گا۔ کیا تم ایک بات کا وچن لوگی (میں۔ چاچاجی وچن کیسا، میں تو آپ کا فرماں بردار ہوں۔ آپ کی یہ اگیا ہے تو میں وچن دیتا ہوں — چاچا نے رادھا کو قریب بلایا اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ونود۔ ایشور گواہ ہیں آج سے یہ تیری داسی ہے۔ ان الفاظ نے تیر نشتر کا کام کیا۔ داسی یعنی۔ آہ میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں تارے ٹوٹنے لگے۔ آہ میں اوشا کو کیا جواب دوں گا۔ میں نے اپنے دین توڑنے کی خاطر آنکھیں کھولیں۔ رادھا کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ چاچا پر نظر پڑتے ہی ایک چیخ کے ساتھ بیہوش ہو گیا۔ آہ۔ ان کی روح کب کی پرواز ہو چکی تھی۔ چہرے پر دائمی مسرت کھیل رہی تھی۔ آہ وہ خوش خوش مجھے تباہ کر کے چلا ہے۔ پھر تاجی وغیرہ سیلم آئے۔ کریا کرم کے بعد ہم دو ماہ تک وہاں رہے۔ اس اثناء میں میں نے خون جگر بہاتے ہوئے ان تمام باتوں کی اطلاع دھڑکتے ہوئے

دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ دیدی۔
اوشا۔ میری اوشا کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے
میری مجبوریوں کو مدنظر رکھ کر معاف کر دیا۔۔۔
اس نے خط میں یہ بھی لکھا "ونود میں صرف
تمہاری ہوں تم نے اپنے قریب المرگ چچا کو وچن
دیا تھا۔ اسے ضرور پورا کرو۔ آہ۔ محبت کے
آگے ہمیشہ وچن کی فتح ہوتی ہے۔ تم مجھے بھول
جاؤ۔ رادہا سے شادی کر لو تو مجھے بھی خوشی ہوگی۔
جب ماتا جی نے اوشا کا خط دیکھا تو ان سے
ان گنت دعائیں ملیں پھر آہ۔ ظالم سماج نے مجھے
بیاہ کی سیاہ ڈوریوں میں جکڑ دیا۔۔۔ رادھا
میری استری مجھ سے پریم کرتی ہے وہ ہر وقت
میری سیوا میں لگی رہتی ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی
ہے لیکن محبت نہیں۔۔۔ آہ۔ یہ دل تو صرف
میری اوشا کا ہے اور رہے گا۔ رادھا نے میری
خاطر اپنا آرام حرام کر دیا۔ جب میں رادھا سے
کہتا ہوں کہ میں اس کے قابل نہ تھا تو وہ اپنا
خون جگر پی کر چپ رہ جاتا ہے۔ کبھی میں کہتا۔
رادھا تو نردوش ہے۔ آہ۔ تو مجھ ظالم کی کیوں
سیوا کرتی ہے۔ کاش جاتے وقت وہ اپرا
کی طرح پاک ہے۔ رادھا کہتی پران ناتھ ایشور
کے لئے یہ نہ کہئے۔ آپ کی زندگی ہے تو میرا سہاگ
ہے۔ ناتھ ایشور نے جب مجھے آپ کی دھرم پتنی

بنایا ہے تو مجھے چاہئے کہ اپنے پتی دیو کی سیوا میں
اپنا سب کچھ مٹا دوں۔ پریم دیکھا تم نے تمہاری
بھابی کا دل۔ وہ ستی ساوتری ہے۔۔۔ آہ۔۔۔
پریم تو اپنے بھیا کے لئے ایشور سے پراتھنا کرو۔
میں۔ آہ۔ بھیا۔ واقعی آپ کی کہانی کافی
دردناک ہے۔ بیچاری اوشا کا کیا حشر ہوا۔
وہ۔ اوشا کا۔۔۔ آہ۔۔۔ میری اوشا۔
اب دوسرے کی ہوگئی۔ میرے بیاہ کے کچھ دن
بعد اس کا بھی بیاہ ہوگیا۔ اب مجھے اسے میری
اوشا کہنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔ وہ۔۔۔
اب ایک متمول تعلیم یافتہ نوجوان کی استری ہے
۔۔۔ آہ۔۔۔ پریم پھر سے ماضی کی یاد تازہ ہوگئی۔
پرانے زخم ہرے ہوگئے۔ آہ۔۔۔ ہمارے
خوش گوار مستقبل کی سنہری عمارت دیکھتے دیکھتے
سماج کے ہاتھوں توڑ دی گئی۔۔۔ آہ۔۔۔
اتنا کہہ کر بھیا اتنا روئے کہ ان کی ہچکی بندھ
گئی۔ آہ۔۔۔ مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا میرے
بھی آنسو جاری ہوگئے۔ ہم دونوں روتے رہے
جب بھیا کے دل سے غبار دور ہوگیا تو وہ پھر
آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے میں نے بھابی کو لانے
کیلئے کہا ہے دیکھیں بیچاری کو اپنے ساتھ لاتے بھی ہیں یا
نہیں۔ دور شرک پر بانسری میں کوئی بجا رہا تھا۔
کیا محبت کا یہی انجام ہے سینکڑوں غم اک دل ناکام ہے

کھلاڑی

سلطانہ عزیز بی۔ اے (حیدرآباد دکن)

نگار منزل دلہن کی طرح سنواری گئی تھی چپہ چپہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ نوبت نقارے زور شور سے پیٹے جا رہے تھے۔ نفیری کی تانیں فضا میں اڑ رہی تھیں۔ بچوں کی چیخم دھاڑ میں ملی جلی مراثنوں کی بلند آواز نے عجیب ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ فضا میں فرمائشی قہقہوں سے تھرا رہی تھیں۔ ورانڈے کی تیز روشنی کیپٹن شمشاد کے کمرے کی تاریکی میں جذب ہوئی جا رہی تھی۔ وہ کمرے کی اداس خلاء میں ٹکٹکی باندھے گھور رہے تھے۔ گویا کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کر رہے ہیں ــــــ کیپٹن کی چھوٹی چھوٹی پُر کشش آنکھوں کی نمی نفیری کے بڑھتے ہوئے سُر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ بجھتی ہوئی سگریٹ کا دھواں کیپٹن کے خیالات کی طرح منتشر تھا۔ ایک سرد سانس ابھری اور فضا کی خنکی میں منجمد ہوگئی ــــــ شمشاد نے کسی نامعلوم خوف سے آنکھیں میچ لیں ــــــ وہ بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ اب اور کچھ دیکھنا نہ چاہتا تھا لیکن احساسات کی دنیا سلگ اٹھی۔ محبت کے شرارے ابھرنے لگے۔ جذبات کے شعلے بھڑک اٹھے جیسے کسی نے دل پر پٹرول چھڑک کر دیا سلائی دکھائی ہو ــــــ وہ کانپ گیا۔ روح لرز اٹھی ایسا معلوم ہوا جیسے بدن پر چنگاریاں دوڑ رہی ہوں۔ اس نے زور زور سے آنکھیں بھینچنی شروع کر دیں۔ دماغی الجھنیں مہ پارہ کی شکل میں مبدل ہوگئیں۔ ذہنی انتشار نے اس کا گلا گھونٹنا شروع کیا۔ مہ پارہ ایک بھیانک چیخ میں منتقل ہوگئی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مہ پارہ کو سمندر پار جاتے دیکھا۔ اور ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی ــــــ ماہ پارہ کی یاد خون کی طرح کیپٹن کی رگوں میں دوڑنے لگی۔ وہ جا چکی تھی۔ اپنے من کے ہیرو کے ساتھ۔ شمشاد کی تمناؤں کا نذرانہ لئے آرزوؤں کے تحفے لئے۔ آج کیپٹن کو پتہ چلا کہ زندگی کا موڑ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کو خیابان کی طرح خوبصورت ــــ قوس قزح کی طرح رنگین سمجھ رکھا تھا۔ کون جانتا تھا کہ ان کی محبوب ہستی زندگی کے دوراہے پر انہیں راستہ کے نشیب و فراز ــــ غار دار پگڈنڈیوں

اور نکیلے پتھروں کی ٹھوکریں کھانے کے لئے تنہا
چھوڑ جائے گی ـــــ مہ پارہ کیپٹن کی نظروں کے
دامن میں پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی، لیکن اس
کی لمبی لمبی مخروطی انگلیوں سے کوسوں دور ـــــ
شاید یہ کیپٹن کی زندگی کا پہلا ناکام رومان تھا
کیپٹن کا سنہرا خواب بہت جلد ایک تلخ حقیقت
اختیار کر چکا تھا ـــــ ماہ پارہ کے ہاتھوں کیپٹن
کی زندگی مٹی کے ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح
بیکار ہو چکی تھی ـــــ زندگی کا کھیل آبگینے کی
طرح نازک ہوتا ہے ۔ٹھیس لگی اور کبھی نہ جڑنے
والے ذروں میں بکھر گیا ـــــ کیپٹن شمشاد بھی
ایک کھلاڑی رہ چکا تھا ۔ کھلاڑی جس نے گداز
جسم والی سانولی نجمہ کے دل سے ہاکی کی گیند کی طرح
خوب کھیلا ۔ اشک کی شدید ضربیں گیند کو ناکارہ
کر دیتی ہیں نا بالکل اسی طرح اس نے نجمہ کے دل پر
بے اعتنائیوں کی کاری ضربیں لگائیں ـــــ
بے وفائیوں سے شگاف ڈال دے ۔ اسے اٹھا کر
پھینک دیا ۔ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گئی ۔
دوسری نئی گیند مل گئی ۔ وہ اب اس سے نہایت
دلچسپی سے کھیل رہا تھا ۔ نئی تھی نا ـــــ بالکل
نئی ـــــ شاہانہ جس کی کل کائنات کیپٹن کی گہری
گہری ٹھری ہوئی گھنی پلکوں والی آنکھوں میں
سمٹ آئی تھی ۔کیپٹن کے کشادہ سینے اور تنومند

بازوں کا سہارا لینا چاہتی تھی ـــــ وہ گھورا کرتی
ـــــ شمشاد کی آنکھوں کو ـــــ ایسے جیسے ننھے
بچے چاند کو کھسکتا دیکھ کر مسکراتے ہیں ۔ شاہانہ
کی کھلتی ہوئی رنگت ، نکلتا قد ، تڑپتی مسکراہٹ
کو وہ پسند ضرور کرتا تھا ۔ لیکن پسند محبت کی طرح
اندھی نہیں ہوتی ۔ پسند ہی تو تھی ۔ انقلاب پذیر
پسند جس نے سرو قد ماہ پارہ کو پسند کیا ۔ کھیلنے
کے لئے نہیں بلکہ اپنے دل کی ملکہ بنانے کے لئے ۔
ماہ پارہ کی اُبھری ہوئی گہری بھوری نیم وا آنکھیں
شمشاد کی زندگی کے افق پر صبح کے ستارے کی
طرح جھلملانے لگیں ۔ ماہ پارہ کے موٹے موٹے تر
تراشیدہ ہونٹوں کی معنی خیز لرزشیں شمشاد کے
خرمن دل پر بجلیاں گرانے لگیں ۔ وہ ایک کالج کی
لڑکی تھی ۔ ساتھ ہی ایک عمدہ کھلاڑی بھی ـــــ
جس نے کیپٹن کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا ۔
لیکن ہاکی کی گیند سے نہیں بلکہ بیڈمنٹن کی
ہلکی پھلکی پردار چڑیا سے ۔ جو ذرا سی ضرب سے
گزوں دور اچھل کے جا پڑی ۔ مہ پارہ نے کیپٹن
کے دل سے کھیلنا شروع کر دیا ۔ لیکن اس پر ہاکی
اسٹک سے کاری نشانے نہ لگائے ۔ بلکہ راکٹ
سے ایسے آڑے ٹیڑھے ترچھے ہاتھ مارے کہ چڑیا
اپنا توازن نہ رکھ سکی ۔ کیپٹن کے دل کی چڑیا
کہاں تک تاب لاتی ۔ جھکولے کھاتے کھاتے

پَر اُکھڑنے لگے ۔ چند ضربوں کے بعد وہ اس قابل
بھی نہ رہی کہ اس سے دوسرا کھیل کھیلا جاتا ۔
یہی تو فرق ہے عورت اور مرد کے دل میں ـــــ
عورت کا دل ہاکی کی گیند کی طرح چوٹیں سہہ سہہ کر
کام دے جاتا ہے ۔ لیکن مرد کا دل چڑیا کے پروں
کی طرح منتشر ہو جاتا ہے ۔ پھر ۔ پھر کون پوچھتا
ہے ۔ اس بیچاری پروں کی چڑیا کو کیپٹن کے
ہونٹ مرتعش ہوئے اور اس لرزش نے ایک
وقفتہً تلخ مسکراہٹ کی شکل اختیار کرلی کیپٹن
نے غیر معمولی تھکن محسوس کی ۔ جیسے کوئی کھلاڑی
اپنے چالاک مخالف سے کوششوں کے باوجود ہار
جاتا ہے ۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا ۔ وہ تھک
چکا تھا زندگی کے کھیل سے ، کھلاڑی نے خود کو
مٹی کے ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی طرح ناکارہ
محسوس کرتے ہوئے آنکھیں میچ لیں ۔ شادیانے
گائے جا رہے تھے ۔ دلہن رخصت ہو رہی تھی ۔
سکوت بڑھتا جا رہا تھا ۔ کیپٹن کے کمرے کی خنک
تاریکی ورانڈے کی تیز روشنی میں جذب ہوئی
جا رہی تھی ـــــ وہ ٹکٹکی باندھے کمرے کی اداس
خلا میں گھور گھور کر کھوئی ہوئی مسرتیں تلاش
کر رہا تھا ۔

شادی

سیدہ زہرا رضویہ

ہمارا سارا "ادبی ذوق" مسسک رہا ہے
یوں مصروفیت بھی تو بلا کی تھی کیونکہ شادی
کی تیاریاں ہنگامہ آور ہوتی ہیں اور بار پڑتا ہے
بیچاری غریب لڑکیوں پر ۔ عم زاد بہن سیدہ
کی شادی کیا ہوئی کہ فرصت مفقود تھی ۔ طرہ یہ
کہ لڑکیوں ہی کے سپرد صبح و شام کی چاء کا انتظام
کیا گیا ۔ مرد بیٹھے ہوئے چاء لاؤ چاء لاؤ کی آوازیں
لگا رہے تھے ۔ کہیں آپ یہ نہ خیال کریں کہ ہم
"کام چور" ہیں ، بلکہ ہوتا یہ تھا کہ بھائی صاحبان
کئی مرتبہ چاء پی کر بھی اعتراض کرتے پھرتے تھے
کہ ارے بھئی ان لڑکیوں کے ذمہ چائے والے
کیوں کی ۔ نہ مزہ نہ لذت ۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ گرم
شربت پی رہے ہیں ۔ آپ ہی تبلائیے طبیعت
جل نہ جائے تو کیا ہو ؟ حالانکہ ہم نے بغیر ستائش
کی توقع پر بہتر سے بہتر انتظامات کئے تھے لیکن
اعتراض کرنا تو مردوں کی فطرۃ ہے ۔ اب سنئے
برات سے چار دن قبل سعیدہ صاحبہ کو زرد
زرد کپڑے پہنا کر "مانجھے" بٹھایا ۔ اس سے
پیشتر اناّ نے نہلایا تھا اور ہم سب بہنوں نے

سر پر روپیہ سے دودھ ڈالا تھا جس میں ہمیں خوب "نیک" ملا۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہونگی کہ مانجھے کے دن سے دلہن کے ساتھ سب ہی زرد کپڑے پہنتے ہیں، اسی دن ہم سب نے "بٹنہ" (جس کو غالباً یہاں چک کہتے ہیں) چکی پر پیسا۔ وہ لہک لہک کر گانے گائے ہیں کہ بس! لکھنوی اور دکھنی اور فلمی غرض کوئی گیت نہ چھوٹا اور اس وقت بھی چچا ابا سے نیک لیا علاحدہ بھائیوں نے بہت "بھانجی" ماری کہ سارا حق لڑکیوں ہی کا ہوتا ہے۔ ہرگز اتنے روپیے نہ دینا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہمارے چچا ابا بیچارے لڑکیوں کے ذرا موافق ہیں اس لئے لڑکوں کی کچھ نہ چلی۔ اسی روز "صحنک" بھی ہوتی ہے (جسے یہاں شاید رت جگا کہتے ہیں)۔ وہ آفت بھی لڑکیوں کے سپرد۔ مزعفر تو پھوپی اماں اور امی جان نے پکایا اور گلگلے ہم نے تلے۔ لیکن توبہ کرتے ہیں کہ آئندہ کبھی کسی کی شادی میں گلگلے تلنے نہ بیٹھیں گے۔ اے ہے کیا ناک میں دم ہوا تھا، توبہ، توبہ، ہوا یہ کہ گھی میدے میں بہت مل گیا اور تلنے میں بڑی مشکل! اور ادھر ہمارے میٹھا کھانے والے پہلوان بھائیوں نے ستایا کہ ایک پلیٹ بھر کر دو چچا ابا کے دوست منگوا رہے ہیں۔ ذرا دو چار چکھنے کو دو تو تم لوگوں کی تعریف کریں۔ واہ واہ کیا کام کی بچیاں ہیں "غرض پھر لاکھ کہو کہ بھیا! اسے ہاتھ نہ لگائیے۔ نذر کے ہیں۔ ارے بیوی کی صحنک میں رکھے جائیں گے۔ مگر کون سنتا ہماری۔ نیچے بڑی باجی اور باجی چنے کی دال اور کھوپرے کا میٹھا بنا رہی تھیں۔ بھائی صاحبان وہاں سے ڈانٹ کھا کر گلگلوں پر اکتفا کرنے آئے تھے۔ جب تک ہم نے بڑی باجی کو نہ پکارا۔ تقریباً پاؤ حصہ چھین جھپٹ کر ان لوگوں نے ہضم کر ہی لیا اور پھر ہنڈیاں بھی بنتے ہی بنتے کتنی ختم ہوگئیں دوسرے دن چچی اماں نے کہا۔ اے لڑکیو! دو اور ہنڈیاں دلہن کے لئے نیچے لیجاؤ۔ تم لوگ بھی کھانا یہ بھائیوں سے چھپتے چھپاتے نیچے ہنڈیاں لے کر پہنچے۔ تھوڑی سی سعیدہ نے کھائی۔ اور ایک ایک ٹکڑا ہم نے ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ قبلہ بھائی جان وارد ہوئے اور زبردستی سب ہنڈیاں کھینچ کر کھا گئے۔ روزآنہ مہمان اتر رہے تھے اور ہمیں یہ حکم ملتا کہ "دلہن" کے پاس سے ہلنا نہیں۔ ایک عجیب ہی مصیبت ہمارے سر آگئی۔ کوٹھے پر چل، بولی، ہنسی مذاق ایک آفت۔ اور ہم ہیں کہ اکیلے دلہن کے پاس۔ آخر ہم بھی تنگ ہو کر انا سے ڈھول بجوانے لگتے۔ باقی

3238
Regd. M. N.
رجسٹرڈ آصفیہ (۱۲۲)

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب میر پورہ حیدر آباد سے شائع ہوا۔



شہاب

شہاب

جلد ۱۳ اردی بہشت سنہ ۱۳۵۴ ف م مارچ سنہ ۱۹۴۵ء نمبر ۶

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے چندہ سالانہ (للعہ) گورنمنٹ سے (عسہ)

اورنگ آباد کی تاریخی اہمیت

جناب عبد المجید صاحب صدیقی ایم۔ اے

اورنگ آباد خجستہ بنیاد دکن کا وہ تاریخی معمورہ ہے جس میں صدیوں کی تاریخ جمع ہے۔ اس کے ہر گوشہ میں تاریخ کے دفینے چھپے ہوئے ہیں اور اس کی فضاؤں میں دکھنی قوموں اور تمدنوں کی دلکش داستانیں گونجتی ہیں۔ اس شہر نے ہر زمانہ میں جدید تمدن کی بنیاد رکھی، جہاں قومی معماروں نے ہر زمانہ میں حیات نو کا درس دیا اور علم و اخلاق کے دریا بہائے۔ اسی شہر سے دکن کے دور دراز گوشوں میں تمدنی ارتعاش ہوتا تھا اور زرین دور لہریں دوڑ جاتی تھیں دکن تو کیا خود ہندوستان میں ایسے شہر کم ہیں جن پر قدیم وسطی اور حال کے کئی دور گذرے اور ذہنی اخلاقی تلاطم ہوا یہ عجیب اتفاق ہے کہ تاریخ کا یہ گراں بہا سرمایہ فنا نہیں ہوا بلکہ اس کی کہنہ دیواروں میں اب تک محفوظ ہے۔

اگرچہ اورنگ آباد کی شہریت سترھویں صدی کی پیداوار ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے گرد و نواح میں صدیوں سے تاریخ جمع ہوتی رہی اسی کے قرب و جوار سے آیا کا[illegible]روں کے بڑے بڑے قافلے گذرتے تھے جن کے گھنٹوں کی آوازیں فضائے محیط میں ذہنی و اخلاقی تموج پیدا کر دیتی تھیں۔ اسی کے آس پاس کئی معمورے بنے اور بگڑے یہ دکن کا شمالی حصہ ہے جہاں بالاگھاٹ کے دلکش سلسلے مشرق و مغرب کی طنابیں ملا دیتے ہیں۔ سہیادری پربت کی سرپوش چوٹیاں جو افق مغرب سے بلند ہوتی نظر آتی ہیں وہ یہیں آکر ختم ہوتی ہیں اسی کی گودی میں کئی ندیاں بہتی ہیں جن کا شفاف پانی سبز درختوں کے جھرمٹ سے گذرتا ہوا بڑی دلفریبی پیدا کرتا ہے اور جہاں بلندی سے گرتا ہے وہاں ایسے دلکش آبشار ملجاتے ہیں جن کا جھلملانا دیکھنے والوں کو گرویدہ کر لیتا ہے۔ اکثر ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے اس وجد آفریں جغرافیہ میں اپنی عمریں گزار دیں اور اس دیوتائے فطرت کے مطالعے کے لئے اپنے کو فنا کر دیا اور آج ہمیں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ بالاگھاٹ کی طبعی دلکشیاں دکن کی تاریخ و تمدن پر کس قدر اثر انداز ہوئی ہونگی یہی جغرافی دلکشیاں ہیں جن کی بدولت تاریخ دکن و تمدن میں شگفتگی پیدا ہوئی۔ سرزمین دکن نے فنون لطیفہ کی جس قدر خدمت کی اس کا حصر کرنا

مشکل ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے لطیف سرمایہ میں دکن کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ایلورا اور اجنٹہ کی حسن کاریاں آج دنیا کو محو حیرت کر دیتی ہیں لیکن اس کو دکن کے دلفریب جغرافیہ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے اس لطیف جغرافیہ میں یہ حسن کاری ہونا ضروری ہے۔

تاریخ و تمدن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اورنگ آباد کا گرد و پیش ہزاروں سال کی تاریخ کی آماجگاہ رہا ہے یہ شمال و جنوب کا سنگم ہے یہاں تمدنوں کے بڑے دریا آکر ملے اور یہیں سے چاروں طرف علم و اخلاق کی شیریں نہریں جاری ہوئیں۔ اسی میدانوں میں ہزاروں سال پہلے آریا آئے۔ اور دکن کی دراوڑی اقوام سے ان کا میل ملاپ ہوا۔ بعض میدان، پہاڑوں کے کوہ دریاؤں کی شاداب وادیوں میں ان آباد کاروں کے اولین نقوش پائے جاتے ہیں۔ دراوڑی اقوام کے تمدنی آثار تو بیشمار ہیں۔ شمال میں مہنجو دارو اور ہڑپا کے شہر اور جنوب میں مسکی اور کنڈاپور اور پانی گری کے تمدنی دفینے دراوڑیوں کے بلند پایہ تمدن کی نشاندہی کرتے ہیں آریاؤں کے آنے سے پہلے دکن تو کیا تمام ہندوستان میں ان کا راج تھا اور شہنشاہتیں قایم تھیں ان قوموں کا آریاؤں کے ساتھ پہلا۔ امتزاج شمال میں ہوا تھا لیکن صدیوں کے بعد بالاگھاٹ میں بھی ہوا اور اس امتزاج سے ایک خوشگوار تمدن پیدا ہوا۔ چنانچہ مرہٹی زبان اور تمدن اسی میل ملاپ کا نتیجہ ہے۔

آج سے دو ہزار سال پہلے اسی اورنگ آباد کے قرب و جوار میں ایک بہت بڑی سلطنت قایم ہوئی تھی جس کو آندھرا سلطنت کہتے تھے۔ یہ سلطنت کوئی چار سو سال قایم رہی۔ اس کا پایہ تخت پٹن تھا جو اورنگ آباد سے بیس تیس میل کے فاصلہ پر دریائے گوداوری پر واقع ہے۔ اسی پٹن سے تقریباً چار سو سال تک نہ صرف دکن بلکہ شمال ہند پر بھی حکومت ہوتی رہی اور یہاں بین اقوامی تصفیے ہوئے۔ کیونکہ اندھرا راجگان شمال ہند پر بھی قابض تھے۔ دریائے گوداوری کی اسی وادی سے اندھرا خاندان کے جلیل القدر راجہ شالیوان اپنے بین اقوامی فیصلے نافذ کرتا تھا۔

اس نے ایک تقویم بھی بنائی تھی جو آج تک شالیوان شک کے نام سے تمام دکن اور جنوب ہند میں رائج ہے۔ اس خاندان کے خاتمہ کے بعد کئی سو سال خاموشی میں گذر گئے اور کوئی بڑی سلطنت قایم نہیں ہوئی۔ چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت چالوکیہ قایم ہوئی تھی

اور اس کے زوال کے بعد راشٹراکٹ خاندان نے جنم لیا۔ اگرچہ ان خاندانوں کے پائے تخت بالا گھاٹ سے دور واتاپی، ملکھیڑ اور کلیانی تھے اور بالا گھاٹ غالباً ان سلطنتوں کا شمالی صوبہ ہوگا لیکن ان سلطنتوں کی تمدنی شمیم انگیزیاں یہاں تک پہنچتی تھیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ چالوکیہ راشٹراکٹ خاندانوں کی سرپرستی میں ہی ایلورا اور اجنتہ کی حسن کاریاں ہوئی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے ان مشہور خاندانوں نے جو چھٹی صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی تک راج کیا تھا۔ بالا گھاٹ کو ہی اپنی ذہنی اور اخلاقی جولانیوں کا مرکز بنایا تھا۔ اگرچہ ان کے پائے تخت یہاں سے بہت دور تھے۔ لیکن ان کی ذہنی اور اخلاقی مہک یہاں تک پہنچتی تھی۔

بارہویں صدی میں چالوکیوں کا آخری دور ختم ہوگیا اور دکن کے کئی حصے ہوگئے اور تین سلطنتیں قایم ہوگئیں منجملہ ان کے بالا گھاٹ کا شمالی صوبہ بھی تھا جو اپنے تاریخی ماحول کے ساتھ ایک علیحدہ سلطنت چاہتا تھا۔ چنانچہ یادو خاندان کی سرپرستی میں مہاراشٹر کی ایک ایک نئی سلطنت تشکیل پاگئی۔ جس کا پایۂ تخت دیوگری تھا۔ یہ بالا گھاٹ کا تاریخی عہد ہے، جہاں بارہویں صدی سے نئی تاریخ جمع ہونے لگی۔ اس دیوگری میں یادو خاندان نے سو سال حکومت کی جس کے حدود سلطنت برار سے شروع ہوکر ناندیڑ تک پہنچتے تھے۔ قلعہ رامچندر کو جو اس خاندان کا بڑا راجہ تھا سب جانتے ہیں۔ اس کا اخلاقی اثر بھی سب کو یاد ہے اس کو دہلی کے خلجی دربار سے رائے رایاں کا خطاب ملا تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی راجہ کے زمانہ میں دکن کے سیاسی حالات نے پلٹا کھایا یعنی تیرھویں صدی کے آخری عشرہ میں شمال کے ترک حملہ آور اچانک دیوگری کی دیواروں کے سامنے نمودار ہوگئے۔ تیرھویں صدی ہندوستان کے سیاسی اور ذہنی تلاطم کا زمانہ ہے۔ اس میں ترکوں کی سلطنت دہلی میں قایم ہوچکی تھی۔ اور اس کے آخری زمانہ میں ترک اس قابل ہوگئے تھے کہ وہ شمال سے نکل کر دکن میں نفوذ کریں۔ دیکھتے دیکھتے ان کا کارواں اجنتا کی پہاڑیوں میں سے ہوکر قلعہ دیوگری کے سامنے نازل ہوگیا۔ ان حملہ آوروں کی آمد گویا نئے زمانہ کا پیغام تھا کہ پرانی تاریخ یہاں ختم ہوگئی۔ اگرچہ کئی سال تک دکن کی پرانی سلطنتیں قایم رہیں لیکن اسی دس بیس سال کے اندر ان حملہ آوروں کے نئے قدم پر شمال کے آباد کار جوق بجوق آنے

لگے اور دکن کے طول وعرض میں آباد ہوگئے
اور خود سلطنت دہلی نے بھی ان کو آباد کیا۔
جب چودھویں صدی کے اوایل میں دیوگری،
ورنگل اور کرناٹک کی سلطنتوں کا چراغ گل
ہوگیا تو دکن سلطنت دہلی سے ملحق ہوگیا۔
اور یہاں شمال کی تمام صدائے بازگشت سنائی
دینے لگی۔ یہ شمال وجنوب کا بہت بڑا امتزاج
ہے جس کی ہر جنبش میں ایک نئی زندگی تھی۔ جو
ترک خاندان دکن میں آباد کئے گئے اور دکن
کے نظم ونسق کے ذمہ دار بنائے گئے وہ امیران
صدہ کہلاتے ہیں۔ یہ دکن کے حقیقی تاریخ ساز
ہیں جنھوں نے دکن کی تاریخ بنائی یہی لوگ
تمدن کی مشعلیں روشن کئے ہوئے دکن کے
تمام طول وعرض میں پھیل گئے اور ہر گوشہ میں
روشنی پھیلائی۔

چودھویں صدی کے وسط میں پھر حالات
نے پلٹا کھایا اور ایک سیاسی ہلچل ہوگئی جو آئندہ
زمانہ کے لئے بڑی عہد آفریں تھی اور عجیب
اتفاق ہے کہ سیاسی تلاطم بھی دیوگری کے تاریخی
مقام میں ہوا جس کو نئے زمانہ میں دولت آباد
کہنے لگے تھے۔ بات یہ ہے کہ دکن کے نئے آباد کار
امیران صدہ اس قدر طاقتور ہوگئے تھے کہ
وہ اپنی خود مختار سلطنت کا خواب دیکھنے لگے

سلطان محمد تغلق کی کوتاہیوں سے جو اس زمانہ کے
فرمان روا تھے امیران صدہ کا راستہ صاف
ہوگیا۔ ۷۴۷ھ ۱۳۴۷ء میں قلعہ دولت آباد کے سامنے
شمال وجنوب کا تاریخی تصادم ہوگیا۔ جس کا
آخری فیصلہ اہل دکن کے حق میں تھا اور دکن
جو صرف آج پچاس سال سے شمال سے وابستہ
تھا پھر جدا ہوگیا۔ امیران صدہ نے اسی دولت آباد
میں اپنی خود مختار سلطنت قایم کردی۔ یہ قرون
وسطی کی مشہور سلطنت ہے جس کو سلطنت
بہمنی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آج اس واقعہ کو
چھ صدیاں گذر گئیں لیکن اہل دکن کو وہ دن یاد ہے
کہ دولت آباد کی مبارک شاہی مسجد میں سلطنت بہمنی
کی پہلی افتاد ہوئی تھی۔ یہ جمعہ کا دن تھا صبح کو تمام
امیران صدہ اپنے زرق برق لباس میں اس تاریخی محفل
میں جمع ہوئے اور اس زمانہ کے مشہور صوفی حضرت
شیخ سراج الدین جنیدیؒ نے جو اس تاریخی محفل کے
متاع گرانبہا تھے علاؤالدین حسن بہمن شاہ کو تخت
پر بٹھا کر اس کی بادشاہی کا اعلان کیا اور پُر اثر انداز
میں حاضرین کو مخاطب کیا تھا۔ اس خطبہ میں سلطنت
کی اخلاقی غایت اور بادشاہ کی ذمہ داریاں بتائی
گئی تھیں۔ شیخؒ کی یہ روحانی آواز برسوں تک
دولت آباد کی تاریخی فضا میں گونجتی رہی۔ اگرچہ
سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے بہمنی بادشاہوں نے

دولت آباد کو چھوڑ کر گلبرگہ کو اپنا پایہ تخت بنا لیا
اور تقریباً ایک صدی کے بعد بیدر میں منتقل ہو گئے
لیکن دولت آباد کے ساتھ اخلاقی اور روحانی
برکتیں شامل رہیں۔ گو بعض اعتبار سے گلبرگہ اور
بیدر پائے تخت تھا لیکن اخلاقی اعتبار سے دولت آباد
نے ہی مرکز کے فرائض انجام دئے۔ اسی کے قرب و
جوار سے کئی روحانی بزرگ سلطنت بہمنی کی اخلاقی
رہبری کرتے تھے۔ حضرت زین الدین اور حضرت برہان الدین
رحمہما اللہ نے جن کے قدم سے دریائے تاپتی کے
کنارے زین آباد اور برہانپور آباد ہیں دولت آباد سے
اخلاقی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ جب کبھی ان لوگوں
نے سلطنت کو اخلاقی حدود سے ہٹتا دیکھا تو حکومت
کو تنبیہہ کر دی۔ علاؤ الدین ثانی بہمنی کے عہد میں جب
بد اخلاقیاں عام ہونے لگیں تو حضرت زین الدینؒ
نے اپنا مصلیٰ بچھایا اور فرمایا کہ اسی مصلیٰ پر سلطنت کے
مستقبل کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ حضرتؒ کی اس آواز
سے تمام ارباب سیاست کانپ گئے اور بادشاہ
وقت علاؤ الدین کو اس اخلاقی قوت کے سامنے
سر جھکانا پڑا تھا۔

پندرھویں صدی کے آخری عشرے میں
پھر حالات بدل گئے اور سلطنت بہمنی کا شیرازہ
بکھرنے لگا اور عجیب اتفاق ہے کہ اس جدید تلاطم
کی صدائے بازگشت بھی دولت آباد کے نواح میں
سنائی دینے لگی۔ مہاراشٹر میں ایک نئی سلطنت قائم
ہو گئی جس کے معمار نظام شاہ کہلاتے ہیں نظام شاہی
خاندان کا پایہ تخت دولت آباد تو نہیں تھا لیکن
اس کے قریب مغرب میں جنیر اور احمد نگر
پائے تخت بنائے گئے۔ تاہم دولت آباد ہی مستقر
سلطنت کا کام دیتا تھا اور یہاں بھی شاہی علم
بلند ہوتے تھے اور شاہی جلوس نکلتے تھے لیکن عجیب
اتفاق ہے کہ صرف ایک سو سال کے بعد ہی یعنے
سولھویں صدی کے آخری حصہ میں سلطنت بری
طرح متزلزل ہو گئی۔ کچھ تو طبقہ داری کشمکش سے اس کو
نقصان پہنچا اس پر طرہ یہ کہ مغل شہنشاہیت اس کو علحدہ
ڈرانے لگی۔ یہ شہنشاہ اکبر کا عہد ہے جس میں مغل سلطنت
پوری طور پر مستحکم ہو چکی تھی اور دکن پر یورشیں
شروع ہو گئیں بالآخر ۱۵۹۵ء میں شاہزادہ مراد
کی فوجیں قلعہ احمد نگر کے سامنے پڑاؤ ڈالنے لگیں
اس سنسنی خیز منظر سے تمام دکن میں رعشہ پڑ گیا۔
دکن کی مشہور ہیروئن چاند بی بی نے دکن کی لاج
رکھ لی اور مغلوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ لیکن یہ
مقابلہ کب تک ہوتا۔ جب چاند بی بی کا انتقال ہو گیا
تو بالآخر مغل فوجیں احمد نگر میں داخل ہو گئیں اور
نظام شاہی سلطنت کا گلا گھونٹ دیا۔ لیکن ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطنت کی تعمیر بڑے اخلاقی
مسالے سے ہوئی تھی۔ چاند بی بی کی قومی آواز

تمام مہاراشٹر فضا میں گونجتی رہی اور قوم کے دردمندوں
کو گرماتی رہی اور چند روز کے اندر ملک عنبر کی
صورت میں ایک اور دردمند نظام شاہی سلطنت
کی رکھوالی کے لئے کھڑا ہو گیا۔

سترھویں صدی بڑی مایوسی کے ساتھ
شروع ہوئی۔ برار اور احمد نگر پر مغل قابض ہو چکے
تھے اور اب ان کا ریلا سنیچے اتر رہا تھا۔
اور وہ دن دور نہیں تھے کہ نظام شاہی سلطنت
کا رہا سہا سرمایہ بھی اسی سیلاب میں بہہ جائے
گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں جو نظام شاہی
سلطنت کے سہارے سانس لیتی تھیں سہم کر رہ گئیں
یہ دکن کا عہد اضطراب ہے۔ اگر ایسے وقت ملک عنبر
کا سا سورما اور رہنمائے قوم افق سیاست پر
نمودار نہ ہوتا تو مستقبل کی تمام امیدیں ٹوٹ
جاتیں۔ اس واقعہ کو تاریخ دکن کا اعجوبہ سمجھنا چاہیئے
کہ ملک عنبر جس کی زندگی ایک غلامانہ حیثیت سے
شروع ہوئی تھی نظام شاہی سلطنت کی رہبری
کے لئے کھڑا ہو گیا۔ چونکہ احمد نگر مغلوں کے ہاتھ
میں چلا گیا تھا اس لئے اس نے اسی دولت آباد
کو پایہ تخت بنایا اور اسی جگہ پرانے شاہی
خاندان کے بعض افراد کو جو گوشہ گمنامی میں تھے
تخت نشین کر کے از سر نو نظام شاہی حکومت
شروع کر دی اور [illegible] کے ماتوں کو جگا کر تمام ملک
زندگی کی لہر دوڑا دی۔ چند ہی روز کے اندر اس
کی فوجیں مغل افواج کا سر توڑ مقابلہ کرنے لگیں
جس طرف ملک عنبر کی فوجیں گذر جاتی تھیں درو
دیوار ہلنے لگتے تھے اور مغلوں کے چھکے چھوٹ
جاتے تھے۔ اس وجہ سے مغل شہنشاہ اور مورخ
اس کو عنبر بد اختر سیہ اختر عنبر بدخصال کے
بدنما الفاظ سے یاد کرتے ہیں لیکن یہ دکن کا بہت
بڑا محسن ہے جس نے دکھنی قوموں کو مغلوں کے
دستبرد سے بچا کر ان میں زندگی کی روح پھونک
دی اور از سر نو ان کی اخلاقی اور ذہنی تعمیر کی۔
اہل دکن اس کو ایک مقدس ہیرو اور سرتاج کی
جگہ دیتے ہیں۔ ؎

در خدمت رسول خدا ایک بلالؓ بود
بعد از ہزار سال ملک عنبر آمدہ

یعنی اہل دکن کا عقیدہ یہ ہے کہ تقدس
میں ملک عنبر حضرت بلالؓ سے کم نہیں ہے۔ اس
کی سرگرمیوں میں تیغ زنی ہی نہیں بلکہ تمدنی
تعمیر بھی تھی۔ یہ شہر اورنگ آباد اسی کی یادگار
اگرچہ اس نظام شاہی دور کا پایہ تخت
دولت آباد تھا۔ لیکن ملک عنبر کی تمدنی وسعت
آگے بڑھ رہی تھی اور ایک بڑے شہر کی طالب
تھی۔ اسی دولت آباد کے مشرق میں اس شہر کا
بنیاد رکھی گئی۔ اس شہر کی پہلی تاریخ سنہ ۱۶۔۔ء کے

لگ بھگ بتائی جاتی ہے جب کہ ملک عنبر نے اس
مقام سے مغل سلطنت کے جلیل القدر سپہ سالار
عبداللہ خان کو شکست دی تھی اس طرح یہ شہر
ایک فتح کی یادگار بھی ہے لیکن سچ تو یہ ہے
یہ متمدن شہر جو ملک عنبر کے شائستہ دماغ اور
بلند حوصلوں کا آئینہ دار ہے ایک آدھ سال میں
تو نہیں بنا۔ روم ایک دن میں نہیں بنتا۔ اگر
مغل مورخوں کا بیان صحیح سمجھا جائے تو یہ شہر
کوئی بیس سال میں جاکر تیار ہوا۔ کیونکہ بڑے
عمرانی خدوخال کے ساتھ اس کو بنایا گیا تھا
جس میں ہر طبقہ کی عمرانی ضرورتیں مہیا کی گئیں
اس میں بلند پایہ شاہی عمارتیں اور مسجدیں
بنائی گئیں۔ قصر نوکنڈی اب بھی ملک عنبر
کے بلند حوصلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ شہر میں
بازار اور شہر کے ارد گرد باغات لگائے گئے
تھے۔ اور آب رسانی کے لئے تمام شہر میں زیر زمین
نہریں دوڑائی گئیں جو قرون وسطیٰ کے عجائبات
میں سے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے کسی شہر میں اہل
شہر کی آرام و آسائش کا ایسا انتظام نہیں تھا
جیسے اس شہر میں تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ
اس شہر کا تمدن ہندوستان کے مغل شہروں سے
کہیں زیادہ تھا۔ ملک عنبر نے اس شہر کا نام فتح
آباد رکھا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ مشہور نہیں ہوا

اور لوگ اس کو قدیم موضع کے نام سے برسوں کھڑکی
کہتے رہے اور ۱۰۶۵ھ کے قریب شہنشاہ اورنگ زیب
کی وجہ سے اس کا نام اورنگ آباد ہوگیا۔ لیکن یہ
در اصل عنبر آباد ہے جس کی آب و تاب خود مغلوں
کو متاثر کرتی تھی۔ آج بھی وہ اپنی روایتوں کے
باوجود اپنی پانی کی داستان سناتا ہے مغل شہنشاہ
اور مورخوں نے صاف نہیں تو دبی زبان سے خود
اس کی تعریف کی۔ ۱۰۲۵ھ میں ایک مرتبہ مغل
فوجوں نے اس شہر پر چڑھائی کرکے اس کو بری
طرح تاراج کیا۔ اس بربادی سے خود مغل متاثر
ہوئے۔ شہنشاہ جہانگیر لکھتے ہیں کہ "سران لشکر ظفر
اثر ... سہ روزہ در آں بلدہ کھڑکی توقف نمودہ
شہرے را کہ در مدت بیست سال تعمیر یافتہ بود
بہ نوعے خراب ساختند کہ در بیست سال دیگر
معلوم نیست کہ بہ رونق اصلی باز آید"۔ لیکن ملک
عنبر نے بہت جلد اس کی مرمت کردی اور اس قدر
جلد اس کی تعمیر کردی کہ دیکھنے والے حیرت کرتے
تھے۔ چنانچہ ایک مغل امیر مرزا صادق اصفہانی
کے تاثرات سے اس شہر کی صحیح عظمت معلوم ہوتی
ہے۔ ملک عنبر کے انتقال کے بعد مرزا صادق ایک
مرتبہ اس شہر سے گزرا تھا۔ اس کی آب و تاب
دیکھ کر وہ اس قدر متاثر ہوا کہ بے ساختہ اس نے
چند اشعار میں تعریف کردی حالانکہ وہ اکبرآباد

شاہجہاں آباد جیسے شہنشاہی شہروں کو دیکھ چکا تھا لیکن ان تاثرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی تعمیری اور عمرانی خوبیاں شہنشاہی شہروں سے کہیں بڑی ہوئی تھیں۔

چہاردم روز چوں سپردم راہ
شہر کھڑکی بہ دید شد ناگاہ
شہر عنبر نسیم مشک سرشت
آب او بردہ آب جوئے بہشت
خاک آں بقعہ رشک اعفر بود
راستی آں بنائے عنبر بود
ہم در و قصر آسمان مانند
سایہ برابر و پایہ بر الوند
ساکنانش ملک بہ نیکوئی
برزمیں آمد آسماں گوئی

یہ تو اورنگ آباد کا پہلا دور تھا۔ لیکن ۱۶۲۶ء میں جب ملک عنبر کا انتقال ہوگیا تو اس کی رونق گھٹنے لگی، چند ہی روز کے بعد اس شہر کے درودیوار پر حسرت برسنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے مغل سلطنت چاروں طرف چھا گئی اور نظام شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دیا۔ خاندیس برار اور مہاراشٹر کے چار صوبے بنائے گئے جو صوبہ دار دکن کے ماتحت تھے اور مغل صوبہ دار کبھی برہانپور اور کبھی اورنگ آباد میں بیٹھ کر مغل صوبوں کی نگرانی کرتے تھے اور یہ

اورنگ آباد کا دوسرا دور ہے جو ملک عنبر کے انتقال سے لے کر آئندہ سو سال تک جاری رہا۔ اس شہر کی حیثیت صوبہ دار کے مستقر سے زیادہ نہ تھی۔ مغل صوبہ داروں نے اس شہر کی کوئی قدر نہیں کی اور ظاہر ہے کہ اس شہر کی سرگرمیاں وہ کہاں رہ سکتی ہیں جو خود ملک عنبر کے عہد میں تھیں۔ لیکن ۱۶۸۲ء میں جب شہنشاہ اورنگ زیب اس شہر میں آگئے تو اس کی رونق بہت بڑھ گئی۔ کیونکہ شہنشاہ کے قیام کی بدولت یہ اب شہنشاہی شہر ہوگیا تھا دوسرے الفاظ میں آئندہ پچیس سال کے دوران میں اورنگ آباد تمام ہندوستان کا پایہ تخت تھا۔ اسی شہر میں تمام ہندوستان کی سیاسی گتھیاں سلجھائی جاتی تھیں شہر میں بعض شہنشاہی عمارتیں بھی بن گئیں۔ قلعۂ ارک بنا اور باغات لگائے گئے لیکن اورنگ زیب کے انتقال کے بعد یہ پھر صوبہ دار دکن کا مستقر بن کر رہ گیا اور اس کی فضائیں خاموش ہوگئیں کیونکہ یہاں شہنشاہیت نہ تھی اور اورنگ زیب کے جانشینوں نے اس کی طرف بالکل توجہ نہ کی۔

لیکن شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہوتے ہی ہندوستان کا نقشہ بدل گیا اور حالات یک لخت متغیر ہوگئے۔ مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہوگئی کہ جلد جلد مغل سلطنت کے دست بازو جھڑنے لگے۔ اسی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سب دستہ پا

گم تھے اور کسی کو اپنی منزل کی خبر نہ تھی۔ سب سے پہلے دکن ہی مغل شہنشاہیت سے علٰحدہ ہوگیا ۱۷۲۴ء میں حضرت مغفرت مآب نواب نظام الملک نے شکر کھیڑے کی جنگ سر کر کے سلطنت ابد مدت آصفیہ کی بنیاد ڈال دی جس کی ذہنی اور اخلاقی برکتوں سے ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ چھوٹی سلطنت نہ تھی جو دو ایک منزلوں پر ختم ہو جائے بلکہ تمام جزیرہ نمائے ہند پر حاوی تھی۔ اس کے حدود قلعہ اسیر گڈھ سے شروع ہو کر جنوب میں مدرا تک پہنچتے تھے یہ مشرق اور مغرب میں مسولی پٹم سے گوا تک پھیلے ہوئے تھے۔ گویا یہ ایک چھوٹی شہنشاہیت تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ اورنگ آباد کا تاریخی شہر اس جدید سلطنت کا پایہ تخت ہو سکتا تھا۔ اسی شہر میں حضرت مغفرت مآب کی وہ تاریخی مسند بچھائی گئی جس پر سیاست کے بڑے بڑے مرحلے طے ہوتے اور بڑی بڑی گتھیاں سلجھائی گئیں یہ مسند اب تک محفوظ ہے جس کا نظارہ اٹھائیسویں صدی کے مدبر جنرل اور آصف جاہوں کی عظمت کو یاد دلاتا ہے یہ اورنگ آباد کا تیسرا دور ہے جس میں یہ شہر نہ صرف ایک بہت بڑی سیاست کا مرکز بن گیا تھا بلکہ علم و اخلاق کا مامن بھی تھا۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ دکنی سلطنتوں کے خاتمے کے بعد علم و اخلاق کی تمام پناہ گاہیں ٹوٹ گئی تھیں اور علما، شعرا بھٹکتے پھرتے تھے اور ان کو کوئی ٹھکانا نہیں ملتا تھا۔ لیکن جب اورنگ آباد میں آصفجاہی مسند بچھ گئی تو بھٹکتے ہوئے مسافر پھر اورنگ آباد میں جمع ہونے لگے۔

سلاطین آصفیہ بہت بڑے تاریخ ساز ہیں ان بزرگوں نے نہ صرف جزیرہ نمائے ہند کی سیاسی اور دستوری تعمیر کی بلکہ اس ملک کو علم و اخلاق کے خد و خال سے سنوارا۔ حضرت مغفرت مآب بڑے عالم و شاعر تھے جن کے قدم سے اورنگ آباد میں بڑی بڑی علمی محفلیں جمع ہوگئیں شعرا شعر خوانی کرتے تھے تو علما علم نوازی۔ خود مغفرت مآب بھی اپنا عزیز وقت علما شعرا کی محفلوں میں گزارتے تھے۔ یہ اب بھی اورنگ آباد کو معلوم ہے کہ شاعرانہ محفلوں میں ایک طرح مصرع پر کتنے دماغ اپنی دماغی کاوش اور ذوق فطرت کا ثبوت دیتے تھے اور ان جواہر پاروں پر سننے والے وجد کرتے تھے۔ علم کی سرحدوں کو آگے بڑھانے کیلئے حضرت مغفرت مآب نے طالبان علم کی بھی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔ طالبان علم کو اپنے سامنے بلا کر ان کا دماغ ٹٹولا اور ان کی بساط کے مطابق ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے لئے وظیفے مقرر کئے تاکہ یہ شوق سے پڑھیں اور علم کی سرحدوں کو آگے

بڑھائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے
علم کی زمین دوز لہریں تمام دکن میں پھیل گئیں
اور دور دراز گوشوں میں علم کی شمعیں روشن
ہوگئیں۔ مغفرت مآب کے جانشینوں نے بھی
یہ مقدس روایتیں قایم رکھیں۔ ناصر جنگ شہید
اور حضرت غلام علی آزاد بلگرامی کی علمی صحبتیں اب
بھی بہت سوں کو یاد ہیں۔ ناصر جنگ شہید کے
شاعرانہ جذبات اہل ذوق کو گرویدہ کرلیتے تھے
شہید کا بلند پایہ کلام جو محمد علی صائب تبریزی
کا جواب ہوتا تھا دنیائے ادب میں تموج پیدا
کرتا تھا ؎

برنگ غنچہ ستی نا رسا مکن اے گل
دریں دو ہفتہ بگلشن تباہ خواہی شد

اورنگ آباد کو یہ فخر کچھ کم ہے کہ اسی جگہ
حضرت آزاد بلگرامی نے اپنی بلند پایہ
تصنیفیں سبحۃ المرجان، خزانہ عامرہ اور
سرو آزاد لکھی تھیں جو دکن کی متاع عزیز ہیں
حضرت آزاد فرماتے ہیں کہ اورنگ آباد میرے لئے
دارالامن ہے۔ اسی اورنگ آباد میں دکن کے
وفادار وزیر صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے
ماثر الامرا کی سی بلند پایہ تاریخ لکھی جو تمام ہندوستان
کا قومی سرمایہ ہے۔ اسی تاریخ سے تمام امرائے قوم
کا حاصل زندگی متصور ہوتا ہے جنھوں نے
کبھی ہندوستان کی قومی تعمیر میں حصہ لیا تھا
اگر آج ماثر الامرا نہ ہوتی تو ہندوستان کا
کا سرمایہ حیات گم ہوجاتا اور آج ہم اپنے
اسلاف کے حیات قومی سے واقف نہ ہوتے۔
اس زمانہ کے بہت بڑے عالم و مورخ لچھمی نراین
شفیق نے حقیقت ہائے ہندوستان کے نام
سے ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ لکھا ہے ماثر
آصفی کے نام سے آصفجاہی خاندان کی تاریخ
لکھی۔ گل رعنا اور چمنستان شعرا کے نام سے
اردو اور فارسی شعرا کے تذکرے لکھے تھے۔ یعنی
شمال و جنوب کے تمام شعبہائے حیات کو کھول کر اہل
بصیرت کے سامنے رکھدیا تھا۔ یہ دکن کا بہت
بڑا سرمایہ ہے جس کی قدر قیمت کا صحیح اندازہ نہیں
لگایا جا سکتا۔ اسی اورنگ آباد میں ولی اور
سراج اورنگ آبادی نے اپنے نغموں سے اردو
کو سنوارا۔ ان اردو شاعروں کے نغمے اب بھی
اورنگ آباد کی فضاؤں میں گونجتے ہیں اگرچہ
اب یہ محفلیں سونی ہیں اور فضائیں خاموش
ہوگئیں اور اورنگ آباد کی اکثر آبادیاں ویران
ہوگئیں لیکن ان ویرانوں میں بھی تاریخ کے نغمے سنائی
دیتے ہیں اور کانوں میں بھولی ہوئی صدائیں آتی ہیں۔

بیٹھا ہوں مست و بیخود خاموش ہیں فضائیں
کانوں میں آرہی ہیں بھولی ہوئی صدائیں

اورنگ آباد تعلیمی کانفرنس

۱- قلعہ ارک میں فروردی کا ہفتہ دوم بلحاظ تاریخی عظمت نہایت اثر آفریں ثابت ہوا- امن کانفرنس تعلیمی کانفرنس- نمائش- فوجی مظاہرہ کے انعقاد نے اورنگ آبادیوں میں ایک حیات نو پیدا کردی تھی جن میں شرکت کے لئے مختلف اضلاع سے بھی کثیر تعداد میں لوگ آئے تھے- رات دن علمی صحبتیں- فوجی مظاہرے- شعرو شاعری کے نغمے تھے-

خطبہ صدارت اور خطبہ استقبالیہ نے دور قدیم کے اورنگ آباد کی تصویر آنکھوں کے آگے کھینچ دی صدر استقبالیہ اور معتمد استقبالیہ اور ان کے شرکاء کار نے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں کافی جد وجہد کی تھی قیام وطعام کا بہترین اسلوب پر انتظام تھا نیز مولوی غلام محمد مصطفیٰ صاحب اول تعلقدار نے اپنے خوشنما بنگلہ گلشن محل میں خواتین اور حضرات کے لئے وسیع پیمانہ پر رہائش کا انتظام کیا تھا نہایت سرچشمی سے فرائض مہمانی ادا کئے جس کی یاد مدتوں فراموش نہ ہوگی-

۲- سال گذشتہ اجلاس نظام آباد سے خواتین کیلئے بھی ایک جلاس کا آغاز کیا گیا اگرچہ کہ اورنگ آباد کے نظام العمل میں ان کے لئے کوئی پروگرام نہ تھا لیکن حالات کے مدنظر اختتام کانفرنس کے دوسرے دن انہیں بھی اپنا اجلاس کرنے کی اجازت دیگئی جس میں کافی تعداد میں خواتین نے شرکت کی اگر ابتداء ہی سے پروگرام وقت رکھا جاتا تو مستقر اور مضافات کی اور بھی خواتین شریک ہوتیں- بانیان کانفرنس کو چاہئیے کہ آئندہ جب کبھی اجلاس ہوں تو اپنے لائحہ عمل میں خواتین کیلئے بھی وقت نکالیں اور یہ کام کسی ذمہ دار کے سپرد کیا جائے تو خواتین کی مساعی جمیلہ سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہوسکتی ہیں کیونکہ جب ان میں کانفرنس کا جذبہ عمل پیدا ہوجائیگا تو وہ ہر پہلو سے مفید اور خوشگوار نتائج پیدا کریگا اور ان کی ہمنوائی بلحاظ تعلیمی اور مالی بہترین برگ وبار لائیگی-

۳- یہ تعلیمی کانفرنس نشستند وگفتند وبرخواستند کا مجموعہ نہ تھی بلکہ نہایت مفید مقالے بھی پڑھے گئے- فی الحال ہم جناب عبد المجید صاحب صدیقی ایم-اے-ال-ال-بی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ کا مقالہ اور محمد یحییٰ صاحب مددگار مال اورنگ آباد معتمد استقبالیہ کمیٹی کی نظم شائع کر رہے ہیں- آئندہ دوسرے مقالے سراج اورنگ آبادی اردو اور جامعہ عثمانیہ وغیرہ شائع کریں گے*

"دین و دنیا"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی - اے (امرتسری)

کہتے ہیں کہ مذہب اگر سیاسیات کی اختراع نہیں تو آلہ کار ضرور ہے، اور اگر اصول عرض و معاوضہ کو مدنظر رکھا جائے جسے اصطلاح میں "مساوات" کہتے ہیں جو ہر زمان و مکان میں کارفرما ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ سیاسیات مذہب کی لونڈی ہے اور اگر کائنات میں نظر کی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کوئی شئی قایم بالذات نہیں ہر ایک شئی کا انحصار دوسری شئی پر ہے اور یہ تعلق زندگی جب ٹوٹ جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے لیکن یہ تعلق پھر بھی کسی نہ کسی صورت میں قایم رہتا ہے دین نہ تو دنیا سے علیحدہ ہو سکتا ہے اور نہ دنیا دین سے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ "اہمسا پرمو دھرما" اور شریر کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسری سامنے کر دینا" بہت دل لبھانے والی باتیں ہیں۔ لیکن مہاراجہ اشوک اور مسیحی دول کے رویہ نے ثابت کیا ہے کہ دین کی شان و شوکت دینوی طاقت اور اقتدار سے وابستہ ہے۔ اور جب یہ نہ ہو تو کوئی "شنکر اچاریہ" کھڑا ہو کر "بدھ مت" کو ہندوستان کے حدود سے باہر نکال سکتا ہے اور مسیحیت تین صدیوں تک رہبانیت کے لباس میں غاروں میں منہ چھپا کر ہی زندہ رہ سکتی ہے جب تک کوئی "قسطنطین" سیاسی اغراض کو لئے ہوئے اس کی حمایت پر کھڑا نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ تاریخ واقعات کو دہرایا کرتی ہے، بات یہ ہے کہ قوانین فطرت کا تقاضا ہے کہ ایک ہی اسباب سے ایک ہی نتائج پیدا ہوں۔ آج کی صحبت میں ہم تواریخ ایران کا ایک ورق پڑھ کر سناتے ہیں، اس میں چند تاریخی واقعات مذکور ہیں جو خواہ رومانی دلچسپی لئے ہوئے نہ ہوں لیکن سبق آموز ضرور ہیں، اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ کسی واقعہ کا ظہور بلا سبب نہیں ہوتا۔ اسباب جنھیں "علت و معلول" سے تعبیر کرتے ہیں وہ اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ عام فہم ان کے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے، اور عوام الناس ان اسباب کی اہمیت پر جو بجائے خود واقعات ہوتے ہیں اور دوسرے اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں غور نہیں کرتے۔ ہر ایک واقعہ کے اسباب یا ابتداد ایسی حقیر ہوتی ہے جیسے کسی مرض کی ابتدا جس کا ازالہ شروع میں آسانی سے ہو سکتا ہے۔

"سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل"

ہمارے تاریخی قصہ کا آغاز ساسانی شہنشاہ قباد کی ابتدائی زندگی کے ساتھ شروع ہوتا ہے لیکن اس عہد کے واقعات سمجھنے کے لئے شاہ پور اول اور اس کے جانشین کے عہد کے چند واقعات کو بھی زیر نظر رکھنا چاہئے تاکہ ایرانی دین و دنیا کا نقشہ سامنے آجائے ساسانی شہنشاہیت جس کا بانی آردشیر بالکان تھا، تواریخ ایران میں شاہان فارس کا یہ چوتھا دور ہے اور اس کے اختتام پر ایرانی دین و دنیا کی شان و شوکت بھی ختم ہوگئی، اردشیر ۲۴۲ء میں فوت ہوا اور جانشین اس کا بیٹا شاہ پور ہوا جس روز جشن تاج پوشی ایران کے طول و عرض میں منایا جارہا تھا۔ ایک شخص شاہ پور کے حضور آیا اور دعویٰ پیغمبری کیا یہ شخصیت "مانی" کے نام سے مشہور ہے۔

جسے اب "ہمدان" کہتے ہیں ان ایام میں "اکتبانہ" کہلاتا تھا، یہ شہر "میڈیا" کا دارالحکومت تھا جو موجودہ "گیلان" ہے اور جس کے حدود میں وہ ممالک واقع تھے جنھیں اب "عراق عجم" اور "آذربائیجان" اور "کردستان" کہتے ہیں، اس شہر میں ایک امیر کبیر پارسی اعلیٰ خاندان کا آدمی پتیک نامی رہتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا "شراک" تھا جو بعد میں "مانی" کے نام سے مشہور ہوا، یہ امیر آدمی اگرچہ ایرانی تھا اور زرتشتی مذہب شاہ سے لے کر گدا کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ لیکن اس وقت یہ فرقہ بندی اور تفرقہ میں ایسا اظہار ہوا تھا کہ وہ کچھ متنفر سا ہوگیا، ان میں سے "جم شائی" اور "شمرادی" اور "فدائی" اور "راوی" اور "شیدانگی" اور "پیکری" اور "آلاری" اور "شیدائی" اور "آخشی" وغیرہم سے اس کا اکثر مناظرہ رہتا، یہ فرقے بھی ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے؛

ان دنوں میں بابل میں ایک اور مذہب "صابئین" زوروں پر تھا۔ یہ حقیقت محققین سے پوشیدہ نہیں کہ تمام ایشیائی مذاہب کا جنم بھومی یہ سرزمین ہے جس کا صدر مقام بابل اور نینوا ہے "آدم کا باغ عدن" اور طوفان نوح کا سراغ بھی یہاں ملتا ہے، حضرت ابراہیم نے ہجرت اسی جگہ کی۔ اور خود بنی اسرائیل نے اسیری کے ایام یہاں بسر کئے "تموربی" اور "فرعون اعظم" (شرقین) کے آئین و قوانین ضابطہ بنے جو آثار قدیمہ کی بیش قیمت اور بہترین شئے ہے "توراۃ" یعنی شریعت موسوی کے قومی احکام کی اصلیت واضح کردی ہے۔ مانی کے والد کو صابی مذہب پسند آیا۔ ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا "غسل" تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ کسی دریا کے کنارہ پر بود و باش رکھتے۔ ان کی بستیاں شام میں دریا یردن

عراق میں دجلہ و فرات کے کناروں پر نظر آتی رہیں۔ اس مذہب کے حالات ایک مستقل موضوع ہے جس کی تفصیل کسی اور صحبت میں بیان کی جائے گی۔ یہ لوگ کئی ناموں سے مشہور ہیں مگر "صابی" ہی زبان زد خلایق رہا، ایک نام "نصاریٰ" بھی ہے جو ان لوگوں اور عیسائیوں پر یکساں حاوی ہے۔ مانی کے والد نے ہونہار بیٹے کی اس مذہب میں تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ ان کی کتب مقدسہ آرامی زبان میں ہیں اور مانی کو ان پر عبور حاصل تھا، وہ پارسی اور شامی اور آرامی اور عبرانی زبانوں سے خوب واقف تھا۔ اور اگر روایات پر اعتبار کیا جائے تو یونانی میں بھی "شد بود" تھی، محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ مانی کے مذہب کی تار و پود، فلسفہ و تخیل، عبادات سب کچھ "سامی" ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ "شید" یعنی نور اور "تار" یعنی ظلمت بظاہر زرتشتی تخیل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ کہ دونوں قدیم اور ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ابتدا میں زرتشت کی تعلیم نہ تھی۔ بلکہ اس کی تعلیم سے واضح ہوتا ہے کہ "اہرمن" کو "ہرمزد" نے پیدا کیا تھا۔ (باقی)

اے نوجوان ہند

جناب محمد یحییٰ صاحب رضوی مددگار مال معتمد مجلس استقبالیہ

دیتا نہیں ہے زیب تجھے فرق رنگ و بو ہونے نہ دے نگاہ کو اپنی بہانہ جو

دنیا کو تیرے عزم کا پھر انتظار ہے تیرا جنون خزاں میں نوید بہار ہے

صبر و سکون و ضبط و تحمل سے کام لے بیخوف ہو کے دامن ہمت کو تھام لے

پھولوں کو چنتا خاروں سے دامن بچاتا چل مردانہ وار ٹھوکریں کھاتا سنبھلتا چل

اپنا سفینہ بحر حوادث میں ڈال دے ساحل کی آرزو کو بھی دل سے نکال دے

طوفاں سے کھیل موجوں کے سر پر سوار چل ساحل سے منھ کو پھیر لے مردانہ وار چل

دنیا میں تو پیمبر امن و امان بن گل چیں نہ بن خدا کے لئے باغبان بن

لطف حیات ملتا ہے بس اتفاق میں
قوموں کی موت آتی ہے شکل نفاق میں

امتِ زرتشت

مس منیزہ بانو کاؤس جی (حیدرآباد دکن)

ماہنامۂ شہاب بابتہ شہریور ۱۳۵۳ف میں میرا ایک مضمون بعنوان "سوانح حضرت زرتشت" شائع ہوا تھا۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین کو اس مذہب کے بنیادی اصول و عقاید سے جن پر پردہ سا پڑا ہوا تھا، کچھ واقفیت تو ضرور ہوئی ہوگی۔

اس مضمون میں اس امر کا انکشاف کرنا چاہتی ہوں کہ زرتشتی جو آج پارسی کے نام سے مشہور ہیں، اصل میں کون لوگ ہیں، اس طبقہ کو پارسی کہنے کی کیا وجہ ہے اور ان کا وطن مالوف کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طبقہ کے آباو اجداد آرین لوگ ہیں جو صدیوں پیشتر ایران کے مختلف صوبوں میں آباد تھے۔ ایران کے شاہی خاندان "ہخی منشی" کے دور میں "پرس" نامی ایک صوبہ ایران کا پائے تخت تھا، اس دور میں یونانیوں نے ایران پر جب حملہ کیا اور جوں جوں ان کی آمد و رفت ایران میں بڑھتی گئی، تو بجائے اس خاص صوبہ کو اس نام سے موسوم کرنے کے۔ انھوں نے تمام ایران کو "پرس" یا "پارس" کے نام سے موسوم کیا جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ رفتہ رفتہ تمام ایران اسی نام سے مشہور ہو گیا اور تفوق اسلام کے بعد جب یہ لوگ اپنا وطن مالوف چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ہندوستان میں آکر پناہ گزیں ہوئے تو اہل ہند نے اس نو وارد طبقہ کو پارسی کے نام سے موسوم کیا۔ ایران پر کئی شاہی خاندان حکمران رہے جن میں پانچ نہایت مشہور و معروف ہیں، آبادیانی، پیشدادی، کیانی، اشکانی اور ساسانی۔ ان میں سے پہلے دو خاندان اس قدر قدیم ہیں کہ ان کے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل ہو سکے ہیں وہ زیادہ تر روایات پر مبنی ہیں۔ اس قدیم مذہب کے بانی حضرت زرتشت، کیانی خاندان کے چوتھے حکمراں لہراسپ کے زمانہ میں پیدا ہوئے لہراسپ کا بیٹا گشتاسپ ایران کے شاہی خاندان کا پہلا رکن ہے جو حضرت کے مذہب پر ایمان لایا، کیانی خاندان کے دس بادشاہ گزرے۔ اس کے بعد اشکانی خاندان کا آغاز اس طرح ہوا کہ کیانی

خاندان کے آخری تاجدار دارا کے زمانہ میں یونانی ایران پر حملہ آور ہوئے اور غلبہ حاصل کرکے ایران پر تقریباً ایک صدی تک قابض رہے یہ زمانہ ایرانیوں پر نہایت سخت گزرا لیکن انھوں نے اپنے عزیز وطن کو یونانیوں کے چنگل سے رہا کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اب سکندر ایران پر قابض تھا۔ اس دور کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فاتح اسکندر نے مفتوحین سے نہایت ہی بُرا سلوک کیا اور اس کے ظلم و تشدد اور بربریت کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ لاتعداد مذہبی، ادبی اور قومی آثار ناپید ہو گئے اور مفتوحین سے سخت ترین ناانصافی یہ کی گئی کہ سکندر کے حکم سے قصر شاہی میں زرتشتیوں کی مقدس کتاب "اوستا" کے متعدد حصے نذر آتش کر دیے گئے اس طرح ایرانی اپنے مذہب اور قوم کے متعدد واقعات سے محروم ہو گئے جس اوستا مقدس کا آج زرتشتی مطالعہ کرتے ہیں وہ اصلی اوستا کا ایک جزو ہے جو خورد اوستا کے نام سے موسوم ہے۔

مذکورہ بالا خاندان اشکانی کا آغاز یوں ہوا کہ ایران کی سلطنت یونانیوں کے زیر حکومت تقریباً (۸۰) سال سے بیشمار تغیر و تبدل کی منزلیں طے کر رہی تھی کہ ۳۲۳ ق م میں سکندر کا انتقال ہو گیا اور ایران کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا اور ہر حصہ پر ایک گورنر مقرر ہو گیا اور ساتھ ہی سلطنت کے نظم و نسق میں ضعف آ گیا۔ اسی زمانہ میں "اشک" نامی پارتھیا کے ایک بادشاہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ اقتدار حاصل کیا اور ایران پر فوج کشی کرکے ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی جو اشکانی خاندان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان کے تقریباً تمام تاجدار یونانی تھے اور چار سو سال تک ایران پر حکمران رہے۔ لیکن چونکہ اسکندر کے انتقال کے بعد ایران کی سلطنت کئی گورنروں میں منقسم ہو گئی تھی لہذا انحطاط کے آثار آئے دن رونما ہونے لگے اس طویل یونانی حکومت کے باوجود ایرانیوں نے اپنے وطن مالوف کو فاتحین کے چنگل سے رہا کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ آخر کار گورنروں کو آپس کی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر اور ایرانیوں کی انتھک محنت اور بے لاگ کوشش سے ایک شخص اردشیر بابکان بن ساسان جو ایران کے شاہی خاندان "کیانی" کا رکن تھا۔ اس نے اقتدار حاصل کیا اور متعدد یلغاروں کے بعد یونانیت کا قلع قمع کرکے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو سلطنت ساسانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ ایران کی تاریخ میں یہ دور نہایت ہی شاندار و عالیشان گزرا ہے

اور انہیں تاجداروں کی انتھک محنت اور بے نفس ملکی خدمت سے ایران کا قدیم مذہب اور تہذیب وتمدن میں زندگی نو کی تخلیق ہوئی۔ پراگندہ مذہبی اور دیگر لٹریچر اکٹھا کیا گیا اور ایک جدید لٹریچر کا آغاز ہو گیا۔ اس دور میں ایران علمی اور عملی ترقی کی منزلیں انتہائی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ طے کرتا رہا اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ علم وعمل اور تہذیب وتمدن میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں اس کا شمار ہونے لگا، اور مختلف ممالک کے علماء نے بھی اپنی تصنیفات میں اس دور کی شان وشوکت قلمبند کی ہے۔ اس خاندان کے تنتیس بادشاہ گزرے اور ان کی زیر حکومت ایران ۴۰۹ سال تک نہایت نظم وضبط کے ساتھ ترقی کرتا رہا لیکن افسوس کہ باد مخالف کے جھونکوں سے کون محفوظ رہا ہے؟ آخر یہ چار سو سال کا فراہم کردہ مواد بھی جو ایرانیوں کی انتہائی جد وجہد اور سعی تمام کا ثمر تھا، عرب کے حملہ سے پراگندہ بلکہ ناپید ہو گیا اور ایرانی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے عزیز وطن سے محروم ہو گئے۔

اس زمانہ میں ساسانی خاندان کا آخری تاجدار یزدگرد شہریار ایران پر حکمراں تھا اور خلیفہ دوم حضرت عمرؓ عرب کی حکومت کی باگ سنبھالے ہوئے تھے۔ مستند تواریخ سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ حملہ سے پیشتر خلافت اسلامیہ کی طرف سے چند شرائط ایرانیوں کے سامنے پیش کی گئیں جن کو ایرانیوں نے نامنظور کر دیں اور لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے، زبردست مقابلہ ہوا۔ آخر کار فریقین کی انتہائی کشمکش اور جد وجہد کے بعد عرب بازی لے گئے۔ اور تاریخ ایران میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا۔ اب ایرانیوں کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ اپنے عزیز وطن کو جو تہذیب وتمدن اور علم وعمل کا گہوارہ بنا ہوا تھا اور جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے زریں لمحات بسر کئے تھے، ہمیشہ کے لئے خیرباد کہیں، لہٰذا ایک کثیر التعداد گروہ بیسیوں مصائب کا سامنا کرتا ہوا، مارا مارا ایک مدت مدید تک پہاڑوں، غاروں اور اطراف وجوانب کے قریوں میں پناہ کی تلاش میں پھرتا رہا۔ آخر کار انھوں نے کوہستان خراسان میں جو ایران کے شمال مغرب میں واقع ہے، پناہ لی لیکن یہاں بھی فاتحین کی جانب سے تعاقب ہونے پر انھوں نے چار وناچار ہندوستان کا رخ کیا۔ سر زمین ہند پر وہ پہلا مقام جہاں ان جلاوطنوں نے اپنا رخت سفر کھولا "دیو" نامی ایک بندرگاہ تھا جو جزیرۂ کاٹھیاوار میں واقع ہے۔ زرتشتی یہاں تقریباً انیس ۱۹ سال تک پناہ گزیں رہے لیکن حالات نامساعد ہوا رہے اور مستقل سکونت کے اسباب

پیدا نہ ہو سکے تو انہوں نے "سنجان" کی جانب رُخ کیا جو گجرات کے مغرب میں واقع ہے۔ اس زمانہ میں جادیو رانا گجرات پر حکمراں تھا زرتشتیوں کے پیشواؤں نے راجہ سے پناہ کی درخواست کی، رانا نے بعض ناگوار شرائط پیش کئے، جس میں زبان، لباس، رسم و رواج اور اسلحہ کے ترک پر زور دیا گیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، ان جلاوطنوں نے آخر الامر ان شرائط کو قبول کر لیا اور سنجان کے قریب ایک وسیع بنجر خطہ اراضی پر سکونت اختیار کر لی۔ اس طرح ہندوستان میں آخر کار اس طبقہ کی رہائش کی مستقل صورت نکل آئی مگر نہایت ہی گراں قیمت پر۔ کیونکہ ایرانیوں کو اپنے مادر وطن سے بچھڑنے کے بعد مستقل سکونت کی خاطر اپنی عزیز زبان، لباس، رسم و رواج اور ہتھیاروں کی قربانی چڑھانی پڑی تھی۔

حیف گردش دوران! جو قوم کسی وقت آسمان تہذیب و تمدن پر مہر و ماہ و انجم کی طرح درخشاں تھی، اب مجبور اور بیکس کسی کے رحم و کرم پر پڑی تھی، یہی وجہ ہے کہ آج زرتشتیوں کے لباس، رسم و رواج میں ہندویت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ اسی تغیر و تبدل کا نتیجہ ہے۔

زمانہ گزرتا گیا اور سنجان میں آئے دن زرتشتیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ابتداءً انہوں نے زراعت کو اپنا ذریعہ معاش قرار دیا اور ایک زمانہ دراز تک نہایت کامیابی کے ساتھ کاشتکاری کرتے رہے، سنجان کی بنجر زمین کو لہلہاتے ہوئے سبزہ زار میں مبدل کر دیا۔ لیکن وہ قوم جس کی تہذیب و تمدن کا، کسی زمانہ میں، دنیا کی بسیط و عریض زمین پر بول بالا تھا، کب تک اس شغلہ پر قناعت کرتی۔ آخر ان جلاوطنوں کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ انگریزوں نے تجارت کی غرض سے سرزمین ہندوستان پر قدم رکھا۔ ان کی آمد نے زرتشتی جلاوطنوں کے لئے ترقی کی نئی راہیں کھول دیں۔

اس وقت تک زرتشتی ہندوستان کی سرزمین اور اس کے حالات سے کماحقہ واقف ہو چکے تھے۔ خواہی نخواہی وہ اپنے عزیز وطن کی یاد جو رہ رہ کر ان کے زخمی دلوں پر نمک چھڑکا کرتی تھی، رفتہ رفتہ دلوں سے فراموش کرنے کی کوشش کی اور انتہائی مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ سرزمین ہندوستان پر ایک، زندگیٔ نو کے آغاز میں مشغول ہو گئے۔ ان لوگوں کی ملکی احوال سے واقفیت، دیانتداری انتھک محنت اور جدت پسندی سے بدیشی تاجروں نے مستفید ہونا شروع کیا۔ نتیجہ اس کا یہ برآمد ہوا کہ زرتشتی اکثر یوروپین کمپنیوں کے ٹھیکہ دار بنگئے

اور انہیں کے ذریعہ یہ غیر ملکی تاجر ہندوستان میں تجارت کرنے اور قدم جمانے لگے۔ زرتشتیوں کی اس انتھک محنت، بے لاگ کوشش، اور جدت پسندی نے انہیں ہندوستان کی تمام صنعتی اور تجارتی تحریکوں میں صف اول میں جگہ دی اور ان میدانوں میں اکثر ترقیوں کے محرک و بانی زرتشتی ہی رہے۔ مثلاً بندرگاہوں کی تعمیر، گرنیوں کا قیام، صحافت و طباعت کا انتظام، ان تمام تحریکوں میں زرتشتی پیش پیش رہے اور اس ملک کو جو صرف ان کی پناہ گاہ تھا۔ فائدہ پہنچانے میں کبھی دریغ نہیں کیا حتیٰ کہ ہندوستان کا پہلا اخبار "بمبئی سماچار" ۱۸۲۲ء میں ایک زرتشتی ہی کی ادارت میں شروع ہوا۔ الغرض ایک قلیل عرصہ میں زرتشتیوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے کہ ہندوستان میں ان کی غیر معمولی قابلیت، ذہانت اور جدت کا شہرہ ہو گیا۔

بہرحال زمانہ گردشیں کرتا رہا۔ انقلابات کبھی بھیانک اور کبھی خوشگوار صورتیں اختیار کر کے دنیا کے پردے پر رونما ہوتے رہے لیکن زرتشتیوں نے استقلال، دیانت، اتفاق اور جد و جہد کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج صدیاں گزر گئیں کہ یہ لوگ اپنے وطن مالوف سے جدا ہو گئے ایک انقلاب عظیم ان کی زندگی میں رونما ہوا لیکن یہ طبقہ باوجود اقلیت کے دنیا کے ہر حصہ میں آباد ہے۔

غزل

جناب مسلم (حیدرآبادی)

جراحت خندۂ دندان نما شد فیض مرہم را
بنا شد بہرہ از شادی نمک پروردۂ غم را

فنائے ذات خواہد عشق در ہر منزلِ الفت
اگر آمادۂ این نیستی رسوا مکن غم را

گدائی طعنہ زن شد بر سریر و تاج دارائی
مگر بشنیدہ باشی قصہ ہائے ابن ادہم را

بہ بزم جان مشتاقان چو از راہ وفا آئی
بجان پاک تو رونق فزائی مجلس جسم را

بکوئے عشق تو پائے رقابت درمیان نبود
فدایت باد یک عالم کہ جانانی تو عالم را

ز چشم خون فشانم اے صبا شرمت نمی آید
چرا پامال ہرزہ در چمن شد لالۂ حمرا

جزاک اللہ در ضیقِ نفس مسلم غزل گفتی
بیاد یار خود ضائع نمی کردی تو یک دم را

اڈیٹر شعاع اردو (کراچی) کے سفر دکن کے تاثرات کے متعلق

دو باتیں

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

رسالہ شعاع اردو (کراچی) کے اڈیٹر جناب کاروان نے اپنے سفر دکن کے تاثرات کی پہلی قسط ماہ ڈسمبر ۱۹۷۴ء میں شائع فرمائی ہے۔ یہ حالات رسالہ کے دو صفحوں پر مشتمل ہیں۔ ایک کالم میں بمبئی کے حالات اور باقی تین کالموں میں حیدرآباد کے حالات درج ہیں۔

جناب کاروان یم۔ اے گزشتہ ماہ اکتوبر میں حیدرآباد آئے تھے اور نظامیہ ہوٹل میں ایک ہفتہ قیام فرمایا تھا۔ واپسی کے بعد اپنے تاثرات شائع کئے ہیں۔

ہر شخص کے تاثرات یا خیالات اس کے اپنے ہوتے ہیں، اس لئے ان کے متعلق کسی اظہار خیال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر جب تاثرات دوسروں پر اثر رساں ہوں تو پھر ان کے متعلق خاموش رہنا گناہ کے مترادف ہے۔

کاروان صاحب کو شکایت بلکہ غصہ ہے کہ حیدرآباد میں "پردے" کا رواج کیوں ہے، اور حیدرآباد کی خواتین کیوں "شمع محفل" نہیں بنتیں۔ چنانچہ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

" حیدرآباد خشک شہر ہے۔ بیحد خشک، مغربی نقطہ نظر سے ہی نہیں بلکہ معاشی، معاشرتی اور قومی نقطہ نظر سے بھی۔ اگر حالات نے سنبھالا نہ لیا اور فضا بدستور خشک رہی تو کم از کم اگلے پچاس برس اور یہاں کی معاشرت ملی نشو ونما کی تنگ و دو بے جان رہے گی۔ اور وہ اس لئے کہ یہاں عورت کو تو اگر نہیں تعلاً دامن انسانیت پر ایک قبیح عیب تصور کیا جاتا ہے اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ عیب دنیا کی نظروں سے چھپانا ہی پڑتا ہے۔ قطع نظر اہل حیدرآباد سے قوم کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے ناظرین ناظرات ذرا غور فرمائیں کہ جس قوم کا نصف حصہ اور حصہ بھی وہ جس کے ہاتھ میں قوم کی تعلیم و تربیت

ہو، اگر اپنے فرائض وحقوق سے بے نیاز ہو کر ملی دولت پر بار گراں بن کر رہ جائے - یعنی عورتوں کو اگر قیمتی زیور یا گوڑھ سمجھ کر اندھیری کوٹھریوں میں بند کر دیا جائے تو اس قوم کی ترقی کی امید ہی کیا رہ جاتی ہے - یہ نسل اگر بہروں کی ہے تو اگلی میں کور چشمی کا اضافہ ہونا لازمی ہے"

غالباً کارواں صاحب حیدرآباد میں بھی بمبئی کی طرح زلف ورخسار کے نظربازی کا جلوہ دیکھنے کے لئے بے تاب تھے اور جب اس سے محروم رہ گئے تو اونھوں نے اپنے غصہ کا اظہار شعاع اردو کے ذریعہ فرمایا ہے، چنانچہ بمبئی کے رنگین جلووں کے متعلق آپ نے حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمایا ہے :-

"گلی گلی میں سینما، اور ہر ہوٹل گلی میں ایک فلم اسٹوڈیو تیرتی ہوئی تتلیاں اور اُڑتے ہوئے پروانے ...."

ہمیں افسوس ہے کہ حیدرآباد میں کاروان صاحب کو بمبئی کی طرح تیرتی ہوئی تتلیاں نظر نہیں آئیں، اور ان کا ذوق نظربازی محروم تماشا رہا اور انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل نہ ہو سکی -

قوم اور ملک کی ترقی صرف خواتین کے پردہ کو ترک کرکے "شمع محفل" بن جانے سے نہیں ہو سکتی - بمبئی کی شمع محفل بننے والی خواتین ...

. . . .

ہماری مشرقی تہذیب کے لئے کوئی اچھا نمونہ اور عمل کے لئے چراغ ہدایت نہیں ہو سکتے - مغرب کی اندھی تقلید اور اپنے اچھی باتوں کو ترک کر کے ترقی کی امید کرنا کوئی صحیح خیال نہیں ہو سکتا - شمع محفل بن کر ترقی کی امید میں ہوس کے دیوتا کو دعوت دینا ایک خیال خام ہے اور نہ ایسی ترقی قوم اور ملت کے لئے سود مند ہو سکتی ہے -

جناب کارواں اس امر پر چراغ پا ہیں کہ تقاریب کے موقع پر کیوں مہمانوں میں تفریق ہوتی ہے، اور درجہ اول اور درجہ دوم کے مہمان علحدہ علحدہ ہوتے ہیں -

جہاں تک ہم کو معلوم ہے جناب کاروان نے صرف "ادارہ ادبیات اردو" کی اس دعوت عصرانہ میں شرکت فرمائی تھی جو ادارہ کے جانب سے اس کے نائب صدر نواب زین یار جنگ بہادر کی صدر المہامی کے مبارکباد ی کے سلسلہ میں ترتیب دیا گیا تھا - صرف ایک دعوت میں شریک ہو کر حسب ذیل خیالات کا اظہار فرمانا ایک اڈیٹر کے شایان شان نہیں ہے -

" حیدرآباد میں کھانا بیٹھنے کی تقریبیں بہت ہوتی ہیں، ان تقریبوں میں دو قسم کے مہمان مدعو

کئے جاتے ہیں، مہمان درجہ اول و مہمان درجہ دوم،
درجہ دوم کے مہمان محض اس لئے مدعو کئے جاتے
ہیں کہ درجہ اول کے مہمانوں کا پس منظر بن کر
پیش منظر اجاگر کر دیں۔ اور اس طرح غربت کے
سامنے امارت زیادہ نمایاں ہو جائے۔"

افسوس ہے کہ کارواں صاحب نے صرف
ایک عصرانہ کو دیکھ کر یہ غلط خیال قایم فرما لیا ہے
اور نہایت وثوق سے خیال آرائی فرماتے ہیں،
حالانکہ دعوتوں میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے
دوست احباب اور ہم مذاق و ہم مشرب کے ساتھ
محو کلام ہوتا ہے کارواں صاحب ایک علمی مذاق رکھنے
والے ایک ادیب ٹھیرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسی
مذاق اور اسی قسم کے اشخاص ان سے ہمکلام تھے۔
اس تفریق مذاق کو درجہ اول اور درجہ دوم پر تقسیم کرنا
سخت نادانی کی دلیل ہے۔

آگے چل کر جناب کارواں اس طرح گوہر افشانی
کرتے ہیں:۔

"دار الحرمت اور ساکنان حرمت نے
میرے دل پر ایک ایسا نقش چھوڑا ہے
جسے نہ تو اہل حیدرآباد کی بے مروتی
مٹا سکتی ہے اور نہ انقلاب زمانہ"

افسوس ہے کہ جناب کارواں صاحب نے
اہل حیدرآباد کو بے مروت تو بتا دیا مگر اس کی صراحت
نہیں فرمائی کہ ساکنان حیدرآباد نے کیا بے مروتی
کی۔ جہاں تک ہمیں معلومات ہیں وہ یہ ہیں کہ
ٹانگے والے اور بعض راہ رو اصحاب نے آپ سے
بے مروتی کی تھی اور وہ اس طرح کہ جناب کارواں
نے تانگہ والوں کو "بیچلر کوارٹرس" چلنے کہا، اور یہ
صحیح پتہ پر انہیں نہیں لے گیا، اور اس طرح غالباً
کسی راہ رو سے آپ نے ایک ایسی شخصیت کا پتہ
دریافت کیا جو حیدرآباد میں مشہور نہیں ہیں،
ظاہر ہے کہ ان امور کو بے مروتی قرار دینا کہاں
تک صحیح اور حق بجانب ہو سکتا ہے۔

یہ چیز صرف حیدرآباد سے مختص نہیں ہے
بلکہ دیگر بڑے اور آباد شہروں میں بھی یہی ہوتا ہے

بہر حال جناب کارواں اپنے ایک ہفتہ کے
قیام میں جو تاثرات لے گئے ہیں اس میں بڑی
حد تک ناانصافی کیگئی ہے۔

پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں
کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پروا
تھنک یو ڈیر میں سننے کیلئے کان تو ہیں
ان سے ملنے میں ہے ایمان کا نقصان اکبر
خیر جو کچھ ہو نکلتے مرے ارمان تو ہیں

اکبر

زبان اُردو

جناب مرزا سلیم بیگ صاحب وکیل و ماہر فن تحریرات

اُردو زبان در اصل ہندو مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ جو ان کے بزرگوں سے اون کو وراثتاً پہنچا ہے اس میں تیرا میرا کرنا در اصل وطنیت اور قومیت کو تباہ کرنا ہے۔ صدیوں سے جس اردو زبان کو اپنی مادری زبان بنا چکے ہیں اور اوس کا نام اردو پکار چکے ہیں۔ اوس کو آج ہندی۔ ہندستانی یا ہندوستانی کہنا۔ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔ مادری زبان کو چھوڑکر دوسری زبان اختیار کرنا سیاست کی ایسی فاش غلطی ہے جس کو ہماری آنیوالی نسلیں کبھی معاف نہیں کرسکیتں۔ ہندی یا اردو کی بولی ٹھولی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے ناموں کا اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کو دھوکہ میں مبتلا کر رہا ہے۔ کانگریس جو اس وقت ہندوستان کی سیاست کا علمبردار اور گاندھی جی جو قوم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ وطنیت اور قومیت کو تباہی کے گڑھے میں ڈھکیل رہے ہیں۔ ہندو مسلمانوں میں مذہبی اختلاف تو ہمیشہ ہی رہا ہے۔ مگر زبان ان دونوں فرقوں کی مشترکہ رہی ہے۔ اور اوس میں میل ملاپ۔ رسم و رواج اور لین دین نے ایک قومیت کی صورت پیدا کر دی تھی۔ کانگریس نے ہندی اور ہندستانی کا مسئلہ درمیان میں کھڑا کرکے ایک اور خلیج پیدا کر دی۔

نہایت آسانی سے اس مسئلہ پر غور ہو سکتا ہے کہ مادری زبان کی تعلیم سودمند ہوتی ہے یا غیر زبان کی۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کو دیکھئے جہاں ابتدائی چار یا پنج جماعتوں کے بعد اردو کی تعلیم ختم ہوجاتی ہے اور غیر زبان میں تاریخ۔ جغرافیہ اور سائنس پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے ملک کو کیا فائدہ پہنچا ہے۔ اور ملک سے غیر زبان کی تعلیم سے کتنے ہونہار سپوت پیدا کئے ہیں۔ برخلاف اس کے یورپ جہاں مادری زبان میں تعلیم ہوتی ہے آج کیا کر رہا ہے۔ ہم صرف اس قابل ہوئے ہیں کہ بڑھاپے تک تعلیم پاکر اپنی غلامی میں اور اضافہ کرلیں۔ اور چند سکوں کے لئے اپنی عزیز عمر خدمت گذاری اور جی حضوری میں گذار دیں۔ یورپ مادری زبان کی

تعلیم سے دنیا کو مالا مال کر دیا ہے اور وہ کچھ پیش کیا ہے جس کو سمجھنا تو درکنار ہم دیکھنے کی بھی تاب نہیں رکھتے۔ کیا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ غیر زبان میں تعلیم پاکر کسی قوم نے ترقی کی ہے؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مادری زبان کو چھوڑ کر کوئی قوم اپنے وقار اور اپنی وطنیت کو باقی رکھ سکی ہے؟ کانگریس میں اردو زبان کو چھوڑنے اور ہندی زبان کی آڑ میں سنسکرت کا پروپگنڈا کیا جا رہا ہے نہ جانے وہ کب پھول پھل لائے اور ہمیں اوس میں کامیابی ہو۔

کانگریس حکومت خود اختیاری اپنے وطن اور قوم کی حفاظت کیلئے چاہتی ہے۔ قوم اور وطن اوس وقت تک خود مختار نہیں ہو سکتے جب تک ہندو اور مسلمان میں یکجہتی اور ہم آہنگی نہ ہو۔ یہ اوسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں فرقے اپنی مادری زبان میں ایک دوسرے کے خیالات کے ساتھ ساتھ ایک زبان اور ایک آواز نہ ہوں۔ ایک آواز اور ایک زبان ہونا صرف اردو زبان کو ہی اختیار کرنے سے ہو سکتا ہے۔ نہ ہندی یا اتھوا ہندستانی سے۔

شاہجہاں کے زمانہ ۱۶۲۸ء سن جلوس سے اردو زبان کو ہر ہندوستانی نے اختیار کر لیا ہے۔ اور اوسی زمانے سے یہ ہندوستان میں دونوں فرقوں کی مشترکہ زبان قرار پا چکی ہے۔

اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بیچاری اردو پر ستم کے پہاڑ توڑنا اور اوس کو راندہ درگاہ کہنا کہاں کی بھل منساہت ہے۔ اس میں تنہا ذمہ داری ہندوؤں ہی پر نہیں ہے۔ بلکہ برابر کا الزام مسلمان پر بھی ہے۔ ہندوؤں نے تعصب کے پردے میں فارسی اور عربی کے مستعمل الفاظ کو ترک کر کے سنسکرت کے موٹے موٹے بعید از فہم الفاظ ٹھونسنے شروع کئے اور اپنی دانست میں اوس کو ہندی مروجہ سمجھنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے یونیورسٹیوں میں تعلیم پاکر اردو سے اپنی نفرت کا اظہار شروع کیا، اور اردو کی بول چال میں انگریزی الفاظ بلاضرورت بولنے لگے۔

ہمارے مسلمان تعلیم یافتہ گھرانوں میں اگر جستجو کی جائے تو اردو کی ایک آدھ کتاب نکلے گی۔ مگر انگریزی کی بیسیوں کتابیں میز پر سجی ہوئی ہونگی۔ انگریزی تعلیم نے اون پر اتنا جادو کر دیا ہے کہ اگر وہ آپس میں خط و کتابت بھی کرنے میں تو انگریزی زبان میں اور اتفاق سے اگر شاعری سے دلچسپی ہے تو شعر بھی انگریزی ہی میں کہتے ہیں۔ ہندوؤں کی وہ کوشش اور مسلمانوں کا یہ رویہ دیکھ کر یقین مانئے دل گواہی دیتا ہے کہ ہندوستان میں نہ اردو ہی رہے گی اور نہ ہندی۔ ایک ایسی

زبان پیدا ہو جائے گی جو قومیت و وطنیت و وقار اور خود داری کو ملک سے فنا کر دے گی۔

کیا مسلمانوں کے لئے یہ افسوسناک امر نہیں ہے کہ آج تک علم حدیث۔ فقہ۔ فلسفہ اور طب کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا اور ان علوم کی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ عربی زبان میں ہوتی ہے۔ کیا اطبا یونانی آج تک فارسی میں اپنا نسخہ نہیں لکھتے۔ کیا مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی ادب کا مطالعہ شوق سے نہیں کرتا۔ یہی ہو رہا ہے اور یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم کو نہ تو اپنی قومیت کا لحاظ ہے اور نہ اپنی مادری زبان کا پاس۔ در اصل ہم مادری زبان کی خوبیوں اور بھلائیوں کو اب تک کہنے کے قابل ہی نہیں ہوئے ہیں۔ انگریزی داں طبقہ نے یوروپ کی تاریخ کا تو ضرور مطالعہ کیا ہوگا گو اونھیں تاریخ ہند سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اونھوں نے یہ ضرور پڑھا ہوگا کہ یورپ میں جب تک لاطینی زبان میں شاعری ہوتی رہی۔ وہاں کوئی مادی ترقی نہیں ہوئی۔ جب لاطینی زبان کو چھوڑ کر مادری زبان اختیار کی تو وطن کا جذبہ بھی پیدا ہوا اور قومیت نے بھی جوش مارا۔ ملٹن کی شاعری نے نہایت حقیر قیمت ایک پونڈ علم و ادب کے بازار میں اٹھائی۔ تاریخ دیکھئے تو وہی ملٹن کی شاعری انگریزی ادب کی جان اور انگریزی زبان کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ انگریزوں نے مادری زبان اختیار کر کے دنیا کو علم و ادب سے حیران کر دیا ہے اور ہم ہیں کہ خود اپنی بھی صورت کو بگاڑے جا رہے ہیں۔ اردو نہ تو اردو ہی رہی ہے اور نہ وہ سنسکرت ہی بنی ہے۔ جب تک ہندوؤں کی کوشش سے اردو سنسکرت بشکل یا مسلمانوں کی لاپرواہی سے اردو انگریزی کا جامہ پہین گی۔ اوس وقت تک خدا جانے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اور تکمیل زبان کے لئے جو کچھ جد و جہد ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے وہ برباد ہو کر نئی زبان کو فروغ اور علمی زبان بنانے تک ہندوستان قومی عظمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

اس وقت ہماری مادری زبان اردو اس نوبت پر آگئی ہے کہ تھوڑی سی مشترکہ جد و جہد سے اس میں چار چاند لگ سکتے ہیں قوم اور وطن کی عزت اور آبرو کا بقا اسی میں ہے کہ کسی طرح بھی اس وقار کو قائم رکھا جائے۔ شکسپیر اور ملٹن کے بدلے اقبال اور غالب کو سراہا جائے۔ زبان کو علم و ادب سے سنوارا جائے۔ سنسکرت۔ فارسی اور عربی کے ادق اور بعید فہم الفاظ کے بدلے عام فہم الفاظ پیدا کئے جائیں۔ نئے نئے محاوروں۔ نئی نئی ترکیبوں اور نئی نئی بندشوں سے زبان کو وسعت دی جائے۔ وہ اعلیٰ ترقی جس کی آرزو مند کانگریس ہے اور اردو کو چھوڑ کر ہندی کا پروپگنڈا

کر رہی ہے اوس وقت تک حاصل نہیں کر سکتی
جب تک وہ مادری زبان اردو کو نہ اپنائیگی۔
مسلمان اوس وقت تک بام ترقی پر نہیں چڑھ سکتے
جب تک وہ مادری زبان اردو کو اپنا اوڑھنا
بچھونا نہ بنائیں گے۔ وطن کی عزت۔ قوم کی ترقی۔
ملک کی آزادی سچ پوچھئے تو مادری زبان کے حاصل
کرنے اور اوس کو اشاعت دینے میں ہے۔ موجودہ
جدید تعلیم اور انگریزی زبان کا شوق درحاصل طوطے
کی طرح رٹنا اور صورت نگاری کرنا ہے۔ جدید علوم
کو مادری زبان میں حاصل کر کے ہی ہم دنیا میں
کچھ کر سکتے ہیں۔ غیر زبان میں تعلیم پاکر اگر سو
فیصدی نوجوان بھی تیار ہوں تو وہ ملک کو
کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ مادری زبان میں علوم
جدیدہ کا ایک آدمی بھی سو آدمیوں کو فائدہ پہنچا سکتا
ہے۔ زبان کی حد تک ہمیں باہمی نفاق کو علیحدہ رکھکر
زبان اردو کی ترویج و ترقی کے لئے مشترکہ کوشش
کرنی چاہئے۔ کیونکہ مادری زبان میں اللہ کی دی
ہوئی طاقت ہے۔ اس طاقت سے فائدہ اٹھانا
ہمارا مشترکہ فرض ہے۔

اگر یہ نہ ہوا اور علوم جدیدہ کے ترجمے مادری
زبان میں نہ ہوئے تو ہم نہ تو وطن کی عزت کو
سنبھال سکتے ہیں۔ اور نہ اپنا قومی وقار قائم رکھ
سکتے ہیں۔ دوسری قوموں کی تاریخ سے ہمیں عبرت
حاصل کرنی چاہئے۔ اور وہ وتیرہ اختیار کرنا چاہئے
جو ترقی یافتہ قوموں نے اپنی مادری زبان کو فروغ
دینے میں کیا ہے۔ مادری زبان کی ترویج میں ہمیں
نہ تو اختلاف کرنا چاہئے اور نہ اوس میں روڑے
اٹکانے چاہئے۔ جو کچھ ہو اور جس طرح ہو اور جس جس
طرح بن سکے اردو زبان کو آگے بڑھانے کی سعی
کرنی چاہئے۔ یہ ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ
ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اردو زبان کی خدمت
مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کی ہے۔ اگر سنہ ۱۸۵۷ء
کے زمانہ پر نظر ڈالی جائے تو ہندوستان کے
تقریباً سارے اخبار ہندوؤں نے جاری کئے تھے۔
بہت سی اردو کی تصنیفات اونہی کی تھیں اور
بہت سے مطبع اونہی کے قبضہ میں تھے۔ ظاہر ہے
کہ ہندو بہت اچھی طرح ہندی کا پرچار کر سکتے
تھے۔ انگریزوں کی عملداری کا زمانہ تھا۔ اور آزادی
نے کوئی فرقہ واری روکاؤ نہیں رکھا تھا۔ صرف
ہندوؤں کی اردو سے محبت اور وطنی جذبہ نے
اون کو اردو کی اشاعت پر آمادہ کیا تھا، وہی
جذبہ اور وہی شوق آج بھی ہونا چاہئے۔ اور
آج بھی اون کو زبان اردو کی اشاعت
کے لئے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو
وہ قدیم سے کرتے آئے ہیں ٭

ذسکا

(بسلسلہ سابقہ)

جناب سید نور الحسن صاحب بی۔ اے۔

ہر ایک تم کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے جیسے تم چاند سے ٹپک پڑتے ہو۔ تم بیک وقت ارمنڈ جرویس ہوکر شرمیلے، خاموش اور سادہ نہیں ہو سکتے۔

جرویس نے مسکراتے ہوئے کہا "کیوں نہیں۔ شہرت وسواسی اور متلون ہوتی ہے اور اس کے طبل کی آواز تمام دنیا میں ایک ہی وقت میں نہیں سنی جا سکتی۔ اُس گندے بازار کے شریف مالک نے جہاں سے کہ میں نے بدوی کی یہ خوشنما پوشاک خریدی ہے کبھی بھی میرا نام نہیں سنا۔ بدقسمت انسان! وہ نہیں جانتا کہ وہ کس چیز سے محروم ہے۔"

اِس موقع پر اُس کی نظر ڈاکٹر ڈین پر پڑی۔ ڈاکٹر ڈین اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسی کہ اُس کی ہر چیز کو غور سے مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔

ڈنزل۔ غالباً یہ تمہارے دوست ہیں؟

مرے نے فوراً جواب دیا "ہاں! آپ کا نام نامی اسم گرامی میکھول ڈین ہے۔ ڈاکٹر ڈین مجھے اجازت دیجئے کہ اپنے دوست ارمنڈ جرویس کا آپ سے تعارف کراؤں۔ ان کی اس سے زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر نے جھکتے ہوئے کہا "ہاں کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے نام کی شہرت چہار دانگ عالم میں ہے۔" جرویس نے کہا "شہرت ہمیشہ مفید نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں شہرت عام شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ شاید ایسی ہستی جس کو تمام عالم جانتا ہے "زولا" ہے۔ حضرت انسان تمام دنیا میں اور تمام زمانوں میں عیب اور گناہ کی پرستش کرنے میں متفق ہیں۔"

فنکار کے مغرور اور نمایاں خد و خال کو متجسسانہ نظر سے بغور دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ڈین نے نہایت آہستہ سے کہا "جناب میں آپ سے اس معاملہ میں متفق نہیں ہو سکتا، میرے خیال میں فرنچ اکاڈیمی انفرادی حیثیت سے انسانی کمزوریوں کی مثل دیگر اصحاب کے قدر کرتی ہے لیکن اجتماعی لحاظ سے کوئی قوت جو اُن سے زیادہ قوی اور برتر ہے ان کو ایسے بدنام Realism کو مطعون کرنے پر متفق کرتی ہے جو فنا اور حسن کے

تمام قوانین کی قربانی ایسے موضوعات کے بحث و
مباحث کی خاطر کرتا ہے جن کا اشارتاً اور کنایتاً
ذکر بھی ایک متمدن سوسائٹی میں مکروہ سمجھا جائے۔

جرویس بے پروائی سے ہنسا۔

اوہ ایک نہ ایک دن اُس کو حقیقت سے
آگاہی ہو جائے گی۔ کوئی قوت انسان میں روح
فطرت سے زیادہ قوی نہیں۔ امتداد زمانہ جب
چند متعصبانہ اخلاقی معیاروں کو فنا کردے گا اور
بے بنیاد کمزور وجدان مٹ جائیں گے تو زولاؔ
ہی پہلا فرنچ اکاڈیمیسین متصور ہوگا اور اُس
کی شہرت اس سے کہیں زیادہ ہوگی جتنی کہ شروع
میں اگر وہ کامیاب ہوتا تو ہوتی۔ چیدہ اصحاب کا
یہی طریقہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ نپولین نے کہا تھا۔

منحنی ڈاکٹر کے چہرہ سے آثار و چڑھاؤ سے اس
کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔

"جرویس جو کچھ تم نے کہا اُس پر تمہیں یقین ہے"

جرویس نے ایک سگریٹ جلاتے ہوئے
اور دھواں کو فضاء میں بکھیرتے ہوئے کہا "میں نے
کیا کہا مجھے کچھ یاد نہیں ہے"

تم نے کہا تھا "فطرت پرستی سب سے بڑی
طاقت ہے۔ اس روح سے زیادہ قوی تر کوئی
دوسری روح نہیں۔ کیا تم اس خیال کے واقعی
معتقد نہیں؟"

ہاں! واقعی۔ مشہور مصور یہ کہہ کر خوش سا
نظر آنے لگا۔ فطرت پرستی فطرت ہے۔ اور دنیا میں
ہر جگہ اور ہر مقام پر کوئی چیز بھی فطرت سے زیادہ
طاقتور اور برتر نہیں۔

ڈاکٹر ڈین نے پوچھا "خدا کے بارے میں
تمہارا کیا خیال ہے"

خدا! یہ کہہ کر جرویس نے زور کا ایک قہقہہ
مارا۔ معاف کیجئے گا۔ آپ پادری تو نہیں ہیں"

ڈاکٹر نے سر نیچا کرتے ہوئے کہا "نہیں کلیسا سے
میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں قانون اور ادبیات کا
ڈاکٹر ہوں۔ بالعموم فلسفہ اور سائنس کا ایک
حقیر طالب علم ہوں۔

جرویس نے بات کاٹتے ہوئے کہا "فلسفہ
اور سائنس۔ اور جناب خدا کے بابتہ سوال کر رہے
ہیں۔ فلسفہ اور سائنس نے خدا سے آگے ترقی
کر لی ہے۔

ڈاکٹر ڈین نے اپنے دونوں ہاتھوں کو
مسرت سے ملتے ہوئے کہا "بالکل یہی بات۔ یہ
آپ کا خیال ہے۔ ہاں! میں یہ خیال کرتا ہوں۔
سائنس اور فلسفہ نے خدا کو اس کی کائنات میں
شکست فاش دیدی ہے۔ ہا ہا ہا۔ بہت اچھے!
بہت اچھے۔ بڑی پُر مذاق بات ہے۔ ہا ہا
ڈاکٹر یہ کہہ کر ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ اس کی

چھوٹی چھوٹی آنکھیں قہقہوں کی شدت سے بھوؤں میں غائب ہوگئیں۔ اور دونوں بھوؤں مل کر ایک ایسی لکیر بن گئی جو قدیم یونانیوں میں طنزیہ جملہ پر لگائی جاتی تھی۔

ڈنزل مرے بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔

جرویس سوائے فن کے اور کسی چیز کی بابت نہیں سوچتا اس کے دوست نے معذرت چاہتے ہوئے انداز میں کہا۔ اُس کے وجود کا واحد مقصد آرٹ ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ اُس کو کبھی بھی کسی اور امر کے متعلق سوائے آرٹ کے سوچنے کا موقع بھی ملا ہو۔

جرویس نے خوش ہوتے ہوئے کہا " اور بھلا کسی چیز کے بابت میں سوچوں۔ زندگی کے متعلق؟ مجھے زندگی آرٹ ہی آرٹ نظر آتی ہے اور آرٹ سے میرا مفہوم ہے فطرت کی بوقلمونی ہر رنگ اور ہر بھیس میں۔

ڈاکٹر ڈین نے زور دیتے ہوئے کہا " اگر ایسا ہے تو تم رومان پرست ہو۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ وہ صرف فطرت ہے اور کچھ نہیں۔ مادہ جس پر روح کو قابو نہ ہو سب کچھ ہو سکتا ہے سوائے Idealist کے۔

بالکل ٹھیک۔ جرویس نے جواب دیا لیکن میری روح اس کو Idealise کرتی ہے۔ میرا تخیل اس سے پرے دیکھتا ہے اور وہ میری روح کے گرفت میں ہے۔

ڈاکٹر ڈین نے دوبارہ ہنستے ہوئے کہا " اخاہ تو آپ روح بھی رکھتے ہیں۔

ہاں بھائی۔ یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

جرویس نے فوری متعجب نظروں سے اس کو دیکھا۔

ہر شخص فطرتاً ایک داخلی قوت رکھتا ہے جس کو عرف عام میں روح کہتے ہیں۔ اصل میں وہ صرف 'مزاج' ہے۔

اچھا! وہ صرف مزاج ہے۔ تو تم یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ تمہارے بعد بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے یہ روح، روپ بدل بدل کر قایم رہ سکتی ہے۔ جب تمام تمہارا بدن گل سڑ کر ختم ہوگیا ہو جب بھی وہ لافانی رہ سکتی ہے۔ گو اس کو قایم رکھنے کے لئے اتنی احتیاط بھی نہیں کی جاتی جتنی مصری ممی کی۔

جرویس نے سگریٹ کے جلے ہوئے آخری ٹکڑے کو پھینکتے ہوئے کہا " ہرگز نہیں۔ روح کی بقاء ایک شکست خوردہ اور پامال نظریہ ہے۔ یہ خیال ہمیشہ مضحکہ خیز تھا۔ موجودہ زندگی کے اُلجھاؤ ہی ہمارے سلجھانے کے لئے کافی ہیں۔ میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ دور زندگی کی ایجاد کے متعلق

کیوں سوچتے رہتے ہیں۔ یہ نہایت احمقانہ اور جنگلی
توہم ہے۔"

ناچ کے کمرے سے دلدوز راگ کی صدائیں
فضا کے دوش پر سوار آنے لگیں [illegible]
کے دل میں ہلچل ڈال دینے والی، توبہ شکن متوازن
سریلی صدائیں ڈنرل مرے کو بے چین کرنے لگیں
وہ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہ ہر آنے اور جانے
والے کو متجسس نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ
کسی کے دیدار کا پیاسا ہے لیکن ڈاکٹر ڈین کی
توجہ کا ارمنڈ جرولیس ہنوز مرکز بنا ہوا تھا۔
وہ جرولیس کے قریب گیا اور آہستہ سے اپنی
دو انگلیاں اس بدوی لباس پر اس جگہ رکھیں
جہاں اس کا دل چھپا ہوا تھا ایک احمقانہ اور
حیوانی توہم اُس نے آہستہ آہستہ کہا۔ تم کو یقین
نہیں ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس زندگی کے بعد
دوسری زندگی یا کئی ایک کے بعد دوسری زندگیاں
ہوں۔ اس زندگی سے تو ہم سب کو دیر سویر گزرنا
ہی ہے۔

"قطعی نہیں۔ میں ایسے خیالات اَن پڑھ
اور جاہلوں کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ میں اپنے
ترقی یافتہ زمانہ کے لئے ایک بدنما دھبہ ہوں گا
اگر ایسے پوچ اور بے معنی خیالات کو ایک لمحہ کے
لئے بھی اپنے دل میں گذرنے دوں۔"

تم خیال کرتے ہو کہ موت ہر چیز کا خاتمہ ہے۔
اس سے آگے کچھ نہیں۔ اس سے آگے کوئی معمہ
نہیں۔ ڈاکٹر ڈین نے یہ کھلے آسمان کی طرف اپنی
چھوٹی سی پتلی انگلی اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ
اس طرح کہے کہ جرولیس جیسے بے پروا انسان پر بھی
وقتی اثر ہوئے بغیر نہ رہا لیکن اس نے ہنسی میں
اڑا دیا۔

"آگے کچھ نہیں۔ واقعی کچھ نہیں جناب والا
اس سے زیادہ واضح اور کیا بات ہو سکتی ہے۔
کہ موت ہر چیز کا خاتمہ ہے۔

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک عورت کی ہلکی
سریلی ہنسی کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی اس کے
کانوں تک پہنچی۔ یہ میٹھی ہنسی بہتر سے بہتر راگ
سے بہتر تھی۔ بالعموم عورت بہت زور سے ہنستی
ہیں اور ان کے قہقہہ کی آواز بطخ کی آواز سے زیادہ
مناسبت رکھتی ہے۔ بجائے کسی فطرتی راگ کے
لیکن یہ ہنسی کی آواز روپہلی اور ملائم تھی۔ یہ معلوم
ہوتا تھا کہ دبے دبے سروں میں کوئی دور بانسری
بجا رہا ہو اور جس میں سوائے مٹھاس کے اور
کچھ نہ ہو۔ اس آواز کو سنتے ہی جرولیس بلکہ تیر
کھائے ہوئے زخمی پرند کی طرح پلٹا اور حیران ہو کر
اپنے دوست مرے کو گھبراہٹ سے تکنے لگا۔

(باقی)

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر

صدر المہام تعلیمات

شہاب

ناہید

شہاب

نمبر ۶	اردی بہشت ۱۳۵۴ف مطابق مارچ ۱۹۴۵ء	جلد ۸

۱- ہمارے شگون - طاہرہ صدیقی آنسہ صغرا کے جواب میں لکھ رہی ہیں اور ہمارے شگون کی ایسی ہی توضیح ہے۔

۲- یاد ماضی - ایک خط ہے محبت کیش بھائی کا جنھوں نے اپنی بہن کو لکھا تھا۔

۳- ڈائری کا آخری ورق - ابتو شاید یہ آخری ہی ہوگا - بشیر بانو کا نوشتہ ہے۔

۴- رخصتی - ایک نصیحت آمیز خط ہے جس کو الوداعی کہہ سکتے ہیں۔ لڑکیاں اگر ان امور کا خیال رکھیں تو وہ اپنے گھروں کو جنت بنا سکتی ہیں۔ مسز عبدالقدیر ثمر کی کوشش ہے۔

۵ - سینما اور بچہ گھر، مس ریٹا نے تجویز تو اچھی پیش کی ہے لیکن اخراجات کی ذمہ داری کیا مس ریٹا اپنے ٹکٹ کے دام کے ساتھ برداشت کر سکیں گی۔ لیکن اون سے تو پوچھئے کہ جو کئی بچوں کے ساتھ سینما دیکھنے آتی ہیں۔ ایسی تجویزوں سے بہتر تو یہ ہوگا سینما دیکھنا ہی کیوں نہ چھوڑ دیں ۔

ہمارے شگون

طاہرہ نور صدیقی

شہاب ناہید کے خریداروں میں سے میں بھی ہوں۔ ماہ بہمن کا تازہ پرچہ اس دفعہ بہت سویرے ملا۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے میں "ناہید" کی اوراق گردانی کر رہی تھی۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اس اشاعت کے لکھنے والوں میں کون کون ہیں اور کس کس عنوانات کے تحت مضامین لکھے گئے ہیں لکھنے والوں میں آنسہ صغرا جنگ بہادر کا مضمون نظر پڑا۔ لیکن میں نے موصوفہ کا تازہ مضمون کیا ہوتا ہے" چنا اور اس خیال سے کہ چلو دسترخوان کے نیچے جانے میں ابھی دیر ہے جب تک یہ دیکھ ڈالوں ـــــ آخر دیکھیں تو کیا ہوتا ہے۔

یقین جانئے میں صغرا جنگ بہادر کے ابھی دو "حادثوں" کو پڑھ کر لطف اٹھا ہی رہی تھی اور کچھ آپ ہی آپ ہنس رہی تھی کہ "ایک حادثہ" میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ امی جان نے آخر ٹوک دیا۔ کہنے لگیں "بی۔ کھانا نکلا ہوا ہے اور تم کتاب پڑھ رہی ہو، بھلا پڑھائی کا یہ کون وقت ہے ـــــ چلو آجاؤ، ورنہ دیر ہوتی ہے [illegible] دیر تک [illegible] ٹھیک نہیں ہوتا"

ـــــ بس فوراً صغرا جنگ بہادر کے مضمون کی "تیلی" کی بات میرے دل میں کھٹک گئی۔ یہ سوچ کر کہ شائد رزق کے دیر تک دھرے رہنے سے بھی کچھ ہوتا ہے نہایت انجان بن کر پوچھی کہ "امی! اگر دیر ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟" مگر انہوں نے کوئی معلومات آفریں جواب نہیں دیا۔ صرف یہ کہکر گردن پھیر لیں کہ "کون جانے کیا ہوتا ہے، بس کہتے ہیں کہ یہ اچھی بات نہیں ہوتی۔ اس سے "افلاس" ہوتا ہے۔ جواب سن کر یقیناً مایوسی ہوئی مگر میں نے والد صاحب سے یہ توقع رکھی کہ وہ ضرور اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے۔ ان سے مخاطب ہوگئی اور اب کچھ پوچھنا ہی چاہتی تھی اتنے میں حضرت خالہ بلی صاحبہ دام اقبالہا جونہ جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھیں سامنے والے کمرہ سے نکل کر دوڑیں اور ادھر ہمارے برادر خورد اصغر سلمہ اپنی مرغیوں کو دسترخوان [illegible] روٹی کھلا رہے تھے۔ بلی کو دوڑتے دیکھ کر [illegible] نے سمجھا ہوگا کہ وہ [illegible] [illegible] [illegible]

دوسری طرف اُچھل بھاگیں۔ پھر کیا تھا۔ سارا کھانا
بکھر گیا اور سالن کے ایک کٹورے پر ان کی لات
کچھ اس طرح جم کر پڑی تھی کہ وہ بھی گویا ایک چھلانگ
مار کر امی جان کی گود میں آ رہا۔ عجیب اتفاق تھا
یہ بھی۔ امی جان کی سفید ساڑی سب رنگین ہوگئی
اور والد صاحب نے قہقہہ لگا کر زخموں پر نمک
پاشی کرتے ہوئے کہا "بیٹی یہ ہوتا ہے"

آپ نے دیکھا کہ کیا ہوتا ہے دسترخوان کے
دیر تک چُنے ہوئے پڑا رہنے سے۔ افلاس افلاس
تو خیر ایک طرف مگر دراصل ایسے یا اسی قسم کے
دوسرے حادثوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ
ضروری نہیں کہ مرغیاں ہی کود پڑیں۔ دوسری
"چھوٹی" چیزیں جیسے کیڑا پتنگا ڈوب جائے یا
تیز ہوا کے چل جانے سے دھول گرد ہی اڑ جائے
غرض کچھ اسی قسم کے امکانات رہا کرتے ہیں کیونکہ
قدیم زمانہ میں مکانات عصر جدید کی تہذیب کے
مطابق پختہ نہیں رہا کرتے تھے اور اگر مکان بڑا
سا پختہ ہوتا بھی تھا تو نہ ہی میز کرسی ہوتی تھی
اور نہ کسی اونچی چیز پر کھانے کا رواج تھا چنانچہ
اس زمانہ کے تجربات نے انہیں سکھایا کہ کھانا دیر
تک چنا ہوا نہ چھوڑا جائے۔ لہذا جب تجربے نے
احتیاط برتنے کی تدبیر سوجھائی تو عقلمندوں نے
دیکھا کہ گھر کے بچوں کو کس طرح محتاط بنایا جا سکتا ہے
چونکہ ممانعت پر عمل کرانے کے لئے ایک خوف کا
ہونا ضروری ہے۔ بس یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ اس سے
افلاس ہوتا ہے۔ اب بھلا مفلسی کا خوف کس کو
نہیں ہوتا۔ لو بات ہی بڑھ گئی کہ دسترخوان کے
دیر تک چنے رہنے سے افلاس ہوتا ہے۔ ورنہ وہ
اگر یہ کہتے کہ ہوا چلیگی تو دھول اڑیگی تو گھر والے
بھی سوچتے ہی رہ جاتے کہ جب چلیگی تب دیکھا
جائیگا۔

یہ اور ایسے ہی دوسرے شگون ہیں جن سے
ہم کو ڈرایا جاتا ہے۔ اگر آپ ان سب کو اکٹھا
کر کے غور کیجئے گا تو اس میں کسی نہ کسی حقیقت کو
ضرور پوشیدہ پائیں گے۔ میں نے جب ان شگونوں
کی ایک مختصر سی فہرست بنا کر غور کیا تو ان میں تمدنی
تہذیبی، اخلاقی، واقعاتی، تنظیمی و تکریمی یا نفسیاتی
اور حفظان صحت کے اصولوں کو کارفرما پایا۔ مثال
کے طور پر میں اپنے ہی مکان کے ایک اور واقعہ کو
پیش کرتی ہوں جس سے واضح ہو جائیگا کہ ہمارے
ان شگونوں نے بظاہر بے معنی باتوں میں کیسی
لطیف، فلسفیانہ اور حکیمانہ حقیقتیں مضمر ہیں۔

ایک دن ہم تمام کسی دعوت میں گئے ہوئے
تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ واپسی پر میری چھوٹی
بہن رشیدہ کی طبیعت کچھ مضمحل ہوگئی سوچا
گیا کہ کیا بات ہوگئی ہوگی۔ کسی کو اور تو ہم میں

نہ آئی لیکن خالہ اماں نے کہا "ہوا کیا، خدا نظر بد بچائے۔ بچی کو کسی کی نظر ہو گئی ہوگی۔ لو میں دلہن بیگم سے کہتی ہوں کہ وہ فوراً ٹوٹکہ کر دیں۔ اللہ چاہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خالہ اماں نے دلہن بھابی سے کہا اور انھوں نے نظر اتارنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک لگن لی گئی اس میں کچھ چونے ہلدی کا پانی بنایا گیا۔ اور یہ رنگین پانی تیار ہو جانے کے بعد ایک کپڑے کے تین ٹکڑے کئے گئے اور آگ سے سلگا دیا گیا۔ پھر رشیدہ سے کہا گیا کہ وہ بیچ صحن میں کھڑی ہو جائے۔ اس کے بعد دلہن بھابی نے نظر کے ٹوٹکہ کا منتر پڑھنے سے قبل رشیدہ سے یوں تکلم فرمایا "بی! آپ ڈرتی کاہے کو ہیں، لو میں یہ نظر اتارے دیتی ہوں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھنا کہ کیا تماشا ہوتا ہے" یہ کہہ کر انھوں نے ان سلگتے ہوئے کپڑوں کو تین تین دفعہ رشیدہ کے ہر بازو سے گھمانا شروع کیا۔ اور فوراً پھر ایک ہنڈیا لے کپڑوں کو اس میں ڈال لگن میں اس ہنڈیا کو الٹ دیا گیا۔ اور پھر رشیدہ کو ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں "دیکھا آپ نے ہنڈیا سارا پانی پی جا رہی ہے" رشیدہ نے دیکھا کہ ہنڈیا نے سچ مچ لگن میں سے پانی کی ایک کثیر مقدار کو پی لیا ہے۔ بھولی رشیدہ کو یقین ہو گیا کہ اسے کسی کی بد نظر ہو گئی تھی لیکن اب دلہن بھابی کے اس توڑ سے وہ جاتی رہی۔ رشیدہ کیا تمام گھر والوں کو اس پر یقین آگیا۔ میں بھی اس تماشا کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ مگر آپ نے دیکھا کہ اس سارے تماشہ کا مقصد کیا تھا۔ لیکن دلہن بھابی کا یہ منتر رشیدہ کے خیالات کو دھوکا دینا نہیں تھا۔ کیا رشیدہ پر یہ نفسیاتی اثرات ڈالنا نہیں تھا کہ ہاں تمھیں نظر ہو گئی تھی مگر اب جاتی رہی۔ بے شک اس سارے تماشہ کا مطلب یہی تھا۔ رشیدہ نے جب اپنی آنکھوں سے ہنڈیا کو رنگین پانی پیتے ہوئے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اگرچہ اسے بری نظر کسی کی ہو گئی تھی لیکن اب وہ اچھی ہو گئی ہے۔ اس کا یہ سمجھنا کہ وہ اچھی ہو گئی ہے" درحقیقت اسے اچھا بنا دیا۔ ماہران نفسیات کا یہ ایک نظریہ ہے کہ ہمارے خیال کو ہماری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہمارا کوئی خیال اگر یقین محکم کی صورت اختیار کرلے تو اس کا عملاً ظاہر ہونا ضروری ہے۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک وہمی صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے رات سوتے وقت دودھ کے ساتھ بچھو بھی پی لیا اور ان کے اس گمان نے انہیں علیل بنا دیا تھا۔ اور جب تک کہ انہیں تے کرا کر کسی حیلہ سے ایک دوسرا مردہ بچھو ان کی تے میں ملا کر دکھلا دیا نہیں گیا وہ صحت یاب نہیں ہو سکے تھے۔ گویا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جب آپ کے خیال کو کوئی دھوکا ہو جاتا ہے

تو اسی قسم کا جب تک دو سرا دھوکا نہ دیا جائے خیال کی صحت ناممکن رہتی ہے۔ مگر ایسے دھوکوں کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کے وہم کو بدلا جائے۔ خیالات کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری جانب مجتمع کیا جائے۔ چنانچہ رشیدہ کے خیال کو بھی ایک ایسا ہی دھوکا دیا گیا تو آپ نے اب اس نظر لگنے کی حقیقت کو سمجھ لیا ہوگا اور اسی کے ساتھ اس شگون کے نفسیاتی اثرات بھی۔

اب آپ پوچھئے گا کہ اس ہنڈیا نے پانی کس طرح پی لیا۔ سنئے وہ اس طرح کہ کپڑا صرف اس لئے جلایا گیا کہ دھواں پیدا ہوا، اور جب اس کو ہنڈیا میں ڈالا گیا تو ہنڈیا کے اندر کی ہوا خارج ہوگئی اس طرح جب اس کو پانی میں الٹا گیا تو پانی کی بیرونی سطح پر ہوا کا دباؤ پڑا اور پانی اس کی وجہ سے ہنڈیا میں چڑھ گیا۔

مختصر یہ کہ ہمارے گھروں کی بڈھی بڑی عورتیں جن نئے نئے رسومات کو بتاتی ہیں ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور پوشیدہ ہیں۔ اگرچہ کہ وہ ان حقائق سے ناواقف ہیں۔ پھر بھی یہ چیزیں گذشتہ زمانہ کے عقلمندوں ہی کی بتائی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کو صرف جاہلانہ رسومات سمجھنا خود ہماری جہالت ہے۔

ذیل میں میں مختصر طور پر چند ما نعتوں کا ذکر کروں گی لیکن گنجائش کی مد نظر اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ البتہ چند اثرات کا اشارہ ان کے محاذی ضرور کر دوں گی آپ اگر اسی کے پس منظر میں غور کریں گے تو سب حقیقتیں آشکارا ہو جائیں گی۔

کہتے ہیں کہ:۔

قول (۱) ”کھڑے ہو کر پانی نہ پیا کریں“

تشریح (صرف حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

قول (۲) ”کھاتے وقت باہر سے آدمی کو اندر نہ آنے دینا چاہئے“

تشریح۔ (یہ بھی حفظان صحت کے اصول کے مطابق ہے۔ کیونکہ اکثر آنے والا دنیا جہان کی سیر کرتا ہوا آتا ہے۔ ممکن ہے اس کے ساتھ سڑک کے جراثیم بھی لپٹ آئیں)

قول (۳) ”جمعہ کی نماز سے قبل سفر نہ کرنا چاہئے“

تشریح۔ (اس میں تعلیمی اور سیاسی اصولوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ تعلیمی یہ کہ جمعہ یوم عبادت ہے۔ سیاسی یہ کہ جمعہ نماز کا خاص مقصد اجتماع ہے)

قول (۴) ”سیدھے بازو سونا“

تشریح۔ (تحت اصول حفظان صحت۔ قلب پر بار پڑتا ہے۔)

قول (۵) ”جاتے وقت ٹوکنا“

تشریح۔ (نفسیاتی اثرات۔ کیونکہ قوت ارادی کمزور ہوتی ہے۔)

قول (۶) "تین کے عدد کو برا کہنا"

تشریح۔ (یہ ایک واقعاتی بات ہے جو انگریزوں سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ جنگ عظیم میں تین سپاہی بیٹھے سگریٹ سلگا رہے تھے کہ وہ گولی کا نشانہ بن گئے۔ پس اسی دن سے یہ قول رائج ہوگیا۔)

قول (۷) "کہانیاں دن میں نہ کہنا"

تشریح۔ (کیونکہ کام میں ہرج ہوجاتا ہے ظاہر ہے کہ دن میں اگر آپ کہانی کہیں گے تو آپ کے اطراف سب گھر والے جمع ہوجائیں گے جس سے کام کا ہرج ہوگا۔)

قول (۸) "ناخن کا کترنا"

تشریح۔ (یہ اصول حفظان صحت کے خلاف ہے۔ کیونکہ ناخنوں کے بیچ میں میلا جمع ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں خود ناخن زہریلے ہوا کرتے ہیں۔)

قول (۹) "مغرب کے وقت جھاڑ کے نیچے کھڑے نہ رہنا"

تشریح۔ (اس لئے کہ شام کا وقت پرندوں کے بسیرے کا ہوتا ہے۔ جیسے آپ ہم سوتے سے قبل تمام ضروریات اور حاجات سے فارغ ہوجاتے ہیں ویسے ہی یہ پرندے بھی اپنی حاجات سے فارغ ہوتے ہیں ایسے وقت اگر جھاڑ کے نیچے کھڑے رہئے تو میلا اور فضلا سر پر گر پڑنے کا امکان ہے)

قول (۱۰) "کھڑے ہوئے کنگی نہ کرنا"

تشریح۔ (اس کی تہذیبی اور نفسیاتی اثرات کے تحت ممانعت کیگئی ہے۔ وہ یہ کہ کھڑے ہوئے کنگی سے بالوں کو نظر لگتی ہے (وہی نفسیاتی اثرات) دوسرے یہ کہ یہ خلاف تہذیب یوں ہے کہ کھڑے ہوئے کنگی کرنے میں اگر ڈبا کندے سے گرجائے تو اتفاق سے اگر وہاں کوئی اور بھی موجود ہوں تو عورت کے لئے یہ ایک شرم کی بات ہے)

قول (۱۱) "کنگی پر کنگی نہ کرنا"

تشریح۔ (صرف اس لئے کہ اگر آپ صرف اوپر سے کنگی کرلینے کے عادی ہوجائیں گی تو ممکن ہے تساہل کے تحت کتنے دن تک کنگی ہی نہ کیجئے گا نتیجتاً سر میں جوئیں پڑجائیں گی۔ لہٰذا اسے احتیاط برتنے کیلئے ڈرایا جاتا ہے کہ اس سے موت آتی ہے)

قول (۱۲) "سوپ کی ہوا نہ لگنا" تشریح (اسلئے کہ سوپ پھوڑتے وقت ممکن ہے سامنے کھڑے رہنے والے کی آنکھ میں کوئی تنکا گرجائے) غرضکہ ایسے اور سینکڑوں شگون ہمارے ایسے ہیں جن سے ہمیں ڈرایا جاتا ہے لیکن ہم ان کے مضمرات سے واقف نہیں ہوتے۔

ڈائری کا آخری ورق

بشیر بانو

۱۴ اگست ۱۳۵۶ف

ایک عرصہ کے بعد آج ڈائری لکھ رہا ہوں
کمزوری اور ناتوانی محسوس ہو رہی ہے سوچتا
ہوں کہ کسی طرح ابھی ڈائری لکھوں۔ پھر کون
جانے کل لکھ سکوں گا یا نہیں ...... ! ! !
دو سال کی طویل مدت کے بعد آج پھر میرے
قدم جھیل کی طرف اٹھنے لگے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے
کتنی سختی سے کہا "ناشاد! تمہاری صحت گرتی
ہی جا رہی ہے۔ اگر تم اب بھی میری باتوں پر عمل
نہ کروگے اور اسی طرح مرجاؤ گے تو یاد رکھو
تمہاری روح کو کبھی تسکین نہ مل سکے گی یہ اچھی طرح
سن لو کہ ......" میں چونک پڑا "یعنی ڈاکٹر
یوسف ......" میں اس سے آگے
کیا کہتا۔ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ ہونٹوں کے
کونے جھک گئے۔ دل زور زور سے دھڑکنے
لگا اور میں باہر نکل آیا۔ زندگی بھر میں نے
تسکین نہیں پائی۔ مرکر بھی بے سکون رہوں۔
.... ! ! یہ کیسے برداشت کروں میں یوسف کی
نصیحتوں پر عمل کروں گا۔ میں روز باہر نکلا
کروں گا۔ میں نے تہیہ کر لیا۔ لیکن جاؤں کس طرف یہ
ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ ایک طرف تو جھیل تھی ...
.... وہ سہانی اور پرکیف ... جس کے کنارے
زندگی کے چند لطیف لمحے بسر کئے تھے۔ لیکن نہ جانے
کیوں وہاں جاتے ہوئے میرا دل مسلا سا جاتا تھا
ایسا معلوم ہوتا تھا میرے آشیانہ کو آگ لگ گئی۔
اسی لئے میں وہاں جاتے ہوئے خوف کھاتا تھا۔
لیکن آج یوسف نے کتنی تاکید کی۔ میرے قدم
اٹھتے ہی گئے۔ جیسے جیسے جھیل سے قریب ہوتا
گیا۔ میری آنکھوں میں آشی کی تصویر آتی گئی۔
جیسے ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یا فضا
خاموش ہے .... منظر اداس اور ہم ایک دوسرے
کو بچشم پرنم تک رہے تھے۔ جیسے صرف آنکھیں ہی
جذبات کا انکشاف اچھی طرح کر سکتی ہیں ! ! !
اس کی موٹی موٹی آنکھیں .... دلکش ہونٹ
اور معصوم چہرہ میری نگاہوں میں پھر جاتا۔ کتنے
حسین تھے وہ دن ! ! جھیل کی ننھی ننھی لہریں
اب بھی ویسے ہی رقص کر رہی ہیں۔ بادل ویسے
ہی امنڈ رہے ہیں۔ اور فضا ویسے ہی مرتعش ہے

لیکن فرق ہے تو میرے دل کی دنیا میں۔ ۔ ۔ ۔ اُس
پُرلطف سکون کے بجائے ہلچل مچی ہے۔ بے انتہا
مسرتوں کی بجائے ختم نہ ہونے والے غم ہیں آنکھوں
میں آنسوؤں کے دو گہرے سمندر ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور
میں ہوں۔ ۔ ۔ ۔ پھر نہ جانے کیوں میری آنکھ سے
آنسو ٹپک پڑے۔

ہاں تو آشی مجسم زندگی ہو کر میری مردہ
روح میں سمائی۔ اور ایک دفعہ پھر زمانے نے مجھے
اُبھارا۔ میں زندگی کی بلندیوں پر تھا۔ ہم دونوں
قریب ہوتے گئے۔ جیسے بسیط آسمان پر دو ستارے
قریب ہو رہے ہوں قریب ہوتے۔ ۔ ۔ ۔ ہوتے
ٹکرا گئے۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک دوسرے سے اتنے دُور
پھینک دیے گئے کہ پھر کبھی نہ مل سکے۔ ۔ ۔ ۔ آشی
کی آمد میری زندگی میں خود ایک دھکہ تھی اب اس
کی جدائی دوسرا دھکہ ہو کر رہ گئی۔ اس دھکے
نے میری زندگی کی ساری بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا
پھر میں تنہا رہ گیا۔ جھیل کی نازک موجوں
کی طرح جو تنہا ابھرتی ہیں اور تنہا غائب ہو جاتی
ہیں۔ ۔ ۔ ۔ آشی مجھ سے دُور ہو گئی۔ ۔ ۔ میرے
خواب و خیال سے بھی دور۔ ۔ ۔ ۔ اس کا کیا حشر
ہوا مجھے اس کی مطلق خبر نہیں۔ لیکن میری تو
زندگی ہی پلٹ گئی۔ جب مایوس تھا اب پریشان
ہوں۔ ۔ ۔ "آشی ادھر آجاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر۔ ۔ ۔
میں ادھر ہوں۔ ۔ ۔ ۔" میں بے اختیار ہو کر
چیخ اٹھا۔ وہ مجھے بلا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وہ
غائب ہو گئی! جیسے صبح ہوتے ہی ستارے غائب
ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ دنیا زور سے
گھوم رہی ہے اور گھومتے گھومتے۔ ۔ ۔ ۔ ٹکرائی
۔ ۔ ۔ ۔ سورج سے ٹکرا گئی اور پھر ہر طرف شعلے تھے
تیز تیز شعلے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یکایک میں چونکا۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ یوسف سرہانے کھڑے تھے انھوں نے
پکارا "کیا ہے یوسف۔ ۔ ۔ ۔ میں کہاں ہوں
۔ ۔ ۔ ۔؟" یہ سُن کر وہ خوشی سے لپٹ گئے۔
"ناشاد! قریب تھا کہ تم مجھے ہمیشہ۔ ۔ ۔ ہمیشہ
کیلئے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ وہ رونے لگے۔
"بھائی روؤ نہیں آپ بھی دُور نہیں ہے۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کیا یہ سچ نہیں۔ ۔ ۔ ۔؟ ناتوانی بہت
بڑھ گئی ہے۔ کسی کو دیکھ کر بھی یہ نہیں معلوم ہوتا
کہ یہ کون ہیں۔ جسم میں روح نکلنے کے لئے بیتاب ہے۔
پڑا پڑا سوچتا ہوں آج کی شام کا واقعہ تو ڈائری
میں لکھنا ضروری تھا۔ لکھ دیا کون جانے پھر کل
لکھ سکوں گا یا نہیں۔ یہ آخری ورق ہے یا ابھی
اور اوراق لکھے جانے والے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہر گھڑی لگتی ہے کیوں ٹھوکر یہاں؟؟
زندگی شاید اسی کا نام ہے!!

یادِ ماضی

ص - ع

اس یقین کے ساتھ کہ اپنا یہ خط پڑھ کر بھائی اپنی بہن کی ایسی بے لوث محبت کے جھونکے کو تازہ کر سکے جس پر زندگی کی سات بہاریں گذر چکی ہیں۔

عزیز از جان بہن! خدا تم کو شاد آباد رکھے۔ آمین۔ تمہارے دو محبت نامے وصول ہوئے۔ معاف کرنا جواب میں بہت تاخیر ہوئی۔ پہلے خط کا جواب لکھا اور بھیجا تو میری بدقسمتی کہ تم کو نہیں ملا۔ میں آج کل ذرا مصروف اور زیادہ پریشان رہتا ہوں اسلئے جواب میں تاخیر ہو گئی مجھے اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ میرا خط نہ جانے سے تم کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن اچھی نگہت! بالیقین مانو کہ تمہاری یاد ہر وقت رہتی ہے۔ گھر میں تو سناٹا ہو ہی گیا ہے لیکن زیادہ تکلیف تو اس سناٹے سے ہے جو میرے دل ویران میں بسا ہے۔ میرا سرمایۂ زندگی اور حلقۂ مسرت بہت محدود تھا ہی اور پھر اس پہ تمہاری جدائی یقین مانو کہ اس سرمایہ زندگی کو صفر اور اس حلقۂ مسرت کو نقطہ بنا رہی ہے۔

زندگی نام ہے مِل مِل کے جدا ہونے کا،
اس لئے اس جدائی کو اصل زندگی سمجھو۔ اور اس زندگی پر خدا کی شاکر رہو۔ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت دعا ہے کہ تمہارے "فرض" کو خوشگوار تر بناتا رہے۔ کیونکہ فرض ہی زندگی ہے تم نے وہ مشہور مقولہ سنا ہوگا۔

I slept and dreamed
that life is beauty.
I awake and saw
that life is duty.

واقعی بھی یہی ہے۔ انسان زندگی کو تصور میں حسن ہی سمجھتا ہے لیکن در اصل زندگی فرض اور ادائیگی فرض کا نام ہے۔ تمہارا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی نہ صرف اس لئے کہ وہ تمہارا خط تھا بلکہ اس لئے اور زیادہ کہ وہ عقل و سمجھ کا آئینہ بھی تھا خدا تم کو خوش رکھے۔ میں نے اپنی امیدوں کے

مطابق بلکہ اس سے بھی زیادہ سمجھدار تم کو پایا تم کو دیکھنے کے لئے بے اختیار جی چاہ رہا ہے۔ ارادہ ہوا ہے کہ ایک روز کے لئے (کیونکہ اس سے زیادہ مجھے موقع نہیں) تمہارے پاس آؤں۔ میرا خیال ہے کہ تبدیل آب و ہوا کا تمہاری صحت پر اچھا اثر ہوا ہوگا۔ اس لئے ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ تم ابھی کچھ دن اور رہو تو اچھا ہے۔ دیہات کی آب و ہوا شہر کی نسبت اچھی ہوتی ہے اور پھر اس کے علاوہ تمہارے وہاں رہنے سے تمہارے شریک زندگی کو بھی آرام ہوگا۔ نگہت! عورت کی زندگی کا کم از کم ہر مسلمان کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس سے اس کے شوہر کی ذات کو آرام پہنچے۔ کیونکہ ہمارے مذہب نے شوہر کا درجہ اتنا بڑا رکھا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اگر خدا کے بعد کسی کو سجدہ واجب ہوتا تو میں کہتا کہ بیویاں اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ اس سے تم یہ آسانی اندازہ لگا سکتی ہو کہ شوہر کا درجہ کتنا بڑا ہے اور پھر بیوی کی اطاعت گذاری شوہر کو بار بار یہ یاد دلاتی رہے گی کہ قرآن نے کہا ہے کہ "عورت مرد کا لباس ہے اور مرد عورت کا لباس ہے"۔ یعنی عورت اور مرد مساوی درجہ رکھتے ہیں اور عورتوں کو بھی مردوں کی طرح دل ہوتا ہے اور اس دل میں آرزوئیں اور تمنائیں بھی ہوتی ہیں۔

جب اس آیت کا خیال عورت کی اطاعت سے، مرد کے دل میں آئے گا اگر مرد خدا پرست ہے تو یقین جانو کہ وہ اپنی بیوی کے احساسات کی ویسی ہی قدر کریگا جیسے خود اپنے احساسات کی کرتا ہے۔ اس طرح باہمی خیال و لحاظ دائمی محبت کا باعث ہوگا۔ آپا نے بغیر مجھ سے پوچھے تمہارے بلانے کو لکھدیا تھا ورنہ میں نہ لکھنے دیتا۔ اس لئے نہیں کہ میرا دل تم کو دیکھنے کو نہیں چاہتا بلکہ اس لئے کہ اگر تم اپنے شوہر کو خوش رکھوگی تو خدا تم سے خوش ہوگا۔ نگہت! تم خود سمجھدار ہو۔ اس لئے میں اس بارے میں زیادہ نہیں لکھنا چاہتا۔ اپنے شریک زندگی کو میرا سلام کہہ دینا بلکہ بہتر یہ ہے کہ یہ خط انہیں پڑھنے کو دیدینا۔ اچھا پیاری بہن زیادہ دعا۔ دعاگو تمہارا بھائی۔ نعیم

رخصتی

مسز عبد القدیر ثمر (لنگسنگور)

عزیز بیٹی - خدا تمھیں تمھاری مسرتوں کے ساتھ سلامت رکھے اور نظر بد سے بچائے - وہ الفاظ جو بارہا لب تک آ کر رہ گئے آج انہیں صفحہ دل سے نکال تمھارے سامنے پیش کر رہی ہوں - سنو اور غور سے سنو - ان الفاظ کو اپنے دل کی گہرائیوں تک جگہ دینا ممکن ہے آئندہ زندگی کے سنوارنے میں ان سے کچھ مدد ملجائے لو آج (۱۶) برس کے بعد اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ کر ہم تم کو اپنے سے جدا کرتے ہیں - در اصل اس کو جدائی نہ سمجھو اگرچہ ناگوار ہے دل نہیں مانتا لیکن تم جس فرض کی انجام دہی کے لئے جدا ہو رہی ہو، اس کا تصور بھی جدائی کی تلخ گھڑیوں کو شربت کے گھونٹ بنا دیتا ہے در اصل ابتک تم ہماری مہمان تھیں اور ہم لوگ صرف تمھارے میزبان تھے اور تمھارا اتنا ہی خیال رکھتے تھے جتنا کہ ایک میزبان ایک بے تکلف مہمان کا - اب خیر سے تم اپنے گھر سدھار رہی ہو - یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ تمھیں ایک نیک اور محمود صفات شوہر ملا ہے اس پر تم جس قدر بھی ناز کرو اور خدا کا شکر ادا کرو کم ہے - اب تمھارے شوہر تمھارے حقیقی خیر طلب ہیں وہ جس طرح تمھاری خاطر مدارات کریں گے ہم نہ کر سکے -

وہ تمھارے ہیں اور تم ان کی ہو - آج تک جس طرح بھی بن سکا ہم نے تمھاری بری بھلی خدمت انجام دی اور اب خدا کی رحمت سے تم مہمان سرائے سے نکل کر اپنے گھر جا رہی ہو، تم کو اپنے گھر کی بہبودی اور شوہر کا اتنا ہی خیال ہونا چاہیئے جتنا تمھارے شوہر کو تمھارا - چونکہ تمھیں رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا ہے - اس لئے اپنے شوہر کی ہر خوشی کو اپنی خوشی اور ان کی ہر تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنا تمھارا فرض ہوگا اور فی الحقیقت تمھاری نیک نیتی، تن دہی، اور شوہر کی خدمت کا صلہ دنیا و آخرت ہر دو جگہ ملے گا -

لخت جگر - اب تم پر فرائض اور ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اور احساس فرائض کا نام ہی انسانیت ہے اور یہی مقصد حیات ہے - دوسرے معنوں میں بھی اب تم بجائے لڑکی کے عورت، بیوی، بیگم کہلانے کی مستحق ہو گئی ہو - یہ تغیر کوئی معمولی بات نہیں بلکہ اس میں بڑے بڑے انقلابات پوشیدہ ہیں - اگر سچ پوچھو تو تمھاری زندگی آج سے شروع ہوتی ہے - ہر عورت کو دنیا میں ایک بہترین بیٹی، بہن، بیوی، اور ماں کی حیثیت سے گزارنا ہوتا ہے - تم نے اولین

دو فرائض بحیثیت بیٹی اور بہن نہایت اچھی طرح انجام دئے جس کی ہمیں نہ صرف مسرت ہے بلکہ اس کی یاد بھی زندگی بھر ہمارے دل میں رہے گی تمہاری جدائی اگرچہ شاق گزر رہی ہے لیکن اے میری نور نظر ہمارے آنسوؤں کو وفور مسرت کے آنسو سمجھو۔ تم نے اپنی دو کامیاب حیثیتوں سے گذر کر اب تیسری میں قدم رکھا ہے اور یہ بیوی کی ہے جو نہایت ہی اہم ہے اب تمھیں ایک وفادار، اطاعت شعار بیوی کے فرائض انجام دینے ہوں گے جس میں اہم چیز شوہر کے مزاج کا پانا ہے۔ کام مشکل ضرور ہے۔ مگر ذرا سے غور و فکر اور مشاہدہ کے بعد تم آسانی سے اندازہ لگا سکتی ہو۔ تم ان کی ہر حرکت یعنی نشست و برخواست طرز گفتگو وغیرہ سے بآسانی مزاج کا مشاہدہ کر لوگی اور پھر اگر تم اُن کے رنگ میں رنگ جاؤ گی یعنی وہ جس چیز کو پسند کرتے ہیں تم بھی پسند کرو اور ان کی غیر پسندیدگی کو اپنی نہ پسندیدگی سمجھو اور اپنے شوہر کے ہر حکم کو بجا لاؤ۔ مرد کے رتبہ کو تم جانتی ہو کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو خدا حکم دیتا کہ عورتیں اپنے شوہر کو سجدہ کریں۔ ان چیزوں کے پیش نظر تم کو چاہیئے کہ اپنے کسی بات سے یہ نہ ظاہر ہونے دو کہ تم کسی طرح اُن کی تحقیر کر رہی ہو اور نہ یہ کہ ان کی قدر نہیں کرتیں اور پھر دیکھو تمہاری زندگی کیسی خوشگوار رہتی ہے بقول کسے "انسان اپنی قسمت کا آپ بنانیوالا ہے"

جو در اصل حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ صرف تمہارے ہاتھ ہے چاہے اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی خوشگوار بنا لو چاہے مصیبتوں سے پُر۔ ذرا سے سلیقہ اور عقلمندی سے تم اپنی چھوٹی سی سلطنت پر بحیثیت ملکہ راج کرو گی۔ اور اپنا گھر جنت بنا لوگی۔ زندگی نام ہے امتحان کا۔ یہاں مصیبت و آلام بھی ہوں گے اور رنج و غم بھی۔ خدا صابرین کے ساتھ ہے۔ صبر کرنا۔ خبردار کبھی ہراسان نہ ہونا اور استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دینا میں کوئی مصیبت ایسی نہیں جو ٹل نہ جائے۔ ذرا ہمت سے کام لینا اور بیڑا پار۔ تم مسلمان ہو، جانتی ہو کہ سروں پر ایک ایسی نگران ہستی موجود ہے جو ہر وقت ہر طرح کی مدد کے لئے تیار ہے بوقت مصیبت خاص طور پر، اور بوقت آسائش شکرانہ کے ساتھ اس کی بارگاہ میں سر نیاز جھکا دیا کرو اور دعا مانگو۔ کوئی وجہ نہیں کہ تمہاری دعا قبول نہ ہو۔ اپنے گھرانے کے ان عورتوں کی مثالیں پیش نظر رکھنا جنھوں نے عالی حوصلگی سے ہر مصیبت کا مقابلہ کیا اور اپنا گھر جنت بنا لیا۔

ہر کام شروع کرنے سے قبل ذرا سوچ لیا کرو۔ عجلت اور غصہ میں کچھ کر نہ بیٹھنا عموماً آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں سسرال جاتے ہی وہاں کے بسنے والوں کو اپنی طبیعت کے موافق بنانے اور ان پر حکومت کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو آئے دن کے مشاہدات سے ظاہر ہے۔ در اصل یہ ان کی نادانی ہے

عزیز بیٹی تم ہرگز ایسا نہ کرنا بلکہ تمہاری کوشش یہ ہو کہ تم خود اپنے آپ کو ان سب کی طبیعتوں میں گم کر دو اور یہ بہترین چیز ہے جس کی وجہ تم سب کے دل میں گھر کر سکتی ہو۔ اس وقت سب تمہارا کہا مانیں گے اور تمہیں عزیز رکھیں گے اور یہ گھر جس سے تمہیں ایک گھبراہٹ سی ہو رہی ہے تمہارے لئے باعث رحمت بن جائیگا۔

ممکن ہے تمہیں پردیس بیاہی جانے کا رنج ہو، مگر بیٹی بات یہ ہے کہ ماں باپ، بھائی، بہن کا گھر تمہارا گھر نہیں۔ تمہارا حقیقی گھر در اصل شوہر کا گھر ہے اس لحاظ سے تم ابتک پردیس میں تھیں اب اپنے گھر جا رہی ہو جو جو باتیں تمھیں حاصل نہیں اس کا غم نہ کرو اور جو حاصل ہیں ان پر فخر کرو اور شکر خالق ادا کرو۔ خود پسندی کس کام کی۔ ذرا غور تو کرو ہزاروں تمہاری بہنیں ایسی ہیں جو یہ نہیں جانتیں کہ آرام کیا چیز ہے۔ دن بھر گھاس کھودنا۔ چکی پیسنا۔ ساتھ ساتھ سارے گھر کا انتظام کرنا۔ میاں کی خدمت۔ ساس سسرے کی الگ ناز برداری۔ لاکھوں ایسی ہیں جن پر راتوں کی نیند حرام جن کی چھاتی پر سوکنیں مونگ دلتی ہیں جو شوہروں کی جوتیاں کھاتی ہیں۔ گھر کا کام لونڈیوں کی طرح انجام دیتی ہیں اور خوش رہتی ہیں کتنی تمہاری بہنیں ایسی ہیں جن کا پالا نکھٹو شوہروں کے ساتھ پڑتا ہے اور وہ بیچاریاں سر پر برقعہ ڈالے گلی کوچوں میں بھیک مانگتی پھرتی ہیں۔ یہ سب کیوں؟ اسلئے کہ اپنی جان سے زیادہ عزیز اولاد اور اپنے شوہر کی خاطر داری سمجھتی ہیں۔

عزیز بیٹی، دولہے والے تمہاری رخصتی کے لئے عجلت کر رہے ہیں وقت تنگ ہے اسلئے اس آخری بات کا خاص طور پر خیال رکھنا وہ یہ کہ تم اس گھر کی چشم و چراغ ہو جس کا سلیقہ اور حسن انتظام مشہور ہے اسلئے خبردار کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے خاندان کے نام و نمود پر آنچ آئے۔ اچھا جاؤ تمہیں خدا کے حفظ و امان میں دیا۔ ہم سب تمہارے لئے بدست بدعا ہیں اور درد بھرے دل سے تمہیں رخصت کرتے ہیں۔

سینما اور بچہ گھر

مس ریٹا کرسٹ جی (حیدرآباد)

خواتین کیلئے حیدرآباد میں لے دیکے تفریح کیلئے سینما ہی ایک مرکز ہے لیکن اس کا یہ حال ہے کہ گھر کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر کبھی تھوڑی دیر کیلئے جی بہلانے کی غرض سے سینما جایئے تو سب سے پہلے جن سے آپ کو سابقہ پڑے گا وہ ننھوں کی چیخ ہوگی جو بن بلائے سینما ہال میں موجود رہتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ پردے پر کوئی اچھا سا گانا ہو رہا ہے یا کوئی دلچسپ مکالمہ شروع ہوا کہ کسی کونے سے ایک ننھے نے داد دی ابھی یہ داد ختم ہوئی نہ تھی کہ دوسرے جانب سے ایک نالہ بلند ہوتا ہے ایک اور صاحبزادے رونے لگے بازی شروع کی جب یہ بحر طویل ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی تو پھر چاروں طرف سے ہش ہش اور خاموش کی بیداد بلند ہوتی ہے۔ مائیں بیچاریاں ان ننھی جانوں کو چپ کرانے میں مصروف ہو جاتی ہیں لیکن کیا مجال کہ یہ مخلوق قابو میں آسکے۔ ان کی پیہم آہ و بکا اور دوسرے تماش بینوں کی چیخ و پکار سے وہ ہڑ بونگ مچتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ان ننھوں سمیت سینما کی چھت پر سے نیچے کود پڑیں۔ غرض ایسے ہنگاموں سے روزانہ سابقہ پڑتا ہے اور کبھی کوئی شو اطمینان سے دیکھنا نصیب نہیں ہوتا

اس روحانی اذیت کا انسداد بجز اس کے ناممکن ہے کہ جس طرح سینماؤں میں سیکلوں کی حفاظت کا انتظام ہوتا ہے بچوں کی نگرانی کا بند وبست کیوں نہ کیا جائے یعنی سینما کے احاطہ میں کوئی جگہ محفوظ کر دی جائے جہاں یہ ننھی فوج اپنی من مانی نشانہ بازی کے لئے چھوڑ دی جائے ان کی نگرانی کے لئے چند آیائیں اور ایک دو منتظمین بھی مقرر ہونا چاہئے۔ شیر خواروں کیلئے جھولے نیز دودھ بسکٹ کا بھی انتظام کیا جانا مناسب ہے اور جو بچے بڑے ہوں ان کیلئے کھلونے وغیرہ رکھے جائیں۔

لیکن اس امر کی احتیاط ضروری ہے کہ منتظمین محبت اور پیار کے عادی ہوں ورنہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ چلیگا کیونکہ جو مخلوق اپنی ماؤں کے قابو میں نہیں آتی وہ غیروں کی کیا پروا کر سکتی ہے اسلئے ممکن ہے کہ منتظمین ان کو چپت لگا بیٹھیں یا جھولے میں ڈال کر کھینچنے کے لئے چھوڑ دیں یا بہت بھاگ دوڑ کرنیوالے بچوں کی ٹانگوں میں ڈوری باندھ کر کھونٹے سے باندھ دیں۔ آیائیں بھی قابل بھروسہ رکھی جائیں تاکہ ضدی اور رونے والے بچوں کو بہلا سکیں ایسا نہ ہو کہ خاندانی علاج یعنی افیون کھلا کر سلا دیں تاکہ گھر جا کر بھی سوتے بچے ہوشیار ہونے کا نام نہ لیں گر اس کے

3238
REGD. M. No.

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۲۲)

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون حیدر آباد سے شائع ہوا۔


ماہنامہ
شہاب

شہاب

جلد ۱۳ خورداد ۱۳۵۴ف م اپریل ۱۹۴۵ء نمبر ۷

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (عہ)

ملکہ میری

جناب سردار کریم نواز خان صاحب ایم۔ اے

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علتہائے ما!

اے دوائے نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما

سوانح و حوادث، عجائب تصادفات، نیرنگیٔ انقلاب، حسن و عشق کی کرشمہ سازی، جذبات متضادہ و متبائینہ کی کشائش اور قلمرو حسن و نزاکت اگر عالم سیف و سنان کی آویزش سے تاریخ و وقائع کے صفحات رنگین رہے ہیں۔

زندگی کو اگر سانس کی آمد و رفتِ محض سے عبارت کو یا جائے اور دل کی دھڑکن، تنفس کی تیزی اور نگاہوں کی خیرگی کے جلوے اس سے چھین لئے جائیں تو دنیا اپنے جذب و کیف سے محروم اور عالم اپنی زیب و زینت سے مجبور ہو جائے۔ ایک انسان زندگی میں سب کچھ حاصل کرے لیکن اگر اُس کا دل ایک عورت کی چشم التفات سے بیگانہ، اس کی آنکھیں ایک اشک دادِجو کی تراوش سے بے نیاز۔ اُس کی جیب زیاں درد اور کسک کے متاع بے بہا سے ناآشنا ہے تو اُس کی زندگی سزاوار ماتم۔

ارسطو اگر شرم و حیا کے واردات واثرات کا فلسفہ مرتب کرتا تو دس ضخیم جلدیں لکھ جاتا جب بھی دنیا اُس کی حقیقت سے بیگانہ رہتی۔ لیکن کسی کے چہرۂ محجوب اور نگاہ شرمگیں کا ایک نظارہ سب کچھ سمجھا دیتا ہے اور حقائق حسن و عشق کے وہ اسرار و غوامض خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو دنیا بھر کے حکیموں اور فلسفیوں کی زبانیں مل کر بھی حل نہیں کرسکتیں۔

آپ کے نزدیک علم البرق کا سب سے بڑا ماہر وہ ہے جس نے کسی وسیع علمی عمارت کے اندر بڑی بڑی کتابیں اور بڑے بڑے آلات دیکھے ہوں لیکن میری نظر میں اس کی حقیقت اس خوش نصیب سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا جسے کسی جمال آتشیں کی ناگہانی جلوہ تابی کے نظارہ کا بار بار موقع ملا ہے اور ہمیشہ اس کے خرمن صبر و شکیب پر بجلیاں گرتی رہی ہیں۔

نہ دانم تا چہ برقِ فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم تصور کردہ ام بگسستن بندِ نقابش را

عالمِ جذبات و حسیات کے صدہا مطالب ہیں جنھیں ہزار ہا صفحات پر پھیلا کر لکھئے جب بھی سمٹ نہیں سکتے لیکن اگر ایک سیمائے گویا، ایک چشمِ سخنور، ایک نگہ ناطق، ایک غمزۂ معنی طراز، ایک جمالِ فکر اندیش سامنے آجائے تو اُن کے درس و فہم کے لئے صرف ایک لمحۂ نظارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم۔

حسن و عشق کی ہر زندگی کے لئے محبت کی پہلی غلطی ہمیشہ دردناک رہی ہے اور اس راہ میں جب کبھی ٹھوکر لگتی ہے تو پہلے ہی قدم کو لگتی ہے۔ ع طفلِ نادانم و اول سبق است

(۱)

ملکہ میری آف سکاٹ لینڈ کے دلِ عشق خواہ کے لئے بھی اس کی پہلی غلطی کی یاد زخمِ حسرت بنی اور اس کی تلافی کے لئے جس قدر مرہم بنے اس راہ کی پہلی غلطی ہمیشہ لاعلاج ثابت ہوئی اور مداوا کی ہر تدبیر اس گھاؤ کو گہرا کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ اور ہر نیا قدم ایک نئی ٹھوکر اور نئے زخم کا سرمایہ دار۔ اور پھر جب یہ زخم گہرے ہو جائیں تو اس کا علاج کنجِ مرقد۔

یہی راہِ عشق کی ٹھوکریں تھیں جنھوں نے بالآخر ملکہ کے خون سے جلاد کے ہاتھوں کو رنگین کرایا حالانکہ کتنے ہی مجرمانِ عشق اور گنہگارانِ محبت ہوں گے جنھوں نے اس قہرمانِ ناز و عشوہ کے سامنے اپنی زندگی کا آخری فیصلہ سُننے کے لئے سر جھکایا ہوگا۔

(۲)

اب سے کوئی چار سو سال پہلے کا واقعہ ہے کہ افقِ حسن و شباب پر ایک شہابِ ثاقب نمودار ہوا جیمز پنجم شاہِ سکاٹ لینڈ کی یہ بیٹی ابھی سات ہی یوم کی تھی کہ سنہ ۱۵۴۲ء میں باپ کے سایہ سے محروم ہوگئی۔ جب اس نے بہارِ حسن کی انیسویں منزل میں آنکھ کھولی تو اس نے اپنے گرد و پیش چاہنے والوں کے ایک ہجوم کو دیکھا۔ ایک نو دمیدہ پھول اس کے برقِ حسن کے پہلے تصادم میں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر چکا۔ مگر بارگاہِ حسن میں محبت کا یہ پہلا چڑھاوا - ازدواجی زندگی کا یہ پہلا صدمہ ملکہ پر کچھ گراں نہ تھا۔ جب کہ ایک جنازہ ارمانوں کا - ایک میت آرزوؤں کی یوں بھی تو ہر روز اس کے کوچے سے نکلتی تھی

(۳)

تماند ناز شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

لارڈ ڈارن لی LORD DARNLEY ملکہ کا پھوپی زاد بھائی اوس کے ناوک نظر کا دہرا صید زبون تھا۔ یہ ۱۶؍ فروری ۱۵۶۱ء میں ملکہ الزبتھ کے وسیلہ سے تقرب کا متمنی ہوا۔ اور ملکہ الزبتھ کی چٹھی لے کر سکاٹ لینڈ وارد ہوا۔ ملکہ میری مروت سے پیش آئی مگر شاہانہ وقار و تمکنت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ ایسے بے لگاؤ تعلق سے ملی کہ ڈارن لی کی آتش شوق نے اس کی کائنات صبر و شکیب کو خاکستر کر دیا۔ گو ڈارن لی امرا کے زمرہ میں شامل ہو چکا تھا مگر حاکم و محکوم کی نسبتوں کے پردے ایسے گراں تھے کہ ان کو ہٹا کر بے حجابی کی منزل تک پہنچنا کچھ آسان نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہوتے ہوتے ایک دن ڈارن لی کو عرض مدعا کا موقع مل گیا۔ ملکہ میری پہلے تو کچھ برہم ہوئی مگر کون نہیں جانتا کہ عورت اس قدر ادعائے ہوشمندی کے باوصف اپنی منفعل خلقت کے تصدق مرد کے پُر فریب اور دلخراش حملوں کی برداشت سے عاجز ہے۔ سب سے زیادہ کامیاب حملہ عورت کی جناب میں مرد کا "فریب محبت" ہے۔ آخری مئی ۱۵۶۵ء کو ڈارن لی اور ملکہ میری ازدواجی سلک میں منسلک ہو گئے اور منزل حجاب کی وسعتیں اپنی تمام پہنائیوں کے باوجود محبت کی آغوش میں سمٹ کر رہ گئیں۔

ڈارن لی کے منظر عام پر آنے سے پہلے ملکہ کی جوانی اپنے گرد و پیش ایسے ہی عاشقوں کا ہجوم اور ایسی ہی عرضیوں اور درخواستوں کا انبار رکھتی تھی اور اس کے چاروں طرف ایسے جانبازوں کا جمگھٹ تھا جو ہر وقت ازمنۂ قیس کی تجدید پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اپنی امیدوں کے خزینہ کو ڈارن لی کے دست تصرف میں دیکھ کر اُن کی آتش انتقام بھڑک اٹھی۔ محبت جب انتقام کی سرحد پر پہنچ جاتی ہے تو بارہا ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک گدائے رہگذر کا دست جنون والی سلطنت کے دامن سے جا الجھا ہے۔ سامان مخالفت جمع ہو گئے۔ ڈارن لی نے چاہا کہ زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ مگر ملکہ نے منظور نہ کیا۔

"تیزی سے بھڑکنے والی شمع ہمیشہ سرعت سے گل ہو جاتی ہے" جس محبت کا آغاز اس شورا شوری سے ہوا تھا۔ بہار حسن کی خوشہ چینی کے بعد وہ بے نمک ہو چکی تھی۔ باب حسن کے تاراج کے بعد طلسم محبت ٹوٹ چکا تھا۔ اب ملکہ ڈارن لی کی نظر میں ایک بے آب موتی۔ ایک ظرف فریب تھا۔

ایک لٹا ہوا کاروانِ شباب، ایک فسوخ عنوان عشرت تھی۔ ڈارن لی کے دل میں ملکہ کے انکار نے رہی سہی محبت کو نفرت سے بدل دیا۔

عورت دنیا میں سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔ عسرت۔ تنگدستی۔ مصیبت اور غم نکبت اور الم۔ ہاں وہ اطلس، دیبا کے لباس کے باوجود بھی خوش رہ سکتی ہے۔ سوکھی روٹی کے ٹکڑے پر بھی قناعت کر لیتی ہے۔ اپنی اولاد اور عزیزوں کے صدموں کو بھی برداشت کر لیتی ہے اور پھر بھی خوش رہ سکتی ہے۔ اگر اس کا خاوند اس سے محبت رکھے۔ آسکر وائیلڈ نے کہا ہے کہ "عورت اپنا بہترین ذخیرۂ حیات مرد کو دیدیتی ہے مگر اس کے بدلہ میں وہ ویسی ہی جنس گرانمایہ اس سے چاہتی ہے" وہ دل ہے، وہ وفائے جنسی ہے، وہ شرافت عہد ہے، وہ حسن مبادلہ ہے۔ وہ مرد کی محبت ہے اور جب وہ اس سے محروم ہو جائے تو پھر یا تو وہ اپنے سرنگوں افتدار اور برباد وقار کی نوحہ خوانی میں مرقدِ شعور شباب بن کر رہ جائے اور یا شاہراہ زندگی کی کسی ایسی الجھی روش پر پڑ جاتی ہے جس کے خارزار آبلہ پائی کا سرمایہ ہیں اور انہیں کانٹوں سے وہ اپنا دامن عصمت بھر لیتی ہے۔

ملکۂ میری اس قماش کی خاتون نہ تھی جو اپنی خوبصورت آنکھوں کے جھکاؤ میں اپنے تمام فتنہ ہائے حسین دفن کر دے۔ اور پھر جب ماحول ایسا ہو کہ "ذرا مسکرا دئے منت باغبان سے چھٹکارا مل گیا۔ پوچھ لیا جنتِ نگاہ اور فردوس گوش ہو گئے" رفتہ رفتہ ملکہ نے بھی اپنے لئے "وظائف شباب" اور معمولاتِ جوانی ڈھونڈھ لئے اور محلہ کے پوشیدہ خلوت خانے اور غیر آباد روشیں گلپوش ہونے لگیں۔

(۴)

ایک بھرپور جوانی اور نظر افروز شباب اگر ایک مطلق العنان سلطنت کی ملکہ کا خمیر حیات ہو جائیں تو اس آسمان کے نیچے کتنے فتنے ہیں جو آنے والے محشر سے پہلے ایک قیامت اس دنیا کے اوپر پیدا نہ کر دیں گے پھر جب ملکہ کے حسن کی شہرتیں سائیکی کے حسن طلسم بند کی طرح ایک کیوپڈ کی دعوت ہو رہی ہوں۔

ملکہ اب ڈیوڈ رزیو اپنے ایک سکرٹری پر دل جا کر متوجہ ہوئی۔ رزیو جوان تھا خوبصورت تھا اور پھر موسیقی کا ماہر تھا حسن و جوانی یوں بھی تو ایک قیامت ہے کیا کم ہیں اس پر موسیقی کا سحر۔ غرض کوئی کہاں تک کہے۔ شبہائے عیش و امتحان کی اس مفروضہ داستان کو جس میں ملکہ اور رزیو باہم

لذت گیر شباب و شعر ہوئے ہوں اور ہنگامی ولولوں سے اپنے جوش کے بار کو سبکدوش عصمت کیا ہو، کوئی بیان بھی کرے تو کیونکر۔ ہاں امفروضہ کیونکہ خلوت خانوں کے دہلیز کے تاورا تاریخ کے ابواب نے ظن۔ قیاس اور تخمین کا سہارا لیا ہے۔

ملکہ کی بے پناہ عنایتوں نے ڈارن لی کے دل میں رقیبانہ جوش پیدا کر دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اسے سلطنت نہ ملنے کا باعث یہی رزیو ہے۔ اب لارڈ نے ملکہ کے دشمنوں کو اپنے ساتھ ملا یا۔ ان کی تعداد کچھ کم بھی نہ تھی۔ آخر ایک پھول کتنوں کا زیب گلو ہو سکتا تھا۔ ۹ مارچ ۱۵۶۶ء کی شام کو ہفتہ کے روز (۵۰۰) آدمیوں نے ہولی روڈ پیلس کو محاصرہ میں لے لیا۔ ۱۴۰ آدمی محل کے اندر گھس گئے۔ ملکہ اپنے سوتیلے بھائی۔ رزیو اور چند دیگر افراد کے ہمراہ اپنے کمرہ میں بیٹھی تھی۔ ڈارن لی ملکہ کے پاس بیٹھ گیا اور پیار سے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے۔ اتنے میں مہیب اور دیو پیکر لارڈ رتھ ون (R W T H V E N.) ذرہ پہنے کمرہ میں داخل ہوا۔ ملکہ نے اسے بلا اجازت مداخلت پر سخت سست کہا۔ اتنے میں کئی آدمی ننگی تلواریں لے کر کمرہ میں گھس آئے۔ ملکہ چھ ماہ کی حاملہ تھی۔ کمرہ میں کشمکش شروع ہو گئی۔ میز الٹ کر ملکہ پر جا گری۔ رتھ ون نے للکار کر کہا کہ ہمیں ملکہ سے کوئی سروکار نہیں۔ رزیو سے انتقام لینا مقصود ہے۔ رزیو نے ملکہ کی آڑ لی۔ اور گون پکڑ کر انصاف کا ملتجی ہوا۔ ملکہ کچھ بولنے پائی تھی کہ کرآف فالڈن سائیڈ KER OF FOLDANSIDE نے ریوالور نکال کر ملکہ سے کہا کہ اگر رزیو کے حق میں ایک لفظ نکلا تو گولی ملکہ کی چھاتی میں ٹھنڈی ہو گی۔ ڈارن لی نے ملکہ کو پکڑ کر رزیو سے علٰحدہ کر دیا اور جارج ڈگلس نے ڈارن لی کا خنجر کھینچ کر رزیو کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اور پھر اسے سیڑھیوں سے گھسیٹ کر نیچے لے گئے۔ رگڑ ون اور گھسیٹ کے نشانوں کے علاوہ رزیو کے جسم پر (۲۶) تلوار کے زخم تھے۔ اس کی لاش کو عریاں کر کے بے عزتی سے پھینک دیا اور بالآخر ملکہ کے حکم سے شاہی قبرستان میں دفن ہوا۔

(۵)

ملکہ نے ڈارن لی سے بظاہر محبت اور پیار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور اسے یقین دلایا کہ رزیو کے قتل کی سازش میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا مگر اس تصنع کے در پردہ اپنے انتقام کو ہوا دیتی رہی۔ ۱۹ جون ۱۵۶۶ء کو ملکہ کو لڑکا پیدا ہوا جو جیمز ششم کہلایا۔ خفیہ طور پر ایک ایلچی کے ذریعہ

پاپائے روم کے پاس طلاق لینے کی سعی کی جو نامشکور رہی۔

جس خمیر میں سیماب کی تڑپ اور شباب کی بے تابی ودیعت کر دی گئی ہو، جس سرشت کو التہاب جوانی کا حصہ بقدر ظرف نہیں بقدر تمنا ملا ہو۔ جس زندگی میں حدت خون سیوا اور جس کے گرد میں تحریک شباب باندازہ ہوس ہو اُس قربان گاہ پر ایک بھینٹ ولولوں کو کیا سرد کرے گی۔ پھر جب عمر ابھی چو بیسویں بہار کی پُرفریب منزل میں ہو اور سربکف جانبازوں کے ایک طویل صف سامنے کھڑی ہو۔ جن کی کارگاہ الفت و التہاب کا تمام تر دار و مدار ان گلابی ہونٹوں کی حسین مسکراہٹ اور ان پھر کتی ہوئی آنکھوں کی بے تاب کن جنبش پر ہو۔

رزیو کی یاد اس کی نعش کے ساتھ قبر میں دفن ہو چکی تھی صرف انتقام کی ہوس باقی تھی اور وہ بھی شاید کسی جذب محبت کی تحریک کے زیر اثر نہ ہو۔ صرف ڈارن لی کے خلاف نفرت کے جذبات کو مشتعل رکھنے کا وسیلہ۔ اگر طہارت ذوق روک تھام بھی کرے تو ادھر شباب ہے کہ روٹھ جانے پر تلا ہے اور پھر جب پاکیزگی کی تکمیل کے لئے تو پیری کا سجادہ مل ہی رہے گا اور جوانی گریز پا ہو۔ اب پھر امیدواروں کا ہجوم۔ طلب گاروں کا انبوہ۔ عشق کی فریادیں۔ حسن کی خود داریاں۔ سوسائٹی کے لئے روز بازار رد و قبول کا ہنگامہ گرم اور مسابقت اور رقابت کی کشمکش کی صلائے عام تھی۔

بالآخر اس معرکہ عظیم میں بوتھویل (BOTHWELL) اپنی فتحمندی سے محسودانہ بازی لے گیا۔ اب بوتھویل کی جوانی ممنون نوازش تھی اور رزیو کے پامال گلزار بوتھویل کی تسکین ہوس کا سامان بنے۔ جوان ارمانوں اور جوان عریانیوں کی منظر رو مالک ملکہ تہذیب نفسی کی آزادیوں میں بیباک تلاش تھی۔ بوتھویل بھی ہولی روڈ ہی کے رہنے والا تھا جہاں ملکہ کا قیام تھا۔ بعد مکانی کی حدیں سمٹ چکی تھیں اور عشرت امروز کو امید فردا پر ٹالنے والے رندوں کی محفل میں محروم دانش متصور ہوتے ہیں۔ جب زندگی کا ایک قدم راستی کی شاہراہ سے ہٹ جائے تو پھر سنبھل کر پلٹنا سُننے میں نہیں آیا۔ بیع سے قبل برتنا مکروہ وگناہ پرانا فلسفہ تھا۔ یہاں پر بقدر ضرورت کی زبان میں پرکھنا معمول۔

(۹)

ملکہ نے اب ڈارن لی کو اپنے راستہ سے ہٹانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور اسے بلا لیا۔ ایک ہفتہ مہمان رکھا۔

پھر وہ گلاسگو چلا گیا۔ ۲۴ جنوری کو خود ملکہ اڈنبرا سے گلاسگو گئی اور ۳۱ جنوری کو اسے واپس لائی۔ مورے MORAY. مورٹن MORTON. میٹ لینڈ MAITLAND. بوتھویل اور ملکہ کے ساتھ شریک سازش تھے۔ ڈارن لی کے قیام کے لئے کرک آف فیلڈ KIRK OF FIELD. کا مکان تجویز کیا گیا۔ قتل کی رات ملکہ نے ڈارن لی سے اظہار محبت میں بیش از بیش تصنع کیا اور وہ رات اس کے ساتھ بسر کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر ہولی روڈ پر ایک سہیلی کی تقریب میں شرکت کا بہانہ کرکے چلی گئی۔ ڈارن لی کی قسمت میں زندگی کی وہ آخری رات تھی۔ صبح کو بارود کا دھماکا ہوا۔ مکان بارود سے اڑ گیا۔ اور ڈارن کی جھلسی ہوئی لاش باغیچہ میں پائی گئی۔ مکر کو مکر سے جیتا گیا۔ فریب کو فریب سے شکست دی گئی۔ پریوی کونسل نے نعش کا معائنہ کیا۔ جرم کی تفتیش ہوئی اور بوتھویل مجرم گردانا گیا مگر کتنے مجرم ہیں جو مصلحتوں کی پناہ میں محروم پاداش رہتے ہیں اور کتنے بیگناہ ہیں جو تدبیر سلطنت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ملکہ سو خدمت گاروں کے ہمراہ سیٹن ہوس چلی گئی اور پھر وہی جوانی صرف معمولات رہی اور ہوس و طائف شباب میں مصروف۔ ۲۱ اپریل کو ملکہ ہولی روڈ سے اپنے بچے کو سٹرلنگ پیلس میں دیکھنے کے لئے گئی۔ ۲۴ اپریل کو واپسی کے وقت آمن برج ALMOND BRIDGE. کے قریب اڈنبرا سے چھ میل کے فاصلہ پر بوتھویل نے ۸ سو سواروں کے ہمراہ ملکہ کو گھیر لیا اور زبردستی قلعہ ڈنبار میں لے گیا۔

اس آغاز محبت سے پیشتر بوتھویل نے لیڈی جین گارڈن سے شادی کی تھی مگر شاہراؤں کے مسافروں کا دم غیر آباد کوچوں کی فضا سے ہمیشہ گھٹتا رہا ہے۔ لیڈی جین نے عدالت میں خاوند پر بدچلنی کا الزام عائد کرکے فصل نکاح کا دعوی کیا اور اسے طلاق کی ڈگری مل گئی۔

شہر کے دروازے بند کر دیے گئے۔ قلعہ سے توپیں سر کی گئیں۔ دوسرے روز ملکہ شہر میں گھوڑے پر سوار ہو کر نکلی۔ گھوڑے کی باگیں بوتھویل کے ہاتھ میں تھیں۔ ۱۵ تاریخ کو ملکہ نے بوتھویل سے نکاح پڑھایا اور بوتھویل ڈیوک آف آرکنی اور مارکوئیس آف فائف کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔

—— (۷) ——

ہر جو می بینم کسے از کوئے او دل شاد می آید   خبر بیم کز وے بیم اول خبر بودم یادم آید

محبت چہرے پر زرتار نقاب ڈال کر آتی ہے مگر اس کی دلفریبی کو چھپے ہوئے چہرہ کی دلفریبی سمجھ لینے میں ہم غلطی کر جاتے ہیں۔ ملکہ میری پر بہت جلد ظاہر ہو گیا کہ اس تعلق میں اس کے لئے خوشی نہیں ہے اور انتخاب کرنے میں اس کے دل پرستش طلب نے جلدی کی۔ سر جیمز میلول لکھتا ہے کہ بوتھویل ملکہ کے ساتھ ایسی بدسلوکی اور گالی گلوچ سے پیش آتا تھا کہ ملکہ نے میرے سامنے چاقو مانگا کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دے مگر

نادان بھگت کرنی اپنی اے پاپی پاپ چین کہاں میں جب پاپ کی گٹھری سیس دھری اب سیس پکڑ کیوں روت ہے

رعایا نے ارادہ کیا کہ ملکہ کو اس ظالم کے ہاتھوں سے نجات دی جائے ملکہ اپنے خاوند کے ہمراہ بارتھ ویک کیسل میں چلی گئی اور ۱۱ر جون کو غلاموں کا بھیس بدل کر ڈنبار بھاگ گئی۔ ۱۲ر تاریخ کو پریوی کونسل نے اعلان کیا کہ اراکین سلطنت بڑے بڑے شہروں سے آئیں تاکہ ملکہ کو ظالم بوتھویل کے ہاتھوں سے نجات دلائی جائے۔ ملکہ کو جب یہ علم ہوا تو گو وہ جانتی تھی کہ فوج ضرور اس کی حمایت کریگی مگر اسے خوف ہوا کہ اس کے سواد نامۂ اعمال کے بھیانک منظر سے برگشتہ ہو کر اسے ہلاک نہ کر دے اس لئے ۱۵ر جون ۱۵۶۷ء کو اس نے خود کو عمائدین سلطنت کے حوالے کر دیا۔ ملکہ اپنے رعایا کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اڈنبرا لائی گئی۔ تقریباً برہنہ تھی، گرد و غبار اور آنسوؤں کے تسلسل سے اس کی صورت تک نہیں پہچانی جاتی تھی۔ گلی کوچوں کے ادنیٰ لوگوں نے اسے گالیاں دیں اور شہر میں گھما کر اسے بلیک ٹرن پائیک میں قید کر دیا، وہاں سے لاچ لیون ایک ۱۰۵ گز چوڑی عمارت میں ایک سال کے لئے قید رکھا گیا۔

عمائدین سلطنت نے لارڈ لینڈ زی کو قید خانہ میں بھیجا کہ ملکہ کو مجبور کرے کہ سلطنت اپنے شیرخوار بچہ کے نام منتقل کر دے مگر ملکہ نہ مانی۔ لینڈ زی نے ملکہ کے بازو کو اپنے لوہے کے دستانوں سے دبایا اور مجبوراً دست برداری نامہ لکھوایا۔

بوتھویل جزیرہ ارکنی میں بھاگ گیا اور بحری ڈاکوؤں کا پیشہ اختیار کیا آخر ڈنمارک والوں نے قید کر لیا اور اسیری میں گمنامی اور ذلت کی موت مرا۔

ملکہ قید خانہ سے بھاگ نکلی اور فوج کے ایک دستہ سے دریا کے پار جا ملی باقی فوج کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ اور ملکہ شکست کھا کر مفرور ہو گئی اور ملکہ الیزبتھ کے پاس انگلینڈ میں پناہ گزیں ہوئی۔ ملکہ الیزبتھ نے اسے قید کر کے زنداں میں ڈال دیا۔ ۱۸ برس قید رہنے کے بعد ملکہ کا قصہ جلاد کی تیغ سے پاک

پاک کیا گیا اور کہا جاتا ہے کہ گردن و دوش کے بار عظیم کی سبکدوشی کے بعد بھی سر بریدہ جسم کے لوتھڑے سے وظائف شباب کی تکمیل ہوئی اور مرنے کے بعد بھی ملکہ کے معمولات زندگی کا احترام کیا گیا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ہرگز زشست چرخ خدنگے خطا نہ کرد ہرگز بہ باغ عہد گیاہے وفا نہ کرد
پیرا ہنے نہ دوخت کہ آخر قبا نہ کرد خیاط روزگار ببالائے ہیچ کس (ملا یزدانی)

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

میں حیران ہوں کہ موجودہ زمانہ میں ادب سے کیا مراد ہے اور اس کی تعریف کیا ہے، فارسی تو ختم ہو چکی۔ اردو کی کوئی کل ہی سیدھی نہیں۔ ہر وہ شخص جس کے پاس یونیورسٹی کی سند ہو وہ ادیب بھی ہے اور شاعر بھی جس کو دیکھئے اوس کا رنگ ہی جدا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم جیسے غیر تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ کس کا اتباع کریں اور وہ زمانہ دور نہیں جب کہ اردو اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہے گی۔ عربی اور فارسی کے مروجہ و مستعملہ الفاظ کو ہم چھوڑتے جاتے ہیں کیونکہ اون کو ثقیل یا ناقابل فہم سمجھتے ہیں اور غیر مانوس ہندی الفاظ کو بخوشی استعمال کرتے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی اصلی زبان عربی ہے یا فارسی مگر اوس سے تنفر بڑھتا جاتا ہے۔ عطارد

دہلی سے ایک رسالہ "آج کل" نام مہینہ میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے جس میں دیدہ زیب تصاویر کے سوا اعلیٰ مضامین، بلند پایہ نظمیں اور جنگی خبریں طبع ہوتی ہیں۔ ۱۵ر فروری ۱۹۴۵ع کے رسالہ میں جناب جگر مرادآبادی کی ایک تازہ غزل طبع ہوئی ہے جس میں تخیل کی بلند پروازی اور جدت طرازی

کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادب کی جھلک بھی نمایاں ہے امید کہ قارئین شہاب بھی اس کے ملاحظے محظوظ ہوں گے۔

کیا مقامات میں ان سوختہ سامانوں کے   خضر بھی بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے

"مقام" بفتح اول ٹھیرنے کی جگہ۔ اصطلاح موسیقی میں ایک پردہ سرود۔ اصطلاح صوفیہ میں مدارج سلوک کو مقام کہتے ہیں "سوختہ سامان" کے لغظی معنی تو ظاہر ہیں مگر یہ لفظ عاشق کے لئے نہ مجاز ہے نہ کنایہ۔ البتہ سوختہ جان کنایتاً عاشق کے لئے مستعمل ہے۔

کدام سوختہ جان راست تاب آتش یا   بہ آہ سرد دلے را کباب کنیم (ابو طالب کلیم)

پہلے مصرعہ میں مقامات بصیغہ جمع اور سوختہ سامان بہ معنی عاشق صحیح نہیں خضر ایک پیغمبر کا نام ہے شعرا مجازاً بہ معنی خجستہ پے وراہ نما استعمال کرتے ہیں۔

کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے   خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

خوشی کے مارے کہوں مجھ کو آج خضر ملے   جو راہ کوچہ جاناں کا راہبر مل جائے (ناسخ)

"قدم لینا" کے معنی ہیں قدمبوس ہونا۔

جس نے کی اس میکدے میں بیعت دست سبو   وہ قدم تیرے بس اے پیر مغاں لینے لگا (ذوق)

"دیوانہ" پاگل یا مجنون کو کہتے ہیں۔

دیوانہ را بہ زیر قدم خار و گل یکیست   سیل از بلند و پست بیاباں خبر نداشت (حزیں)

لیکن جب یہ لفظ کسی کی طرف مضاف ہوتا ہے تو اوس کے معنی عاشق یا مفتون کے ہوتے ہیں۔

حشر کے روز میں اتنا تو کہوں گا آتش   ان پری رویوں نے دیوانہ بنایا مجھ کو

ایک مشہور و معروف پیغمبر کی نسبت یہ کہنا کہ وہ پاگل یا "دیوانہ" کے قدم لیتے ہیں یا بالفاظ دیگر قدمبوس ہوتے ہیں سراسر بے ادبی ہے۔

حسن و صورت کے نہ الفت کے نہ ارمانوں کے   اف کے انسان ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

عجیب و غریب مطلع ہے دونوں مصرعوں میں بظاہر کوئی ربط نہیں۔ اوصاف مندرجہ مصرعہ اول کی نفی کا تعلق آخر ہے کس سے۔ اگر اس کا تعلق انسان سے ہے تو صورت نہ ہونا کیا معنی حسین نہیں تو نہ سہی مگر دنیا میں وہ کونسی مادی شئی ہے جس کی صورت نہیں ہوتی۔ مصرعہ ثانی میں مارے

ہوئے" کا لفظ بھی محاورے کے خلاف استعمال کیا گیا جس کی وجہ مصرعہ ہی مہمل ہو گیا۔ اردو میں لفظ "مارے" معنی معروف کے علاوہ دو دو معنی میں مستعمل ہے۔ ایک معنی ہیں کشتہ مقتول ؎

اوس زلف کے مارے کی اگر خاک کو چاٹے		پیدا دم افعی میں ہو سم اور زیادہ (ذوق)

"مارے ہوئے" بھی اسی معنی میں مستعمل ہے۔ ؎

بس کہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے		جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں (غالب)

دوسرے معنی ہیں سبب یا باعث۔

جب کہ اپنے میں سماوے نہ خوشی کے مارے		گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا (غالب)

آ گیا مارے خجالت کے پسینہ ہم کو (ذوق)

ان میں سے کوئی معنی بھی یہاں چسپاں نہیں۔

چشم ساقی میں تصدق تیرے پیمانوں کے		چند گھونٹ اور بھی لیکن انہی میخانوں کے

میخانہ بطور صفت چشم خوباں مستعمل ہے نہ کہ پیمانہ۔ مصرعہ اول میں بجائے پیمانہ میخانہ اور مصرعہ ثانی میں بجائے میخانہ پیمانہ ہونا چاہئے تھا۔ چند گھونٹ پینے کا ظرف پیمانہ ہوتا ہے نہ کہ میخانہ۔ افسوس تو یہ ہے کہ بصیغہ جمع یہاں پیمانوں اور میخانوں کا استعمال نہایت مکروہ اور نادرست ہے مگر قافیہ پیمائی کی خاطر موقعہ ہو یا نہ ہو استعمال کرنا ہی پڑا۔

ہر قدم لاکھ تھپیڑے سہی طوفانوں کے		حوصلے پست نہ ہوں گے کبھی انسانوں کے

حوصلے پست نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی ہے یا محض ادعائے بے معنی۔ سخت و فور بارش کو طوفان کہتے ہیں مجازاً ہر وہ شئی جو سب کو گھیر لے اور سب پر غالب ہو مثلاً طوفان باد طوفان باراں طوفان آتش وغیرہ مصنف نے یہاں طوفان کس معنی میں استعمال کیا ہے اور یہ کس چیز کا طوفان ہے کچھ نہیں کھلتا جب اسم بطور تنکیر استعمال کیا جاتا ہے تو اوس کی جمع خلاف اصول ہے۔ یہاں تو یہ دعویٰ ہی غلط ہو جاتا ہے کہ طوفان کے لاکھ تھپیڑے کھائے مگر انسانوں میں کا ایک فرد بھی پست حوصلہ نہیں ہوتا۔ شاعر کے تخیل کی بڑی خوبی اسی میں ہے کہ ناممکن کو ممکن ثابت کرے۔

جلوہ دوست یہ آہستہ خرامی تا چند		ندیاں سو کھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

دونوں مصرعوں میں کوئی معنوی ربط نہیں۔ "ندی" کو "جلوہ دوست" سے کیا مناسبت۔

جلوہ کے معنی ہیں خود نمائی ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر میکنند (حافظ)

جلوہ کو آہستہ خرامی یا تیز خرامی سے بھی کوئی واسطہ نہیں چند کا لفظ عموماً ازدیاد کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ کے عوض "تا چند" کہنے کی کوئی خاص وجہ ظاہر نہیں۔ "سو کہہ چلیں" بول چال کے خلاف ہے سو کہہ گییں۔ سو کہتی جاتی ہیں یا سو کہتی چلیں کہہ سکتے ہیں۔

موج مے رنگ شفق لالہ و گل مطلع صبح
چند عنوان ہیں مرے شوق کے افسانوں کے

مصرع ثانی حرف اشارہ کا محتاج ہے۔ بغیر اس کے دونوں مصرعوں میں ربط پیدا نہیں ہوتا۔ "مرے" ضمیر واحد متکلم اور "شوق" بھی واحد پس "شوق" کا افسانہ ہو سکتا ہے افسانوں کہنا صحیح نہیں۔

آگ میں پھاند پڑیں موت سے ٹکرا جائیں
واہ کیا کھیل ہیں ان سوختہ سامانوں کے

آگ میں کود پڑیں کے عوض آگ میں پھاند پڑیں کہنا سراسر غلط ہے۔ پھاندنا کے معنی ہیں اچک جانا کسی چیز پر سے کود کر نکل جانا۔

نہ راہ ہی مجھے سوجھی نہ پھاندنے کی گھات ملی
پھرا کیا پس دیوار (پشت) در خاموش (آتش)

مطلب یہ کہ نہ تو دیوار پر سے کود جانے کا خیال آیا نہ دروازے میں سے داخل ہونے کی سوجھی۔

جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

(غالب دیوان حمیدیہ)

"موت سے ٹکرانا" بھی مہمل ٹکر مادی چیز سے ہو سکتی ہے۔ ع

ٹکرا کے پارہ پارہ ہو گئی کشتی حباب سے (آتش)

نہ موت مادی شئی ہے نہ سوختہ سامان عاشق کے لئے کنایہ ہے۔

اسی کشتی کو نہیں تاب تلاطم صد حیف
جس نے منہ پھیر دئے تھے کبھی طوفانوں کے

"اوسی کشتی" سے کونسی کشتی مراد ہے "تلاطم اور طوفان" کس چیز سے عبارت ہے۔ "طوفانوں کا منہ پھیر دینا" بھی صحیح نہیں اردو میں منہ پھیرنا یا منہ پھیر لینا کہتے ہیں منہ پھیر دینا نہیں بولتے منہ پھیرنا یا پھیر لینا کے معنی ہیں ناراض یا خفا ہونا۔

ظاہر ہے کہ منھ پھیر لیا تم نے خدا سے (میرا)

دوسرے معنی ہیں شرم وحیا تنفر یا بے اعتنائی سے

اے آفتاب محشر آنکھوں سے گر گیا تو موتنھ پھیرتا جدہر سے پھرتیں ادہر نہ کرتا (آتش)

غرض کسی کا منھ پھیر دینا متعدد ی بد و معقول اردو میں مستعمل نہیں۔

حسن کی جلوہ گری سے ہے محبت کا جنوں شمع روشن ہوئی پر لگ گئے پروانوں کے

"محبت کا جنوں" مہمل ہے۔ پر لگنا ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کا جلد انجام پا جانا یا کسی کام کی قدرت حاصل ہونا۔

سفلہ کو گو پر لگیں لیکن ہے نارسا پہونچے کبھی ہوا سے نہ کاہ آسمان پر ناسخ

اے کمان ابرو جہاں جاتا ہوں تیرا خدنگ پہنچتا ہے ایک دم میں پاس میرے پر لگا میر

شمع روشن ہونا پروانے کے پر نکلنے کی علت تو نہیں ہے۔

خاک بھی گور غریباں کی ہے کیا بستیٔ شوق دل دھڑکتے نظر آئے مجھے انسانوں کے

"بستی" بہ معنی آبادی اردو لفظ ہے اور "شوق" عربی لہذا بہ ترکیب اضافی "بستی شوق" کہنا قطعاً غلط ہے مزید لطف یہ کہ "گور غریباں کو" بستی شوق" نہیں کہا بلکہ "خاک گور غریباں" کو "بستی شوق" قرار دیا ہے۔ دونوں میں کیا مناسبت ہے۔ شوق کی بستی اور انسانوں کا دل دھڑکنا عجیب و غریب تخیل ہے۔

مرحبا جذبۂ بے باک جوانان وطن تیغ چم خم ہے تو کہ ہاتھ میں دیوانوں کے

"جذبہ" کی صفت بے باک نہیں۔ چم خم بطور صفت خرام ناز مستعمل ہے خدا بخشے اکبر الہ آبادی نے اس لفظ کا استعمال کیا تھا۔

زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید قد رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

اب جناب جگر نے استعمال کیا "تیغ چم خم" کی صحت میں کلام ہے۔ تلوار کی صفت چم خم نہیں ہو سکتی۔

خضر اگر آپ بھی خائف ہیں تو رخصت لیکن چاہئیں مجھ کو تھپیڑے انہیں طوفانوں کے

ایسے موقع پر رخصت نہیں کہتے خدا حافظ کہتے ہیں۔ "انہیں طوفانوں سے" "کون سے طوفان

مراد ہیں۔ کیا تھپیڑے کھانے کی آرزو کرنا شجاعت و جوانمردی کی علامت ہے؟

کاش یہ راز ہر انسان سمجھ لے ہر دم   اپنا مقسوم ہے خود ہاتھ میں انسانوں کے

اس بحث سے قطع نظر کہ یہ نظریہ کس حد تک قابل قبول ہے پہلے مصرعہ میں جب لفظ "ہر انسان" بطور کلیہ آچکا ہے تو مصرعہ ثانی میں مکرر "انسانوں" کا لفظ نہایت قبیح اور بول چال کے خلاف ہے کہنا صرف یہ ہے کہ "کاش ہر انسان یہ راز سمجھ لے کہ اپنا مقسوم اپنے ہاتھ میں ہے" ہردم کا لفظ برائے بیت ہے معنی و مطلب میں اوسے کوئی دخل نہیں اسی کو حشو قبیح کہتے ہیں کسی مبتدی کے کلام میں ایسے حشو و زوائد ناقابل گرفت ہوں تو ہوں مگر جناب جگر جیسے کہنہ مشق شاعر کے کلام میں معیوب ہے۔

موت کیا آئے گی ہم عشق کے دیوانوں کو   موت خود کانپتی ہے نام سے دیوانوں کے

"عشق کا دیوانہ" بمعنی عاشق صحیح نہیں۔ دیوانہ کے نام سے موت کا کانپنا بھی مہمل ہے۔ حضرت فیض نے کیا خوب فرمایا ہے۔

موت کدھر آتی ہے دیوانی ہے!   فیض تو پہلے ہی فنا ہو گیا

جناب جگر کا مفروضہ یہ پایا جاتا ہے کہ "عشق کا دیوانہ" مرتا ہی نہیں جو صریحاً غلط ہے۔ دوسرے مصرعہ میں دیوانوں سے مراد عشاق نہیں ہو سکتا یہاں تو دیوانہ کے معنی پاگل اور مجنون کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے۔

میں نے دیکھا ہے اوسے روپ میں فطرت کے جگر   میں نے پایا ہے اوسے بھیس میں انسانوں کے

"فطرت کا روپ" یعنی فطرت کی صورت غلط اردو میں روپ کے معنی ہیں صورت یا وضع

نظارہ یوسف ہو زلیخا کو مبارک   بدلے ہوئے ہے مصر کا بازار عجب روپ (آتش)

صبح فرقت نے دکھایا روپ سارا شام کا (ناسخ)

"اوسے دیکھا ہے" کا مشار الیہ کون ہے۔ شاید یہ کوئی چھلاوا ہے دیو ہے یا پری ہے جو کبھی "فطرت کے روپ" میں اور کبھی انسانوں کے بھیس میں نظر آتا ہے۔

براہ کرم تبدیل پتہ سے دفتر کو مطلع کیا کیجئے۔

ٹیلیفون

زینت ساجدہ (حیدرآباد دکن)

"تم کہاں چلی گئی تھیں، میں بڑی دیر سے تمھاری راہ دیکھ رہا ہوں!"

"کیوں کیا بات ہے؟ گئی تھی ذرا بہن کے گھر!"

"بس جب دیکھو تب بہن کے یہاں! جب دیکھو تب بہن کے یہاں! کچھ اپنے کام کاج کی بھی فکر رہی ہے!! بیچاری بیمار ہے۔ اور کوئی کرنے دھرنے والا بھی نہیں۔ اس کے ماں کی تلاش میں کتنے خط کتنے تار دوڑائے۔ ابھی تک کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر ہے تو عورت کی ذات۔ یکدم گھبرا گئی ہے۔ مجھے تو کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔ تب میں کیا کروں؟ اچھا بگڑو نہیں! آخر بات کیا ہے منھ سے تو کچھ کہو!"

یہ بات چیت پٹنہ شہر کے رائے بہادر جیت لال سندھیا اور ان کی بیوی شریمتی وسنتی دیوی میں ہورہی تھی۔ رائے بہادر صاحب پٹنہ کے مشہور رئیس اور بیوپاریوں میں سے تھے۔ وسنتی دیوی بھی ایک پڑھی لکھی "اپٹوڈیٹ" عورت تھیں۔ لیکن پرانے رسم و رواج کو وہ اب تک نہ چھوڑ سکی تھیں۔ اسی سے سماج اور سماج کے باہر، دونوں ہی جگہ ان کی عزت تھی۔ خاص کر اس لئے کہ بہت بڑے دل کی تھیں۔ جہاں ضرورت دیکھتیں کچھ نہ کچھ دیتی ہی تھیں۔ ذاتی سخاوت کے علاوہ ان کے صاحب بھی دینے لینے کے معاملہ میں ان سے کچھ بولتے نہ تھے۔ کیونکہ ایک تو دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ دوسرے وہ خوب سمجھتے تھے کہ ان کی بیوی کی سخاوت بھی ان کو سماج میں بلند کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہے۔

کچھ ٹھنڈے ہوکر رائے بہادر بولے "ہے کیا؟ بیج لال جی کا دو دفعہ فون آچکا ہے وہ کسی طرح نہیں مانتے۔ نہ ان کی بیوی مانتی ہیں۔ ہم لوگوں کو ان کے یہاں جانا ہی ہوگا!"

وسنتی ــ "تو تم چلے جانا، میں نہیں جاؤں گی۔ ان کی بیوی کچھ مغرور سی ہیں۔ میری ان کی ٹھیک نہیں بنتی!"

جیت ــ "نہیں نہیں، تم کو بھی چلنا ہوگا تمھارا نہ جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ ایک تو خود دونوں آکر بلاوا دے گئے ہیں۔ دوسرے دو دفعہ فون بھی

کر چکے - نہ جانے سے جانے من میں کیا سوچیں!"
وسنتی - "خیر تو پھر چلی چلوں گی - کب سے
ان کے یہاں بیاہ ؟ کل نا ؟"
جیت - "ہاں بیاہ تو کل ہے - لیکن دعوت
تو آج اور کل دونوں ہی دن کی ہے - آج افسروں
کو مدعو کیا ہے - کل برادری کو - آج شام کو ٹھیک
آٹھ بجے چلنا ہوگا!"
وسنتی - "تو آج تو میں نہیں چلنے کی -
کسی طرح بھی نہیں!"
جیت - "کیوں ؟"
وسنتی - "کل کہو گے تو خیر چلی چلوں گی ،
پر آج نہیں جا سکتی - تم اکیلے چلے جانا - میری طرف
سے کہہ سن کے معافی مانگ لینا - اور کہہ دینا کہ
کل ضرور ہی آؤں گی"
جیت - "واہ خوب کہی! آج ہی تو اصل
کام ہے چلنے کا! تم سے کہا نا، سب بڑے بڑے
افسر آج آئیں گے - انگریزی وضع کا کھانا ہوگا -
تمھیں ڈنر میں شامل ہونا ہوگا! بیچارے نے
اسی لئے تو خاص طور سے کہلوایا ہے"
وسنتی - "افسر آئیں گے تو آنے دو!
میں آج تو نہیں جا سکتی"
جیت - "آخر کیوں ؟ بات کیا ہے ؟ کیا
اس سے پہلے کہیں ڈنر میں شامل نہیں ہو چکی ہو ؟
ابھی اس دن مسٹر کل کرنی کے ڈنر میں گئی تھیں!"
وسنتی - "مردوں کے سامنے کھاتے مجھے
شرم سی آتی ہے - مگر اس سے کچھ نہیں - میں چلی
چلتی ، پر آج ایک ضروری کام ہے"
جیت - "کیا کام ہے؟"
وسنتی - "ہے کچھ کام"
جیت - "آخر کیا - کچھ معلوم بھی تو ہو - ایسا
ہی کام ہو تو اسے ٹال دو یا کسی اور کو بھیج دینا"
وسنتی - "نہیں دوسرے سے نہ ہوگا"
جیت - "آخر کام کیا ہے - میں بھی تو سنوں"
وسنتی - "وہی بہن کے گھر جانا ہے - اس
کی طبیعت آج بہت خراب ہو رہی ہے - تھوڑی
تھوڑی دیر پر دورے ہو رہے ہیں - اس کے خسر
بہت گھبرا گئے ہیں - کیونکہ گھر میں اور کوئی دیکھنے
والا نہیں ہے - مجھ سے بہت گھبرا کے کہتے تھے - کہ
دن میں یہ حال ہے تو رات کو نہ جانے کیسا ہوگا
سو میں نے کہہ دیا کہ میں شام پڑے آ جاؤں گی -
اور دو تین گھنٹے رہ جاؤں گی"
جیت - (بگڑ کر) "ساری دوپہر بھر بہن کے
یہاں رہیں - جی نہ بھرا کہ شام کو پھر جاؤں گی!
نہیں اب آج جانا نہیں ہوگا - بہن کے آگے
کسی کی بھی کچھ فکر ہے کہ نہیں!"
وسنتی - "بگڑو نہیں - بیچاری کی حالت

بھی دیکھی۔ ایک تو غریبی، دوسرے مہینوں کی بیمار،
اوپر سے شوہر یکایک لاپتہ ہو گیا۔ بھاری ایسی کہ
کس دم آخری سانس نکل جائے پتہ نہیں! آخر
میرا بھی تو کچھ دھرم ہے۔ ایسے وقت میں بہن کے
کام نہ آؤنگی تو پھر کب آؤں گی؟"

جیت۔ (کچھ ٹھنڈے ہو کر) ارے
بھائی تو تم ہی سب کچھ کر رہی ہو نا۔ میں جانے
سے یا مدد کرنے سے تو روکتا نہیں۔ بس اتنا کہتا
ہوں کہ آج اور مت جانا۔ ایک بار تو ہو آئی ہو
اب دوبارہ نہ جاؤ گی تو کیا بگڑے گا؟ ایسا ہی
ہے تو کسی اور کو بھیج دو۔ مہابیر کو بھیج دو، کوشلیا
کو ساتھ لیتا جائے۔"

وسنتی۔ کوشلیا تو کل سے ہی وہیں ہے
اور مہابیر کو میں اس وقت چھوڑتی آئی ہوں
یہ دونوں نہ ہوتے تو کیا اب تک وہ جیتی بچتی۔"

جیت۔ "تب پھر دو دو آدمی وہاں
موجود ہوں تو گھبرانے کی کون بات ہے۔ رہنے
بھی دو۔ آج نہیں کل چلی جانا۔"

وسنتی۔ (کچھ ناراض ہو کر) "میں کہہ
رہی ہوں نا کہ اس کا نہ جانے کس گھڑی دم نکل
جائے اور تم آج کل آج کل کر رہے ہو۔ ایسا ہی
ہے تو تمہارا ہی کون نقصان ہوا جاتا ہے۔ بغیر
میرے، کیا کبھی بنا میرے کسی کے ہاں دعوت نہ
کھائی! کہ سب جگہ بی بی ساتھ ہی جاتی ہے۔"

جیت۔ سب جگہ کی بات اور ہے اور جگہوں
کے لئے کبھی میں نے اتنا زور بھی تو نہیں دیا تھا
آج کوئی بات ہے تبھی تو کہہ رہا ہوں اتنا۔"

وسنتی۔ "کیا بات ہے کچھ وہ بھی تو سنوں۔"

جیت۔ "کہا نا تم سے، آج وہاں سب بڑے
بڑے افسر لوگ آئیں گے۔"

وسنتی۔ "ہاں سنا کہ آئیں گے۔ تب اس سے
کیا۔ افسروں سے تو روز ہی ملتے رہتے ہو!"

جیت۔ "لاٹ صاحب کے آنے کی بھی تو
امید ہے!"

وسنتی۔ "لاٹ صاحب آئیں گے، سیٹھ برج
لال کے یہاں؟"

جیت۔ "ہاں کچھ ایسی ہی خبر ہے!"

وسنتی۔ "ہو گا، کسی طرح دباؤ پہنچایا گیا
ہو گا۔ مگر اس سے کیا پھر؟ لاٹ صاحب سے تم
ملے نہیں ہو کبھی۔ یا وہ تمہیں جانتے نہیں ہیں؟"

جیت۔ "نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے
وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابھی اس دن
ایسوسی ایشن کی طرف سے جو ڈیپوٹیشن . . . . ."

وسنتی۔ "اور پھر تم جا ہی رہے ہو نا، وہاں
ان سے ہاتھ ملانا۔ کمر جھکا جھکا کے باتیں کرنا،
میں نہ رہوں گی تو کیا حرج ہو جائے گا؟"

جیت لال جی اپنی بیوی کی یہ بات سن ایک دم بھبک اٹھے۔ کمر جھکا جھکا کے بات کرنے کا ان کو کچھ روگ تھا۔ خاص کر بڑے افسروں کے سامنے۔ کئی دفعہ، کئی جگہ اس کے لئے ان کے حلقہ احباب میں ہنسی ہو چکی تھی۔ ایسی بات ان کی بیوی بھی کہنے لگیں گی۔ وہ چمک کر بولے "بکو نہیں۔ کچھ سمجھتی بھی ہو کہ جو جی میں آیا کہنے لگتی ہو؟" وسنتی دیوی ان کو ٹھنڈا کرنے بولیں۔ "اچھا نہیں سمجھتی تو سمجھا دو پھر؟ بتا دو نا کہ آج میں تمھارے ساتھ نہیں چلوں گی تو کیا ہرج پڑ جائیگا؟" بڑے رازدارانہ انداز میں جیسے کوئی اہم بات کہہ رہے ہوں۔ جیت لال جی آگے کو جھکے آہستہ آہستہ کہنے لگے "دیکھتا ہوں کہ تم بغیر پوری بات سنے نہ مانو گی۔ نیا سال آرہا ہے نا! خطابات نہ بٹیں گے۔"

اب وسنتی دیوی کو کچھ کچھ خیال ہوا۔ وہ بولیں "اچھا تب؟ تم تو ابھی دو ہی سال ہوئے رائے بہادر، بن چکے ہو۔ اب تمھیں تو کچھ ملنے ملانے کا نہیں ہے!"

جیت - (اور بھی آہستہ) ایسا مت کہو میری رسائی کہاں کہاں ہے جانتی ہو! ایسی پتہ کی بات کہتا ہوں کہ خوش ہو جاؤ گی۔ مگر خبردار زبان سے نکالنا نہیں کسی کے آگے!

وسنتی - اچھا اچھا نہیں کہوں گی۔ مگر بات کیا کچھ ہے کہو بھی!

جیت - اُس سال مسٹر سنہا کو راجہ صاحب کا خطاب ملنے کو تھا۔ مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اب کسی اور کو یہ خطاب دیا جائیگا

وسنتی - "اچھا یہ بات ہے! مگر کس سے سنا تم نے!"

جیت - خود لاٹ صاحب کے پرائیوٹ سکرٹیری سے! کل ہی ناموں کو چنا جائیگا۔ اور لیسٹ کل ہی پریس میں چھپنے کو دیا جائیگا۔ آج اور کل میں ہی کوئی نیا نام چننا ہوگا۔ یوں تو کتنے ہی درخواست گزار ہیں۔ مگر میرا بھی تو کچھ حق ہے۔ خاص کر اس بڑے ہسپتال کے لئے پچاس ہزار چندہ دیدینے سے لاٹ صاحب کی مجھ پر خاص مہربانی ہوگئی ہے اور سنو گی بتاؤں؟

وسنتی "کہو"

جیت - ایک اپنے بڑے خاص آدمی سے وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی آدمی مویشیوں کا ایک ہسپتال اس شہر میں بنا دیتا تو میں بڑا خوش ہوتا۔ میری گڑھے والی زمین اور عمارت آج کل بیکار ہے۔ سوچا ہے کہ مویشیوں کا ہسپتال قرار دے کر لاٹ صاحب سے افتتاح

کراؤں۔ آج اچھا موقع ہے۔ چار آدمیوں کے سامنے اس کا ذکر کرنے کا۔ سن کے ہی لاٹ صاحب خوش ہو جائیں گے"

وسنتی ۔" اور تمھیں راجہ بنا دیں گے! کیوں ؟"

جیت ۔ (انکساری سے) اگر مجھ میں کچھ بھی عقل ہے تو اس موقع پر ضرور۔"!

وسنتی دیوی یہ سن ذرا دیر کو چپ ہو رہیں۔ ان میں اپنے شوہر کی طرح لالچ نہیں تھی۔ پھر بھی کون ایسی عورت ہے جو اپنے شوہر کا بھلا نہ چاہتی ہو! بات بھی کچھ کچھ ٹھیک معلوم ہو رہی تھی۔ اگر ایسی بھاری بات ہے۔ ایسا اہم واقعہ ہے تو ان کے لئے اپنے شوہر کا ہاتھ بٹانا ضروری ہے۔

اپنی بات کا اثر پڑتا دیکھ جیت لال جی بولے۔" ایسی بھاری بات ہے تب ہی تو تم سے چلنے کو کہتا ہوں، نہیں تو کیا کبھی تمہاری خواہش میں نے ابھی تک کبھی رد کی ہے۔"

کچھ سوچ بچار کے وسنتی دیوی بولیں، اچھا تو پھر جب ایسی بات ہے تو میں ہو سکا تو چلی چلوں گی! میں وہاں رگھو بیر کو بھیج دیتی ہوں اور کہہ دیتی ہوں کہ برابر وہاں رہے، اگر بہن کی حالت ویسی ہی رہی جیسی اس وقت ہے۔ تب تو کل صبح میں آؤں گی۔ ہاں اگر کچھ بگڑنی جان پڑے تو مجھے فون کرے۔ فوراً چلی آؤں گی!"

ٹھیک ٹھیک من کی نہ ہونے پر بھی رائے بہادر صاحب کو اتنے پر ہی صبر کرنا پڑا۔ رگھوبیر اُن کا سالا، اور وسنتی دیوی کا چچا زاد بھائی تھا۔ کچھ سوچ کر وہ بولے۔" اچھا میں اسے سمجھا بجھا کے ابھی بھیج دیتا ہوں"

وسنتی دیوی بولیں "تم کاہے کو تکلیف کرو۔ میں جا ہی رہی ہوں بھیج دیتی ہوں۔ کے بجے تک چلنا ہوگا؟"

رائے بہادر جیت لال بولے "ڈنر ٹھیک ساڑھے آٹھ سے ہے۔ مگر میں کچھ پہلے ہی پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ ذرا سیٹھ برج لال جی کو بھی ٹھیک کر رکھوں گا! تم ٹھیک آٹھ بجے تیار ہو جاؤ ———!"

وسنتی دیوی "ابھی تو چھ بجے ہیں۔ بہت وقت پڑا ہے۔ میں تیار ہوتی ہوں۔ مگر تم کہیں جانا نہیں، یہیں رہنا۔ اور اگر بہن کے یہاں سے کوئی فون آئے تو فوراً مجھ کو خبر کرنا!" کہتی ہوئی کمرے کے باہر چلی گئیں۔ پکار کے رائے بہادر صاحب بولے "یونیورسٹی سے گوپال کی چٹھی آئی رکھی ہے۔ تمہاری میز پر ہے۔

پڑھ لینا !"

یہ گوپال رائے بہادر جیت لال اور ونتی
دیوی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بنارس کی ہندو یونیورسٹی
میں پڑھتا تھا۔ ونتی دیوی نے جب دیکھا کہ یہ
اباّ کے لاڈ میں بگڑ جائیگا۔ اپنے جی کو مار کے
اسے اپنے سے اتنی دور بھیج دیا تھا۔ مگر لڑکا
ہونہار تھا۔ ترقی اچھی کر گیا۔

(۲)

سوا سات ہی بجے سے کپڑے لتے سے لیس ہو
رائے بہادر صاحب اپنی بیوی کے آنے کی راہ
دیکھنے لگے۔ مگر ان کا دل اس وقت بہت بے چین
ہو رہا تھا۔ اگرچہ رگھو بیر کو انھوں نے اپنی طرف
سے بھی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ پر اپنی بیوی کی
محبت جو اسے بہن سے تھی جانتے تھے۔ خدا نہ
کرے، اگر اس کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی
اگر چلتے چلاتے فون آ ہی گیا تو پھر وہ کسی طرح
بھی نہیں مانے گی۔ اور اپنی بہن کے یہاں چلی
ہی جائیگی۔ جس سے ان کا سوچا بچارا سب
دھرا ہی رہ جائیگا، اور لاٹ صاحب پر اپنا
اثر ڈالنے کی خواہش بھی ادھوری رہ جائیگی،
یہ کم بخت ان کی سالی بھی کیا بے موقع بیمار پڑی ہے

گھڑی نے ساڑھے سات بجائے۔ بس
اب آدھے گھنٹہ کی بات تھی۔ اگر آدھ گھنٹہ تک
اور کوئی ٹیلیفون، ٹیلیفون نہ آئے، اگر
ایک بار ان کی بیوی گھر سے باہر ہو جائے تو
بس پھر مار لیا۔ پھر تو جو ہونا ہے سو ہو۔ یہاں
سے جانے کے بعد کوئی بلایا کرے ان کی بلا سے،
مگر تب تک؟ رائے بہادر کی نگاہ یکدم جا کر
ان کے سامنے ٹنگی گھڑی کی سوئیوں سے چپک گئی

یہ کیا! کیا ٹن کی آواز ہوئی۔ ٹیلیفون کی
گھنٹی بجی کیا! نہیں ٹیلیفون نہیں ہے، اور
کوئی آواز ہے۔ لیکن اگر گھنٹی بج ہی پڑے تو
کیا ہوگا۔ اگر ان کی سالی مالتی کے بارے میں
کوئی خبر آ ہی پہنچی تو کیا ہوگا؟ پھر تو ان کی بیوی
آئیں گی نہیں دعوت میں! پھر تو لاٹ صاحب
تو ان کے پورے 'اپ ٹو ڈیٹ' ہونے کا
کوئی ثبوت ملے گا نہیں! اف تب کیا کروں!
ایک دم رائے بہادر گھبرا اٹھے۔ مگر پھر اپنے
کو سنبھال سوچنے لگے کہ ٹیلیفون کے اس خطرہ
سے بچنے کی ترکیب کیا ہو سکتی ہے، اور ان کے
تیز دماغ نے ترکیب نکال لی۔ انھوں نے اپنے
سامنے پڑے اخبار سے ایک ٹکڑا اپھاڑا۔ اور
اسے موڑ توڑ ایک بتی سی بنا لی۔ اس سے
ٹیلیفون کی گھنٹی بجانیوالے لنگر کو دونوں
سروں سے کس دیا۔ بس۔ . . . ! اب نہ لنگر
ملے گا نہ گھنٹی بجے گی۔ نہ کوئی پیام اچھا برا

آئیگا۔ سیٹھ جی نے اطمینان سے ایک لمبی سانس لی۔ اور اسی وقت دروازہ سے دیکھا شلث چھاپوں کی کامدار بمبئی سے خریدی ہوئی قیمتی ساڑھی پہنے وسنتی دیوی سیڑھیاں اتر رہی ہیں۔

یہ دیکھ کے ایک بار تو سیٹھ جی خوش ہوگئے۔ ان کی بیوی اب بھی اس ڈھلتی عمر میں بھی، حسین تھیں۔ اپنے آپ کو ہمیشہ وہ سنبھالے رہتی تھیں۔ دیکھ کر کوئی کہہ نہ سکتا تھا کہ ان کا لڑکا فسٹ ایر میں پڑھ رہا ہے۔ تبھی تو لوگ اتنے خوش ہوجاتے ہیں انہیں دیکھ کر۔ اور سچ بھی ہے کہ وسنتی دیوی اپنے میاں کی کامیابیوں کا ایک بڑا سبب بھی تھیں۔

پر زیادہ دیر رائے بہادر نے اپنی بیوی کا روپ دیکھنے میں نہ لگائی۔ انہیں ٹیلیفون کے ساتھ چلی ہوئی اپنی چال کا خیال آگیا۔ اگر کہیں ان کی بیوی اس کمرے میں آگئی تب ؟ کہیں فون کرکے اپنی بہن کا حال چال لینے کا ہی اسے خیال اٹھے تب ؟ اسے اس کا موقع ہی کیوں دیا جائے۔ وہ جھٹ سے اٹھے۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تب آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی دیکھے۔ جلدی سے کمرے کے باہر نکل آئے۔ اور پھر اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے

"اوہ! تم نے بہت دیر کردی! موٹر کب سے کھڑی ہے!" دروازہ کی طرف مڑے۔ ان کی بیوی ان کے کمرے کے دروازہ پر ٹھٹھکی۔ ٹیلیفون اسی کمرہ میں تھا۔ ان کی طرف سے سر گھما کے اس نے پوچھا "کوئی خبر بہن کی تو نہیں آئی ؟" "نہیں کوئی نہیں تم جلدی کرو" کہہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک طرح کھینچتے ہوئے، سیٹھ صاحب مکان کے باہر نکل اپنی موٹر پر جا بیٹھے۔ جب موٹر ان کے دروں سے چل پڑی تبھی انھوں نے ایک اطمینان کا سانس کھینچا۔

(۳)

ڈنر ختم ہوگیا۔ سیٹھ برج لال جی کے مکان کی وسیع سیڑھیاں اتر موٹر پر بیٹھتے ہی سیٹھ جی نے خوشی سے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دبا کر بولے "اوہ! آج ڈنر بھر میں تم نے میرا نام کردیا۔ جس کی نگاہ دیکھو ہم ہی پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دوبار لاٹ صاحب کو بھی تمہاری طرف دیکھتے پایا ——!"

کچھ تنک کر مگر دلی خوشی کو دبا کر وسنتی دیوی بولیں۔ "اور تم خوش ہوگئے۔ کیوں! نہ جانے آج کل کے مردوں کو کیا ہوگیا ہے کہ دوسرے ان کی بی بی کو دیکھیں تو خوش ہوتے ہیں!!!"

"خوش نہ ہوں تو کیا روئیں!" کہہ کے آہستہ سے ایک چٹکی کاٹ رائے بہادر بولے، خیر جو بھی ہو، آج تم نے میرا کام خوب بنا دیا میرے 'مویشی ہسپتال' والے ارادے کا حال سن لاٹ صاحب مجھ سے بہت خوش ہوئے۔ اب کل کی لسٹ میں میرا نام آنا یقینی ہے!!"

حیرت بھری مسرت سے وسنتی دیوی نے کہا "ہاں!" رائے بہادر بولے "ہاں!" وسنتی دیوی بولیں "تو تم اب راجہ صاحب ہو جاؤ گے؟" خوشی سے اندھے گلے سے رائے بہادر نے کہا "ہاں اور تم رانی بنو گی"۔

پر اسی وقت وسنتی دیوی کے کھلے ہوئے چہرے پر دکھ سے گھرا بادل سا آ گیا۔ وہ کچھ درد بھرے لہجہ میں بولیں "بہن سنیں گی تو بہت خوش ہو گی۔ مگر معلوم نہیں اس کی کیسی طبیعت ہے کئی گھنٹوں سے کوئی خبر نہ ملی۔ دل کچھ گھبرایا جاتا ہے۔ غلطی کی جو یہاں آنے کے پہلے ایک دفعہ فون کر کے بھائی سے نہ پوچھ لیا۔"!

سیٹھ جی کے دل کو بھی کیسا ایک دھکا سا لگا! اب جب کے خوشی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دوسروں پر دیا کرنے کو تیار تھے۔ اسی سے اپنی بیوی کے ذکر پر انہیں خیال ہوا۔ کہیں اس بیچ میں بچاری کی حالت خراب نہ ہو گئی ہو کہیں ......! گھر چلتے ہی فون پہ پوچھیں گے"۔ یہ انہوں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بیوی اپنی بہن کو حد سے زیادہ ہی چاہتی تھیں۔ اگر اس کو کچھ ہو گیا ہو تو اسے بڑا دکھ ہو گا۔ اور یہ دکھ ان ہی کے سبب سے تو ہو گا۔ ان کے زبردستی ڈنر میں کھینچ لانے کے سبب اگر وہ آخری وقت بہن پاس نہ رہ سکی تو جنم بھر وہ کیسی تڑپے گی۔ اس حالت میں کیا یہ راجہ اور رانی کے خطاب اسے سکھ پہنچا ئیں گے!

اس طرح کی کتنی ہی باتیں اپنے دل میں سوچتے ہوئے بہیت لال اپنی بیوی کو ادھر ادھر کی باتوں سے دلاسا دینے لگے۔ تاکہ بہل جائے۔ اپنے مکان کے دروازہ پر پہنچتے ہی سیٹھ صاحب نے بیوی کو اوپر بھیجا۔ آپ سیدھے اپنے کمرے میں گئے۔ اور سب سے پہلے فون کے لنگر کو دیکھا۔ لنگر کی بغل میں ان کی لگائی ہوئی کاغذ کی گدی جیوں کی توں لگی تھی۔ اسے ہٹا کے کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ تب چاہا کہ چونگا اٹھائیں اور اپنی سالی کے مکان سے حالت دریافت کریں کہ رک گئے ...... دروازہ پر کسی موٹر کے ٹھہر جانے کی آہٹ ہوئی۔ یہ اس وقت رات کے گیارہ بجے کون آیا؟ ... ٹیلیفون سے ہٹ کر وہ کھڑکی

پاس آئے - دیکھا دھول سے اٹی ایک بڑی موٹر دروازے پر آ کھڑی ہوئی ہے - کون ہے؟ کہاں سے آیا! ہیبت کے مارے سیٹھ جی خود ہی دروازہ کے پاس جا پہنچے - جب تک پہنچیں پہنچیں، تب تک ایک آدمی کو موٹر سے اُتر قریب آتا دیکھ بولے "ہیں! رام پرشاد!! تم اس وقت؟ کیوں کیا بات ہے؟ گپلو کیسا ہے!!

یہ رام پرشاد سیٹھ جی کا بہت ہی پرانا اور بھروسہ والا نوکر تھا - اپنے لڑکے گوپال چند سندھیا کی دیکھ رکھ کے لئے سیٹھ جی نے اسے اس کے ساتھ بنارس بھیجا ہوا تھا - اس وقت ایسے وقت آتے دیکھ سیٹھ جی کا اندیشہ کرنا واجب سا تھا - اور رام پرشاد تھا بھی بہت گھبرایا ہوا - سیٹھ جی کے سوال کے جواب میں اس کے منہ سے کچھ ٹھیک بات نکل نہ سکی صرف دو بار "سرکار!" "سرکار!" کہہ اس کی زبان ہکلا کے بند ہو گئی - سیٹھ جی کی چھاتی دھڑک اٹھی، پوچھا "بتا تا کیوں نہیں کیا بات ہے؟ گوپال میرا بچہ کیسا ہے؟" بڑی مشکل سے رام پرشاد کے منہ سے نکلا "سرکار! ان کی موٹر الٹ گئی اور سخت چوٹ کھا کے ہسپتال میں پڑے ہیں!!" "ہیں! ہسپتال میں!!" سیٹھ جی نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا - اور تب پاس

پڑی کرسی پر گر پڑے - سچ مچ ان کا یہ اکلوتا بیٹا انہیں جان سے زیادہ پیارا تھا -

کسی نہ کسی طرح اپنے کو سنبھال سیٹھ جی اٹھے اپنے کمرہ میں پہنچے گدی پر نڈھال ہو کر گر پڑے - رام پرشاد کو سامنے بیٹھنے کا اشارا کر کے کانپتی آواز میں بولے - "کیسے کیسے کیا ہوا سب کہو!" رام پرشاد کے ڈھنگ سے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ معاملہ خراب ہو گیا ہے - اس کے اس طرح رات کے وقت موٹر کر کے بنارس سے پٹنہ آنے سے ان کے دل کو اور بھی دھکا دے کے بتایا تھا کہ ضرور کوئی بات اس سے بھی کڑی سننے کو باقی ہے - جیسے ابھی رام پرشاد کہہ سن رہا ہے - رام پرشاد بولا "سرکار! گوپال بابو اپنے تین چار دوستوں کو لئے گھومنے گئے تھے، خود ہی ڈرائیو کر رہے تھے - راستہ میں ایک بیل گاڑی ..... !" غصہ سے سیٹھ جی نے ہانک لگائی "اس کی طبیعت اب کیسی ہے سو کہدو - ہسپتال کا ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟" رکتا رکتا رام پرشاد بولا "سرکار ان کے سر میں بہت کڑی چوٹ لگی ہے - ہڈی ٹوٹ کے اندر گھس گئی ہے - جان کا سخت.....!" زور سے سیٹھ جی بولے "ابھی تک جیتا ہے؟ بولتا کیوں نہیں کمبخت؟" رام پرشاد بولا "حضور مجھے وہاں سے چلے تین گھنٹے ہو گئے - میں

میں جو ہوا ہو، مگر میرے آنے تک تو بیہوش
ہونے پر بھی جیتے تھے۔ ڈاکٹروں نے دیکھ کے کہا
تھا کہ سر کی ہڈی مغز کے اوپر دھنس گئی ہے اگر
آپریشن کر کے فوراً ہٹا نہ دی گئی تو جان جانے میں
شک نہیں۔ مگر آپریشن کرنے میں جان کا خطرہ
تھا، اس لئے یونیورسٹی کے ڈاکٹر بنا باپ کی
اجازت کے آپریشن کرنے تیار نہ ہوئے۔ سرکار
کو کتنا فون کیا۔ کتنا ایکسچینج سے کہا، بار بار یہی
سنائی دے "کوئی جواب نہیں ملتا" آخر میں
بہت کہنے سننے پر جواب ملا۔" شاید فون بگڑ
گیا ہے۔ ادھر سے کوئی بھی جواب نہیں آرہا ہے
لاچار ٹیکسی کر دوڑا دوڑا چلا آرہا ہوں ۔۔!"
سیٹھ جی سر کو ہاتھ لگائے لیٹ گئے ان
کی سالی بیمار تھی، اس کے بارے میں کوئی بری
خبر سننے میں نہ آئی جسے سن کے ان کی بیوی ڈنر
میں جانے سے انکار کر دیتی۔ اور اس کے نہ جانے
سے کل کے خطاب کی فہرست میں شائد ان کا نام
آنے سے رہ جاتا۔ یہ سب معمولی باتیں سوچ
سوچ کے انہوں نے لنگر بگاڑا تھا۔ مگر اس
بیچ میں کیا ہوگیا۔ یہ کیسی خبر انہیں سنائی گئی،
یہ پرماتما نے کیسا بدلہ ان کے ساتھ لیا۔ طرح
طرح کی ایسی ہی باتیں ان کے دماغ میں تیزی
سے چکر مارنے لگیں کہ کچھ دیر کے لئے وہ اپنی سب
سدھ بدھ گنوا بیٹھے۔

پر یکایک انہیں ہوش آیا۔ فون کی گھنٹی
کی آواز سن کر۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو ان کی بیوی
وسنتی دیوی فون کے پاس کھڑی بات کر رہی
تھیں۔ ان کی آنکھیں امنڈ آئیں۔ وہ اپنی
بیوی کو دیکھنے لگے جنھوں نے دروازہ کے پاس
کھڑے ہو کر اپنے نوکر کی ساری باتیں سن لی تھیں۔
تھوڑی دیر بعد انھوں نے وسنتی دیوی کو یہ
کہتے سنا "آپ یونیورسٹی کے ہسپتال سے بول
رہے ہیں۔ جی ہاں۔ میں ہی ہوں گوپال چند
سندھیا کی ماں۔ اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟"
جواب کیا آیا وہ سُن نہ سکے۔ پر وسنتی دیوی کو
یہ کہتے سنا "آپ بے کھٹکے فوراً آپریشن کر دیا
کیجئے پرماتما کے ہاتھ ہے۔ ہم لوگ فوراً موٹر
سے روانہ ہوتے ہیں۔" سیٹھ جی اٹھ بیٹھے۔
کانپتی لرزتی آواز سے انھوں نے پوچھا "کیا
ابھی تک جیتا ہے؟" بنا سر گھمائے وسنتی دیوی
نے جواب دیا "ہاں! مگر بہت خطرناک حالت
ہے۔" تب رام پرشاد سے بولیں "تم جاؤ اور
سکھو سے ہماری بڑی موٹر فوراً پھاٹک پر
لانے کو بولو!" سچ مچ سیٹھ جی کی بہ نسبت
وسنتی دیوی اپنے کو اس وقت زیادہ قابو میں
رکھے ہوئے تھیں۔

پندرہ منٹ کے بعد ہی میاں بیوی نہارں کے لئے روانہ ہوگئے۔ اس بیچ میں اپنی بہن کے یہاں فون کرکے وسنتی دیوی نے جان لیا تھا کہ ان کی طبیعت سنبھلی ہوئی ہے۔

- - - - - - - - - - -

ہزاروں روپئے خرچ ہوئے۔ دوڑ دھوپ پریشانی کی انتہا نہیں۔ پھر بھی گوپال کی جان بچ گئی۔ تین مہینوں کے بعد وہ ہسپتال سے نکل سکا۔ اور اب کشمیر کی ٹرپ سے لوٹ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ ہشاش بشاش اور صحت مند دکھائی پڑتا ہے۔ پر سیٹھ جی کے دل میں اس وقت سے کچھ ایسی ہیبت بیٹھ گئی ہے کہ وہ ٹیلیفون کے پاس جاتے بھی گھبراتے ہیں۔

جب یاس ہوئی آہوں نے سینے میں مچلنا چھوڑ دیا

اب خشک مزاج آنکھیں بھی کھلیں ان نے بھی مچلنا چھوڑ دیا

ناوک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا

مرغان خوش الحاں ہوگئے چپ آہو نے اچھلنا چھوڑ دیا

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں، ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب

اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

ایک خط

جہاں بانو ایم۔ اے

افسوس بیشمار سخنہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

میں نے اس کے آگے تمھیں لکھ دیا تھا کہ آئندہ کسی قسم کے القاب سے تمھیں مخاطب نہ کروں گی۔ بس خط لکھو مگر گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ یہی زندگی کی اوندھی سیدھی باتیں جو بعض وقت دل۔ دماغ کو ناکارہ کر دیتی ہیں۔ محسوس کرتے کرتے جی چاہتا ہے تمھیں بھی سنا دوں۔ کیونکہ میں اب تمہارے لئے تفریح طبع کا کوئی سامان مہیا کرنا نہیں چاہتی۔ تم نے مجھے اُلجھا دیا ہے۔ پھر میں کیوں تمھیں سلجھانے کی کوشش کروں —۔ زندگی پر غور کرتے کرتے اب اس نتیجہ پر پہنچ گئی جہاں سے یہ فلسفہ شروع ہوتا ہے۔ جب انسان زندگی کو کھیل سمجھنے لگے۔ اس کے کڑوے کسیلے گھونٹ امرت کی طرح گھول کر پینا سیکھ لے۔ ٹیڑھے ترچھے تیروں کو قابل برداشت بنا لے۔ تو پھر زندگی اتنی بوجھل و گراں نہیں ہو جاتی۔ لیکن اخلاقی فضا کی بیگانہ وشی بھی سہی نہیں جاتی۔ جس پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے۔ اسی سے بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔ دل کے پارے ہو جاتے

والے فقرے۔ آخر بتاؤ کون سہہ سکتا ہے۔ ابھی دل اتنا مضبوط نہیں ہوا۔ کیا ہے تو مذاق ہو رہا ہے۔ کسی کا دل چھلنی تو کسی کا مذاق۔ اف بتاؤ میر کے اس ناصحانہ شعر میں کتنی جان ہے۔ کہتا ہے:

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر!
ہے پیارے ہنوز دلی دور

ہم مسلمانوں میں ہی یہ دل دکھانے والے انداز کیوں ہیں۔ غالب کہتے ہیں۔ جواب میرے بالکل حسب حال ہے "گو مسلمانوں کی ایک بھی خصوصیت مجھ میں موجود نہیں۔ لیکن جانے کیوں میرا دل ان پر دکھتا ہے" نہ پوچھو یہ دل اتنا بوڑا اتنا تھکا ہوا، اتنا بزدل کیوں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہا، کتنی گہرائی ہے۔ اس فقرہ میں۔ تم کیا جانو لیکن شاید دل دکھانے والے ہی یاد رہ جاتے ہیں۔ خود کو یاد رکھنے کے لئے ان جیسوں نے ایک اس قسم کا ڈھونگ مچایا ہے۔ دشمن دوست سے زیادہ یاد رہتا ہے نا؟ ناخن کو ٹھوکر لگتی ہے تو بار بار خیال اسی کی طرف جاتا ہے۔ دوسری انگلیوں کی فکر بھی نہیں ہوتی۔ کانٹے کی کھٹک بھولنے کی چیز ہے؟ پھول توڑتے ہوئے اس کی چبھن میں ایک خاص قسم کا لطف آتا ہے۔ تو یہ ہے میرا دشمن۔ ایک دشمن جو حقیقت میں دشمن ہے۔ شاعر نے دماغ اور اس کا بھاری کر دیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔ ؎

ہر دم ز تو بر سینہ صد داغ جفا خواہم
با درد تو خو کردم حاشا کہ دوا خواہم

تمہارے چند عجیب و غریب سوالات کے جواب میں نہیں دے سکتی۔ کچھ ایسی بات تو نہیں لیکن پھر بھی ہے کچھ ایسی ہی بات۔ اس موقع پر ایک شعر سنو گی؟ سنو کتنا نازک سا تخیل ہے اور کیا انوکھا پن ہے اس میں۔

مجھ سے تو راز عشق کا افشا نہیں ہوا
لیکن چلے ہی جائے ہے تاکید اب تلک

سنو۔ ضمیر کی تسکین کا ایک لمحہ! ساری عمر کی کلفتوں کو بدل سکتا ہے۔ اور یہاں ضمیر کو ہی تسکین نہیں۔ روح کی منزل سے چین و آرام دور دور رہتے ہیں۔ اس "دور" پر ایک چھوٹی سی بحر کا منا سا شعر یاد آیا۔ کتنی پاکیزہ حقیقت۔

نگاہ سے دور رہنے والو!
میرے خیالوں کے پاس کیوں ہو؟

گذشتہ مرتبہ جب کہ میں بیمار ہو گئی تھی اس وقت سے یہ حال ہے کہ دنوں نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر کوئی ایسی دوا بھی نہیں دیتا کہ بس سوتی ہی رہوں۔ ایسی دوائیں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ دل و دماغ سن ہو جاتے ہیں اور انسان پر ایک غنودگی

سی طاری رہتی ہے۔ لیکن ہمیں کہاں یہ فرصت کے دن نصیب۔ دماغی الجھنیں۔ افکارِ عالم ہی سونے نہیں دیتے۔ صبح اٹھی تو اٹھنے کو جی نہ چاہا صبح کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی۔ یونہیں اونگھتی آنکھوں پر تکیہ رکھے پڑی رہی چھٹی کا دن تھا۔ آنکھ کھولنے کا جی نہ چاہتا تھا۔ جانے کیا آسیب رہتا ہے اس وقت آنکھوں میں۔ طبیعت یہ چاہتی تھی کہ آج مجھے تمام دن کوئی بستر سے نہ اٹھائے۔ کاش مجھے یہ احساس ہی نہ ہوتا کہ مجھے صبح اٹھنا ہے — "یہ فرض" اف کتنا خشک، بے لطف، بے معنی، بے رس نکما، غیر شاعرانہ سا لفظ ہے توبہ توبہ۔ ہمارے یہاں رات پیرس کی راتوں کی طرح گیارہ بجے شروع ہوتی ہے۔ دس بجے رات کا وقت تو ابھی "شامِ شام" ہے۔ کیوں جناب میری راتوں سے بھلا آپ کو کیا دلچسپی؟ یوسف ظفر پوچھتے ہیں۔ سے اچھا اب تم کہو۔ تم پر بھی رات آتی ہے۔

وہ رات کا قصہ تھا اب یہ دن کی کہانی ہے۔ شمیم کا باغ دیکھنے گئی تھی۔ قسم قسم کے پھولوں سے رشکِ جناں بنا ہوا ہے کیسی ناقدر ہے چھوڑ کر چلدی کشمیر۔

نسیمہ سے تو اب راستہ گلی کی ملاقات رنگئی۔ نہ اس کے پاس وقت نہ مجھے اتنی فرصت۔ جی کیا فرمایا آپ نے میرا دل — اس کی تعریف؟ ایک طوفان، ایک ہنگامہ، ایک بھونچال یا ایک جنجال اس کے سوائے اور کیا۔ نکمے خیالات جہاں بستے ہیں، جو ٹوٹ جانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یوں بھی دل کی حالت بتانے میں کوئی کامیاب ہوا ہے جو میں ہو سکوں گی۔ زمین ہلجائے تو اس کا نام زلزلہ ہے۔ لیکن دل کی اس حالت کا کوئی نام نہیں۔ سمندر میں ہلچل ہو جائے تو وہ طوفان ہے، طغیانی ہے، تلاطم ہے۔ مگر دل کی اس نوعیت کی ہلچل کو کیا کہا جا سکتا ہے۔ کچھ بھی کیا سکتے ہیں۔ آسمان پر کالے کالے بادل ہوں جو نہ کھلتے ہوں نہ برستے ہوں تو اس کو گھٹا کہتے ہیں۔ مگر دل پر جب ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو نہ روتے بنتی ہے نہ ہنستے بنتی ہے۔ کچھ ایسی ویسی حالت ہو جاتی ہے جس کے اظہار پر قدرت نہیں۔ گونگے کا خواب جیسے۔ یا پھر سے

ایک آوارہ سکون کا اضطراب
سانس لیتا ہے دل خاموش میں!

یہ شاعر نہ ہوتے تو میں یقیناً پاگل ہو جاتی۔ گو اب بھی پاگل نہیں تو نیم پاگل ضرور ہوں۔ کم از کم محسوس تو ایسا ہوتا ہے۔ اور تم؟ انہہ سے دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند۔

والے فقرے۔ آخر بتاؤ کون سہہ سکتا ہے۔ ابھی دل اتنا مضبوط نہیں ہوا۔ کیا ہے تو مذاق ہو رہا ہے۔ کسی کا دل چھلنی تو کسی کا مذاق۔ اف بتاؤ میر کے اس ناصحانہ شعر میں کتنی جان ہے۔ کہتا ہے:

شکوہ آبلہ ابھی سے میر!
ہے پیارے ہنوز دلّی دور

ہم مسلمانوں میں ہی یہ دل دکھانے والے انداز کیوں ہیں۔ غالب کہتے ہیں۔ جواب میرے بالکل حسب حال ہے "گو مسلمانوں کی ایک بھی خصوصیت مجھ میں موجود نہیں۔ لیکن جانے کیوں میرا دل ان پر دکھتا ہے" نہ پوچھو یہ دل اتنا بوڑھا اتنا تھکا ہوا، اتنا بزدل کیوں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہا، کتنی گہرائی ہے۔ اس فقرہ میں۔ تم کیا جانو لیکن شاید دل دکھانے والے ہی یاد رہ جاتے ہیں۔ خود کو یاد رکھنے کے لئے ان جیسوں نے ایک اس قسم کا ڈھونگ رچایا ہے۔ دشمن دوست سے زیادہ یاد رہتا ہے نا؟ ناخن کو ٹھوکر لگتی ہے تو بار بار خیال اسی کی طرف جاتا ہے۔ دوسری انگلیوں کی فکر بھی نہیں ہوتی۔ کانٹے کی کھٹک بھولنے کی چیز ہے؟ پھول توڑتے ہوئے اس کی چبھن میں ایک خاص قسم کا لطف آتا ہے۔ تو یہ ہے میرا دشمن۔ ایک دشمن، جو حقیقت میں دشمن ہے۔ شاعر نے دماغ اور اس کا بھاری کر دیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔ ؎

ہر دم ز تو بر سینہ صد داغ جفا خواہم
با درد تو خو کردم حاشا کہ دوا خواہم

تمہارے چند عجیب و غریب سوالات کے جواب میں نہیں دے سکتی۔ کچھ ایسی بات تو نہیں لیکن پھر بھی ہے کچھ ایسی ہی بات۔ اس موقع پر ایک شعر سنو گی؟ سنو کتنا نازک سا تخیل ہے اور کیا انوکھا پن ہے اس میں۔

مجھ سے تو راز عشق کا افشا نہیں ہوا
لیکن چلے ہی جاتے ہے تاکید اب تلک

سنو۔ ضمیر کی تسکین کا ایک لمحہ! ساری عمر کی کلفتوں کو بدل سکتا ہے۔ اور یہاں ضمیر کو ہی تسکین نہیں۔ روح کی منزل سے چین و آرام دور دور رہتے ہیں۔ اس "دور" پر ایک چھوٹی سی بحر کا منا سا شعر یاد آیا۔ کتنی پاکیزہ حقیقت۔

نگاہ سے دور رہنے والو!
میرے خیالوں کے پاس کیوں ہو؟

گذشتہ مرتبہ جب کہ میں بیمار ہو گئی تھی اس وقت سے یہ حال ہے کہ دنوں نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر کوئی ایسی دوا بھی نہیں دیتا کہ بس سوتی ہی رہوں۔ ایسی دوائیں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ دل و دماغ سن ہو جاتے ہیں اور انسان پر ایک غنودگی

سی طاری رہتی ہے۔ لیکن ہمیں کہاں یہ فرصت
کے دن نصیب۔ دماغی الجھنیں۔ افکار عالم ہی
سونے نہیں دیتے۔ صبح اٹھی تو اٹھنے کو جی نہ چاہا
صبح کی روشنی آنکھوں میں چُبھنے لگی۔ یونہیں
اونگھتی آنکھوں پر تکیہ رکھے پڑی رہی چھٹی
کا دن تھا۔ آنکھ کھولنے کا جی نہ چاہتا تھا۔
جانے کیا آسیب رہتا ہے اس وقت آنکھوں
میں۔ طبیعت یہ چاہتی تھی کہ آج مجھے تمام دن
کوئی بستر سے نہ اٹھائے۔ کاش مجھے یہ احساس
ہی نہ ہوتا کہ مجھے صبح اٹھنا ہے ــــ "یہ فرض"
اف کتنا خشک، بے لطف، بے معنی، بے
رس نکما، غیر شاعرانہ سا لفظ ہے توبہ توبہ۔
ہمارے یہاں رات پیرس کی راتوں کی طرح گیارہ
بجے شروع ہوتی ہے۔ دس بجے رات کا وقت
تو ابھی "شام شام" ہے۔ کیوں جناب میری راتوں
سے بھلا آپ کو کیا دلچسپی؟ یوسف ظفر پوچھتے
ہیں۔ ــ اچھا اب تم کہو۔ تم پر بھی رات
آتی ہے۔

وہ رات کا قصہ تھا اب یہ دن کی کہانی
ہے۔ شمیم کا باغ دیکھنے گئی تھی۔ قسم قسم کے
پھولوں سے رشک جناں بنا ہوا ہے کیسی نادر
ہے چھوڑ کر چلدی کشمیر۔

نسیمہ سے تو اب راستہ گلی کی ملاقات
رہ گئی۔ نہ اس کے پاس وقت نہ مجھے اتنی فرصت۔
جی کیا فرمایا آپ نے میرا دل ــــ اس کی تعریف؟
ایک طوفان، ایک ہنگامہ، ایک بھونچال یا ایک
جنجال اس کے سوائے اور کیا۔ نکمے خیالات
جہاں بستے ہیں، جو ٹوٹ جانے میں اپنا ثانی
نہیں رکھتا۔ یوں بھی دل کی حالت بتانے میں
کوئی کامیاب ہوا ہے جو میں ہو سکوں گی۔
زمین ہلجائے تو اس کا نام زلزلہ ہے۔ لیکن
دل کی اس حالت کا کوئی نام نہیں۔ سمندر میں
ہلچل ہو جائے تو وہ طوفان ہے، طغیانی ہے،
تلاطم ہے۔ مگر دل کی اس نوعیت کی ہلچل کو کیا کہا
جا سکتا ہے۔ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ آسمان پر کالے
کالے بادل ہوں جو نہ کھلتے ہوں نہ برستے ہوں
تو اس کو گھٹا کہتے ہیں۔ مگر دل پر جب ایسی کیفیت
طاری ہو جاتی ہے تو نہ روتے بنتی ہے نہ ہنستے
بنتی ہے۔ کچھ ایسی ویسی حالت ہو جاتی ہے جس
کے اظہار پر قدرت نہیں۔ گونگے کا خواب جیسے۔
یا پھر ــ

ایک آوارہ سکون کا اضطراب
سانس لیتا ہے دل خاموش میں!

یہ شاعر نہ ہوتے تو میں یقیناً پاگل ہو جاتی۔ گو اب بھی
پاگل نہیں تو نیم پاگل ضرور ہوں۔ کم از کم محسوس تو ایسا ہوتا
ہے۔ اور تم؟ انہہ ــ دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند۔

رکشا والا

جناب عزیز قادری صاحب

باپ کے مرتے ہی منگو کو اپنی پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ چھٹی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ آگے پڑھنے کی بڑی خواہش تھی۔ لیکن گھر کا کمانے والا ہی اُٹھ گیا تو چودہ سال کے بچے منگو ہی کے کندھوں پر ماں اور چھوٹی بہنوں کے پیٹ پالنے کا بوجھ آن پڑا چار چھ دن تو رونے دھونے میں کٹ گئے۔ باپ کی جمع کی ہوئی ذراسی پونجی بھی اڑ گئی اور فاقوں کی نوبت آئی تو مدرسہ کا کھلنڈرا اور خوش رہنے والا چھوکرا اتنی بڑی دنیا میں پیسے کمانے کیلئے نکلا۔ کہاں مدرسہ کی چھوٹی سی دنیا جس میں سوائے ہنسنے اور خوش رہنے کے کوئی اور کام نہ تھا۔ اب جو اتنی بڑی دنیا میں اس نے قدم رکھا تو حیران رہ گیا کہ یا اللہ اتنی بڑی بڑی دکانیں ہیں سینما ہیں موٹریں ہیں۔ محل ہیں۔ بڑے بڑے بازار ہیں اور اتنے مالدار لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ لیکن اسے چار پیسے نہیں ملتے۔ باپ کی زندگی میں اسے روز آنہ دو پیسے خرچ کرنے کو مل جایا کرتے تھے اور وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی ریوڑیاں کھایا کرتے لیکن اب اسے پتہ چلا کہ پیسے کس چیز کا نام ہے۔

بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن دونوں دن بھر بھوکی پیاسی پڑی رہتیں۔ لیکن کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ منگو بیچارا کیا کرتا۔ ہر جگہ سر مارا لیکن کسی نے ہفتے بھر کام کرنے سے پہلے دو آنے دینے کو بھی رضامندی ظاہر نہ کی۔

شہر میں ہر قسم کی سواریاں نظر آتی ہیں۔ موٹریں، بس۔ بگھیاں۔ تانگے، سیکلیں اور رکشائیں بھی۔ منگو حیرت سے دیکھتا تھا کہ ایک دُبلا پتلا سا آدمی کس طرح دو دو موٹی سواریوں کو بٹھا کر سڑکوں پر گھسیٹا کرتا ہے۔ کوئی کام نہ ملنے کی وجہ سے آخر اس نے بھی سوچا کہ وہ کیوں نہ رکشا چلائے ایک رکشا والے سے اوس نے پوچھا کہ رکشائیں کہاں ملتی ہیں۔ اس بیچارے نے پتہ بتلا دیا۔ منگو وہاں پہنچا۔ رکھشا کے مالک نے اس کا نام وام لکھ لیا۔ اور اس کا ایک آدمی منگو کا گھر دیکھ آیا تاکہ رکشا لے کر وہ کہیں غائب نہ ہو جائے۔

رکشا پاکر منگو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ سوچنے لگا کہ آج شام کو میں بھی اپنی کمائی کے پیسے گھر لیجاؤں گا۔ تھوڑی دیر تک تو خوشی میں رکشا

لے کر دوڑتا رہا۔ جب ذرا تھک گیا تو سڑک پر آیا اور ہر پیدل چلنے والے کی صورت دیکھنے لگا کہ کون اب اس کی رکشا میں سوار ہوتا ہے۔ ایک موٹے سے لالہ جی کو اپنی طرف آتے دیکھ وہ خوشی سے ناچ اٹھا۔ لالہ جی بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر رکشا والے سے کرایہ چکانے کی کوشش کر چکے تھے۔ انہوں نے بھی سونچا کہ لونڈا معلوم ہوتا ہے کم کرایہ میں پہنچا دے گا۔

پتہ بتایا اور کہدیا کہ ایک آنہ دیں گے بیٹھ گئے۔ منگو نے رکشا کا ہنڈل اٹھایا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر پر کسی نے پہاڑ رکھ دیا ہے پھر بھی چلنا شروع کیا، ایک میل، دو میل لیکن لالہ جی کا گھر ہے کہ آتا ہی نہیں۔ منگو کا پسینہ اور تھکن سے برا حال تھا۔ پہلے تو دو روز سے کھانے کو ملا نہیں۔ دوسرے سیٹھ جی کا دو من وزن اور پھر اتنا فاصلہ۔ غریب منگو کی جان پر بن گئی۔ ہلا نہیں جاتا تھا لیکن لالہ جی ہیں کہ برابر گالیاں دئے جاتے ہیں کہ ابھی اور آگے چل بے لونڈے۔ لونڈے نے آگے چلنا چاہا۔ لیکن قدم جواب دے چکے تھے۔ چکر پر چکر آ رہے تھے۔ بھوک اور پیاس نے اس کے ہوش و حواس گم کر دے تھے۔ وہیں چکر کھا کر گر پڑا۔ سر ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا۔ نوجوانی کا سرخ خون، ایک دھار میں بہہ نکلا، لالہ جی کھشنے میں سے پھسل کر زمین پر آ رہے۔ اور ایک اکنی ان کی جیب سے نکل کر خون کے دھارے میں مل گئی۔ یہ منگو رکشا والے کی زندگی کی قیمت تھی جو لالہ جی کو گھر پہنچنے سے پہلے ہی دیدینا پڑی۔

قطب مینار

جناب نیرؔ (امرت سری)

قطب مینار! اے نشانِ خواجۂ گردوں وقار
سطوت و جبروت رفتہ کا ہے تو آئینہ دار
تیری رفعت اک عجوبہ ہے زمانے کے لئے
چوب ہے تو آسماں کے شامیانے کے لئے
تیری ہر منزل پہ کندہ منزل قرآن ہے
ہیبت مسلم کا حامل۔ حامل قرآن ہے
ملک اپنا گرچہ نذر گردش ایام ہے
پھر بھی تیرے دم سے باقی شوکت اسلام ہے
ہوگئی برباد دلّی تو مگر آباد ہے!
اللہ اللہ! کس قدر محکم تیری بنیاد ہے
توڑتی ہے حوصلہ میرا اگر رفعت تیری
شوق نظارہ مگر ہمت بڑھاتا ہے مری
تیرے نظارے سے آنکھوں کو طراوت مل گئی
روح کو بالیدگی اور دل کو فرحت مل گئی
کس قدر جاں آفریں ہے اور کیسی دلفزا
تیرے سبزہ زار کی پرکیف اور ٹھنڈی ہوا
گرچہ ہیں اٹھکیلیاں اس کی مگر میرے لئے
دل مچل جاتا ہے تجدید تمنا کے لئے

فی النعت سرور عالم صلعم

جناب مسلّم صاحب

صدیر آرائے بزم انبیاء خیر الوریٰ آمد — دگر اندر دہِ ویران عالم کتخدا آمد

صبا آورد مژدہ از نعیم خلد در گوشم — جہاں رنگ و بو را صاحب سیف و ثنا آمد

ورود او مبارک کائناتِ ارض و جوہر را — شہنشاہ امم روح روانِ اولیاء آمد

ز نور بخت شد جلوہ نما بر خاکدان دہر — مپرس از شپرہ چشماں کہ خورشید از کجا آمد

ہزاران دیدۂ بینا بدیوار ازل بودہ — کہ تا عکس رُخ صانعِ عالم بر ملا آمد

یرین شان و رود سادہ اش قربان تکلفہا — غریب و مفلس و بے یار و بے برگ و نوا آمد

نظامات کہن را تا کشد یکسر خط بطلاں — بسیف و باقلم تنہا بقوم اشقیا آمد!

کلید علم اسمائیست اسمائے لطیف وے — محمدؐ مصطفےٰؐ و مجتبیٰؐ و مرتضیٰؐ آمد!

چہ ترسی مسلّما از کثرت عصیان خود ہردم

برائے بخشش ما شافع روز جزا آمد

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب سر مہدی یار جنگ بہادر

صدر المہام تعلیمات

شہاب

ناھید

ناہید

جلد ۸	خورداد ۱۳۵۴ف م اپریل ۱۹۴۵ع	نمبر ۷

۱- گانا۔ معصومہ جنگ بہادر کا ہے یہ گھریلو واقعات کو نہایت دلچسپ انداز میں لکھتی ہیں۔

۲- دل کے ٹکڑے تو دل ہی کے ٹکڑے ہیں مگر آپ داد دیجئے ان کے انتخاب کی۔

۳- کیسے لکھوں۔ صغرا جنگ بہادر نے ثابت کردیا ہے کہ یوں لکھا کرتی ہیں۔

۴- چھوٹے چھوٹے واقعات۔ درحقیقت بعض اوقات نہایت اہم بن جاتے ہیں یہ آپ کو دعوت غور و فکر دیرہے ہیں

۵- آج کل کی شادی مشاہدہ ہے وحیدہ نسیم کا۔

۶- السلام علیکم۔ کو آپ ہم معمولی الفاظ سمجھ کر ترک کر رہے ہیں مگر نہیں جانتے کہ اس میں ہمارے لئے کس قدر خیر و برکت ہے نئی تعلیم نے تو اس کو فرسودہ سمجھ رکھا ہے جب کسی محفل میں نشستند و برخواستن کا موقع آتا ہے تو عموماً سب ہی "شیک ہینڈ" کیا جاتا ہے جس میں وقت صرف ہوتا ہے اگر آپ السلام علیکم کہدیں تو کس قدر آسانی اور اچھی دعا ہوسکتی ہے۔ لیکن تہذیب تو شاید آپ کو اس کی اجازت نہ دے۔

۷- فہمی اور مظہر پہلی مرتبہ آئی ہیں۔ براہ کرم فہمی اپنا پتہ لکھیں۔

۸- بیچارہ ڈاکٹر کی بیچارگی پر شاید آپ افسوس کریں گے۔

"ب"

گانا

آنسہ معصومہ جنگ بہادر (حیدرآباد)

نہ معلوم کس کا قول ہے کہ گانا روح کی غذا ہوتی ہے۔ جس طرح غذا سے جسم میں قوت آتی ہے۔ اسی طرح گانا سننے سے روح کو تقویت ہوتی ہے۔ شاید یہ قول پہلے زمانہ میں ہوگا تو ہوگا لیکن آج کل تو اس کا الٹا ہی اثر ہے۔ کیونکہ جس طرح حد سے زیادہ کھانا جسم اور انسان کی صحت کے لئے مضر ہے۔ اسی طرح حد سے زیادہ گانا سننا بھی روح پر بار ہے۔

آپ کہیں گی نہ سنو زیادہ کوئی مجبور کرتا ہے کیا؟

جی بجا ارشاد آپ کا۔ اجی یہ پہلا زمانہ تھوڑا ہی ہے کہ کبھی کبھی برسوں میں گانا سننے کا اتفاق ہوتا تھا ورنہ اس روح والی غذا کے لئے تو روح ترپتی ہی رہتی ہوگی۔ آج کل ایک ریڈیو ہی کو لے لیجئے جو صبح سات بجے سے چیخنا شروع کرتا ہے تو رات کے بارہ بجے تک طرح طرح کی چیخم دھاڑ سن لیجئے۔ جس طرح کھانے کی چیزوں میں مختلف قسم کی غذائیں رہتی ہیں۔ مرغن۔ چٹپٹے ہلکے پھلکے کھانے اسی طرح روح کی غذا کی قسمیں ہیں۔ مرغن غذاؤں کی جگہ پکّے گانوں کو رکھ لیجئے۔ چٹپٹی غذا فلمی گانے ہوئے اور ہلکی پھلکی غذا تو وہی ہلکے پھلکے گانے ہوئے۔ کھانے والی مرغن غذا تو بڑے مزے سے کھائی جا سکتی ہیں۔ چاہے بعد میں اس کا نتیجہ کیسا ہی ہو۔ لیکن یہ روح والی مرغن غذا تو ذرا ٹیڑھی کھیر ہے جس کا ایک نوالہ بھی کانوں کے ذریعہ روح تک پہنچانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ جہاں سے " آ آ آ " کی تکرار شروع ہوئی کہ بس روح پر اس کا بار ہونے لگا۔ مجبوراً کھٹ سے ریڈیو بند کرنا پڑتا ہے۔ کم از کم میں تو ایسا ہی کرتی ہوں۔ اب رہے فلمی گانے تو یہ بھی ایک حد تک اچھے لگتے ہیں۔ پھر آپ یہی کہیں گی کہ نہ سنئے ریڈیو زیادہ۔ جب دل چاہا سنا جب نہ چاہا نہ سنا۔ اچھا چھوڑیئے ریڈیو کو اب لیجئے سینما۔ یہاں بھی وہی مصیبت۔ وہی گانا۔ گانا۔ گانا۔ مر رہے ہیں تو گانا گاتے ہوئے۔ بیمار ہیں تو گانا۔ بلکہ روتے روتے بھی گانا۔ خیر یہ سب چیزوں سے تو نجات مل سکتی ہے بقول آپ کے کہ اگر گانا پسند نہ ہو تو سینما بھی نہ جاؤ۔ لیکن آپ کو کیا معلوم میری مجبوریاں۔ سینما نہ جانے اور ریڈیو نہ

سُننے سے کہیں میرے کانوں کو امن مل سکتا ہے
اب باقی کیا رہ گیا؟ اجی سب سے بڑی مصیبت
بات یہ ہے کہ ہمارے برادر صاحبان کو ذرا گانے
سے بہت دلچسپی ہے ایسی کہ بس ہر وقت کچھ نہ
کچھ گنگناتے رہتے ہیں۔ اب بتایئے میں کانوں
میں روئی ٹھونس کر بیٹھنے سے تو رہی۔ بھائی
صاحب ہیں کہ وہ ایسا ہرا ہرا کر تانیں لگاتے
ہیں کہ بس تان سین کی روح بھی شرما جائے، ہم
بیٹھے الجبرا کے سوالات حل کر رہے ہیں اور چل
رہا ہے بھائی صاحب کا "کہوں کیا آس نراس
بھئی" خوب زوروں میں۔ اب کہو کہ بھائی ذرا
کم کیجئے نا آپ کا گانا تو جواب ملتا ہے کہ کیوں
کم کریں ہم گا رہے ہیں تم اپنا کام کرو۔ کیا خاک
کام کریں کچھ سمجھ میں بھی تو آئے۔ یہ بھائی صاحب
تو اپنے کو سمجھتے ہیں کہ بڑی اچھی آواز ہے ان
کی۔ جب گاتے ہیں تو روح تڑپ جاتی ہوگی
تان سین کی۔

اور تقی توبہ یہ تو ایسا چکٹ لڑکا ہے
لاکھ منع کرو ہزار خوشامد سے کہو مگر چل رہی ہے
ان کی غزل خوانی، ان حضرت کو غزل کا بہت
شوق ہے۔ جب دیکھو کسی نہ کسی شاعر کا دیوان
ہاتھ میں ہے اور لہک لہک کر گایا جا رہا ہے
"گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر" یا

"دو کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں"
اس قدر زور سے یہ غزل گائی جاتی ہے کہ کانوں
کے پردے پھٹ جائیں۔ اب رہے رضا بھائی
تو بیچارے کو نہ کوئی غزل ہی یاد رہتی ہے اور نہ
آواز ہی ہے۔ لیکن چوکتے یہ بھی نہیں۔ کبھی کبھی
شوق کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کیسا یہ بھی سن لیجئے
ایک مصرعہ غالب کا تو دوسرا ذوق کا۔ اور
ماشاءاللہ اس پر آپ کی آواز۔ سچ پوچھ نہیں تو
بھاگ جاتی ہوں وہاں سے۔ اور تو اور اس
فتنہ واجد بابو کو دیکھئے۔ یہ بھی اس فن کے
حد سے زیادہ ماہر ہیں۔ اور آپ کو گانے بھی کس کے
پسند ہیں۔ چارلی کے۔ ہر وقت امی سے چارلی کے
نئے نئے ریکارڈ منگوانے کا تقاضہ رہتا ہے۔
اور پھر اس کی پوری پوری نقل اتاری جاتی ہے
"صندل کا لگانا چھوڑ دیا" اور نہ معلوم کیا کیا
الا بلا۔ آج کل تو بس۔
"تیرا دھیان کدھر ہے بھائی پلٹ پلٹ"
چیخا کرتے ہیں۔ اب بتایئے آپ کہ ایسے گانوں
سے کوئی اپنے کو کہاں تک بچائے۔ منع کرو تو
الٹی سیدھی باتیں کرنے کو تیار۔ کہا جاتا ہے کہ
تم کیا جانو کہ گانا کیا چیز ہے۔ اری دیوانی روح
کو وجد میں لانے والی چیز ہے روح کو۔ میں باز
آئی بابا اس وجہ سے آپ لوگوں کے گانے سے

تو میری روح بھی تحلیل ہونے لگتی ہے۔ اگر سچ
پُوچھو تو مجھ کو گانے سے اس قدر نفرت بھی
نہیں۔ لیکن گانا گانا ہو تب نا؟
یہ کیا کہ ہر وقت چیخوں سے کان پھاڑے
جا رہے ہیں۔

اچھا اب اجازت دیجئے ذرا ریڈیو
سنونگی۔ گانا سننے نہیں۔ بلکہ آج بچوں کے
پروگرام ہیں استاد تشریف لائیں گے۔ ان کی
باتیں سنوں گی۔

پیغام عمل

نیمی (حیدرآباد)

جمہور کا خیال ہے کہ زندگی بہت مختصر ہے۔
مگر ہمنشیں!! اگر وقت کے صحیح استعمال کا طریقہ معلوم
ہو جائے تو ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

"میرے دوست! اٹھو، دن کو بیکار مت کھو، رات
آ رہی ہے، اس وقت ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔

جو لوگ بہار کے موسم میں پھولوں کے توڑنے کی تمنا
کرتے ہیں انھیں خزاں کے دنوں میں کانٹوں سے بھی زخمی ہونے
کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

ابھی روشنی ہے اس سے پہلے کہ دنیا تاریک ہو جائے ہم کو
منزل پر پہنچ جانا چاہئے۔

میرا زاویۂ نگاہ

مظہر النسا، مہر (حیدرآباد)

۱۔ بہت سی سرسری نگاہوں سے ایک غائر نظر بہتر۔

۲۔ ایک لمحہ حقیر میں وہ سب کر جاؤ جس قدر کہ تم کر سکتے ہو۔

۳۔ دولت کچھ نہیں اس کا صحیح مصرف سب کچھ ہے۔

۴۔ رنگین تصنع آمیزی سے کرخت صاف گوئی اچھی۔

۵۔ تصرفات بیجا سے کسمپرسی بہتر۔

۶۔ بیشمار قیمتی الفاظ سے ایک عملی قدم سود مند۔

۷۔ کسی پر کامل بھروسہ کرنا فریب نفس کا دوسرا نام ہے۔

۸۔ زیادہ سوچ راہ عملی میں رخنہ ڈالے گی۔

۹۔ احسان کر کے اترا نہ جاؤ۔

۱۰۔ بے محل انکساری سے وضعداری بھلی مگر وہ حد غرور تک نہ پہنچے۔

۱۱۔ زمانہ کو موہ لینا چاہتے ہو تو نوک زبان پر نرمی ہو۔

۱۲۔ محنت استوار ہوتی ہے ان الجھنوں سے جس کی پہلی ہی منزل پر تم اکتا جاتے ہو۔

دل کے ٹکڑے

(ج)

آپ نے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے جو مستقبل قریب میں شائع ہوگا۔ ہم دلچسپی کے لئے ہر مہینہ ایک صفحہ اس کے لئے وقف کر رہے ہیں۔

ے آئے تھے انسان ازل ہی سے اسیری
ترک دنیا میں سوچ کیا ناسخ

جب پرسش حال وہ فرماتے ہیں جانئے کیا ہوجاتا ہے
یہ کہتے، وہ کہتے، کہتے تھے جو وہ آتا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں

لوگ اس کو حضور کہتے ہیں!
بیداد گر کو رہ گئی کیا حسرت ستم

ہے ناز و ادا اس کی ہیں طرح کا ہتھیار
تجاہل، تغافل، تبسم، تکلم،

کیا ہوا اگر زباں ہے بند شجیع
کون سا غیرت گل سوئے گلستاں آیا

جو دل پہ گزرتی ہے، وہ دل ہی سمجھتا ہے
غلط یہ لفظ، وہ مضمون برا، یہ بندش سست

بچپن میں لقب پاتے ہیں دلبند جگر بند　حسرت
کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی، کچھ درد سوا ہوجاتا ہے　فانی
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا　میر

کیا جانئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا
پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں　داغ

تم نے آصف کا نام کیا رکھا
جب اپنی موت کوئی دل افگار مر گیا　داغ

قاتل نہیں محتاج مرا تیغ و سناں کا　سودا
یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر　جگر

ان سے کرتی ہیں گفتگو آنکھیں
آج بلبل جو اڑائی ہوئی اوسان آئی　نامعلوم

یہ آپ پہ کیا گزری، کیوں آپ ادھر آئے　شیفتہ
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو　انیس

کیسے لکھوں

آنسہ صغرا جنگ بہادر (حیدر آباد)

لکھنے کا شوق مجھ کو بچپن سے ہے، جب شروع شروع میں نے لکھنا سیکھا تو چپکے سے امی کی میز پر سے ایک آدھ کاغذ اور قلم اڑا لاتی اور کہیں کونے کھدرے میں بیٹھی اپنے ٹیڑھے میڑھے خط میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتی۔ جب ذرا بڑی ہوئی اور عصمت، شہاب وغیرہ پڑھنے لگی تو مجھ کو بھی شوق ہوتا ہے کہ میں بھی دوسری بہنوں کی طرح مضمون لکھا کروں۔ لیکن پھر خیال کرتی کہ " ایں خیال است و محال است وجنوں " کہاں میں اور کہاں مضمون نگاری، غرضکہ کئی دن تک اس شوق کو دباتی رہی۔ آخر کار ایک مضمون لکھکر شہاب ناہید کے لئے روانہ کردیا جو جناب ایڈیٹر صاحب کی مہربانی سے چھپ بھی گیا۔ اب کیا تھا۔ مجھ کو مضمون نگاری میں لطف آنے لگا۔ دوسرے ماہ میں ایک اور مضمون لکھ بھیجا وہ بھی شائع ہوگیا۔ آپ یہ سمجھتی ہوں گی کہ بس قلم ہاتھ میں لیا اور کھٹ سے ایک مضمون تیار "اجی" تو یہ کہیئے ابھی اتنی مشق کہاں اور دو چار مضمون لکھتی ہوں تو تب کہیں جاکر ایک مضمون قابل اشاعت ہوتا ہے۔ میں کیسے لکھتی ہوں، یہ بھی سُن لیجئے۔

" جب اسکول میں چھٹی ہوتی ہے تو ایک دن قبل ہی تصفیہ کر لیتی ہوں کہ کل ضرور کچھ لکھوں گی۔ عنوان کے متعلق بھی سوچ لیتی ہوں۔ دوسرے دن ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو جاتی ہوں۔ بس اب لکھنا شروع۔ ابھی دو چار سطریں ہی لکھنے پاتی ہوں کہ امی کی آواز آتی ہے۔ یہ فریدہ کہاں ہیں آج بہت دیر سے نظر نہیں آئیں میں جھٹ سے باہر نکل آئی " کیوں کیا کر رہی تھیں تم " امی نے پوچھا۔ مضمون لکھ رہی تھی " امی کو غصہ آگیا کہنے لگیں کہ " بس ہر وقت اب مضمون نگاری ہی ہوا کرے گی۔ یوں دن بھر اسکول میں رہتی ہو اور چھٹی کا دن مضمون نگاری میں ختم ہو جاتا ہے۔ آخر تم لوگ کچھ گھر کا کام بھی کرو گی۔ یا صرف پڑھنے لکھنے ہی میں دن گذاردو گی" بس ختم ہماری مضمون نگاری، جلدی جلدی کاغذ سمیٹ سماٹ چپکے سے امی کے پاس چلے آئے۔ اور کام میں لگ گئے۔ پھر دوپہر میں جب سب اِدھر اُدھر ہو گئے اس وقت اِس کو پُورا کر لیا۔

اس طرح سے کوئی دو تین مضمون لکھ کر شہاب کو بھجوا دیجئے۔ اب سنئے تبصرے ہماری مضمون نگاری پر۔ ہمارے بھائیوں وغیرہ کے محرم میں جب حیدر آباد گئے تو سب نے بنانا شروع کر دیا رضا بھائی کہتے کہ "بھئی ابتو فریدہ بڑی مضمون نگار بن گئی ہیں۔ اب تھوڑے دنوں میں کئی کتابوں کی مصنفہ بھی ہو جائیں گی۔ تقی بھائی کہنے لگے "ارے یہ بھی کوئی مضمون ہے۔ ایسے تو میں بائیں ہاتھ سے دن میں کئی لکھدوں" اس پر خوب خوب ہماری لڑائی ہوتی۔ میں کہتی "تو لکھئے نا؟ ایسے لکھنے والے ہیں جب ہی تو ابتک ایک سطر بھی آپ کی لکھی ہوئی نظر نہ آئی" جواب ملتا "کہ ہوں! تم ایسے کوڑ مغزوں کے لئے میں تھوڑی لکھوں گا۔ جب میرا مضمون کسی رسالہ میں چھپے گا تو سارے ہندوستان میں دھوم مچ جائے گی۔ سمجھیں!" "جی ہاں خوب سمجھ گئی" میں جل کر جواب دیتی۔ گرجنے والے بادل برسا نہیں کرتے" اور ظفر بھائی توبہ توبہ یہ تو سب سے خراب ہیں۔ انھوں نے تو صاف ہمارے مضمون لکھنے ہی سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ "اجی یہ چھوکریاں کیا لکھیں گی بھلا۔ امی سے خوشامد کر کے لکھوا لیتی ہیں اور نام اپنا کر لیتی ہیں" سُنیں آپ نے ان لوگوں کی باتیں۔ اب بھلا کہاں سے اتنی ہمت لاؤں کہ پھر مضمون لکھوں۔ جناب ایڈیٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ "آپ لوگ مشق جاری رکھئے آئندہ اچھا لکھنے لگیں گی" ابھی یہاں تو برا لکھنے ہی کے لالے پڑے ہیں اچھے کا وقت نہ جانے کب آئے۔

بعض لوگوں نے ہماری ہمت افزائی بھی کی یہ زیادہ تر بزرگ پارٹی تھی مثلاً نانا ابا نے خوب خوب ہماری تعریف کی۔ ابا نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ یہ ان ہی لوگوں کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ آج پھر میں نے قلم اٹھایا۔

اسکول میں بھی ہماری مضمون نگاری پر اعتراض ہوتے رہتے ہیں۔ سائینس کی ٹیچر کہنے لگیں کہ "کیوں فریدہ۔ اب کی تم نے نمبر بہت کم لئے ہیں کیا بات ہے؟ اس پر حساب کی ٹیچر فرمانے لگیں "بھئی انھیں مضمون نگاری سے کہاں فرصت ہے" پھر کہنے لگیں "دیکھو فریدہ جب تعلیم سے فراغت حاصل کر لو تو جی بھر کر مضمون نگاری کرنا۔ ایک وقت میں دونوں کام نہیں ہو سکتے" اب بتایئے آپ کہ میں کیسے لکھوں۔ کیا واقعی لکھنا ختم کر دوں یا سب کی باتیں اس کان سن کر اس کان اڑا دوں۔

چھوٹے چھوٹے واقعات

صغرا عبدالسبحان

ہماری گھریلو زندگیوں میں ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے ہیں جنھیں اگر نظرانداز نہ کیا جائے تو بات کے بتنگڑ کے علاوہ اکثر زندگیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔ ارشد اور حمیدہ ایک ہی گھر کے پلے بڑھے، جب ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو گھر کے ہر فرد کے دل میں ہل چل مچ جاتی ہے کہ دونوں کس طرح گزار رہے ہیں۔ یقین مانئے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس جذبہ کے تحت ہوتا ہے، محبت یا عداوت؟ اگر کسی ایک نے ارشد کے خیالات معلوم کرلئے اور بدقسمتی سے یہ معلوم ہوا کہ اسے حمیدہ سے کوئی لگاؤ نہیں تو اب یہ بات بھی بھلا حمیدہ سے چھپانے کی ہے؟ ہمدردی جو ہوئی اس کے ساتھ؟ حمیدہ بیچاری کو جو میاں کے دل کا حال معلوم ہوا تو خواہ مخواہ بھی اس کی نظریں ارشد کی ایک ایک باتوں پر رہنے لگی۔ یہ آج کہاں گئے ہوں گے؟ ان کے پاس کس کے خطوط آتے ہیں؟ ان کے ملاقاتی کیسے ہیں؟ چلئے شک وشبہ کی بنیاد جو تباہی کی کھلی نشانی ہے پڑجاتی ہے۔ ارشد کی ذرا سی سردمہری حمیدہ کے دل میں طوفان برپا کردیتی ہے۔ اب وہ اپنی نادانی سے جس کو بھی اپنا ہمدرد جان کر اپنا دکھڑا روئے وہ بھلا ارشد کے سامنے کیسے دہرایا نہ جائے۔ آخر وہ بھی اپنا لڑکا ہی جو ٹھیرا؟ آخر اس کا بھی کوئی اپنا ہے یا صرف حمیدہ سے ہی ہمدردی جتائی جائے۔ یہ لگائی بجھائی دونوں دلوں میں ایک دیوار کھڑا کردیتی ہے۔ ایسی دیوار جو ایک گھر کو بالآخر دو کرکے رہتی ہے۔ حالانکہ گھر والے چاہتے تو ان کی زندگیوں کو سنوار دیتے۔ شکایتوں کو نظرانداز کرکے ایک دوسرے کی اچھائی دلوں میں جاگزیں کرنے اس طرح ممکن تھا کہ کھلم کھلا بغاوت کی آگ نہ بھڑکنے پاتی۔ مگر یہ نہ ہوتا تو گھر والوں کا دلچسپ موضوع گفتگو ہی کیا رہ جاتا؟ اسی طرح غیر گھرانوں کے شادی بیاہ میں بہت سی باتیں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو فریقین کو نظرانداز کردینی ہی عین مصلحت ہے۔ چونکہ طبائع مختلف ہوتے ہیں اس لئے لڑکیوں کو غیر خاندان میں بہت دقت پیش آتی ہے ایسے وقت میں گھر والوں خصوصاً ماؤں کا فرض ہے کہ لڑکی کی دلجوئی اس طرح نہ کریں کہ اسے سسرال والوں سے نفرت ہوجائے بلکہ سسرال کی عزت اور قدر لڑکی کے دل میں ہر وقت اور ہر طرح بڑھانی چاہئے اس طرح ان کی لڑکی کی زندگی ہی سنورتی ہے۔ جو

مائیں لڑکیوں کے ساتھ خود بھی رونے بیٹھ جاتی ہیں یا کسی بات پر لڑکیوں کو اپنے گھر بٹھا لیتی ہیں وہ ان کے ساتھ سراسر ظلم کرتی ہیں۔ شادی کے بعد لڑکی کو اس قابل بنانے میں ماؤں کو فخر حاصل کرنا چاہئے کہ لڑکی خود اپنا گھر سنبھال لے اور وہاں کی ہر بری بات بھی نباہ لے۔ اس کے برعکس شادی ہوتے ہی سمدھیانہ دشمنوں کا گھرانا خیال کیا جاتا ہے، ہر ذری ذری بات پر نظر ہوتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ فلاں بات ہماری لڑکی کو ستانے کے لئے کیگئی ہے۔ اسی طرح وہ گھرانے جہاں ایک سے زیادہ خاندان گذر بسر کرتے ہیں ان میں سے ہر فرد کو اپنی اپنی زبان پر قابو رکھتے ہوئے شیریں کلامی کو فروغ دینے میں کوشاں رہنا چاہئے۔ ایک دوسرے کی کھوج، کسی کی اچھی باتوں سے جلنا، دو آدمیوں کو لڑا کر تماشہ دیکھنا بظاہر بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن ایسی زندگی کتے بلیوں کی زندگی سے بھی بدتر ہے کیونکہ ؎

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

ازدواجی زندگی میں تو ایسے ان گنت واقعات درپیش ہوتے ہیں جو رائی کا پہاڑ تو بن سکتے ہیں مگر جنھیں نظر انداز کر دیا جائے تو ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ یہ نظر اندازی محبت کو مستحکم کرنے میں سچی معاون ثابت ہوتی ہے۔

مادری محبت

دنیا کا سب سے زیادہ دلکش اور موثر منظر کیا ہے؟ ماں کے وجود کا منظر ہے جب وہ اپنے بچہ کو ممتا بھری نظروں سے دیکھتی ہے اس سے زیادہ دلفریب نظارہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہر قسم کے افکار دنیا سے خالی الذہن، سادہ دل بچہ کودتا اچھلتا پھرتا ہے اور اس کی ماں مادرانہ محبت و ہوشیاری سے اس کی معصومانہ حرکتوں کی نگرانی کر رہی ہے۔ — نامعلوم کمال

اوس احساس سے زیادہ خوشگوار احساس شاید کوئی نہیں جو ماں کے دل میں اپنے بچہ کے کہلانے کے وقت پیدا ہوتا ہے اس احساس سے زیادہ الم احساس کوئی نہیں جو ماں اپنے بچہ کو تکلیف میں محسوس کرتی ہے، اس باب میں عورت، مرد سے کہیں زیادہ زندگی اور زندگی کی حقیقت کا شعور رکھتی ہے۔" انسان باپ سے زیادہ ماں سے متاثر ہوتا ہے سب سے پہلی صورت جو ہمارے ذہن میں قایم ہوتی ہے وہ ہماری ماں ہی کی صورت ہوتی ہے۔ ہم زندگی بھر اس صورت سے متاثر رہتے ہیں جب ہم حسن کا احساس کرتے ہیں تو ہمارے سامنے اپنی ماں کا وہ چہرہ آ جاتا ہے جو ہمیں ہنسایا کرتا تھا کبھی ہم اسکے خط و خال کو نادانستہ حسن کا معیار قرار دیتے ہیں ہم اپنی ماں کے کس قدر مزاج دان ہوتے ہیں صرف اس کی آنکھیں دیکھ کر ہم سمجھ جاتے ہیں کہ وہ خوش ہے یا ناخوش حالانکہ ہم بالکل بچہ ہوتے ہیں اور ہمارا سادہ ذہن دنیا کی کوئی بات بھی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ — بلوفی

آج کل کی شادی

وحیدہ نسیم (حیدرآباد)

ہم نے دیکھی نرالی اک شادی
ہندی رسموں کی خانہ بربادی

گھر کے سب کاروبار انگریزی
پھول ہندی تھے خار انگریزی

نہ تو دولہا کو کوئی پاس وفا
نہ تو دلہن کو کوئی شرم و حیا

نہ تو پہلے سے رسم و راہ ہوئے
چٹ ہوئی منگنی پٹ بیاہ ہوئے

نہ ہوئے چند سال نسبت کے!
نہ پھٹیں چادریں گھسے جوتے

ہائے پہلے کے تھے یہی دستور
جب کہ آتے تھے قاضی پرنور

خطبہ عقد جب پڑھاتے تھے
مصری بادام سب لٹاتے تھے

اب لٹانے کو ہو گئے کافی
لاسنجر چاکلیٹ اور ٹافی

اس پہ دنیا کا اک نیا احوال
رنگ مغرب میں ان کا اک اک بال

کوٹ پر کس طرح نہ جچے ٹکٹا
ہیٹ پر کس طرح بندھے سہرا

چپ چپاتے وہ اس طرح آئے
کوئی پردے میں جس طرح جائے

شادی کیا جوشش ہے تمنا کا
دن کو گویا ہے قصد اغوا کا

پھر دولہن صاحبہ کا رنگ نیا
یعنی شرم و حیا کا ڈھنگ نیا

نہ تو سانچق ہے اور نہ ہے مانجا
نہ تو جوڑا ہی ہے چڑھاوے کا

کیا ضرورت جو ہو سہاگ پڑا
ٹائیلٹ سٹ اگر نصیب ہوا

میں ہوں قربان لبوں کی سرخی کے
ہو لپسٹک بجائے مسی کے

کیوں نہ مہندی کا رنگ ہو مفقود
ہو گیا نیل پینٹ جب موجود

نہ تو کاجل ہی کچھ نمایاں ہے
نہ تو وہ مانگ ہی پر افشاں ہے

کالا سا نٹ لگا ہے بالوں میں
روز پوڈر لگا ہے گالوں میں

اس کے اوپر سے پھر لباس سفید
مرگ شوہر کی گویا ہے امید

عقد کیا گویا انٹروڈیوس ہوا
جلوے کے بدلے شیک ہینڈ کیا

عقد و شادی سبھی کیا منظور
یہ نہ جانا کہ ہو وفا بھی ضرور

جس قدر جلد یہ جڑا رشتہ
اس قدر جلد ٹوٹ جائے گا

قصہ کوتاہ اب نسیم کرو
اپنے ماحول سے ذرا تو ڈرو

السلام علیکم

آنسہ ساجدہ احمد محی الدین

جس طرح زندگی کی عمارت چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تعمیر ہوتی ہے اسی طرح نیکیوں کی عمارت بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تیار ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے ہماری لاپروائی اور کم توجہی کا جس نے آج ہمیں تنزل میں ڈال دیا ہے۔ اگر آج ہم ذرا سی توجہ کریں اور اپنے دینی فرائض کو پہچانیں تو کامیابی اور فتح مندی ہمارے قدم چومے گی۔

السلام علیکم۔ کہنے میں معمولی سی چیز۔ لکھنے میں دو حرف۔ مگر اس کے فوائد پر نظر ڈالیں تو یہی چیز ہمارے لئے باعث رحمت و نصرت ہے مگر افسوس ہے کہ اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ خصوصاً زنانہ مجلسوں میں تو مطلق اس کا رواج نہیں ہے۔ عام طور پر آداب ہی کہا جاتا ہے جو کسی نے ہمت بھی کی تو اسے پشیمان ہونا پڑتا ہے۔ کاش ہمارا دینی مطالعہ وسیع ہوتا اور ہم جانتے کہ اس چھوٹے سے لفظ میں خدائے تعالیٰ کی کتنی رحمت اور ہمارے لئے کتنی سلامتی ہے قرآن پاک میں ہے۔

"السلام علیکم تو خدا کی طرف سے پاکیزہ تحفہ ہے" مگر ہم بدقسمت ہیں جو خدائے تعالیٰ کے اس پاک تحفہ سے محروم رہنا چاہتے ہیں۔

حدیث شریف میں یہاں تک اس کی تعریف کی گئی ہے کہ

"پس جب دیکھو کہ مسلمانوں میں باہم محبت نہیں تو سمجھ لو۔ اللہ کے ساتھ تعلق و اسلامی ایمان کی بیتابی پر پانی اتر آیا ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں کہ چیخو چلاؤ تم اندھے ہو گئے ہو بینا بن جاؤ بلکہ آپس میں السلام علیکم کا رواج خوب پھیلاؤ کہ اس میں دن رات اللہ کا نام لینے اور بار بار سلامتی کی دعا دینے سے قلوب میں انس انکسار پیدا ہو گا اور باہم محبت ہو گی۔"

قوموں کی زندگی افراد کے خلوص اور اتفاق پر موقوف ہے۔ قوم گویا جسم ہے۔ اگر کوئی عضو خراب ہو جائے تو اس کا اثر تمام جسم پر پڑتا ہے وہ معمولی کیوں نہ ہو۔

قومی مشین کو چلانے کے لئے بڑے بڑے صدارتی جلسے کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم کو

اپنی معمولی معمولی غلطیوں کی طرف توجہ کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ ہر وہ شخص لیڈر ہے جو اپنے دین کی تبلیغ کرے اور ہمیشہ عمل جاری رکھے وہ چاہے تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ قوم کی خدمت کے شیدائی پہلے اس طرف متوجہ ہوں۔

معمولی معمولی پرزوں کی خرابی سے مشین خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح معمولی باتوں کو نظرانداز کرنے سے قوم برباد ہو جاتی ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اس لئے سب سے پہلے والدین کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ قوم کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ ہر ایک اپنے ماحول کی صحیح رہبری کرے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

"بیچارا ڈاکٹر"

سلطانہ عزیز بی۔ اے عثمانیہ

ڈاکٹر نوازش کی لمبی لمبی سیاہ خمیدہ زلفیں اکثر ڈاکٹر کو شاعر سمجھنے پر مجبور کرتیں لیکن تھے وہ ڈاکٹر۔ شاعرانہ خدوخال کے حامل۔ ایک شاداب مسکراہٹ کے مالک۔ ڈاکٹر کی عمر ۳۵ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ مگر بیچارہ ڈاکٹر ابتک کنوارا ہی تھا۔ شادی کے لئے جب کسی لڑکی کا انتخاب کیا جاتا۔ یہ کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور تراش لیا کرتے۔ کبھی کہتے لڑکی تعلیم یافتہ نہیں۔ کبھی فرماتے مجھے دولتمند بیوی چاہئے کبھی بول اٹھتے۔ میں ازحد حسن پرست ہوں مجھے حسین لڑکی کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے یہ بیچارے ہندستان میں انگلستانی خیالات رکھتے تھے۔ بیاہ سے پہلے لڑکی پرکھنا چاہتے۔ ڈاکٹر نوازش کی اس دیرینہ آرزو کی تکمیل ہندستانی فضا نہ کرسکتی تھی لیکن وہ مصر تھے۔ تلے ہوئے تھے اپنی ہٹ پر۔ اسی ضد نے ڈاکٹر کے شباب میں پھپوندی سی لگا دی تھی۔ وہ عمر سے پہلے بوڑھے دکھائی پڑتے تھے۔ ہاں۔۔۔ تو ڈاکٹر نوازش کا بیاہ تھا۔ سنا ایک دوست نے یہ نسبت طے کی تھی۔ لڑکی کے متعلق ڈاکٹر کی تفتیش اور تشخیص نہایت شد و مد کے ساتھ جاری تھی آنکھ ناک سے زیادہ۔ ڈاکٹر سفید رنگ کے شیدائی تھے۔

جب سے یہ سن پایا تھا کہ لڑکی سفید سے بالکل جلے ہوئے کپڑے کی طرح ۔مسکراہٹ کی شادابی اور بڑھ گئی تھی ۔غرض یہ اپنی آن دیکھی دلہن کی شان میں خوب خوب قصیدے پڑھتے ۔ڈاکٹر سے جب یہ سوال کیا جاتا ۔"اگر لڑکی بدصورت ہوئی تو ؟"ڈاکٹر کا چہرہ سنجیدہ ہوتے ہوتے ڈروانا ہو جاتا چھوٹی چھوٹی گہری آنکھوں میں عجیب سی یاس کروٹیں لینے لگتی۔

میں نے دریچہ سے جھانکا ۔ڈاکٹر نوازش موتیا کی روش کے قریب ٹہل رہے تھے ۔موتیا کے تختے ۔سفید سفید شگفتہ پھولوں سے پٹے پڑے تھے ۔میں تیز تیز ڈاکٹر کے پاس پہنچی ۔ایک پُرجوش تبسم نے میرا خیر مقدم کیا ۔سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں نکھری پڑ رہی تھیں ۔اور ہوائیں تو بس گنگنائے جا رہی تھیں ۔ڈاکٹر نے اپنی موٹی موٹی مخروطی انگلیوں سے اپنے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا ——سلمیٰ ۔سنا لڑکی کا قد چھوٹا ہے ۔کاش اس بات کا پتہ پہلے ہی چل جاتا ——سب بات تو اب طے ہو گئی ۔مالن کیاریوں سے سوکھے پتے نکال چکی کچرے کا ٹوکرا لئے سامنے سے آہستہ آہستہ گذر رہی تھی ۔میں نے شرارتاً سوا تین فیٹ کی مالن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ڈاکٹر کم از کم اتنا قد تو ضرور ہو گا ۔ڈاکٹر کے چہرے پر حزن سا برسنے لگا

شگفتگی جاتی رہی ۔اداسی کی تہیں جمنے لگیں ۔وہ مالن کی پستہ قامتی کا نہایت غور و خوض سے معائنہ کرنے لگے ۔سامنے شہتوت کے ٹہنے پر چڑیوں کا جوڑا چہکتے چہکتے رک گیا ۔بادل کے ایک بھورے سے ٹکڑے نے چمکیلی شعاعوں کو گدلا دیا ۔فضا کچھ مکدر سی ہو کر رہ گئی ۔ڈاکٹر نوازش کے دلی تفکر کا اندازہ لگاتے ہوئے میں نے تسلی دینا شروع کر دی ۔علم و دولت حسن کا اجتماع یکجا ذرا ناممکن ہے ڈاکٹر صاحب میں اس سے زیادہ نہ کہہ سکی ۔الفاظ حلق کے نیچے ہی رک گئے ۔ان الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا ۔ڈاکٹر کی خموشی گویائی میں بدل گئی اور وہی شاداب مسکراہٹ عود کر آئی ۔

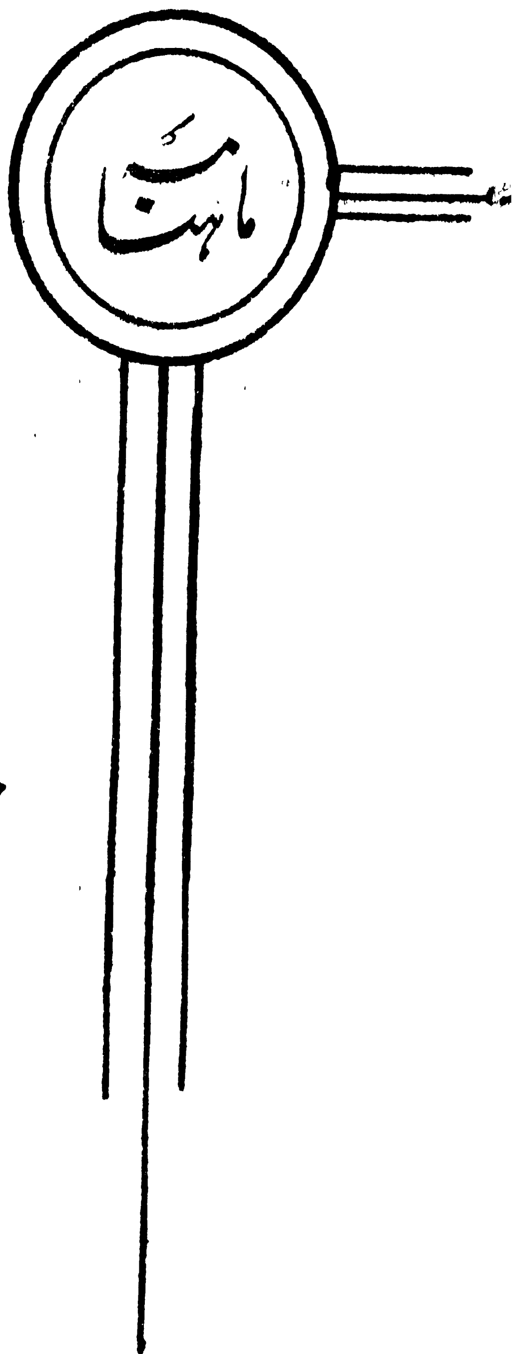
شادی کا دن تھا ۔ڈاکٹر نے غیر معمولی احتیاط سے (shave.) کیا ۔گلابی ٹوئیڈ کی شیروانی شاعرانہ حسن کو نکھار رہی تھی ڈاکٹر کی آنکھیں کسی نامعلوم روشنی نے چمک رہی تھیں ۔عمر رسیدہ ڈاکٹر واقعی کم عمر معلوم ہو رہے تھے ۔ڈاکٹر موٹر میں سوار ہوا ہی چاہتے تھے ۔وہی پستہ قد مالن نمودار ہوئی ۔جھاڑو کا کٹا لئے ۔موتیا کے پودوں کی اوٹ سے ۔ڈاکٹر کی نظر مالن پر پڑی ۔پھر مجھ پر ۔میں بے اختیار مسکرا پڑی ۔ڈاکٹر کی مسکراہٹ قہقہہ میں مبدل ہو گئی ۔موٹر جا چکی تھی مالن نے کیاریوں سے سوکھے پتے نکالنے شروع

کر دیئے - میں اسی مختصر قد کا تصور لئے نوازش صاحب
کی شادی میں پہنچ گئی - پانچ بج چکے تھے مراثنوں
کی آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی جارہی تھیں بہا
عورتیں زرق برق کپڑوں میں لدی پھندی ادھر
سے اُدھر گھوم رہی تھیں - بچوں کی چیخ دھاڑ نے
گھر سر پر اٹھا لیا تھا - دلہن کو سنوارا جا چکا تھا
میں دلہن کے کمرے میں پہنچی - ڈاکٹر نوازش کا تخیلی
پیکر نگاہوں میں لئے گورا رنگ - لمبے لمبے سیاہ
بال - پھول کی پتی سے ہونٹ اور قد - نہیں نہیں،
میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکی - سرخ کپڑوں
میں لپٹی لپٹائی گٹھری سی مسہری پر دھری تھی -
دھڑکتے دل نے - کپکپاتی انگلیوں نے گھونگٹ
اٹھایا - ڈاکٹر نوازش کے حسین تخیلی پیکر نے موٹی
بھدی پھیکی سفید مورت کی جگہ لے لی تھی میرے
منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی - آنچل چھوڑ ورانڈہ
میں پہنچ صوفے پر دراز ہوگئی - ڈاکٹر نوازش
کی تمناؤں نے کتنی تلخ حقیقت اختیار کر لی تھی
امیدیں کتنی بھدی اصلیت سے دوچار تھیں -
اتنے طویل انتظار کا ایسا یاس انگیز نتیجہ دیکھ کر
دل دہلنے لگا - میرے سر کی رگیں زور زور سے
ہلنے لگیں - دلہن گذر رہی تھی - میری نظروں کے
آگے سے - وہی سوا تین فٹ والی مالن میری
آنکھوں میں گھوم گئی - مجھے چکر سا آگیا - ایسا
معلوم ہوا جیسے میرے سر کی رگیں ایک دوسرے سے
ٹکرا ٹکرا کر پھٹ جائیں گی - آنکھوں تلے دھندسی
چھانے لگی وہاں سے اٹھی مشکل سے - بغیر کچھ
کہے سُنے موٹر میں سوار ہو گھر پہنچ گئی طبیعت
بہت مضمحل سی تھی - معلوم ہوتا تھا میں بہت
زیادہ تھک گئی ہوں - کمرے کی تنہائی اداس تر
ہوتی جارہی تھی - میں نے دریچے سے سر نکالا -
ڈاکٹر نوازش موتیا کی روش کے پاس ٹہل رہے
تھے - پھول مرجھا چکے تھے ـــــ میں آہستہ آہستہ
ڈاکٹر کے پاس پہنچی - مجھ سے کچھ نہ کہا گیا ایک لفظ
بھی نہ نکل سکا زبان سے - معنی خیز خموشی چھانے
لگی ہوا سسکیاں بھر رہی تھی ـــ سامنے
شہتوت کی شاخ پر چڑیوں کا جوڑا اداس اور
خاموش تھا ـــ مالن ـــ پستہ قد مالن کیاریوں
سے سوکھے پتے جھاڑ رہی تھی ـــ ڈاکٹر نوازش
نے ایک آہ کھینچی - دردوغم میں لپٹی ہوئی ـــ اور
ساتھ ہی ڈاکٹر کی شاداب مسکراہٹ خشک
ہونٹوں کا ایک بے معنی ارتعاش بن کر رہ گئی -

3238
Regd. M. N. O.

رجسٹرڈ آصفیہ (۱۲۲۱)

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب بیرپورہ حیدرآباد سے شائع ہوا



شہاب

شہاب

جلد ۱۳ تیر ۱۳۵۴ف مئی ۱۹۴۵ء عیسوی نمبر ۸

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

گورنمنٹ سے (عہ)

"دین و دنیا"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی اے امرتسری

(بسلسلہ پیوستہ)

زرتشتی مذہب کا اصل اصول "توحید" ہے جس کا حلیہ بعد میں ایسا بگڑا جیسے مسیحیت کا۔ بہرحال "مانی" دوئی کا ایسا ہی قائل تھا جیسے مسیحی تثلیث کے۔

لیکن اپنے نئے مذہب کو ایرانی ذہنیت پر اثر ڈالنے کے لئے اس نے زرتشتی مذہب سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور ان دنوں میں تمام ایرانی "دوئی" کے پرستار تھے، لیکن محققین متفق الرائے ہیں کہ مانی نے سوا ناموں کے زرتشتی مذہب سے اور کچھ نہ لیا اور ان کے مفہوم کو بھی سامی تخیل میں ڈھالا دن میں چار دفعہ نماز وضو کے ساتھ اور قبلہ سمت شمال بالخصوص اور عموماً آفتاب کی جانب تھا۔ موسوی دس احکام اس کی شریعت کے اصول تھے، لیکن مجاہدہ میں غلو رہبانیت کی حد تک پہنچا ہوا تھا لیکن اس کے لئے ہر ایک مانی پرست مکلف نہ تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ وہی "موعود" اور "فارقلیط" ہے جس کا دنیا انتظار کر رہی تھی اس کا مناظرہ زرتشتیوں اور صابیوں اور مسیحیوں سے بھی رہتا۔ چنانچہ اسقف "آرچی لوس" کے سامنے اس نے تقریر کی۔ اس کا خلاصہ ایک مکتوب میں اب بھی محفوظ ہے، مانی نے بہت کچھ کتابی اور مکتوبی صورت میں لکھا جو زیادہ تر سامی اور پارسی زبان میں ہے، اس نے اپنی حروف ابجد بھی ایجاد کئے جو کتاب فہرست میں "الندیم" نے درج کئے ہیں۔ اور کتابوں کا نام اور خلاصہ بھی لکھا ہے۔

شاہ پور ایک الو العزم بادشاہ تھا۔ اردشیر بابکان نے اگرچہ ایرانی طوائف الملوکی کا خاتمہ کرکے مرکزی حکومت قایم کردی تھی لیکن امراء اور بالخصوص آتشکدوں کے موبد در "ہیربد" ایک گونہ پریشانی کا موجب تھے اس نے دیکھا کہ "مانی" کی شخصیت میں اس کے سیاسی اغراض خاطر خواہ پورے ہوسکتے ہیں اس لئے اس نے یہ دین متین قبول کرلیا، اب دین کی حمایت میں دنیوی طاقت تھی۔ اس لئے اس کی اشاعت سرعت کے ساتھ ہونے لگی، خود مانی بھی ایران کے طول عرض میں پھر گیا، پھر چینی ترکستان اور چین اور ہندوستان میں گیا، اور حد ہے کہ عراق اور شام سے نکل کر یہ مذہب یونان اور روم میں بھی

داخل ہو گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایرانی
یہاں قاطع یعنی تلوار وہ کام کر رہی تھی جو غالباً اکیلے
مذہب سے نہ ہو سکتا۔

اگرچہ اردشیر کے آخری ایام میں رومی
اور ایرانی فوجوں میں جھڑپ شروع ہو گئی
تھی کیونکہ رومی شہنشاہیت کی حدود ایران
سے ملحق تھیں، لیکن شاہ پور کی تخت نشینی کے
ساتھ ہی رومی پیش قدمی کا خطرہ بڑھ گیا، اس
وقت "مانی" نے شاہ پور کو تسلی دی کہ تائید
ایزدی کے ساتھ وہی غالب آئے گا، ابتداء
میں ایرانی افواج کو پے در پے شکستیں ہوئیں
لیکن جب "گارڈین ثالث" رشیا کے میدان
میں ایرانی لشکر کو شکست دے کر عراق پر بڑھا
اور "مداین" پر حملہ کی تیاری میں مصروف تھا جو
اس وقت ایرانی سلطنت کا دار الحکومت تھا
تو شاہ پور خود میدان میں اُتر آیا۔ اس وقت
عراق میں عربی طوائف الملوکی تھی۔ عربوں نے
شاہ پور کا ساتھ دیا، گارڈین مارا گیا، اور
آرمینیا اور عراق شاہ پور کے قبضہ میں آ گیا چند
سال امن میں گذر گئے۔ ۲۵۱ء میں سرحدی
چھیڑ چھاڑ نے پھر شاہ پور کو چونکا دیا اس دفعہ
شام رومی اور ایرانی افواج کا رزمگاہ بن گیا
آخر کار رومی شہنشاہ "ویلرین" خود شاہ پور کے
مقابلہ میں آیا۔ ایرانی پسپا ہو کر عراق میں آئے اور
یہاں معرکہ میں رومی شہنشاہ قید ہو گیا اور فتح
"درفش کاویانی" پر لہرائی۔

ان واقعات سے جو آنے والے واقعات کا
پیش خیمہ تھے واضح ہو گیا ہو گا، دین و دنیا میں
کتنا گہرا تعلق ہے، شاہ پور کے آخری ایام تھے
اور مانی ایک طویل سفر کے بعد ایران میں واپس
آیا۔ اس کی عدم موجودگی میں امراء قدیم زرتشتی
مذہب کی حمایت کے لئے اوٹھ کھڑے ہوئے۔ شاہ
پور کا انتقال ۲۷۲ء میں ہو گیا اور جانشین اس کا
بیٹا "ہرمزد" "مانی" مذہب کا پیرو تھا۔ لیکن ایک سال
کی حکومت کے بعد جو رومیوں سے لڑتے بھڑتے
گزرا یہ بھی مر گیا اور شاہ پور کا دوسرا بیٹا بہرام
گور تخت نشیں ہوا۔ مغان ایران نے مطالبہ کیا کہ
مانی کو قتل کیا جائے۔ سیاسی فضا کچھ ایسی بگڑی
ہوئی تھی کہ بادشاہ "پلاطوس" کی طرح مجبور
ہو گیا اور یہ مثیل مسیح ۲۷۶ء میں صلیب پر
مار دیا گیا۔ حکومت کا سایہ گیا اور مانی مذہب پر
زوال آنا شروع ہوا، روم میں "لیو" اعظم
حکومت کے بل بوتے پر اس کی بیخ کنی کے درپے
ہوا۔ پاپائے روم جو "لیو" کے جانشین ہوئے
اس کا قلع و قمع کرتے رہے۔ "ولن ٹینٹن" نے
فتویٰ صادر کیا کہ مانی کے پیرو جلاوطن کئے جائیں۔

شہنشاہ "جسٹینین" نے حکم دیا کہ جہاں پائیں قتل
کئے جائیں، لیکن "مانی" کے دلائل عقلی ونقلی کچھ
ایسے مسیحی علما کو اسپند آ چکے تھے کہ ان کی تحریریں
میں تیرھویں صدی کے عیسوی تک ان کا بے
تکلف استعمال مسیحیت کی تائید میں کیا جاتا۔

اس وقت ایران دو خطروں میں گھرا ہوا
تھا۔ شمال مغرب کی طرف رومی اور شمال مشرق
کی جانب ترک "ہیاطلہ" سرحدی آبادیوں کو تاراج
کر رہے تھے۔ لیکن دو سو سال کے عرصہ میں شاہان
فارس نے بہت کچھ طاقت بڑھائی ۴۵۹ء کا
واقعہ ہے کہ فیروز پسر یزدگرد ثانی اپنے بھائی کو
بیدخل کر کے تخت و تاج کا مالک ہوگیا۔ اس
وقت ترک ہیاطلہ کا بادشاہ "خشنتوا" تھا جس
کا دارالسلطنت "باختر" میں تھا جسے اب بخارا
اور خیوا کہتے ہیں، اس کے جنوب میں وہ سلسلہ کوہ
ہے جسے اب "غور" کہتے ہیں، دریا جیحون باختر
کو "صغد" سے جدا کرتا تھا، فیروز اکثر ترکوں سے
لڑتا رہا۔ ایک لڑائی میں یہ اسیر ہوگیا اور اس
شرط پر رہائی ہوئی کہ ایک بیش قرار رقم دو سال
کے عرصہ میں ادا کرے، اور اپنے بیٹے "قباد" کو
بطور "یرغمال" خشنتوا کے پاس رکھے۔

خوبرو نوجوان قباد نہایت ذہین واقع
ہوا تھا۔ اس نے جلد ہی خشنتوا کے دل میں
گھر کر لیا، ایک دفعہ غور کے پہاڑوں میں بادشاہ
شیر کا شکار کر رہا تھا۔ شیر بادشاہ پر حملہ آور ہوا
قریب تھا کہ خاقان شیر کے پنجوں میں آ رہتا،
قباد ساتھ تھا، بڑھ کر تلوار کا ایسا تلا ہوا ہاتھ
دیا کہ شیر کٹ کر گر گیا۔ ایسی ایسی شائستہ
خدمات کا یہ اثر ہوا کہ خاقان نے قباد کو بالکل
آزاد چھوڑ دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جس وقت وہ
چاہے اپنے ملک کو واپس جا سکتا ہے، لیکن قباد
کا دل کچھ ایسا لگا ہوا تھا کہ واپس جانے کا نام
نہ لیتا۔ وہ اکثر خاقان کی دختر کے ساتھ سیر و شکار
کے وقت ہمرکاب رہتا۔ اور غالباً یہی دل لگی کی
وجہ تھی کہ اسے وطن مالوف بھی بھولا ہوا تھا۔

گفت معشوقے بعاشق ای فتا
تو بغربت دیدہ بس شہرہا
پس کدامیں شہر زانہا خوشتر است
گفت آں شہرے کہ در وے دلبر است

(رومیؒ)

چودھویں رات کا چاند طلوع ہو رہا تھا
دریا جیحون کی لہریں بیشمار چاندوں کو آغوش
میں لئے ہوئے تھیں۔ کنارہ پر حد نگاہ تک چادر
نور بچھی ہوئی تھی۔ قباد اور خاقان کی لڑکی یہ
پر کیف نظارہ دیکھتے ہوئے سیر کر رہے تھے شہزادی
نے پوچھا کہ "سچ بتاؤ، تم چند روز سے بہت متفکر

نظر آتے ہو۔ کیا وطن کی کشش غالب آ رہی ہے؟"
شہزادہ نے کہا کہ" یہ بات نہیں۔ مجھے ایران سے
سخت متوحش خبریں مل رہی ہیں۔ اور خاقان کو
بھی تمام حالات کا علم ہے۔ میرا باپ سخت بیمار تھا
اور منجموں نے اطلاع دی تھی کہ ممکن ہے کہ جانبر
نہ ہو سکے۔ لیکن اب خبر ملی ہے کہ وہ مفقود الخبر ہے
میرے تین بھائی بلاؤش اور زہرہ اور جاماسپ
دعویدار تخت و تاج ہیں، اور ایران میں خانہ جنگی
شروع ہو گئی ہے اگرچہ مجھے یقین ہے کہ وزیر
"زرمہر" کی دانائی سے یہ گتھی سلجھ جائے گی،
لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب مجھے کیا کرنا
چاہئے۔ اگر مجھے تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں بھی
قسمت آزمائی کرتا"۔ شہزادی نے کہا کہ" میں
کبھی نہ روکتی اور اب بھی نہیں روکتی لیکن اگر تم
میرے مشورہ پر عمل کرو تو مناسب ہے کہ پہلے
بھائیوں کو ایک دوسرے سے نپٹ لینے دو،
اور اگر تم خاقان کو کہو گے تو وہ ضرور تمہاری مدد
کرے گا"۔ قباد نے کہا کہ" مجھے بھی پورا یقین ہے
تمہاری رائے مجھے صائب معلوم ہوتی ہے لیکن
میں خاموشی کے ساتھ اس امر کا منتظر بھی نہیں
رہ سکتا کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے
میرے والد نے آرمینا کا علاقہ فتح کیا تھا۔ جو
دوبارہ رومیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ مجھے
یہ بھی خبر ملی تھی کہ زرمہر جان توڑ مقابلہ کر رہا
ہے کاش ایک دفعہ وہ مجھ سے مل جاتا۔ مجھے
اس پر پورا بھروسہ ہے"۔ شہزادی نے کہا کہ
سر دست تم کوئی عملی کارروائی نہیں کر سکتے اس
لئے مناسب ہے کہ اپنے حالات سے زرمہر کو اطلاع
دو اور اسی سے مشورہ طلب کرو کہ تمہیں اب کیا
کرنا چاہئے"۔ قباد نے کہا کہ" یہ ٹھیک ہے شہزادی
صاحبہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تمہاری
صورت میں مجھے "سروش یزدانی" مل گیا۔
اور سچ تو یہ ہے کہ میں ایران کے تخت و تاج
لے کر کیا کروں گا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے مجھے
ایک خون کے دریا عبور کرنا پڑے گا اور یہ خون
میرے بھائیوں، میرے عزیزوں، میری قوم کا ہے"
شہزادی نے کہا کہ تم تو ان لوگوں کی طرح بہکی باتیں
کرنے لگے جو ترک دنیا کر چکے ہیں، اس کے بعد تم
یہ بھی کہو گے کہ مجھے زن و فرزند کی بھی خواہش
نہیں"۔ شہزادہ نے کہا کہ" نہیں نہیں ایسا
مت کہو، میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تم ہو وہاں
"مینو بہشت" ہے بھلا بہشت کو چھوڑ کر میں
کہاں جا سکتا ہوں"۔ شہزادی نے کہا کہ مردوں
کی محبت پر اعتبار کرنا نادانی ہے۔ دیکھو میرے
اور تمہارے باپ کے ہاں کتنی بیویاں ہیں ان
کے لئے مینو بہشت یہاں بھی ہے اور آئندہ زندگی

میں بھی" قباد نے کہا کہ میں نور و نار کی قسم کھا کر
کہتا ہوں کہ تمہارے سوا میری رفیقہ حیات
اور کوئی نہ ہوگی" شہزادی نے کہا کہ اچھا
وہ وقت کو آنے دو۔ آپ اس مہم کی فکر کرو
جو درپیش ہے۔ قباد نے کہا کہ میرا دل گواہی
دیتا ہے کہ میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا
کیونکہ مجھے تم سا دور اندیش صائب رائے
مشیر مل گیا ہے۔

دونوں باتیں کرتے خیموں کی طرف لوٹے
دوسرے روز خاقان نے قباد کو طلب کیا اور
تمام حالات سے آگاہ کیا جو ایران میں رونما
ہو رہے تھے۔ قباد کو معلوم ہوا کہ "زرمہر"
جس کو عرب مورخین "مہر نرسی" لکھتے ہیں،
آرمینیا میں رومیوں کے مقابلہ میں کامیاب
ہوا اور مہر "بلاوش" کے ساتھ ہو کر "زہرہ"
سے لڑا، زہرہ مارا گیا اور اب "بلاوش" ایران
کا بادشاہ ہے۔ خاقان نے قباد کو کہا کہ اگر
تمہاری مرضی ہو تو میں ایک جرار فوج "تمہارے
حوالہ کئے دیتا ہوں" قباد نے کہا کہ بہتر ہے کہ
کچھ عرصہ انتظار کیا جائے اور دیکھا جائے کہ
واقعات کیا صورت حالات پیدا کرتے ہیں؟
اور یہ کہ امراء اور اعیان ایران کس کے طرفدار
ہیں۔ "زہرہ" تو لڑائی میں مارا گیا لیکن جاماسپ
بھی ہاتھ پیر مار یگا، جب تک حالات موافق
نہ ہوں۔ ہمیں صبر سے انتظار کرنا چاہیئے"

"جاماسپ" خاموش نہ تھا وہ بظاہر
نیک دل "بلاوش" سے ملا رہا۔ بلکہ "زہرہ"
کے مقابلہ میں لڑتا رہا، وہ ایک ہی کائیاں تھا
سمجھ گیا کہ لڑ کر بھائی پر غالب نہیں آ سکتا۔ اس لئے
پہلے تو وہ امراء اور مغون کی حمایت حاصل کرنے
کے لئے توڑ جوڑ کرتا رہا اور کسی حد تک کامیاب
بھی ہو گیا۔ لیکن "زرمہر" کے ہاں دال نہ گلی اب وہ
ایک اور چال چلا، اپنی سوتیلی بہن پر ڈورے
ڈالے، اور خفیہ تعلق زن و شوی قایم کر لیا۔

اگر ہم آریا، یونان و روم، وایران
و ہندوستان کی تاریخ دین و دنیا کا مطالعہ کیا جائے
تو واضح ہو گا کہ ان کی ذہنیت نے ایک خاص
بات پیدا کر رکھی تھی جو دیگر قوموں میں نہیں ملتی
ان کے ہاں "فلسفہ" نے مذہب کی جگہ لے لی اور
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف "خالص" ویدک
دھرم" اور دوسری طرف ایران میں پاکیزہ زرتشتی
دین کی صورت بالکل مسخ ہو گئی، ایک شخص "بکس"
نامی یونان میں پیدا ہوا جس کو یونانیوں نے
بعد میں دیوتاؤں کی طویل فہرست میں نمایاں
جگہ دی، یہ عیش و عشرت کا دیوتا ہے۔

(باقی)

ہمارا نوجوان

(۹)

شہاب کے چودہ سالہ دور میں اصنافِ ادب میں جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہمارے نوجوانوں کا ذوقِ افسانہ نویسی اور شوقِ فسانہ خوانی ہے آئے دن اس شوق کو دیکھ کر اندیشہ ہو رہا ہے کہ اس کی روک تھام نہ کی جائے تو آئندہ چل کر یہ مرض ادب کے چہرہ پر ایک بدنما داغ بن کر رہ جائیگا ہر وہ نوجوان جو شد بد اردو سے واقف ہے اوس کا موضوعِ سخن افسانہ نویسی ہوتا ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ سنیما کی بہتات اور بازاری افسانوں کے اشاعت کی کثرت انہیں کسی اور صنف کی جانب توجہ کرنے میں مانع ہوتی ہے چونکہ معلومات محدود، اچھا ماحول وسیع مطالعہ نہیں ہوتا اس لئے ان کے افسانوں میں رفعتِ خیال اور اعلیٰ تخیل، دلکش تحریر، پس منظر کا عموماً فقدان رہتا ہے چونکہ عنفوان شباب کے جذبات کار فرما رہتے ہیں اس لئے ان کے افسانوں کی بنیاد حسن و عشق پر ہوتی ہے اور اپنے اظہار خیال کے لئے انہیں یہی موضوع موزوں دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ افسانہ افسانہ نہیں ہوتا تا وقتیکہ دو دلوں کی تڑپ نہ دکھائی جائے نتیجۃً یہ افسانہ حزنیہ یا طربیہ بن جاتا ہے اگر وہ اس خیال سے ہٹ کر افسانہ نویسی کی طرف توجہ کرے تو کافی مواد مل سکتا ہے اور ان میں آئندہ چل کر لکھنے کا اچھا سلیقہ پیدا ہو جائے گا مگر وہ اپنے مرکزِ خیال سے ہٹنا پسند نہیں کرتا اس لئے ان کے مستقبل سے بڑی مایوسی نظر آتی ہے۔

پرچہ کے ایک مرتب کو ہر روز تحریری یا بالمشافہ ایسے افسانہ نویسوں سے سابقہ رہتا ہے جو اپنے افسانوں کی نمائش چاہتے ہیں۔ اگر انہیں اچھا مشورہ دیا جائے اور ان کے جوہرِ قابلیت کے اظہار کا راستہ بتایا جائے تو ان کی سمجھ میں مطلق نہیں آتا وہ فقط "ہمت افزائی" کہہ کر اپنی خواہش کو منوانا چاہتا ہے حالانکہ ایسی ہمت افزائی اس کو غلط راستہ پر ڈالدینے کے اندیشہ سے خالی نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی درخواست ناقابل قبول ہوئی ہے تو وہ سعی و سفارش سے بھی دریغ نہیں کرتا وہ چاہتا ہے کہ اس کا افسانہ شائع ہو جائے حالانکہ یہی نوجوان اپنے لباس کی تزئین اور بالوں کی تراش اور اس کے سنوارنے میں جتنا وقت صرف کرتا ہے اس کا کچھ حصہ سمجھ بوجھ کر افسانہ نویسی میں صرف کرے تو توقع بندھتی ہے کہ مستقبل میں شاید کچھ

کامیاب ہو سکے مگر ان کے پیش نظر مستقبل کا سوال ہی نہیں ہوتا ہے وہ حال کو ہی دیکھنا چاہتا ہے اوس کی تحریروں کو تنقیدی نظر کا کوئی اندیشہ ہی نہیں رہتا بخلاف اس کے لڑکیاں جو کچھ لکھتی ہیں غور و فکر سے اور سوچ سمجھ کر کہ تنقیدی گرفت میں اون کی تحریر نہ آسکے حالانکہ ایسی کئی لڑکیاں اس وقت ہماری نظر میں موجود ہیں جنھوں نے تحریری میدان میں اپنے لئے جگہ نکال لی ہے اور ان کی تحریروں کے اکثر خواہشمند دکھائی دیتے ہیں لیکن نوجوانوں میں ایک بھی ایسا نہ ملا کہ جس نے ابتدائی حالت سے ترقی کرتے ہوئے اپنے لئے کوئی مقام تلاش کر لیا ہو۔ البتہ اس عرصہ میں ایک نوجوان سے سابقہ پڑا تھا کہ جس نے اپنی افسانہ نویسی کی بنیاد سائنٹفک اصولوں پر رکھی تھی اگرچہ اوس کے افسانے کافی طویل ہوتے تھے لیکن پڑھنے والوں میں اس کی مانگ تھی اور سائنس کا کوئی نہ کوئی نظریہ نہایت لطیف انداز میں حل کیا کرتا تھا مگر وہ ایسا لاپروا ثابت ہوا کہ کسی مستقل عنوان پر کام کرنے سے بھاگتا رہا ہے۔ اب وہ مختلف مذاق آرٹ۔ موسیقی شاعری وغیرہ میں اُلجھا ہوا ہے بظاہر کوئی توقع نہیں کہ ان فنون میں وہ استقلال کے ساتھ کام کر سکے کیونکہ وہ بہت جلد گھبرا جاتا ہے اور نت نئی چیزوں کے پیچھے دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ایسے نوجوان کسی صحیح اصول پر کوئی کام کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں تو یقیناً اپنے کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچا سکیں گے لیکن ایسے کم ہیں ان کا شمار انگلیوں پر ختم ہو جاتا ہے۔

ذیل میں چند ایسے افسانہ نویس نوجوانوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جنھیں افسانہ نویسی کے پردے میں بعض غلط توقعات قایم تھیں لیکن وہ اپنے خیال میں کچھ اس قدر مستقل تھے کہ انہیں اس خیال سے باز رکھنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔

ایک نفیس سوٹ میں ایک نوجوان تشریف لائے اور اپنے آپ کو علی گڑھ کا گریجویٹ بتا کر ایک افسانہ دے گئے۔ میں نے بی۔اے کے احترام کے مدنظر کوشش کی کہ افسانہ شائع کر دوں مگر ایک لفظ ایسا بھی نہ تھا کہ تحریر کی دلکشی کے صدقہ ہی میں شائع ہو سکے اسلئے بجز خاموشی کے چارہ نہ تھا۔ یہ کامل تین مہینہ تک تشریف لاتے رہے اور ہر روز اشاعت کا تقاضا کرنے لگے میں نے مجبور ہو کر اون سے دریافت کیا کہ آخر آپ کو اس افسانہ کی اشاعت پر اس قدر اصرار کیوں ہے۔ نہایت معصومانہ انداز میں فرمانے لگے۔ میں سول سروس میں جانے کو شاں ہوں، مجھے یقین ہے کہ اگر یہ افسانہ شائع ہو جائے تو مجھے

مقصد میں کامیابی ہوسکتی ہے ان کا یہ جواب سن کر
بڑی حیرت ہوئی کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان کس قدر
غلط اصول کا شکار ہے چونکہ مجھے یقین تھا کہ
ان کے افسانے سے بجائے کامیابی کے اونہیں
مایوسی کا منہ دیکھنا پڑیگا شائع نہ کرسکا مگر آج
میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک سررشتہ میں ...
... نمائش کے موقع پر نمائش بینیوں کو اپنے
سررشتہ کے اصول سمجھا رہے تھے۔

ایک اور افسانہ نویس تشریف لائے
جو کالج کے طالبعلم ہیں اور ایک افسانہ بغرض
اشاعت دے گئے جب کہ ان کی تحریر میں املا
اور انشا سے تک بے نیازی تھی تو مجھے جرات
نہیں ہوئی کہ اوس کو شائع کرکے ان کی جرات
کو اور بڑھایا جاتا اس لئے یہ بھی ڈال دیگئی لیکن
انھوں نے سعی و سفارش اور خطوط سے اتنا
بیزار کردیا کہ میں خود کچھ عرصہ پریشان ہوگیا تھا کہ
ایسے افسانے شائع کرکے دوسروں کو غلط فہمی
کی دعوت دینی تھی خاموش رہنا پڑا مگر وہ خود
تشریف لائے میرے استفسار پر فرمانے لگے کہ
میں نے افسانہ میں چند اصلاحی چوٹیں کی ہیں اور
میرا مقصد یہ ہے کہ اس طرح اون غلطیوں کی اصلاح
ہوجائے گی۔ چونکہ یہ خیال محال جنون کی حد تک
پہنچا ہوا تھا اونہیں اپنے افسانہ کی اشاعت
میں کامیابی نہ ہوئی اور مایوس جانا پڑا وہ آج
بھی ملتے ہیں اور میری صورت سے بیزار دکھائی
دیتے ہیں۔

ایک اور نوجوان نے زحمت گوارا کی
اور ایک افسانہ دے گئے۔ افسانہ کیا تھا ایک
سانس میں جالیات۔ ذوق نظارہ بے چینی اور
بے تابی کو بیان کرتے چلے گئے۔ نتیجہ ... شوکت
الفاظ میں مل کر اپنا نتیجہ کھو بیٹھا تھا اس لئے
اشاعت میں تامل رہا مگر وہ خود تشریف لائے
اور بیحد اصرار کرنے لگے۔ میرے پوچھنے پر شرماکر
ارشاد فرمایا کہ ایک جگہ میرے تقرر کی نسبت
بھی ہورہی ہے اگر یہ افسانہ شائع ہوجائے تو
اپنے مقصد میں قطعی کامیابی ہوگی۔ مجھے ہنسی آگئی
اور میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ نسبت
ہی کی نسبت سے کسی اور جگہ قسمت آزمائی کیجئے تا جہاں
افسانوں کو وقعت نہ دیجاتی ہو۔ وہ نہایت ناکام
واپس گئے مجھے آج تک ان کی ناکامی پر افسوس ہے
کہ اس نوجوان کا کیا حشر ہوا کہیں راستہ میں
مل جائیں تو نہ جانے مبارکباد کہنا پڑے یا ان کی
حسرتوں پر ماتم۔

ایک اور نوجوان تشریف لائے جن کی

صورت سے زیادہ مجھے ان کے سوٹ اور خوشنما بال نے متاثر کیا۔ چپکے سے ایک افسانہ بھی دیا اور فرمائش کی کہ اسی وقت اپنی رائے کا اظہار کردوں۔ بڑی مشکل سے وعدہ فردا پر انہیں ٹالا گیا۔ اطمینان سے فسانہ پڑھتا ہوں تو قدم قدم پر املا کی ٹھوکریں تھیں۔ البتہ فسانہ کا پلاٹ ان کے سوٹ کے بالکل برعکس تھا

"آپ کسی میلہ میں تشریف لیجاتے ہیں، شوق نظارہ تو نہیں لیکن تفریحاً ایک پہاڑی دامن میں وارد ہوتے ہیں۔ جہاں چادر تان کر گوشہ عافیت بنا لیا گیا ہے۔ مگر اتفاق دیکھئے کہ چادروں سے کوئی بیکار نازک لڑھکتا ہوا نیچے آتا ہے اور آپ ہمدردی میں اپنے ہاتھوں پر وہ حسین بوجھ سنبھالتے ہیں اور اسی یادگار دلنا کی یاد میں اپنے کلائی کی خوبصورت گھڑی کسی کی صندلی کلائی پر باندھتے ہیں اور وہ خراماں خراماں اپنے گوشہ عافیت میں پہنچ جاتا ہے اور آپ ایک زخمی پرند کی طرح درخت کے سایہ میں آسودہ راحت ہوتے ہیں اور جب نیند سے بیدار ہوتے ہیں گوشہ عافیت کا پتہ نہیں آپ اس کی بے وفائی پر ماتم کرنے لگ جاتے ہیں۔" مجھے آپ کی ذات سے ہمدردی ہے کہ آپ نے اپنی قیمتی گھڑی ضائع کردی۔" میں یہ کہہ کر افسانہ واپس کردیتا ہوں۔ غرض ان افسانوں کے روز مرہ بڑھتے شوق کو دیکھ کر ارادہ ہے کہ کسی اشاعت میں ایسے تمام افسانے شائع کردئے جائیں جس سے افسانہ خوانوں کی تشنگی دور ہو سکے۔

غزل

جناب سید بشیر احمد صاحب قادری

ملا کے آنکھ وہ ملنے سے جی چراتے ہیں
لگی ہے آگ جو سینہ میں وہ چھپاتے ہیں
تڑپتا دیکھ کے مجھ کو وہ مسکراتے ہیں
غضب ہے مجھ پہ وہ یوں بجلیاں گراتے ہیں
نہیں سدا ہی رہی اب تو ہاں جی ہاں کہد
ہم ایک ہاں کیلئے کتنے دکھ اٹھاتے ہیں
بحر بھی ہوکے نہ دو کچھ تو ہم کو حیرت ہے
غریب ہوکے ہم اتنے گہر لٹاتے ہیں
جلانا مارنا بس کھیل ہی تو ہے ان کا
"نہیں" سے مارتے اور کہکے "ہاں" جلاتے ہیں
کہاں کا قصہ پارینہ لے کے بیٹھے ہو
وہ ہم سے کہتے ہیں جب حال دل سناتے ہیں
بلا دلیل ہے دعویٰ کہ "تم پہ مرتے ہیں"
بشیر یا کہتے نہیں بلکہ کر دکھاتے ہیں

"تم سے"

"راحت نسیم"

سنا کہ اب شہاب بھی تمہاری نظروں سے
گزر رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ پہلے ہی سے اس کا
فیصلہ تھا۔ خیال ہوا کہ چلو آج دو باتیں کر لوں
تم سے۔ میں جانتا ہوں تم یہ سطور ضرور پڑھو گی
اور شاید کئی بار۔ ہو سکتا ہے کہ پڑھتے پڑھتے
تم بے چین ہو جاؤ، اور تھوڑی دیر کے لئے
ہی سہی، لیکن بہر حال تمہارے تخیلات پھر سے
ایک مرتبہ ماضی کی طرف دوڑیں، تمہاری آنکھیں
اشکبار ہو جائیں اور گزرے ہوئے پُر کیف
لمحات کی یاد از سر نو تازہ ہو کر تمہارے نازک
قلب کو بے چین کر دے۔ لیکن میرا منشاء ہرگز یہ نہیں
آنسو نہ بہانا کبھی! وہ قیمتی ہیں کم از کم میرے
لئے۔ یاد کرو میری اس سراسیمگی کو جو تمہاری
آنکھوں میں آنسو کے شبہ ہی سے پیدا ہو جاتی
اور اس شبہ پر ہی میں گھنٹوں مضطرب رہتا
اور تم پر سوالات کی بوچھاڑ ہو جاتی۔

تم نے محبت کی دنیا میں قدم رکھا۔ زبان
خلق تو یہ ہے کہ اس میدان میں عورت کے قدم
مرد سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں لیکن پھر تم
کیا ہو گیا؟ تم بہت جلد ڈگمگا گئیں۔ ایک ہی ہلکی
سی جنبش نے تمہارے سارے استقلال کو متزلزل
کر دیا اور تم یہ بھی بھول گئیں کہ کسی نے تمہیں اپنے
بازوؤں کا سہارا دیا تھا۔ ساتھ نہ چل سکتیں تو
نہ چلتیں پر اپنی محبت کو نبھانے کا تو موقع دیتیں
شاید تم نے سمجھا تھا کہ طوفان کا مقابلہ کئے بغیر ہی
ہم اپنی کشتی کو اُس پار لگا لیں گے۔ کیسی غلطی!!
حالانکہ میں نے تیار کیا تھا تمہیں، دنیا کی ہر موج
کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے کے لئے۔ یاد کرو۔
کیا کچھ نہ کہا تھا! تم نے بھی تو کی تھی نا تائید!!
لیکن وہ شاید محض میری موجودگی کی بناء پر ہوگا
جوں ہی نظروں سے دُور ہوئیں تو پھر احساس
باقی نہ رہا۔

تم کسی اسٹیج پر تو کھڑی نہیں کی جا رہی تھیں۔
تمہیں کسی عدالت میں بھرے مجمع کے سامنے تو پیش
نہیں کیا جا رہا تھا؟ پھر تم پریشان کیوں ہو گئیں؟
اور ایسی پریشان کہ لمحہ بھر میں سب کچھ فراموش
ہو گیا۔

تم نے شاید سمجھا کہ دنیا صرف تمہاری ہی

متوجہ ہے اور تم ہی کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنائے
ہوئے ہے۔ لیکن سوچو! "دنیا"۔۔۔ کیسا عجیب و
غریب تخیل!!! غور کرو، دنیا کو کسی سے کوئی دلچسپی
نہیں۔ رہی اس کی نکتہ چینی تو یہ اس کے فرائض
میں داخل ہے اور بتلاؤ یہ کون سے کام پر نہیں
ہوتی؟ اگر آج تم اپنے گھر غربا کو کھانا کھلاؤ
اور انھیں کپڑا تقسیم کرو، تب بھی تم نکتہ چینی کے
کسی نہ کسی پہلو کا نشانہ ضرور بنوگی۔ پھر اس کا
ڈر کیا؟ یہ نکتہ چینیاں ایک بلبلے سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتیں جو سطح آب پر آتا ہے اور دیکھتے
ہی دیکھتے غائب۔ دنیا کے اسٹیج پر روز نت
نئے واقعات رُونما ہوتے ہیں۔ پر کوئی انھیں اپنا
وظیفہ حیات نہیں بنالیتا۔ پھر تم ہم تو ایسے تھے
بھی نہیں۔ علم بغاوت تو بلند نہیں کیا تھا؟ چھوڑ
نہ دیا تھا دوسروں پر؟ سامنے ہوتیں تم تو شائد
ایک ایک بات واضح کیجاتی۔ تم نے زبردستی اپنے
دل و دماغ کو آماجگاہ بنا لیا غلط فہمیوں کا۔
تم بھولی بھالی کیا سمجھ سکتیں زمانہ کی نیرنگیوں کو؟
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایک دن آئیگا اور شائد
ضرور آئے گا جب کہ تم بہت کچھ سنوگی مجھ سے۔
اور ایک مرتبہ پھر۔۔۔ آخری دفعہ۔۔۔ آنسوؤں کا
سیلاب بہاکر اس کو ہمیشہ کے لئے غرق کردیں گے
اور پھر کبھی آنکھوں میں طوفان نہ آسکیگا۔

تمھارا خیال غلط ہے۔ بیچاری رفیعہ نے کچھ
نہیں کیا اور نہ اس داستان نے۔ تم خواہ مخواہ
ذمہ دار ٹھیراتی ہو۔ میں نے کہا نا تم بہت بھولی
ہو۔ تمھیں کیا خبر کہ رفیعہ سے پہلے ہی "مالن"
نے ڈالی لگانے کے بجائے چنگاری لگادی۔ تم
سمجھ رہی ہونا؟ کاش! تم کم از کم اندازہ ہی
لگا سکتیں ان باتوں کا جن کا تذکرہ تک میں نے
نہیں کیا۔ آخر میں ایک اور بات۔ تم سے صرف
خیریت دریافت کی۔ بڑا روکھا جواب دیدیا تم
نے۔ خواہش کے مطابق صرف فضا ہی میں کہدیا
ہوتا۔۔۔ "خیریت"۔ تمھارے الفاظ ہوا کی
لہروں میں ضم ہوکر مجھ تک پہنچ جاتے اور میں اسی
میں انتہائی مسرور ہوتا۔

تم نے غلط سمجھا۔ میں بھاگ تھوڑے ہی
رہا تھا؟ چند دنوں کی روانگی تھی اور پھر میں نے
مقام بھی تو اوپر لکھدیا تھا جہاں سے وہ سطور
لکھے گئے تھے۔ دکن کے اس گوشہ میں، جہاں
ہمارا جھونپڑا ہے، اب دنیا بھر کی کشش موجود ہے
اس گوشہ اور اس کے کسی فرد کو بھی چھوڑنا اب
ممکن نہیں۔ مر کر بھی، وہیں جیئں گے۔

اب رخصت۔ خدا تمھیں ہمیشہ خوش و
خرم رکھے اور ہوسکے تو جلد ملائے۔ رنج و غم، فکر و
مصیبت کا تمھارے پاس شائبہ تک نہ ہو، تمھاری

ہر پلا میرے سر رہے - اگر میری زندگی کی قربانی سے بھی تمھیں مسرتیں حاصل ہو سکیتں ہیں تو یہ حقیر شئی بھی تمھارے آگئے قربان ہے - تمہاری بیش قیمت محبت، تمھارا خلوص -

ہاں! اب بھی میرے پاس ہیں اور زندگی بھر رہیں گے - میرے دل میں ان کی جتنی قدر ہے شائد کسی اور چیز کی نہیں - کسی اور کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی - تمہارے پاس اگر ہو تو اس کو پُر کر سکتی ہو - میرے پاس کچھ نہیں کہ تمھیں دے سکوں اور جو تمھارے قابل ہو سکے اور تم نے جو کچھ بھی دیا اس کا میں اہل نہ تھا - تم کہتی ہو تم نے سب کچھ کھو دیا لیکن میں نے درحقیقت ہمیشہ کے لئے سب کچھ پالیا - خدا حافظ -

---

نئی کتابیں

دھوپ چھاؤں } یہ مجموعہ ہے جناب فضل الرحمن صاحب ناظم نشریات لاسلکی کے نغموں کا - ہم عنوان پر یہ نظمیں محیط ہیں، پر کیف اور دلکش - موصوف ملک میں اپنے ڈراموں کی وجہ سے کافی شہرت کے مالک ہیں - ہمیں خبر نہ تھی کہ شعر و سخن میں بھی آپ اپنا خاص مرتبہ رکھتے ہیں - زیر نظر مجموعہ میں - صبح مشرق - دکن کا دلدادہ - نغمہ مسرت - کالج - نوید امن - طلسم تخلیق - دائمی منظر - چاند خاص کر جاذب توجہ ہیں جن میں شاعر نے اپنے دلی تاثرات سے دوسروں کو بھی متاثر کر دیا ہے - ذوق سلیم رکھنے والوں اور گل و بلبل سے اُلجھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا - لکھوائی چھپوائی دیدہ زیب ہے - عہ قیمت پر آپ کو مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ - کتاب خانہ انجمن ترقی اُردو عابد روڈ حیدرآباد دکن سے حاصل کر سکتے ہیں -

شاہنشاہ جہانگیر } خدیجہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ ماڈل پرائمری اسکول نے بچوں کے لئے سادہ اور سلیس زبان میں - ڈرامہ لکھنے کی اچھی قدرت بہم پہنچائی ہے - اس سے پہلے آپ کی کئی نا[illegible] اور ڈرامے مقبولیت حاصل کر چکے ہیں - جہانگیر بھی اسی سلسلہ کی ایک زریں کڑی ہے - یہ ڈرامہ حال ہی میں مدرسہ [illegible] فوقانیہ دارالشفا سے تمثیل بھی ہو چکا ہے - محترمہ کی یہ سعی قابل ستائش ہے - قیمت ۶ر حیدرآباد بک ڈپو سے مل سکتا ہے -

---

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

نالوں کا شب ہجر اثر دیکھئے کیا ہو
کٹ جائیگی جب رات سحر دیکھئے کیا ہو

معلوم نہیں مجھ کو تو اس جنگ کا انجام
اڑنے کو تو لڑتی ہے نظر دیکھئے کیا ہو

جینے کی تمنا ہے نہ مرنے کا ارادہ
ہوتی ہے یونہیں عمر بسر دیکھئے کیا ہو

دیوانگی عشق کا کھلتا نہیں کچھ حال
دھڑکا ہے یہی آٹھ پہر دیکھئے کیا ہو

ہر وقت انہیں دیکھتی ہے چشم تمنا
ہو جائے اگر دل کو خبر دیکھئے کیا ہو

نہس نہس کے مجھے گھور کے باتوں میں لگا کے
وہ لے تو گئے دل کو مگر دیکھئے کیا ہو

کل تک تو رہا حشر کا سامان الٰہی!
پھر آج سر راہ گذر دیکھئے کیا ہو

مجھ پر ہی پڑا کرتی ہے صیاد کی نظریں
اس چشم عنایت کا اثر دیکھئے کیا ہو

مشکل ہے عزیز اپنے گناہوں کی تلافی
رہتا ہے یہی مجھ کو تو ڈر دیکھئے کیا ہو

نگاہ آس

جناب میر احمد علی صاحب عاؔجز مازن درانی

میرے معبود تو تو دانا و بینا ہے۔ تجھ سے کوئی حاجت پوشیدہ نہیں واقعی میرا جسم وضمیر اور اس کے معصیت کن نفسیاتی تخیلات تو قطعاً اس قابل نہیں کہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں، تیری تیری اور مجھ پر۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ او۔۔۔۔۔۔ بلندی پر سے دیکھنے والے۔ تو جانتا ہے کہ میرے گرد ہجوم بہشتی تو نہیں جن کے اشکال نورانی سے ندامت ہو میرے قلب منتشر کو اور شرمسار ہو جائیں نگاہیں میری۔۔۔۔۔۔ تو خوب واقف ہے او عالم الغیب کہ میرے قرب فرشتوں کا تو ماحول نہیں کہ جن کی بزرگی و برتری تقدیس و تقدس پر مرتکز ہو جائے میری ضعف نظر بھی۔۔۔۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ میں گنہگار سہی۔۔۔۔۔۔۔

درست ہے کہ میرے ایام حیات معصیت کن سہی۔۔۔۔۔۔ مانتا ہوں کہ میری روح بھی بدترین سہی۔۔۔۔۔۔ میں کسی آرزو کا اہل بھی نہ سہی۔۔۔۔۔۔۔

لیکن کم از کم تیرے نام لینے کا اہل تو ہوں اور تیرے آگے سائل بن کر آیا ہوں۔

اے داتا سائل کو مایوس کرنا تیری شان نہیں تیری ہی قسم سائل کی دین میں تاخیر تیرے محبوب کو بھی پسند نہیں۔

میرے رب بتا۔ آخر یہ دین میں تاخیر کیوں؟ اسلئے او ہمیشہ کے دینے والے۔ مجھے وہ سب کچھ دے جا جس کی مجھے ضرورت ہے۔ اتنا دے جا کہ بس۔ پھر ترسنے کو بھی جی ترس جائے فانی ہستیوں کے آگے دست دراز کرنے کی ذلت سے بچا جو دے کر اتراتے ہیں فرعون بے سامان کی طرح۔۔۔۔

مجھے معلوم ہے عجز تجھے بہت بھاتا ہے انکساری تجھے بہت پیاری ہے۔۔۔۔۔

تو مجھ بلالے اپنے حضور میں تاکہ تیرے ہی روبرو کھڑا مانگتا رہوں۔

ورنہ یہ وہ جگہ ہے کہ اغیار بھی طنز یہ مسکرا دیں گے میری نگاہ آس پہ

حماقت

زینت ساجدہ

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسفید

تیسرا پیریڈ فری تھا مسز بھاشکر آج غیرحاضر تھیں۔ عمر بھر میں چند ہی خوش قسمت دن ایسے ہوتے ہیں جب وہ کالج نہیں آتیں۔ ورنہ جب دیکھو تب موجود۔ آج اور زیادہ مسرت بخش بات یہ تھی کہ انھوں نے کوئی کام بھی نہیں بھیجا تھا۔ ہم نے سوچا چلو کچھ دیر گپ بازی ہی رہے۔ کلاس روم کی دیواروں میں گھٹ کر بیٹھنا تو کفران نعمت ہوتا۔ اس لئے ہم سب بوڑھے املی کے پیڑ تلے۔ سبزہ سے گھری ہوئی اکیلی چٹان پر جا بیٹھے۔ ہم میں سے کسی نے کہا "واقعی ہم بندر لگتے ہیں۔"

علیہ نے جواب دیا "اس میں کیا شک ہے"

انیس بولی "مسئلہ ارتقاء کی رو سے تو ایمان لانا ہی پڑتا ہے کہ ہم اسی نسل کی [illegible] بیٹیاں ہیں۔ اور ہماری کھلی ہوئی حماقتیں اس کی مستند سند ہیں"

آمینہ بولی "اور کوئی اس کا اعتراف کرے نہ کرے لیکن میں تو اقرار کرتی ہوں کہ میں آپ سب سے زیادہ احمق ہوں۔" "ثبوت! کوئی تازہ ثبوت؟" ہم چلائے۔

آمینہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ پیٹھ املی کے تنے سے لگا دی۔ پاؤں جھلا کر بولی "کچھ دن ہوئے ایک رات یونہی آنکھ کھل گئی۔ رات کافی ڈھل چکی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں سے ورے بڑا چاند ٹھنڈی ٹھنڈی ہنسی ہنس رہا تھا۔ ہوا کی خاموش لہریں ایک گیت بہاتی لائیں۔ کوئی مجنوں جیسے چاندنی میں جینا شاید آتی نہیں، گا رہا تھا۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ کان دھر کے سنا تو پتہ لگا [illegible] رہی تھی۔ "من تو لے گیا کون؟" جانے کوئی لے بھی گیا تھا کہ نہیں! جانے اس کے کوئی من ہے بھی کہ نہیں؟ میں یونہی سوچتی رہی۔ یہ من، یہ چاہ اور پیار سب مجھے جھوٹے دھندے معلوم پڑتے ہیں [illegible] ہو گیا۔ چاند اپنے [illegible] سے ساکت ہو گیا۔ گیت بھی گیا ہمیں چپ کر دیتے ہیں۔ من کو لے گیا کون ہے؟ —— نازک نازک نینا اپنے پیا سے موہ لینے والے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ دماغ

سوچنے لگا۔ اس نے یہ گانا بھلا کب گایا تھا؟
کس فلم میں گایا تھا؟ ــــ سوچتی رہی، سوچتی
رہی کبھی اِدھر کبھی اُدھر پہلو بدلتی رہی۔ کچھ یاد
نہ آیا۔ نینا پہلے کس فلم میں آئی تھی۔ اُنہوں۔
کچھ بھی یاد نہ آیا۔ دماغ میں کریدسی ہونے لگی۔
جیسے کمبل کیڑے رینگ رہے ہوں۔ جتنا یاد کرتی
اتنا ہی بھولتی جا رہی تھی۔ گیت خاموش ہو چکا
ہر شئے سو رہی تھی۔ کائنات سوئی ہوئی تھی۔
اور میں جاگ رہی تھی۔ صرف یہی سوچنے کے لئے
کہ اس کا پہلا فلم کون سا تھا۔ بے چین تھی آخر
جب رہا نہ گیا تو میں نے امّی کو آواز دی۔
امّی ۔ امّی ۔ اچھی امّی ذرا اٹھئے تو ۔ امی جاگ
پڑیں۔ گھبرا کر لائٹ کھولی۔ میں بستر سے اتر آئی
"کیا ہے؟" انھوں نے پوچھا "ذرا بھابی کے
کمرے تک تو چلئے!" امی نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات
ہے؟" میں نے کہا "ایک ضروری بات ہے"
امّی نے کہا "یہ آدھی رات کو کیا بات کریگی
وہ بھی سو رہی ہوں گی۔ صبح پوچھ لینا۔ اب
کیوں بے آرام کرتی ہے؟" میں نے مچل کر کہا۔
"نہیں نہیں! ابھی چلئے اسی وقت بہت
زیادہ ضروری بات ہے۔ ورنہ میں سو نہ سکونگی"
"امی بے چاری ــــ کتنی اچھی امی ہیں۔ اٹھ
کھڑی ہوئیں۔ دالان میں روشنی کی صحن میں
اجالا تھا ہی۔ شال اوڑھ لپیٹ کر بھابی کے کمرے
پر پہنچی۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ ملا۔
ضرور گہری میٹھی نیند سو رہے تھے سونے والے۔
دوبارہ ـــ بھائی جان کی آواز آئی۔ دوبارا
ـــ سہ بارہ ـــ بھابی جان کی آواز آئی "کون؟"
میں نے کہا "میں ہوں۔ میں نینو" گھبرا کے
انھوں نے دروازہ کھولا۔ آنکھیں مخمور تھیں۔
دخل در معقولات وہ بھی بے وقت گھبرا گئے۔
یوں ہی شریفوں کا کام تو نہیں کہ کواڑ کھلواتے
پھریں وہ بھی آدھی رات کو۔ "کیا بات ہے؟"
ــــ "ذرا بھابی کو جگا دیجئے"۔ بڑی مشکل سے
بھابی جاگیں۔ "کیا بات ہے مینو؟" "سنئے! بھابی
نینا پہلے کس فلم میں آئی تھی؟" ــــ "اور ایک
رات ہیں" "ہاں ہاں"۔ میں نے اطمینان کی
ایک لمبی سانس کھینچی۔ اور کمرے میں لوٹ آئی۔
امی پریشان بھابی جان حیران اور بھابی کا مارے
ہنسی کے برا حال تھا۔ خود بھابی بھی اکثر اسی قسم
کی حماقتیں کرنے کی عادی ہے۔ اس دن سے میری
حماقت کا تذکرہ ہر کس و ناکس سے ہوتا رہا۔
اور میں سُن سُن کر شرماتی پچھتاتی رہتی۔ دوسروں
کا کیا کہنا میں خود اپنے آپ پر ہنستی تھی۔ اور
سوچتی تھی کہ مجھ سے زیادہ احمق کوئی نہ ہوگا"
ہم سب بند رخاموش بیٹھے۔ آمنہ کی

داستان حماقت سنتے رہے۔ کیونکہ سب کی نفسیاتی تحلیل اور تخیلی ترکیب ایسی ہی تھی۔ ہم سب کو نہ صرف آئینہ سے بلکہ اپنے آپ سے بھی ہمدردی تھی۔ ہائے اللہ ہماری حماقت۔ ہم سب حماقت مآب ہیں۔ تھوڑی دیر سکوت رہا۔ املی کا بوڑھا درخت جانے کیا سوچتا کھڑا تھا۔ اس کی طویل زندگی میں اس طرح کبھی کسی نے اپنی کوتاہیوں کا یوں اعتراف نہ کیا ہوگا۔ آخر جرجیس بولی "دنیا میں کیا ہم سے زیادہ بھی کوئی احمق ہوگا"

——— "کیوں نہیں۔ ضرور ہے۔ اگرچہ کل تک میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔ کل سے میری ہمت کچھ بندھی کہ ہم کچھ زیادہ بے وقوف نہیں۔" ہم سب خوشی میں ایسے چلائے جیسے کسی گنوار کو نوبل پرائز یا کسی نا اہل کو کوئی عہدہ مل گیا ہو۔"

"پرسوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میاچ تھا۔ عسکری کھیل رہے تھے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ مانا ہوا کھلاڑی ہے۔ اپنے کالج کی بہت ساری لڑکیاں اور دوسری عورتیں بھی دیکھنے آئی تھیں۔ میں اور بھابی۔ بھلا ایسے موقعے کہیں ہاتھ سے دئے جا سکتے ہیں۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ ایک لڑکی آئی۔ کم عمر عورت بنی سنوری۔ نازک نازک۔ بیلے کی کلی جیسی۔ آنکھیں چمکیلی مگر اداس تھیں۔ خواہ مخواہ ہم اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کسی کو نہیں دیکھا۔ جیسے ہمارا عدم وجود برابر تھا ——— کھیل شروع ہوا تو ہم نے دیکھا آنکھیں چلمن کی تیلیوں سے لگی ہوئی ہیں۔ اور نگاہیں عسکری سے چمٹی ہوئی۔ تک رہی ہیں، پی جانا چاہتی ہیں اور بلائیں لے رہی ہیں۔ عسکری کی ہر حرکت لڑکی کی آنکھوں میں چمکتی۔ اس کی روح، اس کا دل اور اس کے سارے احساسات صرف آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ یکایک جانے کیا ہوا کہ عسکری کی طبیعت خراب ہوئی۔ اور پہلے جتنا اچھا وہ کھیل رہے تھے۔ اتنا ہی ڈھیلا کھیلنا شروع کیا ——— اب کوئی امید نہ تھی کہ وہ جیت سکیں گے لڑکی گھبرا گئی۔ اس کے لب ہلنے لگے۔ میں اور بھابی نے کان لگا دیئے۔ کہہ رہی تھی "عسکری تمھیں ہارتا ہوا کیسے دیکھوں۔ تم ہارنے کے لئے نہیں ہے۔ کم از کم میں تمھیں ہارتا نہیں دیکھ سکتی۔ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں جان دیدوں گی۔ آنکھیں پھوڑ لوں گی۔ دیکھو میرا دل خون ہوا جاتا ہے۔ تم سنبھل بھی جاؤ ———" اور جانے وہ کیا کیا کہتی رہی۔ ہم دونوں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ پر اسے خبر نہ ہوئی۔ واقعی چند لمحوں میں اس کا گلابی چہرہ پسینہ میں ڈوب گیا تم نے کبھی شبنم سے بھیگے گلاب کو دیکھا ہے۔ ہائے اللہ اتنی پیاری صورت اور پھر یہ حماقت۔

قدرت کی ستم ظریفی پر نہ رویا گیا نہ ہنسا گیا۔
لڑکی بہت بے چین تھی۔ آخر رہا نہ گیا۔ یہ کہکر
گاڑی منگوائی "عسکری ہار رہے ہیں۔ میں
دیکھ نہیں سکتی"۔۔۔ اور چلدی۔ سب حیرت
کے مارے حیران تھے۔ آخر بھابی نے کہا "عینو ہم
بھی بہت زیادہ احمق ہیں۔۔۔ لیکن خدا کا شکر
ہے اتنے تو نہیں"۔ جب سے بھابی کی بات سوچ
سوچ کر ہنستی ہوں۔ اپنی حماقت پر کڑھنا چھوڑ
دیا"۔۔۔ ٹن ٹن ٹن تیسرا پیریڈ ختم ہو گیا۔
پچاس منٹ گویا حماقت میں گذر رہے تھے۔ ہم
سب انگلش کلاس کی جانب کو [illegible]
لیکن [illegible] ہم اتنے تو احمق نہیں

خانہ کعبہ میں نماز کی ابتدا

جب کہ فاروقؓ ہوئے حلقہ بگوش اسلام
آپ نے پوچھا کہ تعداد ہے کتنی اس وقت
کہا [illegible] اس وقت ہیں چالیس [illegible]
[illegible] امید ہی ہو گی [illegible]
حضرت فاروقؓ نے کی عرض یہ اللہ کے رسولؐ
[illegible] بتوں کی ہو پرستش ہر وقت
وہ خدا اور اس کی عبادت کہ نہیں جس کا شریک
یوں ہو پوشیدہ گوارا نہیں کرتی ہمت

پھر تو بوبکرؓ و عمرؓ حمزہؓ عمرؓ وقاصؓ
سوئے کعبہ ہوئے راہی انہیں لیکر حضرت
منتظر حضرت فاروقؓ کے تھے اہل قریش
آپ کو دیکھ کے پھر سب کو ہوئی سخت حیرت
جانب کعبہ چلے آتے ہیں شاد و خرم
جوش اسلام سے رہ رہ کے ٹپکتی شوکت
بڑھ کے اک شخص نے پوچھا کہ عمرؓ بات ہے کیا
کیا ہوا آپ کا وعدہ کہو کیا ہے حالت
کہہ دیا آپ نے ہاں خادم اسلام ہوں میں!
بعد مدت کے کشادہ ہوا باب رحمت
ہاں خبردار جو کی تم نے ذرا بھی جنبش
تیغ یہ دیکھ لو اور پھر کہیں نہیں خیر [illegible]
رعب سے حضرت فاروقؓ کے تھی کس کی مجال
منہ پہ لاتا کوئی ہو گئے سیدھے رخصت
پھر یہ پہنچا کہ گروہ خانہ کعبہ میں گیا
اور ادا خانہ کعبہ میں کیا دو رکعت

بارہا عرض کیا گیا ہے کہ ایک مہینہ قبل
ختم چندہ کی اطلاع دی جاتی ہے کہ اس عرصہ
میں آپ آئندہ خریداری کی نسبت فیصلہ
کریں آپکی جواب نہیں بھیجتے اور وی۔پی
بھیجی جاتی ہے تو واپس کرکے دفتر کو مصارف کا نقصان
پہنچاتے ہیں آخر اس طرز عمل کی کبھی اصلاح بھی ہو گی؟

ایک خط

جہاں بانو ایم اے

ہم اس سے زیادہ وحشت دل عالم کو پریشاں کیا کرتے!!!

آج صبح ہی صبح ایک ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ گئی - ایک خواب پریشاں کی تعبیر بھلا کیا ہوسکتی ہے - کیا ہو گی - کون جانے - جانی بوجھی باتیں - پر انجانی جیسے - زندگی کا اصرار ہے کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھوں - ماضی کو بھول جاؤں قصۂ پارینہ کو دفن کردوں - لیکن پھر یہ شاعر --- یہ حیات نو کے حسین معمار - جینے بھی تو نہیں دیتے - کچھ اِدہر اُدہر کا پراگندہ ادب دیکھ رہی تھی - یونہیں دل بہلانے - بہت سی باتیں بھول جانے - کہ حفیظ کا یہ شعر نظر سے گذرا - اور پھر کچھ بھی تو نہ پڑھ سکی - لو تم بھی سن لو کیا کہتے ہیں یہ حضرت ؎

زمانہ ہو گیا حفیظ پر یہ دل کا حال ہے
کوئی گیا ہے جیسے میرے پاس سے ابھی ابھی

انسان زندگی کے بعض واقعات کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی نہیں بھول سکتا شاعر سیدھے سادے تخیل کو لفظوں کے بے جان ڈھانچہ میں روح پھونک دیتے ہے کھلی ہوئی باتوں سے اسے کھیلنے کے ڈھنگ یاد ہیں - اکثر شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لئے کسی میر کی، کسی غالب کی، کسی اقبال کی ضرورت ہوتی ہے - ہماری تمہاری سمجھ سے ماوراء ہوتی ہیں ان کی صفات - ہاں تو کل کچھ لوگ آگئے تھے - علمی بحث مباحثہ تھا - یونہیں اِدھر اُدھر کی باتیں - بے سروپا مگر جاندار - روح پرور - ادب آموز - لفظ "عورت" پر خیال آرائی ہونے لگی - یہ عربی زبان کا لفظ ہے نا - لغت میں جس کے معنی سختی اور دشواری کے ہیں - لیکن تازہ واردان بساط ہوائے دل اس کو مصیبت اور کمزوری سے معنون کرتے ہیں جانے دو - اب کون بحث کرے ان سے - ایک لفظ کے دو متضاد معنی - بتاؤ کیسے باور کروں - کہاں سختی اور دشواری - اور کہاں کمزوری - کتنا کمزور اعضاء شکن تخیل ہے ان کا جو اس کو کمزور بتاتے ہیں - اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے نہیں - لیکن حقیقت سے کیسے گریز کروں - ان کی اس نوازش کو اوڑھوں یا بچھاؤں؟ کیا کروں؟ اب کہنے والوں

کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ وہ جو چاہیں کہتے رہیں، لیکن اپنا اپنا خیال ظاہر کرنے میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ میرا اپنا یہ نظریہ ہے کیا معلوم تمھیں بھی اس سے اتفاق ہو کہ نہ ہو۔

تحمل، بردباری اور ضبط نفس یہ وہ خوبیاں ہیں جن سے عورت کی زندگی کا ایک گہرا تعلق ہے۔ مصیبت کے وقت بعض مرد کس قدر گھبرا جاتے ہیں بلکہ بوکھلا جاتے ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں سدھرتا انھیں اس وقت۔

"اک پھول کا دامن سی نہ سکے تنظیم گلستاں کیا کرتے"

عورت ہر آنیوالی مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے، ہر تکلیف کو سہنے کے لئے تیار و مستعد رہتی ہے۔ وہ کمزور ہے لیکن مصیبت کے وقت طاقتور بن جاتی ہے۔ وہ بہادری پر مرتی ہے۔ اور بہادری کے مواقع کی متلاشی رہتی ہے۔ اس کے نزدیک گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی آن واحد کی دلیرانہ زندگی زیادہ وقعت و منزلت رکھتی ہے۔ عرب قوم کی عورتیں اس شوہر کی بیوی بننے پر فخر کرتی تھیں جنھوں نے سینہ پر ضرب کھائے ہوں۔ پیٹھ کا زخم ان کے لئے باعث ننگ سمجھا جاتا تھا۔ فی زمانہ یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ عورت مصائب سے خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ اس میں تاب مقاومت نہیں

وہ نری بزدل ہے۔ وہ ہر ایسے کام میں حصہ لینے سے ڈرتی ہے۔ جس میں جان کا خدشہ لگا ہوا ہے۔ لیکن یہ سب سوءظنی ہے ـــــ وہ زخمیوں کے زخم کتنی بے جگری سے دھوتی ہے۔ اس کے کبھی ان زخموں کو دیکھ کر بیہوشی کا دورہ نہیں پڑا۔ عورت ایک بہادر اور دلیر مرد کو پسند کرتی ہے۔ وہ جب یہ نہیں چاہتی کہ اس کا باپ، بھائی، شوہر یا بیٹا بزدل ہو تو وہ کیونکر بزدلی کی ذلت کا تصور بھی کر سکتی ہے۔ بہادر مائیں قوم کے لئے باعث صد فخر و ناز مانی جاتی ہیں۔

ڈر اور خوف انسانی زندگی کے لئے نہایت تلخ تخیل ہیں۔ جن کا انجام یاس وحسرت، ذلت و پشیمانی ہوتی ہے۔ طمانیت و آسائش کے زمانہ میں تو سب ہی شان کی لیتے ہیں۔ لیکن جب کسی مصیبت کا حقیقی سامنا ہوتا ہے۔ یا کوئی خطرہ قریب ہوتا ہے۔ تو پھر جان جیسی بیوفا چیز کی حفاظت کی کیسی کیسی تدبیریں سوجھتی ہیں۔ حفظ ماتقدم کی ہر امکانی کوشش کیجاتی ہے۔ اب نرسنگ کو ہی لو۔ کیسی صبر آزما منزل ہے۔ لیکن آج تک کسی مرد کو نرسنگ کرتے دیکھا ہے؟ وہاں صبر و برداشت کا مادہ ہی کہاں۔ قربانی کی صفت سے محروم۔ بھلا کیا جانیں نرسنگ۔ عورت کو اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اسی لئے شاید وہ

آتی سخت جان بھی ہوتی ہے۔ جو خطرہ سے گھبراتا ہے خطرہ اسی کا خیر مقدم کرتا ہے۔ زندگی۔ ایک ناپائیدار سی چیز ہے۔ موت چونکہ اٹل ہے۔ اور اس دو دن کی زندگی ہیں، ایک دن اس کا بھی ہے۔ اس لئے زیادہ اہمیت دینے کے قابل تو انسان کی موت ہے۔ خوف وہراس ایمان کو مستحکم نہیں رہنے دیتے۔ موت سے ڈرنا ایمانی کمزوری ہے۔

عورت ایک قوم کی تخلیق کا باعث ہے۔
اگر کسی خاندان کی عورت واقعی بزدل
اور کم ہمت ہے تو ہم یہ کہہ کر اپنا سر پیٹ لیں گے۔
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

فنا کے بعد لحد پر وہ آکے روتے ہیں
کہاں کی چھیڑ نکالی ہے کہہ دو سوتے ہیں

شاد عظیم آبادی

فنا کے بعد بقا کی ہوس نہیں ہے مجھے
رہا ہوں قید سے قید قفس نہیں ہے مجھے

باز۔ حیدر آبادی

شہید کے مرقد پر

کسی شہید کے مرقد پر ایک حاجتمند
چمن کے کچھ گل تازہ چڑھانے آیا تھا
چھڑک چھڑک کے عرق اور لگا لگا کر عطر
وہ تشنگیٔ عقیدت بجھانے آیا تھا
دل ستم زدہ و اشکبار آنکھوں سے
اسے فسانۂ کلفت سنانے آیا تھا
چلا وہاں سے تو روح شہید کہنے لگی
کہ "بے خبر! مجھے تو کیوں ستانے آیا تھا"
یہ عطر و پھول چڑھانے تھے مہ جبینوں کو
میں ناز نین ہوں مجھ کو سنگھانے آیا تھا
جو لانا ہی تھا تو شمشیر تیز دم لاتا
تو میری روح کو بزدل بنانے آیا تھا

کالی کاپی

غفار سعید

ابا جان کالج گئے ہوئے تھے — میں ان کے کمرہ میں بیٹھی کاپیاں الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ — مجھے کاپیوں پر لڑکوں کے نام پڑھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ اور پھر ان کے حاصل کردہ نشانات — اور بعض پر ابا جان کا ریمارک (Remark) بھی خوب ہوتا۔ میری نظر ایک سیاہ جلد کی کاپی پر پڑی — میں نے اٹھا کر دیکھا کسی رنگیلے کے افسانے تھے خط تو اچھا تھا میں نے افسانوں کے صرف عنوانات دیکھ کر پھینک دئے۔ مجھے افسانے پسند آتے تھے لیکن افسانہ نویسوں سے چڑ تھی۔ معلوم نہیں ان لوگوں نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ پھر میں نے کالی کاپی اٹھالی اور سوچا۔ پڑھ کر تو دیکھو آخر لڑکے نے لکھا کیا ہے۔ اور ویسے پڑھنے کو بھی جی بہت چاہ رہا تھا — اور افسانے ابھی تک میں رسالوں اور کتابوں ہی میں پڑھتی تھی۔ مسودہ کی شکل میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں پڑھنے والی تھی کہ امی جان نے ڈانٹ بتائی کہ ترکاری بنانی ہے اور میں افسانے وہیں چھوڑ کر بھاگ گئی۔

صبح ابا جان کالج جا رہے تھے۔ ارادہ ہوا کہ کہہ دوں ابھی مت لیجائیے مجھے ذرا پڑھنا ہے مگر پھر خاموش ہو گئی — اور جیسے ہی ان کی نظر ہٹی میں نے جھپٹ کر وہ کاپی کاغذوں میں چھپا دی۔ ابا جان جاتے ہوئے کاپی بہت ڈھونڈتے رہے اور نہ ملنے پر مجھ سے بھی تلاش کرنے کہا۔ میں نے سوائے اس جگہ کے جہاں کاپی تھی ہر طرف دیکھ ڈالا اور ابا جان بادل ناخواستہ وہ کاپی بغیر لئے ہی چلے گئے لو جاتے ہوئے کہہ گئے کہ شام میں ان کے ساتھ کاپی کا مالک آئیگا میں ڈھونڈ رکھوں۔ ابا جان کے جانے کے بعد میں نے وہ افسانے ایک ایک کر کے سب پڑھ ڈالے۔ کاپی کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ نام پڑھا۔ ابھی فسٹ ایر میں ہے یہ — لیکن باتیں بہت بڑی بڑی کرتا ہے۔ جیسے لڑکیاں اس کی غلام ہیں — مجھے اس کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ آخر افسانہ نویس ہوتے کیسے ہیں — میں کاپی پھینک کر چلی آئی —

میں اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی ـــــ شاید پانچ بجے ہوں گے اتنے میں باہر سے اباجان نے آواز دی۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ابا کے ساتھ کوئی کالج کا لڑکا بھی تھا۔ سانولا رنگ۔ متوسط قد۔ شیروانی پہنے تھا ـــــ میں دروازہ کھول کر اندر چلی آئی ـــــ اباجان نے آتے ہی کاپی مانگی اور میں نے لاکر دیدی۔ اباجان مردانے میں کاپی لیجاتے ہوئے کہہ گئے کہ میں دو پیالی چائے بھیج دوں۔ چائے کی فرمائش سنتے ہی مجھے غصہ آگیا۔ اب ان افسانہ نویسوں کے لئے چائے بھی دی جارہی ہے۔ میں دل ہی دل میں اباجان کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اور اس افسانہ نویس کو تو دل چاہ رہا تھا کہ بس ـــــ ......! میں نے عمداً ایک پیالی میں نمک ملادیا۔

پردے میں سے جھانک کر دیکھا تو ـــــ افسانہ نویس صاحب بیٹھے ہوئے تھے ـــــ اباجان کپڑے بدلنے گئے تھے ـــــ میں نے ماما کے ہاتھ سے شکر کی پیالی لیلی اور نمکین پیالی اس لڑکے کو دے آنے کہا۔ افسانہ نویس صاحب اپنی کاپی دیکھنے میں مشغول تھے پیالی لے کر رکھ لی اور بدستور کاپی دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد ایک گھونٹ پیا اور پھر برا سا منہ بناکر رکھ دیا۔ اس کی ایسی صورت دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور شاید اس نے آواز سن بھی لی ہو۔ وہ پیالی کو رکھ کر بیٹھ گیا ـــــ اتنے میں اباجان داخل ہوئے اور اس نے فوراً اٹھ کر ادب سے وہ پیالی انہیں پیش کر دی ـــــ اباجان تکلف کر رہے تھے ـــــ اور مجھے ادھر ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے ماما کے ہمراہ فوراً دوسری پیالی بھجوادی مگر اس نے وہ پیالی خود لیلی۔ اب تو میرا حال برا ہوا جاتا تھا۔ پردہ چھوڑ کر بھاگ آئی ہاتھ پاؤں میں کپکپی چھوٹ گئی ـــــ اور دل چاہتا تھا کہ اسے ایک پتھر کھینچ ماروں۔ اتنے میں اباجان داخل ہوئے۔ غصہ سے ان کا برا حال تھا۔

"بیوقوف کہیں کی ـــــ" انھوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"اجی ہوا کیا ـــــ" امی جان نے کہا۔

"ہوتا کیا صاحبزادی کو شکر اور نمک کی تمیز نہیں۔ دیکھو نا چائے میں نمک ملادیا"

امی جان نے کہا "کئی بار کہا بھی کہ سفید نمک علیحدہ رکھا کرو۔ شکر اور نمک کی تمیز جاتی رہتی ہے مگر تم کہاں ......!

میں کونے میں دبکی کھڑی تھی ــ دوپٹہ کا کونہ دانتوں میں دبائے ۔ کتنا بدمعاش ہے ـــ ! قسم ہے جو اس سے اس کا بدلہ نہ لیا تو ۔ میری نفرت اور بڑھ گئی ۔

کچھ دنوں بعد ابا جان کے یہاں اس کی کاپی پھر دکھائی دی ۔ ابا کالج گئے ہوئے تھے ـــ میں نے سوچا بہتر ہے کہ اسے جلا دیا جائے ۔ پھر سوچا ابا جان سے خوب ڈانٹ پڑے گی ـــ پھر ارادہ ہوا کہ لکیریں کھینچ دوں ـــ اور میں نے اکثر جگہ پنسل سے لکیریں کھینچ دیں ـــ بعض مقامات پر سیاہی بھی چھڑک دی اور اس کے نام کے آگے " بدمعاش " لکھ دیا ـــ اس پر بھی میرے انتقام کی آگ نہیں بجھی ـــ ابا جان نے دو تین روز بعد کاپی واپس کر دی ۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا ۔ شاید وہ خود بھی دیکھ کر انجان ہو گیا ہو گا ـــ اس کی خاموشی سے میری اور شکست ہوئی ـــ اور اب تو میں بری طرح اس سے نفرت کرنے لگی اور انتقام کی آگ بھی بہت بڑھ گئی ـــ اور سوچنے لگی کہ اس سے کچھ اس طرح کا انتقام لینا چاہیئے کہ عمر بھر یاد رکھے ـــ دن گذرتے گئے ـــ !!!

ابا جان کمرے میں نہیں تھے ۔ کالج کے پرچے میز پر رکھے ہوئے تھے ـــ گرمیوں کی تعطیلات تھیں ـــ دوپہر کا وقت تھا ـــ میں خاموش بیٹھی ہوئی تھی ، یکایک مجھے خیال آیا ۔ انتقام کا بہترین موقع ہے ۔ میری نظر پرچوں کے بلنڈلوں پر پڑی ـــ ایک طرف جانچے ہوئے پرچے رکھے تھے ۔ مگر شاید اس کا پرچہ اس میں نہ ہو ـــ میں پرچے الٹ پلٹ کرنے لگی ـــ نام کیا تھا اس کا ـــ یاد نہیں پڑتا ـــ تھوڑی دیر تک میں پرچے الٹ پلٹ کرتی رہی ـــ آوہ خوب یاد آیا ـــ اور تھوڑی سی تلاش میں اس کا پرچہ بھی مل گیا میں نے سرخ پنسل ہاتھ میں لی ۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ ابا جان کو پتہ چل گیا تو ـــ کسی کی زندگی کا ایک سال ـــ " صفر " ـــ دس نشانات کم کر دیے گئے ۔ یعنی ـــ فیل ـــ اور وہ بھی ـــ سالانہ امتحانات میں ـــ آہ ۔ ہا ۔ ـــ ہا . . . . .

پانچ چھ سال گذر گئے ـــ ابا جان کو وظیفہ ہو گیا ـــ زندگی بالکل بدل گئی ـــ دوپہر کا وقت تھا ـــ " وہ " بیٹھے ہوئے تھے ـــ اپنی انگلیوں سے میرے بال میں کنگھی کرتے ہوئے ۔ وہ اپنی طالبعلمی کی زندگی یاد کر رہے تھے ۔ ہماری شادی ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے ۔ میں چپ

چاپ بیٹھی ان کی باتیں سُن رہی تھی باتوں باتوں
میں میں نے پوچھا" اچھا کیا آپ کبھی فیل بھی
ہوئے ؟"

"ہاں"

"کب"

"ایک بار انٹر میں — ہمارے پروفیسر صاحب
کی لڑکی کی عنایت کی وجہ سے ۔"

"وہ" — میں پریشان ہوکر اٹھ گئی —
میں نے ان کے چہرہ کو دیکھا — صورت جانی ہوئی
نظر آئی —"

"وہ کالی کاپی آپ کی ....!!!
.... وہ مسکرا رہے
تھے .... میں شرمندہ تھی — !

گلاب کا پھول

نہیں - کلیوں کو پھول بنانا تمہارے بس
کی بات نہیں ؟

کلی کو لے کر جھنجھوڑو - مارو جو چاہے کرو!
اسے پھول بنانا تمہاری طاقت سے باہر ہے -
تمہارا چھونا اسے ملوث کر دیتا ہے - تم اس کی
پنکھڑیوں کے ٹکڑے اڑا دو - انہیں خاک میں
ملا دو - مگر کوئی مہک کوئی رنگ نمودار نہ ہوگا -

آہ - کلیوں کو پھول بنانا تمہارے بس کی
بات نہیں - وہ جو کلی کا منہ کھول سکتا ہے وہ
یہ کام بس یوں ہی کر دیتا ہے وہ اس پر ایک نگاہ
ڈالتا ہے اور اس کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے
لگتا ہے اس کے سانس سے کلی اپنے پروں کو
پھیلا دیتی ہے اور ہوا میں پھول بن کر لرزنے لگتی ہے
رنگ دلوں کی تمناؤں کی طرح چھلکنے لگتے ہیں اور
مہک ایک پیارا راز افشا کر دیتی ہے وہ جو کلیوں
کا منہ کھول سکتا ہے وہ یہ کام بس یوں ہی
کر دیتا ہے - ٹیگور

دوشیزگی

دیوی کا مجسمہ ایک کنواری دیوی کا خنک مرمریں
مجسمہ جھیل کے بے حرکت پانی کی نگہبانی کر رہا ہے جس
میں ایک قرمزی پتیوں والا کنول کا پھول تیر
رہا ہے اور چاند کے روپہلی عکس لرزاں لرزاں
چمک رہے ہیں اس کی چاند کی سی سرد و بے داغ
آنکھیں جذبات سے عاری ہیں - بے عیب زمردوں
سے بنی ہوئی ہیں اور دونوں ہاتھ اس کے
مرمریں سینہ پر رکھے ہوئے ہیں - جہاں
انہیں زندگی کی کوئی دھڑکن کوئی حرکت
محسوس نہیں ہوتی -

تاثیر

الفتِ رفتہ

یاد ایام کہ دل محوِ جمالِ یار تھا — رات دن مجھ کو میسر جلوہ دیدار تھا
حسن کی تنویر سے ہستی تھی میری مستنیر — اکتسابِ نور کرتے تھے مرے قلب و ضمیر
ذرّہ ملوِ تجلی تھا میرا سینہ کبھی — انعکاس جلوہ عارض کا آئینہ کبھی

جس سے آتی تھی شعاعِ امید کی آلام میں
چھپ گئی وہ شمع آخر کسوت ایام میں

شمع! وہ روشن تھا جس سے میرا فانوسِ خیال — جس سے حاصل میری پروازِ تخیل کو کمال
روز روشن اس کی فرقت میں شبِ یلدا ہوا — میرا جنت زار گھر دوزخ کا ہمسر بن گیا
بجھ گئی وہ شمع پروانہ تڑپتا ہے ہنوز — حسن کی گرمی گئی اب ہے جدائی کا تموز

اک مسلسل خامشی ہے میرے موجودات میں
سہم جاتا ہے کوئی جیسے اندھیری رات میں

کیا ہوئے وہ دن کہ تھا میرا مقدر سازگار — کشور ہستی تھی اک دنیائے بے لیل و نہار
دل مرا اندوہ و رنج و غم سے کوسوں دور تھا — ایک کیف بیخودی میں رات دن مخمور تھا
ساقئ گلچہرہ بے منت پلاتا تھا مجھے — میں اگر بیہوش ہوتا تھا جگاتا تھا مجھے

ہو چکا وہ دور، وہ صہبا نہیں ساقی نہیں
آہ! اس اجڑی ہوئی محفل میں کچھ باقی نہیں

(نیرؔ امرتسری)

ڈِسکا

جناب نور الحسن صاحب بی۔ اے

(بسلسلہ پیوستہ)

یہ کون ہے؟ اس نے دریافت کیا۔ میں
یہ جاں نواز ہنسی پہلے بھی سُن چکا ہوں۔ یہ ضرور
میری جانی پہچانی ہستی ہے "
لیکن مونزل نے گویا اس کی گفتگو سُنی
ہی نہیں۔ وہ پھیلا پڑا ہوا ہزاروں خواہشوں
کی دنیا لئے ہوئے بصد آرزو و شوق وہ ان کو
دیکھ رہا تھا جو طرح طرح کے لباسوں میں ملبوس
نہایت اشتیاق کے ساتھ ایک خاص مرکز
پر کھنچے چلے آتے تھے۔ یہ ایک عورت تھی جو
زرّیں لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور
پرانی وضع کا مصری نقاب آنکھوں تک ڈالے
تھی [illegible] کی کمر پیٹی اور بالوں میں جواہرات
ہی جواہرات تھے۔ وہ عورت چل نہیں رہی تھی
بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آہستہ آہستہ [illegible]
رہی ہے۔ اُس کا آدھا کھلا ہوا ڈھیلا ڈھالا
لباس کی موزونیت سے نہایت ڈھکا رہا تھا
لباس گویا چاند کے اطراف ہالہ تھا۔ اس کے
آگے آگے ایک حبشی شوخ SCARLET
لباس پہنے ہوئے اُلٹے پیروں چل رہا تھا اور
مصری عجیب وضع کا مور کے پروں کا پنکھا اپنی
مالکہ پر آہستہ آہستہ جھلتا جاتا تھا۔ مور کے
پروں کی آب و تاب زرّین لباس کی چمک خیرہ
کر دینے والے جواہرات، اُس کی آنکھوں کی
سحر آگیں سیاہی اور ان کی چمک یہ تمام چیزیں
بیک وقت جرویس پر برق بن کر گریں۔ کچھ
ایسی ہی بات تھی جس کو وہ نہ سمجھ سکا کہ کیا
بات تھی جس نے اس کو اندھا کر دیا۔ اُس کا
سر چکرا گیا۔ بغیر محسوس کئے ہوئے کہ وہ کیا کر رہا
ہے وہ بڑے اشتیاق سے آگے بڑھا لیکن اتنا
[illegible] چھوٹا سا ہاتھ اُس
نے اپنے کاندھے پر محسوس کیا۔ وہ جھجھک کر
[illegible] سا ہو کر رک گیا
"معاف کیجئے گا" اس نے اپنی [illegible]
[illegible]
[illegible]

دوسرا باب

جرویس ایک دم چونک پڑا اگرچہ ابھی وہ
بوکھلایا ہوا تھا۔ کس کے متعلق استفسار کیا؟

شہزادی دُسکا۔۔۔ نہیں! میں انہیں نہیں جانتا۔ نہیں ٹھیرو۔ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ان کو دیکھا ہے۔۔۔۔ کہیں شاید پیرس میں۔ کیا تم میرا ان سے تعارف کرا دو گے؟

ڈاکٹر نے کہا کہ میں یہ فرض ڈنزل مرے کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ ان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ ڈاکٹر تو ایک خاص انداز میں مسکراتا ہوا اور اپنی ٹوپی کو سر پر اچھی طرح جماتا ہوا ناچ کے کمرے کی طرف چلا گیا لیکن جرویس گومگو کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اُس کی آنکھیں متحیر کر دینے والی زرین مجسمہ پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ مجسمہ کوئی خواب کی طرح اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔

ڈنزل مرے آگے بڑھ چکا تھا اور اب شہزادی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے سے مسرت کے آثار نمایاں تھے جس کو کہ وہ چھپانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد جرویس اس کی طرف بڑھا اور گفتگو کا کچھ حصہ سُن سکا۔

مرے کہہ رہا تھا "آپ حسین ترین مصری شہزادی ہیں۔ لباس مکمل ہے"۔

وہ ہنسی۔ پھر وہی میٹھی عجیب وغریب ہنسی۔ جرویس کے رگ وریشہ میں وہ ہنسی سما گئی۔ اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔ وہ کانوں میں بجتی ہوئی دماغ میں سما گئی اور اس کو جانی پہچانی، سنی سنائی ایک عجیب سی بازگشت معلوم ہوئی۔

اُس نے جواب دیا "کیا ایسا نہیں ہے؟ میں تاریخ کے نقطۂ نظر سے صحیح ہوں جیسا کہ تمھارے دوست ڈاکٹر ڈین کہیں گے کہ میرے زیورات سچے ہیں۔ وہ سب ایک ہی مقبرہ سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اتنے میں ایک مردانہ آواز نے کہا "شہزادی صاحبہ معاف کیجئے گا۔ مجھے ایک کمی آپ کے لباس میں محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ آپ کا آدھا چہرہ نقاب سے چھپا ہوا ہے اور یہ ہم لوگوں پر ظلم ہے۔ اُس نے ایک خاص انداز میں اپنے حسن کی تعریف کا جواب دیا۔ اور یوں گوہر فشاں ہوئی کہ قدیم مصر کا یہی رواج تھا۔ اس زمانہ میں محبت کے یہ نہ تھے جو آپ ہیں — ایک نظر غلط انداز، ہلکی سی مسکراہٹ ایک دل کو آتش محبت میں جلانے اور دوسرے کو عشق کے شعلوں میں بھسم کرنے کے لئے کافی تھے۔ عورتیں جوانی میں اپنے چہروں کو اس لئے چھپاتی تھیں کہ لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ وہ اپنے حسن کو فضول خرچ کر رہی ہیں اور سن رسیدہ ہونے کے بعد اور بھی چھپاتی تھیں تاکہ اپنے

چہرے کی جھریوں سے سورج کے حسین دیوتا کو ناراض
نہ کریں۔ یہ کہکر وہ کچھ اس دلربایانہ انداز میں
مسکرائی کہ جرویس غیر شعوری طور پر اس سے
دو چار قدم اور نزدیک ہوگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا
کہ گویا اس کو ایک مقناطیس ہے جو اپنی طرف
کھینچ رہا ہے۔ شہزادی نے مسکراتے ہوئے کہا
لیکن میں ہر وقت نقاب سے اپنے چہرے کو مستور
رکھنے کے لئے مجبور نہیں ہوں یہ کہتے ہوئے
اس نے نقاب کو الٹ دیا۔ نقاب کا الٹنا تھا
کہ ایک حسین ترین مکھڑا جلوہ افروز ہوا جس کی
تر و تازگی کنول کو مات کرتی تھی اور جس کے
سامنے چاند شرمایا جاتا تھا اور جس حسن کی
تصویر کو بنی آدم نے کبھی نہیں دیکھا اور جس کے
سامنے ذی روح زبان ساکت ہو جاتی اور
دم رکنے لگتا تھا۔ مسٹر مرے غالباً اب آپ
خوش ہوئے۔ ڈینرل پیلا پڑ گیا۔ اس نے جھکتے
ہوئے ہونٹوں میں کچھ کہا اُس
نے اپنی کماندار بھوؤں کو اٹھایا اور اس کو
نظر بھر کر دیکھا۔

تم بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہو لیکن
میں ان سے ہمیشہ خوش نہیں ہوتی۔ غالباً یہ
یہ میری خطا ہے" اور جیسے ہی وہ آگے
بڑھی اس کا حبشی غلام اس کے آگے آگے
حسب سابق چلنے لگا۔ جرویس اس کے راستہ
میں حائل ہوگیا اور ایک دوسرے کے مقابل
آ کھڑے ہوئے۔

جرویس نے ایک حاکمانہ انداز میں ڈینرل
سے کہا "میری اس خاتون سے ملاقات کراؤ"

ڈینرل نے اس کو متعجب نظروں سے
دیکھا کیونکہ اس کی آواز صاف بتا رہی تھی کہ
وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش
کر رہا تھا۔

"یقیناً۔ شہزادی صاحبہ مجھے اجازت دیجئے"
وہ رک گئی حسن کا ایک خاموش اور مکمل مجسمہ۔
مجھے اجازت مرحمت فرمائیے تاکہ اپنے دوست
ارمنڈ جرویس کو میں پیش کروں۔ فرانس کے
مشہور ترین مصور ارمنڈ جرویس شہزادی دہکا۔
اس نے اپنی گہری، سیاہ آنکھوں کو اٹھایا
اور جرویس کے چہرہ کو بغور دیکھا اور جیسے ہی اس
نے شہزادی کو بے باکی کی نظروں سے دیکھا تو اس کو
ایک قسم کی تھرتھراہٹ اپنے جسم میں محسوس ہوئی
اس میں کوئی انتہائی مانوس مماثلت تھی۔ اس کے
بدن کی خوشبو، اس کا قد و قامت۔ اس کے
بال اور سینہ گو جواہرات سے مزین تھے اور خصوصاً
اس کی آواز جو نہایت دلدوز اور پُر اثر تھی۔

"اگر ملاقات ہو ہی گئی" جناب ارمنڈ جرویس

اس نے اپنے سر کو متانت سے جنبش دیتے ہوئے اور ایک طرف جھکاتے ہوئے کہا۔ لیکن میں آپ کو اجنبی نہیں سمجھ سکتی کیونکہ ہماری روحیں ایک سال سے ایک دوسرے سے واقف ہیں یہ

ایک چکا چوند کر دینے والی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔ جرویس نے جیسے ہی اس سے ہاتھ ملایا وہ ہاتھ جو عجیب و غریب جواہرات سے مزین تھا اور جس کو اس نے نہایت مہربانی سے جرویس کی طرف بڑھایا تھا ایک بے پناہ جذبات کا طوفان اس کے دل میں امنڈ آیا اور تمام نسوں رگوں میں خون کی کثرت روانی کی وجہ سے ہیجان پیدا ہو گیا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی آپ سے شرف ملاقات حاصل ہے۔ شاید حسین خواب میں جو ابتک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا تھا" یہ کہتے کہتے اس کی آواز شدت جذبات سے دھیمی پڑ گئی۔ شہزادی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے چہرے سے نہ مسرت اور نہ خفگی کے آثار نمایاں ہوئے۔ لیکن نوجوان ڈاکٹر جو کے دل پر سے اور رنگ کی وجہ سے ... جھگڑا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کو احساس ہوا کہ عورتوں اور مردوں میں ایسے واقعات اور مواقع ہو سکتے ہیں۔ جب آپس میں رقابت پیدا ہو جائے اور ایک بے چین خواہش اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے اور ترتیب سے لباس، دولت، ماثر اور خوش اطواری میں بڑھ جانے کی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک حسرت کی نظر جرویس کی مردانہ وضع قطع پر ڈالی اور اس کے سڈول اور متناسب بدن نے جو جھنجلاہٹ اس کے دل میں پیدا کی تھی اس سے اس کو شرم محسوس ہونے لگی۔ اس کو گو اپنے حسن کا احساس تھا اور اس دن فینسی ڈریس میں وہ اور بھی بھلا معلوم ہو رہا تھا لیکن جرویس کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی یہ جاذبیت قدرتی تھی۔ اس کی ایک ادا تھی۔ وہ انوکھی طرز رہائش کا مالک تھا۔ اس کے حرکات و سکنات سے ہر موقع پر اس میں جاذبیت پیدا کر دیتے تھے۔

جب وہ اسکاٹ لینڈ میں اس کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا تو معمولی ٹوئیڈ میں ملبوس اس کو دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ ٹوئیڈ کوئی اس سلیقہ سے نہیں پہنتا کہ ٹوئیڈ کسی پر ایسی نہیں سجتی جیسی جرویس پر۔ بدو کے لباس میں جواب وہ زیب تن کئے ہوئے تھا اور چھوٹا نکلتا تھا اس کی آنکھوں اور ہونٹوں میں جذبات کے شعلے بھڑک رہے تھے اور وہ بدوؤں کے لباس کے ساتھ وہ بدو ہی نظر آتا تھا۔

(باقی)

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر

صدر المہام تعلیمات

شہاب

ناہید

ناہید

جلد ۸ | تیر ۱۳۵۴ ف مطابق مئی ۱۹۴۵ عیسوی | نمبر ۳

۱۔ نماز۔ کا مضمون پڑھیے اور سوچیے کہ ہماری نماز کن تخیلات میں ادا ہوتی ہے۔

۲۔ دقیق نگاہیں۔ رحیم النسا رفیق کا مختصر سا فسانہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ آئی ہیں ناہید میں۔

۳۔ کوہاٹ۔ واقعی بڑی دور ہے رحیم النسا سجانی نے لکھا ہے۔

۴۔ کے تصور سے۔ آج سے ایک عرصہ پہلے حجاب بنارسی شہاب میں لکھا کرتی تھیں۔ بہت دنوں بعد پھر مصروف نگارش ہیں۔

۵۔ ایک دوپہر۔ غالباً گذرے ایام کی یاد ہے۔

۶۔ چند نیم وحشی قبایل۔ غالباً یہ اقتباس ہے جو وحیدہ نسیم نے بھجوائے ہیں۔

۷۔ خطابت کے اصول آپ کے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

۸۔ فسانہ کی اشاعت کیلئے ذوق کی حد تک نامہ اپنا واضح پتہ لکھیں گمنام مضامین قابل توجہ نہیں سمجھے جاتے۔

۹۔ گذشتہ مہینہ زینت ساجدہ کا مضمون "ٹیلیفون" جو شائع ہوا ہے وہ ہندی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (ادب)

ہماری نماز

نجیبہ حسرت

خدانے جو نعمتیں عطا کی ہیں بندوں کو مطلق اس کا احساس نہیں، ناشکر گزار کبھی دماغ پر زور ڈال کر یہ نہیں سوچتا کہ ذرہ سے لے کر آفتاب تک کس کا ظہور ہے؟ ان حشرات الارض کو رزق دینے والا کون ہے؟

ہر پرند، چرند اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کرتا ہے، اپنے معبود حقیقی کی عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ برعکس اس کے انسان کو دیکھئے جس کو اللہ نے اشرف مخلوق بنایا۔ جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ وہی اپنے رب کا شکر ادا کرنے کی بجائے گرم گرم لحافوں میں منہ لپیٹ کر آرام سے سوتا ہے صبح ہوئی تو ان کو کچھ سروکار نہیں۔ سورج نکلا تو نکلنے دو۔ نماز کا وقت ختم ہو رہا ہے ختم ہونے دو۔ زوال ہو رہی ہے ہونے دو۔ انہیں تو سردی ہو رہی ہے۔ فانی گھونسلے جسم کو آرام دے رہے ہیں۔

اگر کوئی خدا کا نیک بندہ ادا کرے گا بھی تو اپنی غرض کے لئے۔

بندہ اپنا بعض کی نماز کا حال سنئے۔ فجر کی نماز کے لئے بڑے اہتمام سے رات ہی کو گھڑیال میں الارم کی کنجی دیتے ہیں۔ پورے پانچ بجے گھڑی نے الارم بجانا شروع کر دیا۔ لیکن نیند کے غلبہ کا یہ عالم ہے کہ آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ سارا گھر گھڑی کے شور سے بیدار ہو گیا لیکن نمازی صاحب کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ بڑی بوڑھیوں نے اٹھایا کہ میاں الارم بج رہا ہے اٹھو۔ بڑی مشکل سے ادھر کی کروٹ ادھر بدلتے ہوئے رضائی اور اچھی طرح اوڑھ لی جاتی ہے۔ جب دوبارہ سہ بارہ اٹھانے کی کوشش کی گئی تو بصد مشکل انگڑائیاں لیتے آنکھیں ملتے سی سی کرتے سردی کو برا بھلا کہتے بیدار ہوتے ہیں۔ اور سوئیٹر، گلوبند، موزے دستانے وغیرہ زیب تن کر کے رفع حاجت کے لئے گئے تو پون گھنٹہ۔ اس کے بعد وضو کے پانی کی باری آتی ہے۔ پانی گرم کرنے کے لئے ماما کو حکم ہوتا ہے۔ منجن اور تولیہ لانے کے لئے سوتے ہوئے چھوکرے کو جھنجھوڑ کر اٹھایا جاتا ہے ادھر بیچاری ماما چولھا پھونکتے پھونکتے بیزار ہو گئی۔ لکڑیاں کچی ہیں چولھا جلتا ہی نہیں۔ ادھر تقاضہ پر

تقاضہ کہ پانی جلد لاؤ، نماز کا وقت گزر رہا ہے۔
غریب ماما لکڑیاں بیچنے والوں کو کوستی ہوئی
بہ وقت پانی لا دیتی ہے۔ اب میاں صاحبزادے
وضو کرنے بیٹھے ہیں۔ کمبخت کریم کھڑاویں لانے
بھول گیا۔ استغفر اللہ، بڑے نالائق سے سابقہ پڑا
ہے۔ بیچارہ کریم کھڑاؤں کی تلاش میں سرگرداں
ہے۔ رات کو کسی نے بلی کو مارا تھا۔ ایک تو جھاڑ
کے گملے کے پاس ملا اور ایک ندارد۔ اب ٹوپی
اور جانماز کی باری ہے۔ ٹوپی تلاش کرنے میں
تھوڑا سا وقت ضائع ہوگیا لیکن ٹوپی نہیں
ملی۔ وقت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے نانی اماں
کی جانماز پر۔ سر پر تولیہ لپیٹ فجر کی نماز ادا
ہونے لگی وہ بھی اس قدر عجلت سے کہ کچھ الفاظ
زبان سے ادا ہو رہے ہیں اور باقی حلق پر ہی
اکتفا کر رہے ہیں۔ رکعت باندھ کر اِنّی وجہت
بھی شروع نہ ہوئی تھی کہ ماسٹر صاحب کا ریاضی
کا ہوم ورک حل ہونے لگا اب + اج لا اور
ہ ب ج ا لا کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زاویہ ب کا ناصف
ن کھینچو خط ب ا کی تنصیف وغیرہ وغیرہ۔ اس کے
بعد سورہ فاتحہ شروع کیا کہ کل شام کے کرکٹ
میاچ کا نقشہ ذہن میں پھرنے لگا۔ امرناتھ نے
دو گول بنائے۔ ہادی نے ایسا تاک کر مارا ابھی
رن بھی نہ بنا تھا کہ وکٹ اوٹ۔ ۔ ۔ ۔ خدا خدا
کر کے شیطان کے قریب سے بچ کر جیسے بھی ہو نماز
فجر ادا کی۔ ظہر کے لئے خدا بھلا کرے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب
کا کہ مدرسہ میں ظہر کی نماز واجب کر دی۔ جو تھوڑا
سا وقت یار دوستوں سے گپ شپ مارنے کا دوپہر
کی چھٹی میں ملتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ خدا کے ڈر
سے تو نہیں البتہ جرمانہ کا خیال کرتے ہوئے کہ چورن
اور برف کے لڈو کے پیسے اگر جرمانہ میں چلے گئے تو
کھاؤ گے کیا۔ نماز ظہر بھی ادا کر لی۔ عصر کو گراؤنڈ پر
کھیل رہے تھے۔ مغرب تک گھر لوٹ آئے، اور
نشرگاہ حیدرآباد کا بچوں کا پروگرام سننے میں
مشغول ہوگئے۔ پروگرام کچھ ایسا دلچسپ ہوتا ہے
کہ چھوڑ کر جانے جی نہیں چاہتا۔ عشا کو کچھ تو نیند
اور پیٹ بھر کھانے کی وجہ سے سستی چھائی تھی اور کچھ
استاد شیطان نے بھی بہکا دیا۔ کل سے ضرور پڑھیں گے۔
کے خیال سے تسلی دیتے ہوئے سو گئے۔ یہ تھی طالبعلم
کی نماز۔ اب بیگمات کی نماز کا حال سنئے۔ پہلے تو
چھوٹے بچوں کی ماؤں پر نماز فرض ہی نہیں بچوں
کی دیکھ بھال خود ایک عبادت ہے انہی کی گود سے
بچے پروان چڑھ کر کوئی عالم کوئی فاضل کوئی ملا
اور کوئی مولوی ہوتا ہے۔ یہ کیا کچھ کم احسان اللہ
میاں پر ہے جو نماز پڑھیں گی۔ نیو فیشن طالبات کو
تو اپنے تعلیم اور بال سنوارنے کریم لگانے پاؤڈر لگانے
سے ہی کب فرصت ہوتی ہے جو نماز پڑھیں گی۔

اسکول کی گاڑی صبح ۶ بجے آجاتی ہے ۶ بجے تک
اگر لباس تبدیل نہ کریں بالوں کو نہ سنواریں کتابیں
ٹھیک نہ کریں تو کیا ہو۔ اگر فضول نمازیں وقت
گنوایا جائے تو یہ سب کام کب ہوگا۔ اب رہے
بیچارے درمیان والے جو نہ تو نیو فیشن ہیں نہ
طالب العلم بس گھریلو زندگی بسر کرتے ہیں ان کی
نماز کا حال سنئے۔ صبح ہوتے ہی مرغ نے اذاں
دے کر اپنا فرض ادا کر دیا۔ بیچاری نے مرغ کی
اذان کی آواز سن کر لحاف الٹا اور فوراً اٹھ
بیٹھی ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کر کے رکعت
باندھی کہ خیال آیا کہ آج میاں کو صبح کا دفتر ہے۔
اگر ملازمہ کو اناج دے کر نماز پڑھتی تو بہتر تھا
جلد جلد سنت ادا کی اور ملازمہ کو آواز دی اشاروں
سمجھانا شروع کیا کیونکہ وظیفہ پڑھ رہے ہیں
بات نہیں کر سکتے۔ ہوں اوں چار ماپ آٹا سبحان اللہ
سبحان اللہ جلدی سبحان اللہ سبحان اللہ پاؤ سیر
قیمہ ہوں اوں سبحان اللہ سبحان اللہ سات بجے
تک ہوں سبحان اللہ اللہ اکبر سبحان اللہ۔ ملازمہ
بیچاری منہ دیکھتی ہوئی کھڑی ہوئی ہے۔ ہوں
صبح کا دفتر ہوں سبحان اللہ اللہ اکبر سبحان اللہ
اللہ اکبر سبحان اللہ اللہ اکبر سبحان اللہ اللہ اکبر
سرکار جلدی ہوں ہوں سبحان اللہ اللہ اکبر۔ اب
فرض کی نیت کی اور سورہ فاتحہ میں خیال آیا کہ
فکر نہیں ہے۔ پہلے ہی خیال آتا قیمہ کے ساتھ
منگوا لیتی۔ اتنے میں سرکار بیدار ہوتے ہیں اور
بیوی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "ابھی تم نماز
پڑھ رہی ہو۔ کیا مصیبت ہے ان عورتوں سے"
(گھڑی دیکھ کر) "اف مجھے ناظم صاحب کے
پاس جانا ہے ناشتہ کب ملے گا۔ اجی قائم بی
ای ای۔ کیا کھانا نہیں پکا۔" فیروز کہاں مر گیا
دستر بھی نہیں بچھا۔" . . . . وغیرہ وغیرہ۔ بیوی
نے آدھی پڑھی نماز ختم کی اور میاں کے ناشتہ
کے لئے آگئیں۔ یہ تو تھی فجر اب ظہر کا حال سنئے
اللہ کی بندی نے دو رکعت پڑھتے تیسری کے
لئے ہاتھ اٹھایا بھی نہ تھا کہ چھنن چھن نانا
چھن کی آواز نے نماز کو درہم برہم کر دیا۔ روشن
جائے کے برتن دھو کر لا رہی تھی کہ کشتی چھوٹ
گئی اور سارے برتن پھوٹ گئے۔ زبان سے
تو قل اعوذ ادا ہو رہا ہے اور دل میں روشن
کو گالیاں دی رہی ہیں کہ حرام زادی کے ہاتھوں
میں طاقت نہیں نہ معلوم کھایا پیا کہاں چلا
جاتا ہے کتنی دفعہ تاکید کی کہ آہستہ آہستہ چلا کر
اور تھوڑے تھوڑے برتن لیجایا کر لیکن کمبخت
سنتی نہیں موئی حرامزادی۔ جہیز کا اتنا عمدہ
سیٹ شاید ہی کہیں ملے۔ اب موئی کو اتنا
مزا چکھاؤں گی کہ یاد رہے۔ بہر حال جلد نماز ادا کی

اور روشن کی خبر لینے پہنچ گئیں۔ بیچاری روشن
ندامت اور شرمندگی کے مارے کانپتی ہوئی ٹوٹے
ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کرکے اور ان کو جوڑنے کی
ناکام کوشش کر رہی تھی کچھ سمیٹنے میں ہاتھ کٹ
گیا تھا جس کو وہ دبا کر اور زیادہ خون نکالنا
چاہتی تھی شاید خون کو دیکھ کر بیگم صاحبہ کو
رحم آجائے۔ لیکن توبہ کیجئے بیگم نے اپنے جہیز
کے سیٹ کا یہ ناس ہوتے ہوئے دیکھا تو آپے
سے باہر ہوگئیں جو ہاتھ لگا اسی سے بیچاری کو
پیٹنے لگیں۔ لات، مکی، چوٹی غرض ہر قسم کی بچاری
کو تکلیف دی جب بھی دل کا بخار کم نہ ہوا۔
بیچاری لاوارث معصوم بچی چیختی چلاتی رہ گئی۔
نماز تو ثواب کمانے کے لئے پڑھ رہی تھیں لیکن دل دکھا کر
الٹا عذاب کمایا یہ نماز ظہر کا حال تھا۔ اب عصر کا
حال ملاحظہ فرمائیے۔ نماز پڑھ رہی تھیں کہ سوئیاں
تاگہ بی کی دلخوش کن آواز نے دل کو اس طرف
متوجہ کر دیا۔ رشیدہ نے بلا کر جائزہ لینا شروع
کیا اور ادھر نماز ڈانواڈول۔ خوش رنگ ساڑیاں،
کٹورے گلدان صابن ربن وغیرہ متحرک سینما کی
طرح ذہن میں پھرنے لگیں۔ اگر ساڑی اچھی ہو
تو پرانی ساڑی دے کر لوں گی۔ کیونکہ ابھی اماں
کے پاس نیاز میں بھی تو جانا ہے اگر نئی ساڑی
ہو تو کیا اچھا ہوگا۔ غرض جوں توں کرکے نماز
ختم کی اور ساڑی بلوز وغیرہ کے لئے آ دھمکیں۔
یہاں تک تو عورتوں کی سرگزشت تھی اب مردوں
کا حال بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مرد عموماً سال میں دو دفعہ نماز پڑھتے ہیں
عید الفطر اور عید الضحیٰ، یہی دو ایسی عیدیں جب
مسلمان لوگ مسجد جا کر نماز پڑھتے ہیں وہ بھی ہر سال
طریقہ بھول جاتے ہیں۔ نماز کی تیاری تو بہت
دھوم دھام سے ہوتی ہے، نہانے اور عیدگاہ
جانے کا باقاعدہ انتظام ہوتا ہے۔ امور مذہبی کے
چھپے ہوئے اشتہار کو غور سے بار بار پڑھ کر نماز کا
طریقہ یاد کیا جاتا ہے۔ جماعت میں کھڑے ہو کر
آنکھ بچا کر سامنے والے شخص کی طرح کرتے جاتے
ہیں۔ سامنے والا شخص ہوتا ہے وہ اپنے سامنے
والے کو دیکھتا ہے۔ غرض یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح
سے حل ہو ہی جاتا ہے اور خوش خوش جب گھر
پہنچتے ہیں تو قربانی کا گوشت مزے لے کر اڑاتے
ہیں۔ اسی طرح جو لوگ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں وہ بھی
کافی تیاری کرتے ہیں، نہا دھو کر شیروانی پہن کر
عطر وغیرہ مل کر عطر کو ہر طرف مہکاتے ہوئے مسجد کی
طرف چلتے ہیں اور جب پہنچتے ہیں تو لوگ نماز سے
فارغ ہو چکے ہیں اور جو لوگ پنج وقتہ نماز پڑھتے
ہیں وہ ہر نماز میں ہر شخص اپنے پیشہ کے متعلق
سوچتا رہتا ہے۔ وکیل صاحب اگر نماز پڑھ رہے

ہوں تو مقدمات کی پیروی میں نئے نئے پہلو دل میں سوچتے رہتے ہیں مدعی نے اگر ایسا کیا تو مدعی علیہ کو ایسا کرنا...... وفلاں فلاں۔ غرض ہر شخص اپنے کاروبار کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ ان سب سے پاک و سچی نماز تو ہماری عطیہ کی ہے جو دوسروں کو وضو کرتے دیکھ کر خود بھی وضو کرکے اپنی زبان میں توتلی زبان میں پوچھتی ہے۔

اماں دان میں بی نماز پلوں۔ اماں جان تو بہت خوشی سے اجازت دیدیتی ہیں وہ بھی انہی کے ساتھ کھڑی ہو کر اماں کی جیسی حرکتیں کرتی جاتی ہے۔ وضو بھی کس طرح کرتی ہے دو چار ہاتھ منہ پر مار پاؤں دھو چلو اٹھ کھڑی ہوئیں اور کہیں سے ایک میلا تولیا ہاتھ لگا تو اسی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور جا نماز پر کھڑے ہو کر ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مضبوطی سے باندھ کر مسکرا کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ پاکر جلد جلد سجدہ کرکے دعا کرتی ہے۔ اللہ ابا کو بہت دے امی کو بہت دے بھائیوں کو تامیاں تر۔ میرے تو اچھا رت۔ چلو دعا ختم اب وہ خوشی سے اٹھتی ہے اور ہر ایک سے کہتی پھرتی ہے۔ میں نماز پلی۔ یقیناً خدائے تعالیٰ اس چھوٹی سی بچی کی نماز سے بہت خوش ہوتا ہوگا۔ کیونکہ اس نے جو نماز پڑھی وہ ریاکاری اور دنیا کے تکلفات سے علٰحدہ ہے۔ خدا ہم سب کے دل میں بھی سچے دل سے نماز پڑھنے کی توفیق دے۔

خطابت کے دس اصول

۱۔ ہمیشہ نرم و آہستہ آواز سے بولنا شروع کرو رفتہ رفتہ آواز کو بلند کرو۔

۲۔ ہر لفظ کو زبان اور لب کی پوری حرکت سے صاف صاف ادا کرو۔

۳۔ ہر لفظ دوسرے سے علٰحدہ ادا کرو تاکہ باہم گڈمڈ نہ جائیں۔

۴۔ ٹھیر ٹھیر کر گہری سانس لے کر تقریر کرو اور ایسا کبھی نہ ہو کہ تم کچھ بول رہے ہو اور تمہارے دانت بند ہوں۔

۵۔ اپنے سامنے سامعین کی طرف دیکھتے رہو اور اگر کوئی تحریر پڑھ رہے ہو تو کوشش کرو کہ آواز کی موجوں کا رخ سامعین کی طرف سے نہ ہٹے۔

۶۔ جب خطبہ دو تو پوری طرح تن کر کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔

۷۔ تقریر کے وقت کبھی تنگ و چست کپڑے استعمال نہ کرو۔

۸۔ کھانا کھانے کے بعد تقریر کرنے سے احتراز کرو۔

۹۔ میٹھی چیزیں زیادہ استعمال کرو۔

۱۰۔ اور اگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود تمہاری آواز کام نہیں دیتی تو کسی طبیب سے رجوع کرو۔

دل کے ٹکڑے

ہمیں اسیر تو ہونا ہے اپنا اچھا یاد　　کشش نہ دام کی دیکھی، نہ کوشش صیاد　　غالب

اے آہ ذرا بنا دے سیدھا　　ہے چرخ میں سخت کج ادائی　　مومن

میری زندگی پر تعجب نہیں تھا　　میری موت پر ان کو حیرانیاں ہیں　　حفیظ

جہاں میں داغ نے دیکھا ہے کس کو　　یہ تکتا چارسو کیا جانے کیا ہے

مصحفی! ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم　　تیرے سینہ میں بہت کام رفو کا نکلا

بس ابتدا ہی ابتدا ہے زندگیٔ عشق میں　　کہ بھول بھی سکی تیری نگاہ اولیں کہیں　　فراق

بہائے درد و الم درد و غم کی لذت سے　　وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کیلئے　　اصغر

ان سے تسکین غم بھی کیا چاہوں　　کس کو توہین غم گوارا ہے　　شجیع

وہ سجدہ کیا، رہے احساس جس میں سر اٹھانے کا　　عبادت اور بقید ہوش، توہین عبادت ہے　　سیماب

آرزو پھر ہے درپئے تدبیر　　شعر ناکام کی دہائی ہے　　فانی

بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشق معتبر ہو کر　　گزر جا، ہاں گزر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر　　جگر

پہلی سی چشم تر نہیں، لب کوئی شرر نہیں　　تجھ کو ہے شکوہ کس لئے تو بھی تو باخبر نہیں

دامن دوست کا خیال غلام الم جنون ہے　　اشک غم آؤ پونچھ لیں اپنی ہی آستیں سے ہم　　گمر جالسی

ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو　　کہ سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

جوش ملیح آبادی

«ج»

دقیق نگاہیں

رحیم النساء رفیق

شیام لال گاؤں کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن کا ٹکٹ ماسٹر تھا۔ چند قیمتی سوٹ اور کچھ آرائشی وزیبائشی سامان بس یہی کل اس کی کائنات تھی۔ آدمی جوان اور نہیں مُکھ ہونے کے علاوہ بلا کا سادہ لوح واقع ہوا تھا علم نجوم و موسیقی میں اسکے کافی مہارت تھی۔ تصرفات بیجا سے اسے ایک والہانہ اُنس تھا۔

ادنی طبقے کے دہقانی لوگ جو اسے اکثر سمجھ نہیں سکتے تھے عام طور پر ایک خاموش اور خبطی انسان تصور کرتے۔ گاؤں والوں کو زیادہ تر یہ شکایت تھی کہ وہ ٹکٹ دینے کے بجائے ان لوگوں کے ہاتھوں کو بغور دیکھا کرتا ہے جو بسا اوقات ٹکٹ کیلئے اس کی کھڑکی میں دراز رہتے ہیں۔ لیکن شیام ان باتوں سے قطعی بے نیاز اپنی زندگی کے دن کاٹے جا رہا تھا وہ اکثر سوچا کرتا کہ دنیا میں یہ رسمی مراعات و دکھاوے کے تکلفات یہ عظیم ترین نشیب فراز آخر کیوں؟ کیا بہتر ہوتا جو پرماتما اس زمانہ میں دکھ سکھ اور زر بھی ایک ہی توازن سے تقسیم کرتے تاکہ دنیا والے بغیر کسی شکوہ شکایت پر سکون زندگی گزار سکتے ..... خدا جانے اور بھی ایسی کتنی ہی باتیں روز اس کے صفحہ دماغ پر آتیں اور ایک حرف غلط کی طرح مٹ جاتیں مگر شیام کی ناخن عقل کبھی اس گرہ کو کھول نہ سکی۔

(۲)

ایک روز گاڑی کے آنے میں کافی دیر تھی شیام ٹکٹ گھر میں بیٹھا بدستور کسی گہری سوچ میں منہمک تھا اور کبھی ایک ہلکے تبسم کے ساتھ گنگنا بھی جاتا۔ اچانک ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔ مسٹر شیام ایک ٹکٹ ...... اور یہ سامان بھی بُک کرا دیجئے۔

شیام مسکراتے ہوئے۔ اوہو رادھا تم! سمجھتے یہ چھٹیاں شروع ہوئیں اور تم پردیسی کو خیرباد کہتی چلیں اب یہ چھٹیاں کہاں گزارو گی .....؟

رادھا گاؤں کے اسکول کی ایک ٹیچر اور شیام کی ملاقاتی

رادھا تم تو جانتے ہو شیام اسی جگہ میں اب

اپنا پرایا کوئی نہیں یونہی دن بیتتے جاتے ہیں گھر جا رہی ہوں۔ پتاجی بہت بیمار ہیں سندیسہ آیا ہے کہ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ بھگوان جانے میرے بھاگ میں ان کے درشن بھی ہیں یا نہیں اُن ہی کی آشائیں بنی ہوئی ہیں ورنہ ایک بے جان تنکے کی طرح بھی چلی جاتی سچ ہے کہ دنیا میں کسی کا سہارا بھی انسان کو بے سہارا کر دیتا ہے اور ......

شیام۔ نہیں نہیں رادھا اتنا نراس نہ ہو بھگوان پر بھروسہ رکھو وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا ......

رادھا بات کاٹتے ہوئے ...... شیام ایک بات کہوں۔

شیام۔ ضرور۔

رادھا۔ سنا ہے کہ گاؤں والے تمہیں جوتش کہا کرتے ہیں رام جانے یہ الٹی پلٹی باتیں کس حد تک صحیح ہیں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھئی میں تو تب جانوں کہ تم میرا بھی ہاتھ دیکھو اور سچ سچ بتاتا کہ کیا لکھا ہے آخر میرے بھاگ میں۔

شیام۔ سنجیدگی سے۔ بہت ممکن ہے رادھا دہقانیوں کی طرح تم بھی میری ان باتوں پر طنزیہ مسکرا دو۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ ان چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں اور باریک باریک سے بے جوڑ لکیروں میں دنیا کے کتنے زبردست انقلابات پنہاں ہوتے ہیں حال ہی میں ایک بدشکل سا ہاتھ سرسری طور پر میری نگاہوں سے گزرا تھا مجھے یقین ہے کہ اس وقت وہ خوش نصیب دنیا کے چپہ چپہ کی سیاحت کر رہا ہوگا۔ چنانچہ تمہارا بھی ہاتھ دیکھتے ہوئے میری دقیق نگاہیں صاف یہ کہہ رہی ہیں کہ عنقریب تمہارے قلب کو ایک روحی اذیت سے ہمکنار ہونا پڑیگا اور چند ہی ساعتوں بعد اچانک اک خوشگوار مسرت سے تمہاری آنکھیں چکا چوند ہو جائینگی۔ اور تم تھوڑی دیر کیلئے ایک رومانوی دنیا میں کھو کر غالباً شیام کی اس پشینگوئی کو بھی بھول جاؤ گی۔

———(۳)———

گاڑی اسٹیشن سے قریب تر تھی جس کی سیٹی سے رادھا چونک پڑی ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ شیام واقعی زندگی میں ایسے خوشگوار لمحات اگر آجائیں تو میں وچن دیتی ہوں کہ اس سمے میں تمہیں ہرگز نہ بھولوں گی۔ گاڑی اسٹیشن سے بڑھتی جا رہی تھی رادھا اور شیام کی امیدوں کو لئے ہوئے۔

———(۴)———

دسمبر کی ایک سہانی شام شیام شہر سے آتے ہوئے ملفوف کے مطالعے میں مصروف تھا معاً ایک

باریک سی رنگین تحریر پر اس کی نظریں مرتکز ہو کر
رہ گئیں۔ لفافہ فوراً چاک کیا۔ لکھا تھا

اچھے شیام

پرنام

افسوس کہ پتا جی چل بسے جس کے صدمہ نے
مجھے اس دنیا میں تنہا اور پژمردہ چھوڑ دیا۔ اور
معلوم ہوا ہے کہ ایک پوشیدہ و کثیر رقم میرے
لئے چھوڑ گئے ہیں میں چاہتی ہوں کہ اس کے
تصرفات تم سے اور مجھ سے ہی وابستہ رہیں اور
.... کیا یہ میری پرارتھنا منظور ہے۔

مضطرب جواب

گاؤں والوں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں
پرادہار شیام کی شادی کے شادیانے بج رہے تھے۔

"آہ وہ لطیف گھڑیاں بہت جلد گذر گئے اب
پھر وہی تنہائی ہے اور یاد ماضی!!!
گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے

ایک دوپہر

آمنہ صدیقی

کچھ عجیب دل خوش کن سماں تھا مجھے ایسا محسوس
ہو رہا تھا کہ ہر ایک آنیوالی سانس میرے لئے سامان
مسرت و انبساط لا رہی ہے۔ آج پوری ہونیوالی تھی
میرے ارمان، میرے سکون نا آشنا دل کے ارمان نکلنے
کے لئے میرے سینہ میں مچل رہے تھے۔ پیاری سکھی کیا ہی
پرمسرت تھی وہ گھڑی جب کہ میں مدتوں بعد تم سے ملنے
آ رہی تھی۔ افراط مسرت سے میرے ہاتھ پاؤں سرد ہوئے
تھے، اور میرا ننھا سا خوشیوں سے مجروح دل بری طرح
دھڑک رہا تھا۔

وہ لامتناہی راستہ کسی طرح ختم ہی نہ ہوتا تھا کہ یکلخت
جھاڑوں کے جھنڈ سے تمہارا خوبصورت مکان نظر آنے
لگا۔ اس وقت پرند اپنے اپنے آشیانوں میں بیٹھے
دھیمے دھیمے چہچہا رہے تھے۔ شاید وہ بھی شور مچا کر
مخل ہونا نہ چاہتے تھے۔ موسم کتنا خوشگوار تھا ٹھنڈی
ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا
تھا کہ آفتاب بھی ہماری ملاقات سے خوش ہو رہا ہے
دلپسند دھوپ پیپل کے "دل نما" پتوں کو تاروں کی
طرح جھلکا رہی تھی۔ اس وقت میں ہر چیز میں ایک
کیف محبت محسوس کر رہی تھی اور میرا دل ایک شگفتہ
پھول تھا۔ اف میں اب ان احساسات کا اظہار
نہیں کر سکتی جو میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔

۴۴

کوہاٹ

مسنر رحیم النساء سبحانی

۲۵ر اگسٹ کو ہم حیدر آباد دکن سے روانہ ہوکر ۲۹ر کو صبح ۵ بجے کوہاٹ پہنچے۔ راستہ بہت آرام سے گزرا۔ صرف دہلی پر سیٹ محفوظ ہونے میں گڑبڑ ہوئی۔ لیکن راولپنڈی تک محفوظ ہوئی۔ البتہ راولپنڈی سے کوہاٹ تک محفوظ نہ ہوسکی۔ جس سے کچھ تکلیف ہوئی اور گرمی بھی کافی تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ مکان اچھا کشادہ اور خوبصورت مل گیا ہے جس کے اطراف نالے بہتے ہیں، باغ بھی ہے، یہاں مکانوں کی قلت ہے اور بڑی دقت سے ملتا ہے۔ سرکاری مکان میں تو چار آفیسر ایک گھر میں رہتے ہیں۔ میرا مکان ملٹری ہاسپٹل کے قریب ہے۔ یہاں کا ملٹری ہاسپٹل بہت بڑا اور شاندار ہے۔ کوہاٹ اچھا شہر ہے ہر ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہیں لیکن ریشمی کپڑا نہیں ملتا۔ روزمرہ کا تو مل جاتا ہے یہاں سینما بھی ہے خاصہ بڑا ہے۔ یہاں طانگے کرایہ پر چلتے ہیں مگر کرایہ تانگوں کا بہت ہوتا ہے کہیں اگر تانگہ ٹھیراؤ تو کرایہ کے علاوہ پانچ چھ روپیہ لیتے ہیں۔ یہاں کوئی خاص چیز دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔ اگر ان پٹھانوں کی دنیا میں چند گھرانے اچھے نہ ہوتے تو دل کا بہلنا مشکل تھا لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ خوب دعوتیں اور پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں یہاں کے لوگ ہنسنا اور خوش رہنا اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں شلوار شیمز دوپٹہ پہنتی ہیں۔ مرد گھر میں شلوار قمیص پہنتے ہیں۔ باہر جاتے وقت سوٹ میں رہتے ہیں یہاں رات کے کھانے کے بعد ہری چائے پی جاتی ہے۔ دعوت میں بھی کھانے کے بعد چاء کا دستور ہے۔ یہاں غلہ اور ہر ضرورت کی چیزیں بہت گراں ہیں۔ نوکروں کی تنخواہیں بہت ہیں۔ خانساماں (۴۰) روپیہ ہے۔ آیا (۵۰) روپیہ۔ دھوبی (۱۶) روپیہ لیتا ہے۔ بعض دھوبی تو فی کس (۸) روپیہ لیتے ہیں۔ مہتر (۱۵) روپیہ۔ چھوکرا (۱۵) روپیہ اور کھانا۔ مالی (۲۵) روپیہ۔ یہاں ہر گھر میں مالی رکھنا ضروری ہے کیونکہ چمن اور ترکاری لگانا ضروری ہے۔ مکان کے اطراف دیواریں نہیں ہوتی ہیں بلکہ درختوں اور اور پھولوں کو بیل سے صحن گھیرا جاتا ہے۔ اس سے مکان کا پردہ

ہو جاتا ہے اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے کنٹونمینٹ
بہت صاف ستھرا ہے۔ اور صفائی کا بہت
اچھا انتظام ہے۔

ہر موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سردی
میں سخت سردی اور گرمی میں سخت گرمی۔ سردیوں
میں پہاڑوں پر برف جمی رہتی ہے اور چار مہینے
سخت سردی رہتی ہے۔ ہر وقت آتش دان
جلانا ہوتا ہے۔ ایک دو دن تو برف کی بارش
ہوئی۔ بہت لطف آیا۔ برف روئی کے گالوں
کی طرح گر رہی تھی اور اتنی گری کہ ہر درخت کا
پتہ سفید ہو گیا اور صحن بھر گیا۔ گرتی ہوئی برف
کی میں نے تصویریں لی ہیں اور پہاڑوں کی بھی۔
یہاں سردی اس قدر ہوتی ہے کہ ہر درخت کا
پتہ سوکھ جاتا ہے۔ اور ترکاری بھی سردی سے
خراب ہو جاتی ہے۔ مارچ کا مہینہ موسم بہار کا
ہوتا ہے۔ وہاں یعنی حیدرآباد میں جو ترکاری
گرمی میں ہوتی ہے وہ یہاں سردی میں، اور
یہاں سردی کی ترکاری وہاں گرمی میں ہوتی ہے۔
گرمیوں میں سورج رات کے پونے نو بجے
غروب ہوتا ہے۔

ہم لوگ ایک دن پشاور دیکھنے کے لئے
گئے تھے۔ پشاور بڑی اچھی جگہ ہے ہر مشہور جگہ
اور عمارت باہر ہی سے موٹر پر چکر لگا کر دیکھا۔
کیونکہ وقت کم تھا۔ وہاں لڑکیوں اور لڑکوں کے
دو کالج اور میوزیم بھی ہے۔ یہاں سے پشاور جاتے
ہوئے ۹ میل سے بہت ہی خطرناک راستہ پہاڑوں
کا ہے۔ موٹر جب اونچائی پر چڑھتی ہے تو موت
آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ جب انتہائی بلندی پر
موٹر چڑھ جاتی ہے تو نیچے کا راستہ دکھائی
نہیں دیتا اور ذرا نزدیک کا راستہ سانپ کی طرح
دکھائی دیتا ہے۔ موٹر کئی میلوں کا چکر لگاتی ہوئی
اوپر چڑھتی ہے اور پھر نیچے اترتی ہے تو بہت
ڈر لگتا ہے۔ اکثر موٹریں الٹ کر نیچے چلی گئی
ہیں۔ ہمارے یہاں آنے کے بعد بھی دو تین حادثے
ہوئے۔ یہاں سے ۹--۱۰ میل بعد ہی آزاد علاقہ
شروع ہو جاتا ہے۔ صرف گورنمنٹ کی سڑک ہے
آزاد علاقہ کے لوگ چاہے وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو
ہر ایک کے کندھے پر بندوق ساتھ رہتی ہے اور
وہ اپنا کام کرتے ہیں۔ مگر بندوق ساتھ رہے گی۔
ان کے مکانات صرف پتھر کے بنے ہوئے چھوٹے
چھوٹے مگر مضبوط ہوتے ہیں۔ ہم لوگ صبح ۱۰ بجے
پشاور گئے اور شام میں ۶ بجے واپس گھر ہوئے
راستہ میں بہت لطف آیا۔ کئی لوگوں کا ساتھ
تھا۔ پشاور یہاں سے (۴۰) میل ہے۔

یہاں پردہ کا بہت خیال ہے عورتیں
بغیر برقعہ کے نہیں نکلتیں۔ یہاں کے گاؤں میں

کوئی عورت پر نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا ورنہ اس کی خیریت نہیں۔ یہاں کی عورتیں بہت دلیر ہوتی ہیں۔

حیدر آباد کی باتیں سننے کو دل چاہتا ہے ریڈیو پر بھی حیدر آباد بالکل سنائی نہیں دیتا صرف دہلی اور پشاور سے ریڈیو سنتی رہتی ہوں پشاور سے پروگرام بہت اچھا ہوتا ہے۔ یہاں پارٹیاں اتنی ہوتی ہیں اور کرنی پڑتی ہیں کہ بالکل فرصت نہیں ملتی۔ اور روز ہم لوگ ملتے ملاتے ہیں۔

چند نیم وحشی قبائل
کی عورتوں کے رسم و رواج

نیٹیگو قوم کی عورت اس قوم کی عورت کا رنگ بالکل سیاہ ہوتا ہے اس پر سے حسن افزائی کے لئے چہرے کو سبز وسے رنگ لیتی ہیں۔ شادی کے معاملہ میں بالکل آزاد ہوتی ہیں عجیب بات یہ ہے کہ مردے کو آڑوں دفن کرتی ہیں اور اس کے ترکے کو جلا ڈالتی ہیں۔

نیا قوم کی عورت آپ کا مسکن اصلی جنوبی افریقہ ہے چہرہ گول اور دانت لانبے ہوتے ہیں اگر آپ کا شمار دائرہ انسانیت سے خارج کرکے گوشت خوار جانوروں میں کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ آپ اپنے لانبے نکیلے دانتوں سے جسم انسانی کو بھی گوشت کے شوق میں سرفراز فرماتی ہیں مردے کباب بنا کر ان کو دفن کر دیتی ہیں مصیبت کے اوقات میں ایک مرغ کو پانی میں چھوڑ دیتی ہیں اگر وہ رہ گیا تو فال نیک ہے ورنہ آغاز مصیبت۔

زولو قوم کی عورت دانت چھوٹے ناک چوڑی اور بال بیحد گھنے ہوتے ہیں۔ ہڈیوں کا زیور زیب تن فرماتی ہیں اور اس پر سے گدنا گوندکر آپ اپنے حسن کو دو بالا کرتی ہیں۔ سارے بدن پر ہمیشہ چربی لگی رہتی ہے سمجھ لیجئے کہ چکنا گھڑا بنی ہوئی ہیں۔

نیوزی لینڈ کی عورت غصہ بیحد ہوتا ہے چنانچہ اکثر اوقات غصہ سے ناچنا شروع کر دیتی ہیں۔ زولو عورتوں کی طرح ہڈیوں کا زیور پہن لیتی ہیں جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اس کے سا... اس کا مال و اسباب بھی دفن کر دیتی ہیں اور نوکروں و اعزا کو بھی مار ڈالتی ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ سب مرحوم کے کام آئے۔ سلام کا عجیب وغر... طریقہ یہ ہے کہ ملتی ہیں تو آپس میں ناک رگڑتی ہیں... اگر عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تو پہلے رو لیتی ہیں۔ (وحیدہ نسیم)

براہ کرم مضامین صاف خط میں روانہ فرمائیں کیونکہ غلطی کا امکان ہے۔

"تصور سے"

حجاب بنارسی

خواب رنگین محبت کا دکھایا کیوں تھا؟ میری خوابیدہ امنگوں کو جگایا کیوں تھا؟

راز جینے کا مجھے تم نے بتایا کیوں تھا؟ چار دن کے لئے طوفان اٹھایا کیوں تھا؟

یاد رہ رہ کے مجھے آتے ہیں وہ خواب جمیل تھے کبھی کعبہ دل کے لئے تم میرے خلیل!

کیا خبر تھی کہ کروگے نہ وفا کی تکمیل قصہ درد جگر مجھ کو سنایا کیوں تھا؟

میں تو واقف بھی نہ تھی رسم جہاں سے ہمدم زندگی صرف تبسم تھی محبت کی قسم!

چھیڑ کر تم نے میرا بربط ہستی اس دم گیت الفت میں ڈوبا ہوا گایا کیوں تھا؟

نغمہ عشق سے معمور تھی یہ ساری فضاء غنچہ دل کو مرے چھیڑتی تھی باد صبا!

سوز سے کس لئے تم نے مجھے آگاہ کیا دل کو آتشکدۂ شوق بنایا کیوں تھا!

داغ ناکام محبت کا لگانا تھا تمھیں روز یوں پچھلی پہر جب کہ رولانا تھا تمھیں!

شمع کی طرح مجھے ہائے جلانا تھا تمھیں ربط مجھ بخت کی ماری سے بڑھایا کیوں تھا

اب بھی تجدید محبت کی خدارا کر لو!

اس طرح درد محبت کا مداوا کر لو!

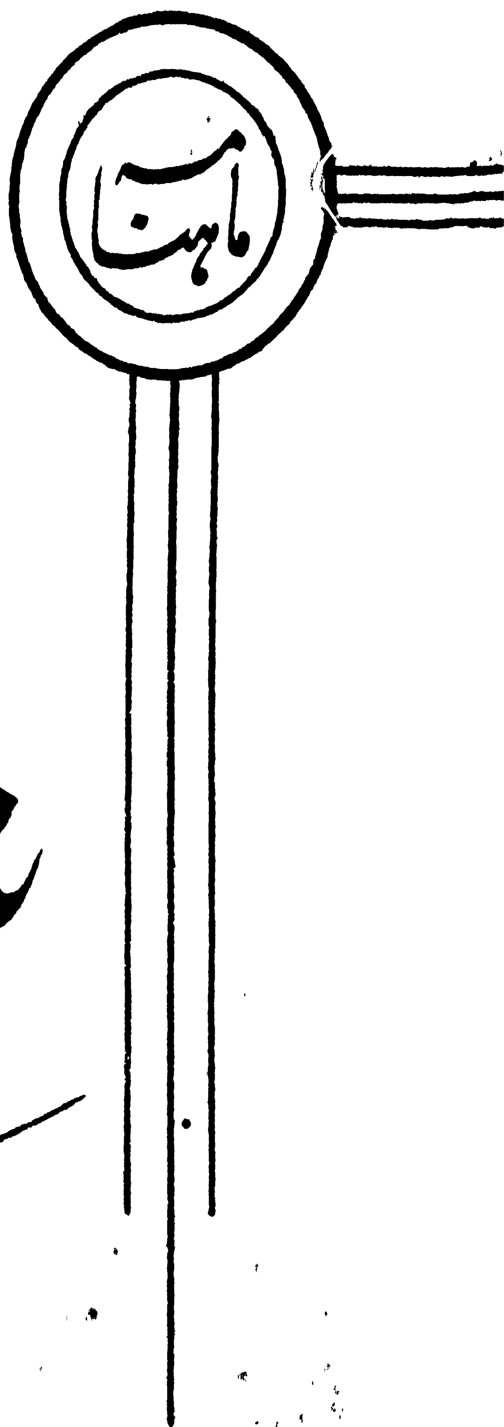
3238
REGD. M. N. O

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب دبیرپورہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔

امداد صابری

جلد ۱۳ نمبر ۹



شہاب

جلد ۱۱ امرداد ۱۳۵۴ ف م جون ۱۹۴۵ء نمبر ۹

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے سالانہ چندہ
(ضمہ)

اردو میں علامت فاعل "نے" کی اہمیت

جناب محمد حافظ علی صاحب صدیقی

یہ ایک مستند اور مسلمہ امر ہے کہ دکن میں سب سے پہلے اردو کی داغ بیل پڑی اور شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں یہاں یہ کئی قرن پہلے پروان چڑھی۔ آج اردو تقریباً سارے ہندوستان کی عام زبان ہے۔ آب وہوا، جغرافیائی اثرات اور چند اسباب کے تحت ہر ضلع یا صوبہ کی زبان میں کسی قدر فرق ضرور ہوا کرتا ہے۔ ہر ایک کی یہ کوشش ضرور ہونی چاہئے کہ وہ جہاں تک ہو سکے اس فرق کو دور کرے۔ دکن میں عام طور سے علامت فاعل "نے" کے استعمال سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دکن میں اردو کے متقدمین نے عام طور سے اس کے استعمال کو بیجا سمجھا۔ چنانچہ دکن کے ایک استاد "آگاہ" جو بیجاپور میں ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور جنھوں نے نظم ونثر میں (۱۶) کتابیں لکھی ہیں وہ اپنی مثنوی گلزار عشق کے دیباچے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "تذکیر وتانیثِ فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہے، اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے اور اگر مونث ہے تو مونث، یہ قاعدہ موافق عربی کے ہے کہ سید السنہ ہے، اور قیاس صحیح بھی اس کی تائید کرتا ہے برخلاف محاورہ اردو کے اس میں نسبت فعل کی مفعول کی طرف کرکے مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر کرتے ہیں۔"

تابعین نے ایک عرصہ تک اس قاعدہ کی پابندی کی مگر جب سے کہ شمالی ہندوستان اور دکن میں آمد ورفت کے ذرائع میں سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں شمال اور دکن میں ارتباط بڑھنے لگا ہے اور بین الصوبجاتی فرق بھی مٹنے لگا۔ اب یہ ضروری ہے کہ اس فرق کو دور کرکے یکسانیت پیدا کی جائے۔ اس لئے ہم اس مقصد کے پورا کرنے کی غرض سے آج کے مضمون میں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس "نے" کے استعمال کو اس طرح پیش کریں کہ روزمرہ کی گفتگو اور تحریر میں اس کا بہ آسانی استعمال کیا جا سکے۔

ہماری بات چیت، گفتگو، تقریر اور

تحریر کے ہر ایسے ٹکڑے کو جس میں کسی ایک
بات کا مطلب پورا ہو جائے جملہ کہتے ہیں ۔
جملے میں فاعل، مفعول اور فعل یا صرف فاعل
اور فعل ہوتا ہے ، کام کرنے والے کو فاعل
اور جس پر کام کا اثر فاعل سے گزر کر مفعول پر
پڑے اس کو مفعول اور کام کو فعل کہتے ہیں
"احمد نے روٹی کھائی" اس جملہ میں احمد
فاعل "نے" علامت فاعل روٹی مفعول اور
کھائی فعل ہے ۔ "راشد دوڑا" میں راشد
فاعل اور دوڑا فعل ہے ۔ اس جملہ میں فاعل
راشد کے دوڑنے کا اثر کسی اور پر نہیں پڑ
رہا ہے اور صرف دوڑا پر ختم ہو رہا ہے ۔
اس لئے اس جملہ میں فاعل اور فعل ہے ،
مفعول نہیں ہے ۔ پہلی مثال میں اگر فعل "کھائی"
سے پہلے کیا یا کیا چیز لگا کر سوال کریں تو جواب
ملے گا "روٹی" ایسے فعل کو جس کا اثر مفعول
پر پڑے فعل متعدی کہتے ہیں اور دوسری
مثال میں فعل دوڑا کا اثر کسی اور پر نہیں
پڑ رہا ہے ۔ اس لئے اس فعل کو فعل لازم
کہتے ہیں ۔ فعل میں تین زمانوں ماضی ، حال ،
مستقبل میں سے کسی ایک زمانہ کا ہونا بھی
ضروری ہے ۔ ماضی کی چھ قسمیں ہیں (۱) ماضی
مطلق جیسے محمود نے روٹی کھائی ۔ (۲) ماضی
قریب ۔ سیتا نے خط لکھا ۔ (۳) ماضی بعید ۔
موہن نے کتاب پڑھی تھی ۔ (۴) ماضی شکیہ ۔
نصیر نے کپڑے خریدے ہوں گے (۵) ماضی شرطیہ
یا تمنائی ۔ زاہد نے اگر امتحان کی تیاری کی
ہوتی تو کامیاب بھی ہوا ہوتا یا کاش تم
نے مجھ کو اس سے مطلع کر دیا ہوتا (۶) ماضی
استمراری ۔ مجاہد سبق یاد کر رہا تھا ۔ ان چھ
ماضیوں میں سے پہلے پانچ ماضیوں میں یعنی
ماضی مطلق ، ماضی قریب ، ماضی بعید ، ماضی
شکیہ یا احتمالی اور ماضی شرطیہ یا تمنائی ہیں
جب کبھی بھی اور جس وقت بھی فعل متعدی استعمال
کیا جائے تو ہمیشہ علامت فاعل "نے" کا استعمال
کرنا لازمی اور ضروری ہے ورنہ جملہ غلط ہوگا ۔
چونکہ ہر قاعدہ کا ایک نہ ایک استثناء ضرور ہوا
کرتا ہے اس لئے اس عام قاعدہ کے تحت بھی
چند فعل متعدی جیسے لانا ، بولنا ، لیجانا اور
بھولنا مستثنیٰ ہیں ۔ ان لفظوں کے ساتھ کبھی
بھی "نے" استعمال نہیں ہوتا جیسے نصیر روٹی
لایا ، فہمیدہ بولی ، خلیل اسے نہیں بھولا ۔ وہ
اپنی ٹوپی لے گیا ۔ اگر لانا اور لیجانا کے بعد
"دینا" بڑھا دیا جائے تو پھر "نے" استعمال
ہوگا جیسے رشید نے ہمیں کتابیں لا دیں ۔
جیتنا ، ہارنا ، اور سمجھنا کے ساتھ "نے" آتا بھی ہے

اور نہیں بھی آتا جیسے سعید نے شرط ہاری یا سعید شرط ہارا۔ جب "نے" استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے استعمال کے لئے چند خاص باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ عربی کی طرح اردو میں بھی فعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت موجود ہے ان پانچوں ماضیوں میں جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے اگر فعل متعدی ہے تو "نے" کا استعمال کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اس صورت میں فعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت میں فاعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت کا قطعاً کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ ہر حالت میں معفول کو دیکھا جائیگا۔ اگر مفعول مذکر یا مونث واحد یا جمع ہے تو فعل بھی مذکر یا مونث اور واحد یا جمع ہوگا۔ جیسے خالد نے دس کتابیں خریدی تھیں، حمیدہ نے پانچ آم کھائے ہیں۔ موہن اور سوہن نے مٹھائی خریدی ہوگی۔ اگر سلمیٰ اور کلثوم نے کھانا پکا لیا ہوتا تو ہم نے وقت پر کھا لیا ہوتا۔ اس کے برخلاف فعل لازم میں کبھی "نے" استعمال نہیں ہوگا۔ فعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت فاعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت کے مطابق ہوگی۔ اس لئے کہ اس میں مفعول ہوتا ہی نہیں

جیسے سیتا بھاگی، موہن دوڑا، لڑکے آئے۔ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ بچے گئے ہوں گے صرف ان پانچ ماضیوں میں جب فعل متعدی ہو تو "نے" کا استعمال کرنا لابد و لازمی ہے۔ بغیر "نے" کے جملہ بالکل غلط ہوگا۔ اس کے استعمال میں عام طور سے جو غلطی سرزد ہوا کرتی ہے وہ محض مفعول کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت سے ناواقفیت کے باعث ہوتی ہے اس لئے ہم ذیل میں تذکیر و تانیث کے قاعدوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اگر ان پر عبور حاصل کر لیا جائے اور مستثنیات کو خاص طور سے یاد کر لیا جائے تو "نے" کے استعمال میں کبھی غلطی نہ ہوگی۔

بہ نظر سہولت ہم اسم کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(۱) جاندار اور (۲) بے جان

(۱) بعض جاندار اسموں کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ مذکر کے لئے ایک علیحدہ لفظ ہوتا ہے اور مونث کے لئے کوئی اور لفظ جیسے باپ ماں۔ بھائی، بہن۔ مرد، عورت۔ بیل گائے۔ مینڈھا، بھیڑ۔

(۲) ہندی الفاظ کے آخر میں اگر "الف" ہو تو وہ عموماً مذکر ہوتے ہیں اور اگر آخری حرف

"ی" ہو تو مونث جیسے لڑکا، لڑکی۔ دادا، دادی۔ بوڑھا، بوڑھی۔ اندھا، اندھی۔ بکرا، بکری۔ کبھی اسم مذکر کے آخری حرف الف یا "ی" کو "نون" سے بدل دیتے ہیں جیسے نائی سے نائن، گوالا، گوالن، دھوبی، دھوبن۔

(۳) کبھی اسم مذکر کے آخر میں "ی" معروف بڑھا دیتے ہیں جیسے برہمن، برہمنی، کبوتر، کبوتری وغیرہ۔ مغل مغلانی۔ پٹھان پٹھانی۔ ہرن، ہرنی۔ تیتر۔ تیتری۔

(۴) کبھی اسم مذکر کے آخری حرف کو گرا کر یا بغیر گرائے کے ن، ی یا الف، ن، ی بڑھا دیتے ہیں جیسے استاد، استانی۔ سید، سیدانی وغیرہ، ہندو، ہندوانی، مہتر، مہترانی، مور، مورنی، فقیر، فقیرنی۔ دیور، دیورانی، جیٹھ، جیٹھانی۔

(۵) اکثر ہندی الفاظ جن کے آخر میں "ی" ہو تو مونث ہوتے ہیں، جیسے لڑکی، گھوڑی، مگر تیلی، دھوبی، تنبولی۔ پنجابی، نائی، ہوچی، بنگالی۔ شاستری، قاضی، منشی ہمیشہ مذکر استعمال ہوتے ہیں

(۶) اسم مذکر کے آخری حرف کو بدل کر یا بغیر بدلے کے ی بڑھا دیتے ہیں، جیسے کتا سے کتیا، بندر، بندریا، چوہا، چوہیا، چڑا، چڑیا۔

(۷) کبھی اسم خاص کے آخر میں نون یا ی زیادہ کر دیتے ہیں جیسے رحیم سے رحیمن، نور، نورن، کریم، کریمن، نصیب، نصیبن، محمدؐ، محمدی۔

(۸) بعض جاندار ہمیشہ مذکر بولے جاتے ہیں ان کی تذکیر و تانیث کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا جیسے کوا، اژدھا، باز، الو وغیرہ، چیتا، سانپ، مچھر، نیولا، جگنو، خرگوش، طوطا، ہریل، تیندوا۔

(۹) اسی طرح بعض ہمیشہ مونث استعمال ہوتے ہیں جیسے فاختہ، لومڑی، شاما، گلہری وغیرہ۔ مچھلی، قمری، چیل، بطخ، مینا، چھچھوندر۔ مگر بلبل اور طوطی کو مذکر یا مونث ہر دو طرح سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اب بے جان اسموں کی تذکیر و تانیث کے چند قاعدے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) جن اسموں کے آخر میں الف یا ہ ہو وہ اکثر مذکر ہوتے ہیں جیسے سونا، لوہا، کوٹھا، باجہ، چھاپہ وغیرہ، پیڑا، تماشا، دلاسا، تھالا، چھالا، تارہ، پیشہ، حقہ، ہفتہ، نشانہ، بیاہ، گناہ، ٹھاٹھ، ساتھ، سکھ، دکھ مگر پڑیا، ڈبیا، گٹھیا، انگیا، ٹھلیا، ادا، قضا، رضا، خطا، جفا،

دفا، استدعا وغیرہ، انتہا، التجا، ایذا، دنیا، عقبیٰ، چھالیہ۔ گھاگرا، گنگا، جمنا، سبھا، راہ، پناہ، درگاہ، تنخواہ۔ تھاہ، ٹوہ، جگہ، گرہ، توجہ، توجیہہ۔ تنبیہہ۔ ساکھ، لاکھ، نتھ، سوجھ، بوجھ، کرکھ، ہمیشہ مونث استعمال ہوتے ہیں۔

(۲) جن اسموں کے آخر میں یاے معروف ہو وہ اکثر مونث ہوتے ہیں، جیسے نیکی، بدی، کنگھی، بجلی، بولی، کشتی، چھری، سوئی مگر پانی، موتی، دھی، گھی، جی، ماضی، مذکر ہیں۔

(۳) جن الفاظ کے آخر میں ت، ٹ، ہٹ ہو وہ اکثر مونث ہوتے ہیں جیسے قدرت، طاقت شوکت، لگاوٹ، سجاوٹ، کروٹ وغیرہ، چوکھٹ دولت حشمت، آہٹ، گھبراہٹ مگر شربت، خلعت، رایت مذکر ہیں۔

(۴) فارسی کے ایسے حاصل مصدر جن کے آخر میں ش ہو اکثر مونث ہوتے ہیں جیسے خلش تپش، سازش، تلاش وغیرہ، تراش، معاش، مگر خراش مختلف فیہ ہے۔

(۵) وہ لفظ جو تفصیل کے وزن پر ہیں اکثر مونث ہوتے ہیں جیسے تقدیر، تدبیر، تعظیم، تکریم، تحصیل وغیرہ۔ تکمیل، تمہید، تائید مگر تعویذ۔ شہتیر۔ نخچیر، خط گیر۔ انجیر، خنزیر، مذکر ہی مستعمل ہیں۔

(۶) وہ الفاظ جو تفعل کے وزن پر ہیں اکثر مذکر ہوتے ہیں جیسے تکبر، تجسس، تفحص وغیرہ تصوف، تملق، تعیش مگر تہجد، تہتک، توقع، توجہ مونث ہیں۔

(۷) تفاعل کے وزن پر جو لفظ ہوں گے وہ عموماً مذکر ہوں گے۔ جیسے تجاہل، تلاطم، تعارف، تدارک، تواتر لیکن ترازو، تواضع، تگاپو، مونث ہیں۔

(۸) جو الفاظ انفعال اور افتعال کے وزن پر آتے ہیں وہ مذکر بولے جاتے ہیں، جیسے انفصال، انتخاب، انتظار وغیرہ انتقال، انکسار، اختلاف، اجتناب، اختیار، امتیاز، مگر احتیاط، احتیاج، اطلاع مونث ہیں۔

(۹) عربی، فارسی، ہندی، اور انگریزی مہینوں اور دنوں کے نام سوائے جنوری، فروری، مئی، جولائی اور جمعرات کے سب مذکر ہیں۔

(۱۰) سوائے دہلی اور بمبئی کے تمام شہروں کے نام مذکر ہیں۔

(۱۱) جن لفظوں کے آخر میں بند آتا ہے وہ مذکر ہیں جیسے گلوبند، کمربند، بازوبند۔

(۱۲) جن اسموں کے آخر میں گاہ ہو وہ

مونث ہیں جیسے جلوہ گاہ، قتل گاہ، تماشا گاہ، عیدگاہ مگر بندرگاہ مذکر ہے۔

(۱۳) ہر قسم کی آواز کو مونث بولتے ہیں، جیسے قلقل، کوکو، چٹ چٹ، دھڑا دھڑ، چھما چھم۔

(۱۴) جو الفاظ دو فعل یا دو حاصل مصدر سے مرکب ہوتے ہیں وہ عموماً مونث ہوتے ہیں جیسے آمد و رفت، گفت و شنید، نشست و برخاست، خرید و فروخت وغیرہ، اٹھا بیٹھا، مار پیٹ، لکھا پڑی، مگر خورونوش، ساز باز، بست و کشاد، لین دین مذکر ہیں۔

(۱۵) ایسے دو اسم جن میں سے ایک مذکر اور دوسرا مونث مل کر آئیں تو عام طور سے مذکر لفظ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جیسے شراب و کباب، تیغ و خنجر، چشم و چراغ، وغیرہ جود و عطا، نان و نمک، رنگ و بو، چال چلن، مگر آب و ہوا، آب و گل، دوات قلم، بول چال، رد و بدل مونث ہیں۔

(۱۶) فارسی مضاف و مضاف الیہ میں مضاف کے لحاظ سے تذکیر و تانیث کا استعمال ہوتا ہے جیسے برق طور، شمع حرم، مونث ہیں مگر رنگ محفل، حسن سماعت، مذکر ہیں، تخم ریحان، سوانح عمری مونث ہیں۔

(۱۷) برگ درخت، برگ گل مذکر ہیں اور برگ حنا برگ گاؤ زبان مونث ہیں۔

(۱۸) کف ہر معنی میں مذکر ہے مگر کف دست اور کف پا مونث ہیں۔

(۱۹) مشت پر، مشت غبار، مشت استخواں مذکر ہیں، اور مشت خاک مونث ہے۔

(۲۰) کتابوں کے نام عموماً مونث ہیں جیسے گلستاں بوستاں، پنج رقعہ، تمدن عرب۔ جن کتابوں کے آخر میں نامہ یا شروع میں فسانہ ہو تو مذکر جیسے سکندر نامہ، فسانہ عجائب، قرآن اور اس کے مترادفات مثلاً مصحف فرقان۔ کلام اللہ، کلام مجید مذکر ہی بولے جاتے ہیں۔

(۲۱) کلام مجید کی سب سورتیں مونث بولی جاتی ہیں اگرچہ کہ لفظ سورہ مذکر ہے مگر نام سورۃ کے ساتھ مونث ہی مستعمل ہے، جیسے اس نے سورۂ یٰسین پڑھی۔ اسی طرح سے آیۃ بھی مونث ہے۔

(۲۲) دو یا زیادہ اسماء کی خبر جن میں کوئی مذکر ہو اور کوئی مونث اگر ایک ہی فعل سے ادا کئے جائیں تو جو اسم فعل سے قریب ہو اسی کا لحاظ کیا جائے گا۔ جیسے شراب ملی نہ کباب، قلم پایا نہ دوات۔

(۲۲) وہ عربی الفاظ جو اردو میں واحد مذکر مستعمل ہیں اگر ان کی جمع عربی قاعدے کے مطابق الف اور ت سے بنائی جائے تو اس جمع کو بھی جمع مذکر ہی استعمال کریں گے۔ جیسے درجہ سے درجات، اشارات، مجاہدات وغیرہ مقامات، انعامات، اوقات، اسی طرح سے ممنوعات، مصنوعات، محلات، مکروہات ہیں۔ مگر معلومات، موجودات اور اوقات بمعنی قوت واحد مونث ہی مستعمل ہیں۔

(۲۴) کئی اسم مونث ہوں اور ایک مذکر ہو تو فعل جمع مذکر لایا جائیگا جیسے آہ وزاری و نالہ و فریاد۔ سب محبت میں بے اثر نکلے۔

(۲۵) بعض الفاظ جمع کی صورت رکھتے ہیں مگر واحد مونث ہی مستعمل ہیں۔ جیسے کائنات، واردات، اوقات وغیرہ مساوات مدارات، حوالات، ملاقات۔ مکافات، مناجات۔

(۲۶) دھاتوں اور جواہرات کے نام پہاڑوں، ستاروں، سیاروں، اور گنجفے کی بازیوں کے نام عموماً مذکر ہیں۔ مگر ان میں سے چاندی مونث ہے۔ مگر روپا مذکر ہے۔

(۲۷) نمازوں کے نام اور عروض کی بحروں کے نام مونث ہیں جیسے فجر۔ عصر، بحر طویل۔

"نے" کے استعمال کے وقت چند باتیں فاعل کے بارے میں بھی یاد رکھنا ضروری ہے جیسے لڑکا کی جمع لڑکے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ لڑکے نے روٹی کھائی تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ صرف ایک لڑکے نے روٹی کھائی۔ اس لئے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایسے جمع فاعل کے آخر سے علامت جمع ی کو واو اور نون سے بدل دیتے ہیں جیسے لڑکوں نے روٹی کھائی مگر فاعل جب جمع مونث ہوتا ہے تو علامت جمع الف نون میں سے الف کو واو سے بدل دیتے ہیں جیسے لڑکیوں نے چاء پی لی۔

'کو' علامت مفعول ہے جب جملے میں علامت فاعل "نے" اور علامت مفعول 'کو' دونوں استعمال کئے جائیں تو وہ عام قاعدہ جو "نے" کے استعمال کے بارے میں ہم نے اوپر بتلایا ہے بدل جاتا ہے یہ کہ فعل کی تذکیر و تانیث اور وحدت و جمعیت نہ تو مفعول کے لحاظ سے آتی ہے اور نہ فاعل کے لحاظ سے بلکہ ہر حالت میں فعل واحد مذکر لایا جاتا ہے جیسے رشید نے کل سعیدہ کو نمائش میں دیکھا، رضیہ نے کس کتاب کو پڑھا۔

ایک اور چیز یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ماضی قریب، ماضی بعید اور ماضی تمنائی یا ماضی شرطیہ میں اگر فعل جمع ہو تو اصل فعل واحد ہی رہتا ہے اور صرف فعل ناقص "ہے" "تھا اور ہوگا" کے جمع کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے محمود نے روٹیاں خریدی تھیں۔ محمود نے آم خریدے ہوں گے۔ اگر ان چند قاعدوں کو ذہن نشیں رکھا جائے تو "نے" کے استعمال میں کبھی غلطی واقع نہ ہوگی۔

غزل

جناب عظیم حیدر آبادی

آنکھوں میں رہے عالم بیخواب کہاں تک
اے قلب حزیں نالہ بیتاب کہاں تک

آخر کوئی حد بھی ہو اس انداز جفا کی
حسرت زدہ اشکوں کا یہ سیلاب کہاں تک

اے چشم فسوں ساز! دہائی ہے دہائی!
تڑپا کرے آخر دل بیتاب کہاں تک

بھولی ہوئی الفت کی کہانی کو نہ چھیڑو
اُمڈے گا پھر آہوں کا یہ سیلاب کہاں تک

غیروں پہ کرم، مجھ سے تغافل کی لگاوٹ
میرے لئے یہ تلخئ زہر آب کہاں تک

یہ ہجر کا پیماں ہے یا جھوٹی تسلی
اک ہجر مسلسل ہے ترا خواب کہاں تک

خود ان کا نہ ملنا ہی عظیم ایک بلا ہے
پھر اور بھی یہ رنجش احباب کہاں تک

لمعات

(نیر امرتسری)

نام ورد زباں تمہارا ہے
زندگی کا یہی سہارا ہے

غیر پر التفات جلوت میں
ہم سے خلوت میں بھی کنارا ہے

نازک اندام سنگدل بھی ہے
سنگ مرمر میں سنگ خارا ہے

دہر کا غم تو خیر کیا کہتا
تیری فرقت نے ہم کو مارا ہے

شکوہ کرتے ہیں جور گردوں کا
اصل میں تم سے استعارا ہے

کاش کے تم ستم روا رکھو
ہم کو آزار ہی گوارا ہے

دم لبوں پر ہے آنکھ ہے در پر
یاس و امید کا نظارا ہے

قول زاہد درست ہے لیکن
ابر کا اور ہی اشارا ہے

عشق نے تاب دی یہ اشکوں کو
کوئی موتی کوئی ستارا ہے

یا تو کشتی بھی ہم کو لے ڈوبی
یا تھپیڑوں نے پار اتارا ہے

خویش و احباب چل دئے نیر
ہم ہیں اور گور کا کنارا ہے

غزل

جناب نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ

پھولوں میں ہم انداز ترا دیکھ رہے ہیں
غنچوں میں تبسم کی ادا دیکھ رہے ہیں

سب باندھ چکے کب کے سرِ شاخ نشیمن
ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

اُس وعدہ فراموش سے اتنا کوئی کہدے
مشتاق ترے راہ قضا دیکھ رہے ہیں

آیا تھا زیارت کے لئے کون الٰہی!
پامالِ مزارِ شہدا دیکھ رہے ہیں

کس رند کی مقبول دعا ہو گئی یارب
اٹھتی سوئے میخانہ گھٹا دیکھ رہے ہیں

سب مئے کے طلبگار ہیں ساقی سے مگر ہم
بیٹھے نگہ ہوش رُبا دیکھ رہے ہیں

وسعت ہے خداداد جلیلؔ اپنی نظر میں
خلوت میں دو عالم کی فضا دیکھ رہے ہیں

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

جناب ساغر نظامی سے ادبی دنیا ناواقف نہیں موجودہ دور کے مشہور شعرا کی فہرست میں آپ کا نام بھی شریک ہے موقت الشیوع رسایل میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ کئی مرتبہ حیدر آباد دکن میں بھی تشریف فرمائی ہوئی تھی بعض اضلاع کی بھی سیر کی شعر و سخن کی صحبتیں رہیں کیا عجب ہے کہ حیدر آباد کے بعض نو جوان شعرا سے آپ کو ذاتی تعارف بھی ہو۔

یکم مارچ ۱۹۴۵ء کے رسالہ "آجکل" میں آپ کی ایک غزل طبع ہوئی ہے۔ واضح ہو کہ یہ رسالہ دہلی سے شائع ہوتا ہے وہ دہلی جس کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی استاد داغ کو فخر تھا کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔

کیوں داغ دہلوی کی زبان مستند نہ ہو ‫ ‫ پیدا کیا خدا نے اوسے تخت گاہ میں

جناب ساغر نظامی کا کلام تو اکثر اصحاب کی نظر سے گزرتا ہی رہا ہے لیکن میرے تاثرات و تشکیکات کے ساتھ اوس کا مطالعہ اہل ذوق کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

کام آخر میرا کیف ناتمام آ ہی گیا ‫ ‫ پھر کوئی ساغر بکف بادہ بجام آ ہی گیا

کف بمعنی ہتھیلی مجازاً ہاتھ۔ ساغر اور جام دونوں فارسی مترادف الفاظ ہیں ایک ہاتھ میں تو ساغر ہے مگر "بادہ بجام" کہاں ہے۔ "ساغر بکف" خالی تھا صراحی کی ضرورت تھی مگر موزونیت اور قافیہ کی خاطر معنی و مطلب اور حسن بیان سے صرف نظر کر کے "بادہ بجام" کہدیا حالانکہ شراب رکھنے کا ظرف شیشہ۔ مینا یا صراحی ہے۔ شراب جام میں نہیں رکھتے جام سے پیتے ہیں۔

جال اپنے نور کا تانے رہے خورشید و ماہ ‫ ‫ نور برساتا مرا ماہ تمام آ ہی گیا

"نور" کے معنی ہیں روشنی جال نور کے لئے صفت ہے نہ تشبیہ چاند اور سورج کی روشنی کو جال کہنا صحیح نہیں مصرعہ اول سے یہ مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ دونوں وقت واحد میں اپنے نور کا مظاہرہ کر رہے ہیں "نور کا جال تاننے" کا مقصد یہ پایا جاتا ہے کہ "ماہ تمام" کی آمد میں مزاحمت ہو

جو سراسر مہمل ہے "جال تاننا" اردو کی زبان نہیں، اردو میں جال پھیلانا کہتے ہیں۔

بلبلوں کے لئے دام رگ گل کافی ہے جال پھیلا کے نہ صیاد گلستاں روکے (آتش)

جال لگانا بھی کہتے ہیں۔ ع

طائر روح کے لئے صیاد اجل! سبزہ تیغ میں جوہر سے لگا رکھا ہے جال (ذوق)

جال بچھانا بھی محاورہ ہے۔ ع

ہاتھ آتا ہے مقدر سے ہمائے دولت جال کس کس نے بچھایا نہیں دانائی کا (بحر)

بہرحال جال تاننا غلط ہے۔

رو کتی ہی رہ گئیں معصوم دوراندیشیاں ان کے لب پر میرا ذکر ناتمام آ ہی گیا

"معصوم دوراندیشی" غلط ہے "دور اندیشی" کی صفت معصوم نہیں ہوسکتی "ناتمام" کا لفظ بھی محض قافیہ کی خاطر بے معنی و مطلب ہیں اوس سے کوئی ترقی نہیں ہوتی۔

ہے جہاں عشق و ہوس کو اعتراف بیکسی تلخی ہستی کے قربان وہ مقام آ ہی گیا

"وہ مقام" راز سربستہ شاعر کے ذہن میں ہے مگر "تلخی ہستی" کی وجہ اوس مقام کا آجانا بے معنی ہے۔ تلخی کے معنی ہیں کڑوا مجازاً ناگوار "ہستی" ترجمہ ہے وجود یا زندگانی کا "تلخی ہستی" صحیح ہے تو اوس کے معنی ہوئے زندگی کا ناگوار یا اجیرن ہوجاتا ہے۔

برخضر زندگانی جاوید تلخ ساخت عمر دوبارہ کہ بمن زاں دو لب رسید (صائب)

"اوس مقام" کے آنے کی علت "تلخی ہستی" کو قرار دینا مہمل ہے کسی مقصد کے حاصل نہ ہونے سے زندگی تلخ ہوسکتی ہے مگر یہ تلخی حصول مقصد کا سبب نہیں ہوسکتی۔

دل کہاں اور عمر بھر یہ بار پامالی کہاں کچھ یہ ناکارہ ترے گلیوں میں کام آ ہی گیا

"پامال" مصیبت زدہ "پامالی" بہ یائے مصدری بہ معنی مصیبت زدگی دل اگر مدت العمر مصیبت اٹھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا اور "یہ ناکارہ" بہ معنی عاشق مصیبت برداشت کرتا ہے تو اس بیان میں ادبی نزاکت اور شعری لطافت ہی کیا ہے تری گلی کے عوض "تری گلیوں" کہہ کر اور بھی خرابی پیدا کر دی۔

تشنگی نے میکدے میں کار قزاقی کیا قوت بازو سے مجھ تک دور جام آ ہی گیا

قزاق چور لٹیرا قزاقی مصدر کار قزاقی مہمل تشنگی کا کار قزاقی اور قوت بازو عملاً تو دونوں بیکار ہی رہے مگر دور جام آہی گیا پھر "کار قزاقی کیا" کے کیا معنی ہیں۔

جیسے ساغر سے چھلک جائے مچلتی موج مئے　　　کانپتے ہونٹوں پہ اون کے میرا نام آہی گیا

کانپتے ہونٹوں پر کسی کا نام آنے میں اور مچلتی موج مئے ساغر سے جھلک جانے میں کوئی مناسبت یا تشبیہ نہیں ہے۔ مچلنا ہندی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ہٹ یا کسی بات پر اصرار یا ضد کرنا۔ بیموقع اڑ جانا شوخی کرنا۔

دل یہ کہتا ہے کہ تو ساتھ نہ لے چل مجھ کو　　　ورنہ میں جا کے وہاں دیکھ مچل جاؤں گا　(ذوق)

لہذا موج مئے کا مچلنا بے معنی ہے۔ ہونٹوں پر نام آنا اردو میں نہیں کہتے زبان پر نام آنا کہتے ہیں۔ سہ

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے۔

"ہو تو سہی"

جناب سید سلطان محی الدین صاحب سیفؔ بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ

نشۂ حسن کا آنکھوں میں اثر ہو تو سہی　　　حسرت دید تو ہے ذوق نظر ہو تو سہی

آہ و نالوں کی حکایات تو سنتا ہوں مگر　　　میری آہوں میں الٰہی یہ اثر ہو تو سہی

قتل ہونے کا تو ارمان بہت ہے لیکن　　　نذر دینے کے لئے خون جگر ہو تو سہی

سننے والے پہ نہ سننے کا عبث ہے الزام　　　کہنے والے کی زباں میں یہ اثر ہو تو سہی

یوں تو کہنے کے لئے کہئے انا الحق لیکن　　　ایسی عظمت کا سزاوار بشر ہو تو سہی

پردۂ صبح میں پنہاں ہے مسرت لیکن　　　شام غم ختم ہو عشرت کی سحر ہو تو سہی

کون ہے وہ جو نہیں طالب راحت لیکن
سیفؔ آرام سے دنیا میں بسر ہو تو سہی

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

نالوں کا شب ہجر اثر دیکھئے کیا ہو
کٹ جائیگی جب رات سحر دیکھئے کیا ہو

معلوم نہیں مجھ کو تو اس جنگ کا انجام
اڑنے کو تو لڑتی ہے نظر دیکھئے کیا ہو

جینے کی تمنا ہے نہ مرنے کا ارادہ
ہوتی ہے یونہیں عمر بسر دیکھئے کیا ہو

دیوانگیٔ عشق کا کہلتا نہیں کچھ حال
دھڑکا ہے یہی آٹھ پہر دیکھئے کیا ہو

ہر وقت انہیں دیکھتی ہے چشم تمنا
ہو جائے اگر دل کو خبر دیکھئے کیا ہو

ہنس ہنس کے مجھے گھور کے باتوں میں لگا کے
وہ لے تو گئے دل کو مگر دیکھئے کیا ہو

کل تک تو رہا حشر کا سامان الٰہی
پھر آج سر راہ گذر دیکھئے کیا ہو

مجھ پر ہی پڑا کرتی ہیں صیاد کی نظریں
اس چشم عنایت کا اثر دیکھئے کیا ہو

مشکل ہے عزیزؔ اپنے گناہوں کی تلافی
رہتا ہے یہی مجھ کو تو ڈر دیکھئے کیا ہو

فتح و کامرانی

پانچ سال آٹھ مہینے سات دن ہوتے ہیں کہ دنیا خون ریزی اور خون آشامی کے ہلاکت بار دور سے گذر رہی تھی دنیا کا سکون درہم برہم تھا۔ بربریت اور استبدادیت کی زنجیریں تیار کی جا رہی تھیں۔ یاد ہوگا کہ جرمنی کے کار فرما ہٹلر نے بہ زعم باطل یکم سپٹمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ پر حملہ کرکے امن وعافیت کو برباد کرنے کی کوشش کی اور ۳ر سپٹمبر کو اس کی بیخ کنی کے لئے برطانیہ اور فرانس نے صف آرائی کا اعلان کیا۔ آخر ۸ر مئی کو حق نے ظلم کا اور انصاف نے جور کا خاتمہ کر دیا اور جرمنی کے جرنیلوں نے بلا شرط ہتھیار ڈال دئے اور اپنی ہار مان لی۔ دنیا نے پھر ایک بار اطمینان کا سانس لیا۔

اس آگ اور خون کی ہولی میں مادر ہند کے سپوتوں نے اپنی قربانیوں سے دریغ نہیں کیا آج ہندوستانی جرنیلوں کا فخر وناز بالکل جائز ہے کہ اس فتح میں ان کا بھی بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

حیدر آباد اور اوس کے شہریار نے (خدا دیرگاہ سلامت رکھے) آخر وقت تک یار وفادار کے ثبوت میں دامے۔ درمے۔ جو گرانقدر اعانت کی ہے وہ تاریخ جنگ میں ایک زرین صفحہ ہوگا۔

مسٹر چرچل نے ہندوستانی وقت ½ ۶ بجے اس لڑائی کے خاتمہ کا مژدہ سنایا، تمام دنیا میں مسرت و شادمانی کے شادیانے بجنے لگے۔

حیدر آباد جو کسی معاملہ میں پیچھے رہنا اپنی آن کے خلاف سمجھتا ہے سب سے پیش پیش رہا۔ غرباء کو کپڑا۔ بھوکوں کو اناج۔ بچوں کو مٹھائی۔ ملازمین کو سہ روزہ تعطیل اور تمام شہر میں روشنی ناقابل فراموش ہے۔ گویا یہ پیش خیمہ ہوگا دوسرے جشن فتح کا۔

نقد و نظر

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے (امرتسری)

رسالہ "آج کل" (دہلی) مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۴۵ء میں حضرت جگر مرادآبادی کی تازہ غزل شائع ہوئی اس پر "شہاب" بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۵ء میں حضرت عطارد نے "نقد و نظر" کے تحت تنقید فرمائی، تمہید میں واضح فرمایا کہ جن حضرات سے یہ توقع ہے کہ وہ اردو علم ادب کو اپنی شستہ بیانی اور افکار عالیہ سے معراج ترقی پر پہنچا دیں گے وہی اسے قعر پستی کی طرف لے جارہے ہیں، قادرالکلام ادیب کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ اپنے مافی الضمیر کے لئے ایسے موزوں استعمال کرے کہ مخاطب پر ان کا مفہوم من و عن واضح ہوجائے، یہ خوبی متقدمین کے کلام میں پائی جاتی ہے اور ان میں صنائع و بدایع اس خوبی کو اور بھی جلا دیتے ہیں، آج کل یہ باتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ ترکیب الفاظ میں جدت ضرور ہے لیکن قواعد صرف و نحو کے خلاف اس لئے بے معنی، حسب وعدہ میں نے جو کچھ لکھا ہے ملاحظہ ہو۔

بڑھ رہے مجذوب کی اشعار غزلخوانوں کے   ایسے ہی طور ہوا کرتے ہیں دیوانوں کے
قید معنی سے ہے آزاد کلام شعراء   کس طرح باندھے مضامین کوئی ارمانوں کے

حضرت جگر کی طرز نرالی ہے، شوق اتباع میں میں نے جو کچھ آپ کے تازہ ارشادات زیر تنقید حضرت عطارد) پر لکھا ہے ملاحظہ ہو۔

حضرت جگر فرماتے ہیں۔

"کیا مقامات ہیں ان سوختہ سامانوں کے   خضر بھی بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے"

حضرت عطارد کا ارشاد ہے کہ "سوختہ سامان" عاشق کے لئے نہ مجاز ہے نہ کنایہ، البتہ "سوختہ جان" کنایتہً عاشق کے لئے مستعمل ہوتا ہے، چنانچہ ابو طالب حکیم کہتا ہے کہ۔

"کدام سوختہ جان است تاب آتش ما   بہ آہ سرد دلے را کباب کنیم"

میری ذاتی رائے ہے کہ "سوختہ سامان" بھی کنایتہً عاشق کے لئے استعمال ہوتا ہے، مومن مرحوم ارشاد ہے کہ

"دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے فلس ماہی کے چراغ شب ہجراں ہونگے"

اس میں کلام نہیں کہ مومن مرحوم نے "سوختہ سامان" سے ایک بات پیدا کی ہے۔ لیکن حضرت جگر نے اس کی رعائت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ رہا خضر کا معاملہ حضرت عطارد کا یہ خیال کہ ایک مشہور و معروف پیغمبر کی نسبت یہ کہنا کہ دیوانوں کے قدم لیتے ہیں یا قدمبوس ہوتے ہیں انتہائی بے ادبی ہے، شعراء کے لئے توسب کچھ جائز ہے اور خود حضرت عطارد نے ذوق مرحوم کا یہ شعر سنداً پیش کیا ہے۔

"کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے"

اس سے بھی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ خضرؑ روایات کے رُو سے پیغمبر بلکہ استاد حضرت موسیٰؑ ضرور ہیں، لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ ان روایات کا اصل ماخذ ایرانی حکایات ہیں جو کیانی بادشاہ "کیخسرو" کے متعلق مشہور ہیں، یہ ایک خواب کی بناء پر تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا، اور جنگل کی راہ لی، امرا وزراء نے بحیرہ خرزنک (جو لفظ خضر سے ملتا جلتا ہے) ساتھ دیا۔ بادشاہ نے غسل کرتے ہوئے اس میں غوطہ لگایا اور پھر نہ ابھرا، روایت یہ ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور بھولے بھٹکے مسافروں کو سیدھے راستہ پر لگا دیتا ہے، اس قصہ کو حضرت موسیٰ کے ایک واقعہ پر چسپاں کیا گیا جس کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ "مصر" ان ایام میں چند صوبوں میں منقسم تھا، انتہائی شمال مشرقی صوبہ کو "مجمع البحرین" کہتے تھے کیونکہ اس مقام پر "نیل" کی انتہائی مشرقی شاخ کا جو یونانی دور دورہ میں "پلوزیم" کہلاتی ہے البحر (بحیرہ روم) سے اتصال ہوتا۔ دستور یہ تھا کہ شاہی خاندان کے نوجوان اور امراء و وزراء کے لڑکے تربیت کے لئے ان صوبہ داروں کے پاس بھیجے جاتے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ جن کی پرورش شاہی محل میں ہوئی مجمع البحرین کے صوبہ دار کے پاس اس غرض کے لئے بھیجے گئے، مصری آئین و قوانین کے رُو سے ہر ایک سرکش لڑکا جو والدین کے کہنے میں نہ ہو واجب القتل تھا یہی قانون شریعت موسوی کا بھی ہے (توراۃ۔ کتاب استشناد باب ۲۱ آیات ۱۸ تا آیت ۲۱) بقول مولف اعمال الرسل "حضرت موسیٰ مصری علوم میں کامل تھے" خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ ہے، ممکن ہے کہ خضر سے مراد حضرت جگر کی پنجاب کا "پیر میٹر" یعنی وزیر اعظم ہو۔ حضرت جگر عموماً شاعروں میں مدعو کئے جاتے ہیں جو عموماً سرکاری یا نیم سرکاری ہوتے ہیں اور ان کی آمدنی کا اکثر حصہ "وار فنڈ" میں جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں راولپنڈی میں زیر صدارت ڈپٹی کمشنر ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں حضرت جگر بھی شریک تھے۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت جگر کے قدم پڑھ کر خضر نے لئے ہوں۔ وہ وزیر اعظم ہے تو یہ بھی تو اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں۔
با تباع حضرت جگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے ملاحظہ ہو۔

مرتبے کتنے ہیں اعلیٰ تیرے دیوانوں کے بڑھ کے لیتے ہیں قدم کانٹے بیابانوں کے
کچھ کڑی اتنی نہ تھی پاؤں میں زنجیر حیات خضر کو کہئے قدم لے تیرے دیوانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ:-

حسن و صورت کے نہ الفت کے نہ ارمانوں کے اف کہ انسان ہیں مارے ہوئے انسانوں کے"

حضرت عطارد کا ارشاد ہے کہ "اس عجیب و غریب مطلع کے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں"
حسن اور صورت اور الفت اور ارمان سب انسانی اوصاف ہیں۔ اس لئے "اوصاف مندرجہ مصرعہ اول کی نفی کا تعلق آخر ہے کس سے؟" اگر اس کا تعلق انسان سے ہے تو نفی و اثبات دونوں مصرعوں میں بے معنی ہیں، بات یہ ہے کہ حضرت جگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حسن وغیرہ پر مرنا تو تاگزیر امر ہے اور اس سے کوئی سچ مچ مرتا تھوڑا ہی ہے یہ تو صرف شعر میں مرنا ہوتا ہے، مرنا وہ ہے جو کسی انسان پر انسان کی طرف سے بوجہ ظلم وستم وارد ہوتا ہے، یعنی حسن وغیرہ سے کوئی نہیں مرتا۔ انسان انسان کے مارے مرتا ہے، یہ اعتراض کہ اکثر انسان طبعی موت سے مرتے ہیں یا کسی حادثہ کی وجہ سے اس لئے حضرت جگر کا نظریہ کلیہ نہیں صحیح ہے لیکن ـــــ خیر جانے دیجئے جو کچھ میں نے باتباع حضرت جگر عرض کیا ہے سُن لیجئے۔

جو خلاکت زدہ دنیا میں نظر آتے ہیں وہی انسان ہیں مارے ہوئے شیطانوں کے

انسان انسان کو نہیں مارتا یہ امر انسانیت سے بعید ہے البتہ شیاطین انس بھی ہوا کرتے ہیں یہ بھی ملاحظہ ہو۔

واعظ شہر فرشتوں سے ہیں ملتے جلتے اس لئے ڈھنگ نہیں جانتے انسانوں کے
اب تو کافر کا نہیں ملتا کہیں نام ونشان ہاں پتہ ملتا ہے کاموں سے مسلمانوں کے
دوست دشمن کے ہوئے حضرت دل کیا کہئے مجھ سے بیگانہ ہوئے ہو رہے بیگانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"چشم ساقی میں تصدق تیرے پیمانوں کے چند گھونٹ اور بھی لیکن انہی میخانوں کے"

حضرت عطار د کا ارشاد بجا ہے کہ "میخانہ" بطور چشم خوباں مستعمل ہے نہ کہ پیانہ، مصرع اول میں بجائے پیانہ میخانہ اور مصرعہ ثانی میں بجائے میخانہ پیانہ ہونا چاہئے، چند گھونٹ پینے کا ظرف پیانہ ہوتا ہے نہ کہ میخانہ۔ عرض ہے کہ

مد بھری آنکھوں کے صدقے میں پلادے ساقی ایک دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیانوں کے
حضرت شیخ سے ہے ہم کو عقیدت۔ لیکن محتسب کہتا ہے یہ رند ہیں میخانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"ہر قدم لاکھ تھپیڑے سہی طوفانوں کے حوصلے پست نہ ہونگے کبھی انسانوں کے"

حضرت عطارد کا ارشاد ہے کہ "حوصلے پست نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی ہے یا محض ادعاء بے معنی، وفور بارش کو طوفان کہتے ہیں مجازاً ہر وہ شئی (جس کا مذکور ہونا چاہئے) جو سب پر غالب (بوجہ کثرت ہو) یہاں طوفان کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور یہ کس چیز کا طوفان ہے" غالباً حضرت جگر کا یہ مطلب ہے کہ دنیا میں جتنے بھی طوفان ہیں، طوفان بے تمیزی سے لے کر باتمیزی تک کسی کا کچھ اثر انسانی حوصلہ و ہمت پر نہیں ہوتا اس لئے آپ نے طوفان بصیغہ واحد نہیں بصیغہ جمع "طوفان" استعمال فرمایا، اس میں کچھ تخصیص کسی طوفان نوح وغیرہ کی نہیں، بلکہ وہ بھی "طوفان" میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہر طرف لاکھ ہوں طوفان حوادث برپا حوصلے پست کہیں ہوتے ہیں انسانوں کے

حضرت جگر کو "طوفان" سے کچھ ایسا شغف ہے کہ بار بار باندھتے ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"خضر اگر آپ بھی خائف ہیں تو رخصت لیکن چاہئیں مجھ کو تھپیڑے انہیں طوفانوں کے"

بظاہر اس شعر میں خضر سے مراد وزیر اعظم پنجاب نہیں بلکہ خضر علیہ السلام ہیں، حضرت عطارد کا ارشاد ہے کہ ایسے موقع پر "رخصت" نہیں "خدا حافظ" کہتے ہیں اور یہ کہ انہی طوفانوں سے مراد کون سے طوفان مراد ہیں؟ — جو کچھ میں نے عرض کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

خطرہ جان ہے اگر خضر حوادث سے تمہیں چھوڑ دو مجھ کو بھنور میں انہی طوفانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"اسی کشتی کو نہیں تاب تلاطم صد حیف جس نے منہ پھیر دئے تھے کبھی طوفانوں کے"

حضرت عطارد دریافت فرماتے ہیں کہ "اسی کشتی سے کونسی کشتی مراد ہے، تلاطم اور طوفان کس چیز سے عبارت ہے" حضرت عطارد بھی بعض اوقات تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں، آپ کو معلوم تو ہے کہ پہلی کشتی حضرت نوحؑ کی تھی اس کے بعد اسی نمونہ کی اور بھی کشتیاں تیار ہوئیں اور اب تو ڈریڈناٹ اور ڈسٹرائر۔ کیا کیا مہیب نام ہیں ان کم بختوں کے۔ سطح بحر پر چند طوفان ہلاکت برپا کر رہی ہیں اور سنا ہے کہ ایک اور کشتی بھی ہے جس کو آبدوز کہتے ہیں، آپ کا اختیار ہے جو بھی چاہیں ان میں سے منتخب کر لیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جگر کے خیال میں کوئی پرانی کشتی ہے جو اب طوفان حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ شاید زنگ خوردہ۔ بوسیدہ ہو کر رہ گئی بچاری، جب نئی نئی ہوگی تو طوفان اور تلاطم کو خاطر میں نہ لائی ہوگی۔ یاد آیا کشتیاں اور بھی ہیں مثلاً کشتی عمر، چنانچہ ذوق مرحوم کا ارشاد ہے کہ

"ذوق اس بحر فنا میں کشتی عمر رواں جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا"

اور ایسے ہی "کشتی قوم" اور اسی قبیل کی اور بھی کشتیاں ہیں جن کا حال مجھے معلوم نہیں بہر حال شعر کا مفہوم ہر ایک فرسودہ کشتی پر چسپاں ہوتا ہے، حضرت عطارد کا یہ ارشاد کہ "منہ پھیر دینا متعدی بدو مفعول اردو میں مستعمل نہیں" اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں کہ صحیح ہے، استاد ذوق مرحوم فرماتے ہیں کہ۔

"پھرتا ہے سیل حوادث سے کہیں مردوں کا منھ شیر سیدھا پیرتا ہے وقت رفتن آب میں"

یہی تخیل ان لفظوں میں بھی ادا ہو سکتا ہے کہ

"پھرتا ہے سیل حوادث سے کہیں اپنا منھ کھاتے آئے ہیں تھپیڑے انہی طوفانوں کے"

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"جلوہ دوست یہ آہستہ خرامی تا چند ندیاں سوکھ گئیں شوق میں طوفانوں کے"

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ دونوں مصرعوں میں کوئی معنوی ربط نہیں۔ جلوہ دوست کو ندی سے کیا مناسبت، جلوہ کے معنی ہیں خودنمائی اس کو آہستہ یا تیز خرامی سے کوئی واسطہ نہیں، چند کا لفظ عموماً اعداد کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے، یہاں "تا کے" ہونا چاہیئے، (اور اگر "کب تک" لکھتے تو کیا ہرج تھا) "سوکھ چلیں" بول چال کے خلاف ہے "سوکھ گئیں" یا سوکھتی چلیں کہہ سکتے ہیں بات یہ ہے کہ ندی کا کام ہے چلنا" اگر خشک ہو کر بھی بہے تو وہ ندی نہیں۔ یہ تخیل میرے فہم سے

اتنا اعلیٰ و ارفع ہے کہ اتباع سے قاصر ہوں۔

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"موج ہے رنگ شفق، لالہ و گل مطلع صبح — چند عنواں ہیں مرے شوق کے افسانوں کے"

حضرت عطار دکا ارشاد ہے کہ مصرعۂ ثانی صرف اشارہ مصرعہ اول سے ربط پیدا کرنے کے لئے چاہیے "میرے" ضمیر واحد متکلم اور "شوق" واحد پس شوق کا افسانہ ہوسکتا ہے "افسانوں" کہنا صحیح نہیں' بجا' نہیں تو اتباع منظور ہے، ملاحظہ ہو۔

درد دل، زخم جگر، قطرہ خوں، دیدہ نم — یہی عنواں ہیں مرے عشق کے افسانوں کے
شعلۂ طور، ید بیضا، عصائے موسیٰ — یہی عنواں ہیں جگر آپ کے افسانوں کے
مطلع صبح وطن، مقطع شام غربت — یہی عنواں ہیں جگر آپ کے دیوانوں کے
رنج و غم، یاس و الم، حسرت حرماں ماتم — یہی مضموں ہیں جگر آپ کے افسانوں کے
نغمہ و زمزمہ تار نفس، ساز حیات — کیا ہی رنگیں ہیں مضامیں ترے ارمانوں کے

بخوف طوالت یہی کافی ہے ورنہ حضرت جگر کے شعر زیر تنقید نے کچھ ایسا ہیجان ہمارے تخیل میں پیدا کر دیا کہ عنوانوں کے طوفان امڈ کر آ رہے ہیں۔ حضرت جگر فرماتے ہیں کہ:-

"آگ میں پھاند پڑیں موت سے ٹکرا جائیں — واہ کیا کھیل ہیں ان سوختہ سامانوں کے"

حضرت عطارد بجا ارشاد فرماتے ہیں کہ پھاندنا کے معنی ہیں اُچک جانا۔ کسی چیز پر سے کود کر نکل جانا اس لئے "آگ میں کود پڑیں" ہونا چاہیئے "پھاند پڑیں" سراسر غلط ہے۔ غیر مادی شی موت سے ٹکر لینا بھی صحیح نہیں۔ اتباع ملاحظہ:-

نار نمرود بھی بن جاتی ہے گلزار خلیل — جذبۂ عشق اگر دل میں ہو انسانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"حسن کی جلوہ گری سے ہے محبت کا جنون — شمع روشن ہوئی پر لگ گئے پروانوں کے"

حضرت جگر بظاہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شمع کے روشن ہونے پر جو حسن کی جلوہ گری ہے پروانوں کو پر لگ گئے جو محبت کا جنون ہے۔ اور وہ اڑ اڑ کر آنے لگے۔ حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ محبت کا جنون مہمل ہے اور شمع کا روشن ہونا پروانے کے پر نکلنے کی علت نہیں ہمارے

تباع کی پرواز ملاحظہ ہو۔

کیا تعجب ہے فلک کے بھی ہوا بِ دلیں جلن شعلہ شمع کو پَر لگ گئے پروانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"خاک بھی گور غریباں کی ہے کیا بستی شوق دل دھڑکتے نظر آئے مجھے انسانوں کے"

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ "بستی شوق" کی ترکیب اضافی قطعاً غلط ہے، بستی اردو ہندی اور شوق عربی، دونوں کا میل تو برادران وطن کو بھی نہیں بھاتا۔ یہ حضرت جگر کو کیا سوجھی "بستی شوق" گور غریباں تو ہو سکتی ہے، خاک گور غریباں نہیں، رہا دل کا دھڑکنا ہمیں تو کبھی نظر نہیں آیا کسی اور طرح محسوس ہوا ہو تو ہو بہر حال تخیل بلند ہے مگر الفاظ کی پستی نے ابھرنے نہ دیا، اور گور غریباں تک اتباع کرنے میں ڈر لگتا ہے۔

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ

"کاش یہ راز ہر انسان سمجھ لے ہمدم اپنا مقسوم ہے خود ہاتھوں میں انسانوں کے"

حضرت عطارد کی تنقید کو مدنظر رکھتے ہیں غالباً حضرت جگر کا مطلب یہ ہے کہ

"ماسعیٰ" ہی میں ہیں تقدیر کے مضمر اسرار اپنا مقسوم ہے خود ہاتھوں میں انسانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں۔

"موت کیا آئے گی ہم عشق کے دیوانوں کو موت خود کانپتی ہے نام سے دیوانوں کے"

حضرت عطارد کا ارشاد ہے کہ "عشق کا دیوانہ" بہ معنی عاشق صحیح نہیں۔ دیوانہ کے نام سے موت کا کانپنا مہمل، مفروضہ جگر کہ عشق کا دیوانہ کبھی مرتا ہی نہیں صریحاً غلط۔ بات یہ ہے کہ

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

عرض ہے۔

عشق اور عقل بہم ہو نہیں سکتے ہرگز یہ پری بھاگتی ہے سایہ سے انسانوں کے

حضرت جگر فرماتے ہیں

"میں نے دیکھا ہے اسے روپ میں فطرت کے جگر میں نے پایا ہے اسے بھیس میں انسانوں کے"

حضرت عطارد کا اعتراض بجا ہے۔ "اسے دیکھا ہے کا مشارٌ الیہ کون ہے؟ غالباً خدا ہی ہے"

کس کو ہے تاب کہ وہ حسن مجرد دیکھے ہاں یہ ممکن ہے کہ ہو روپ میں انسانوں کے

مکتوب

جہاں بانو ایم۔ اے

جینے کے اشتیاق سے پھر ہے رمیدگی   پھر سینہ حیات میں عزم سفر ہیں ہم

آج کل کچھ عجیب ہو گئی ہوں۔ ہر بات کو بس سوچنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ غور و فکر کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے۔ عجب مصیبت ہے یہ بھی۔ واقعی وقتی جذبات سے متاثر ہونے والوں کا کیا بھروسہ۔ یہ بھی شاید ع تمہاری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا۔

عقل اور سوجھ بوجھ سے کام لو شاید ایسی تلخ کامی سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ مگر تمہاری تو عقل چر کھانے گئی ہے۔ پہلے بھی تم میں کہاں تھی عقل۔ جواب آسکتی ہے۔ وہی بقول شخصے

جوں جوں بلند ہم ہوئے پستی نظر پڑی

محبت کو دشمنی سے کیا واسطہ۔ محبت تو قربانی کو کہتے ہیں۔ پھر بھی میں اس موضو خیالات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ محبت ایک جلتی ہوئی سانس ہے۔ اور بس۔ اس کی تشریح ہو بھی کیا سکتی ہے ع

کیا چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں

محبت ایک شعر ہے جو کہا نہ گیا ہو۔ ایک الجھی ہوئی سی بات جو سمجھ میں تو آجائے لیکن جسے سمجھانا نہ آسکے۔ ایک تخیل جس کا احساس ہو سکے لیکن اظہار نہ ہو سکے۔ بظاہر ایک گھسا ہوا پامال موضوع۔ لیکن جس کے ہر خزاں میں بہار کی رنگینیاں ہوں۔ اب بھی تم اس کو نہ سمجھو تو پھر میں تمہاری عقل کو جانے کیا سمجھوں۔ ایک تمہارے میرے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔

عقل تو تری سو نی نہ ہوئی   کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

۔ ماں مجاز کے اس تخیل ہی پر ٹوٹتی ہے۔ یہ ریڈیو ہمیں کیا سناتا ہے۔ یہ پکے گانے اور خیال ــــ عجیب بے ہنگم سی چیز۔ جس فریاد کی کوئی لے نہ ہو۔ مختلف قسم کی چیخیں مار کر اگر ان کو آرٹ کا شاہکار کہیں تو اس سے زیادہ اور نامعقولیت کون ہو سکتی ہے۔ ایک "الاپ" جس کی

کوئی تنگ ہی نہ ہو۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک مریض ہے جو درد کی شدت سے کراہ رہا ہے۔ جس کو کراہ میں مزہ ملتا ہے جس کو طبیب کراہنے سے منع نہیں کرتے۔ بس ایسے ہی کچھ ہوتے ہیں یہ پکے گانے۔ یہ خیال اگر صرف خیال ہی بن کر رہ جائیں اور آواز کی دنیا میں نہ آئیں تو کتنا اچھا ہو۔ فضا میں یہ چیخم دھاڑ نہ پھیلے۔ موسیقی صحیح معنوں میں موسیقی بن جائے۔ لیکن دنیا کو کیا کریں۔ آخر اس کے ساتھ گزارنا ہے۔ جیسے انسان بعض وقت اپنے عیوب اور اپنی کمزوریاں دوسروں کی زبانی سننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور چپ چاپ سنجیدگی سے بیٹھا ہوا کسی کی غیر سنجیدہ دیوانی حرکتوں کے آثار چڑھاؤ پر غور کرتا ہے اسی طرح وہ ایسی الاپ سننے پر بھی شاید مجبور ہے۔ یہ دنیا مجبوریوں کا ایک سلسلہ ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ

اب جبر بھی نہیں ہے میرے اختیار کا

دریا کا بند ٹوٹ جائے تو سیلاب مشکل سے رکتا ہے اور اس وقت رکتا ہے جب طوفان کم ہو جائے۔ چنانچہ آسمان کی بھی جھڑاس نکل جاتی ہے جب کہ وہ خوب سا رو لیتا ہے۔ اس کی طبیعت کا بار بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ مگر جب کوئی خوب چیخ چیخ کر رونا چاہے اور اس کو اس وقت ہنسنا پڑے اس مشکل سہنے کا تمھیں کبھی احساس ہوا ہے؟ بھلا

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام

ایک واقعہ لکھ کر تمھارے جذبات کو ذرا مشتعل کرنے طبیعت چاہتی ہے۔ ہمارے محلہ میں ایک مکان ہے۔ موٹ کی باؤلی چلتی ہے۔ دو تین حوض ہیں۔ کافی بڑا باغ ہے۔ لہلہاتے درخت میوں سے لدے جھوم رہے ہیں۔ مالک مکان خاصے رئیس و قت ہیں۔ پاس پڑوس میں غریب دیہاتیوں کی چند خستہ و بوسیدہ جھونپڑیاں ہیں۔ نہ جانے یہ غریب۔ کنگال۔ جھونپڑیوں میں رہ کر محلوں کا خواب کیوں دیکھتے ہیں۔ کبھی سنا ان غریبوں نے ان کے کنوئیں سے پانی لیا تھا۔ جس پر انھیں خوب ہی گالیاں سننی پڑیں۔ اور مارنے کی دھمکی دی گئی ہے۔ غریب تو صرف چولے پر ہانڈی چڑھانے کی اشد ضرورت سے مجبور ہو کر پانی لیتا ہے۔ یا پھر پینے اور پیٹ کی دہکتی آگ بجھانے کے لئے۔ امیروں کی طرح اس کی مختلف ضرورتیں تو ہیں نہیں کہ پانی سے سو رنگ کھیلتے ہیں۔ یہ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ۔ ہتاؤ یہ چلتی پھرتی لاشیں پانی کی تلاش میں

کہاں جائیں گی۔ آس پاس کہیں پانی کی بو باس نہیں۔ یہ ہیں آج کل کے دولتمند جو غریب کے ارمانوں سے بھی جان کر ہولی کھیلتے ہیں

یہی جب موت بن بیٹھیں تو کیسے زندگی ہوگی۔

آج کل مقرر بڑی لمبی چوڑی تقریریں کرتے ہیں۔ شاعر آزاد نظم لکھ کر زندگی کی غلامی کو آزادی سے بدلنے کے لئے پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ادیب رکشا والا۔ مزدور۔ الا بلا جیسے عنوانات پر قلم فرسائی کرکے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔ لیکن حقیقت "عمل" میں پوشیدہ ہے عملی پہلو کی سوچ بچار کا مادہ کسی میں نہیں۔ اور غالباً ہو بھی کیسے۔ جب کہ پَر بند ہے ہیں۔ بازو سینچے ہوئے۔ تم نے بند فانوس کی شمع میں کبھی خاک پروانہ نہیں دیکھی؟ کیا اثر ہوا دل پر؟ او منہ ہٹاؤ جی —— ہمارا تخیلی نظام مادی نظام سے دور، بہت ہی بہت دور ہے۔ جس تک رسائی اپنے بس کا روگ نہیں۔ یہ عالم بیداری کے سپنے بھی کہیں سچی تعبیر دے سکتے ہیں۔ صرف خواب اور تخیل سے کچھ نتیجہ نکلا ہے۔ ایک حد تک سب مل کر کسی مقصد کے حصول کی کوشش کریں تو کامیابی پھر بھی ممکن ہے اجتماعی کوشش و سرگرمی انفرادی کوشش سے بہتر ہوتی ہے۔ بس جٹے جاؤ جب تک جینا ہے۔ ان واقعات پر سوچتے سوچتے سر گھومنے لگتا ہے۔ گردش ایام سے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے۔ کیا دنیا اور وقت کو سوائے اس کے کوئی کام نہیں آتا؟ تو میں سکھاؤں اسے۔ اور بہت جلد سکھاؤں

فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے۔

جانے کبتک ہے یہ گردش تقدیر میں۔ تاہم تسلی بھی ہوتی ہے کہ انسان کا کوئی فعل اس کا اپنا تو نہیں ہے۔ اس کی ساری کی ساری ہستی "مشیت" کے حوالے کر دی گئی ہے۔ معبود اپنے بندہ کو جس حال میں رکھے۔ اس کو شکوہ نہ کرنا چاہئیے۔ سرگزشت بلاکشاں نہ سنو تو بہتر ہے۔ لیکن بہ زبان بے زبانی ایک آواز آتی ہے۔

ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے
اور بھی دور فلک میں ابھی آنے والے

لیکن جنھیں زبان کے چٹخارے ہوں وہ گونگے جذبات کو کیا سمجھ سکیں گے۔

"ذسکا"

جناب سید نور الحسن صاحب بی۔ اے

(بہ سلسلہ سابقہ)

اور جیسے ہی وہ شہزادی ذسکا کے ہاتھ کا بوسہ لینے کے لئے جھکا۔ ڈنبزل نے محسوس کیا کہ وہ دونوں یکساں ہیں۔ طاقتور، تندرست اور توانا اور مرد خوبصورت عورت میں کئی چیزوں میں مماثلت ہوتی ہے۔ یکساں گہری دبیز بھوؤں، آدھی وحشیانہ آدھی مترحمانہ آنکھیں اور دونوں کے جاذب نظر قد موزوں۔ یکساں ہلکے پھلکے حرکات جسمانی اور پھر بھی دونوں مختلف تھے گو بہت سے حرکات میں ملتے جلتے تھے۔ ان میں وہ مماثلت نہیں تھی جس کو خاندانی مماثلت کہتے ہیں بلکہ یہ مماثلت ایسی تھی جیسے خاص TYPE کے آدمیوں میں پائی جاتی ہے۔ اگر ڈنبزل کو یقین سے یہ نہ معلوم ہوتا کہ جرویس فرانسی نژاد اور ذسکا روسی نژاد ہے تو وہ حکم لگادیتا کہ جرویس اور ذسکا شریف اور مصری النسل ہیں۔ وہ اس خیال کا اظہار باآواز بلند کر دیتا اگر وہ یہ دیکھتا کہ جرویس نہایت بیباکی سے ایک ناچ کے بعد دوسرا ناچ شہزادی ذسکا سے طے کرتا جاتا ہے اور ظاہر اسوائے اس کے اور کسی کا نام اپنے ناچ کے پروگرام میں لکھنا نہیں چاہتا۔ اس زیادتی پر ڈنبزل کو غصہ آگیا اور اس نے اپنے حق کو منوانے کا تہیہ کر لیا۔

ڈنبزل نے کہا، شہزادی صاحبہ آپ نے پہلا ناچ میرے ساتھ ناچنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نہایت درست ہے اور میں ضرور اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ جرویس کے ساتھ دوسرا ناچ ہو سکتا ہے۔ سازوں کی آواز جانفزا ہے ہمیں اندر چلنا چاہئیے۔ ڈنبزل نے جرویس اور دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے جو حلقہ کئے ہوئے تھے کہا "اس طرح بھیڑ بھاڑ سے ہم آپ کے داخلہ کی شان وشکوہ کو ماند کردیں گے۔ اور ہاں یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آج رات آپ کس روپ میں ہیں۔ یقیناً گزشتہ زمانہ کی کوئی مایۂ ناز تاریخی ملکہ۔

اس نے جواب دیا "نہیں میں شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ آج کی رات میں جیتی جاگتی تصویر ہوں ایک مشہور و معروف

ناچنے والی ڈسکا چارمینریل کی جو ایک مشہور مصری
سپاہی کی حرم تھی۔ تاریخ میں اس ہیرو کا نام
ARANES ہے۔

وہ یہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کے حلقہ
بگوش اس کی آواز سے مسحور ہو گئے۔ جرویس کو ہی
وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی اور اس کو مخاطب
کرکے وہ یوں گوہر فشاں ہوئی۔

ہاں! میں چارمینریل ہوں۔ جیسا کہ میں
نے آپ سے ابھی کہا۔ وہ ایک ناشائستہ ہستی
تھی یا یوں سمجھئے کہ اچھے انگریز اس کو ناشائستہ
ہی سمجھیں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اس کی
باقاعدہ شادی ARANES سے نہیں
ہوئی تھی۔

یہ تفصیل جس بناوٹی شرم اور متانت
سے دیگئی تھی اس کی وجہ سے سامعین کھلکھلا کر
ہنس پڑے۔ جرویس نے خوش ہوتے ہوئے کہا
کہ فرانس میں ایسی ہستیاں ناشائستہ نہیں سمجھی
جاتیں۔ وہاں وہ اور بھی دلچسپ نظر آتی ہیں۔

اس نے طنزاً مسکرا کر کہا" تو پھر یہ کہئے
کہ آج کا فرانس کل کا مصر ہے اور غالباً فرانسیسی
اتنی ہی معشوق رکھتے ہیں اور اتنے ہی بیوفا
ہیں جیسا کہ ARANES تھا۔

جرویس نے خوش ہوتے ہوئے کہا
ہاں مجھے ماننا پڑتا ہے کہ میرے وطن میں بجنسہ ایسے
لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں کیا ARANES
کوئی بہت مشہور و معروف آدمی تھا۔

شہزادی نے جواب دیا" ہاں تاریخی
روایات سے ثابت ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا بہت
بڑا سورما تھا کہ جیسے آپ اپنے زمانہ کے بہت
بڑے مصور ہیں۔"

جرویس نے گردن جھکادی۔ حسین چارمینریل
یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ اس عجیب وغریب
نام کا زبان پر آنا تھا کہ جرویس ایک دم جھجک
گیا گویا اس کو ڈنک سے مارا گیا ہو۔ اور کچھ دیر
کے لئے متحیر سا رہ گیا۔ شہزادی نے اپنی سیاہ آنکھوں
کو استفسارانہ طور پر اس کی آنکھوں میں ڈال دیا۔

مسٹر جرویس کچھ نہ کچھ آپ کی تکلیف کا
باعث ہے۔

جرویس کی بھوویں آپس میں مل گئیں جیسے
کوئی شخص کشمکش میں ہو لیکن پھر اس نے اپنے
آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا" کچھ نہیں... گرمی...
...ہوا..... ایسا ہی معمولی سا واقعہ چلئے
کیا آپ ناچ میں نہیں شریک ہوں گی۔ ڈینرل
موسیقی تم کو مدعو کر رہی ہے۔ جب تم پہلا ناچ
ختم کر چکو گے تو میں شہزادی صاحبہ کے ساتھ دوسرا
ناچ شروع کروں گا۔ فی الحال خدا تمہیں مبارک کرے۔

وہ علٰحدہ کھڑا ہو گیا اور پوری جماعت کو گزرنے کا
راستہ دیدیا۔ شہزادی ذسکا خراماں خراماں
بغیر پاؤں کی چاپ سنائے دئے کہراتی ہوئی
مع ڈنزل میورے کے گذر گئی۔ حبشی غلام دونوں
کے آگے آگے مورچھل ہلاتا ہوا چل رہا تھا اور
تمام اس متعجب کر دینے والی خاتون کے عشاق
پیچھے پیچھے تھے۔ جردیس اس منظر کو بغور دیکھتا
رہا یہاں تک کہ ناچنے کے کمرے میں جانے سے
پیشتر شہزادی نے مڑکر جردیس کو مسکرا کر دیکھا
آدمیوں کے کھچا کھچ بھرا ہونے کے باوجود دونوں
کی نگاہیں ملیں اور دونوں ایک دوسرے کو پہچان
گئے۔ پھر باہر کی روشنی یعنی شہزادی اندر کی
روشنی میں گم ہو گئی۔ جردیس اکیلا رہ گیا۔ وہ
ایک کرسی پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے کوئی بہت
تھکا ہوا ہو اور قالین کے پیچ در پیچ ڈزائن
کو تکنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو پیشانی پر پھیرتے
ہی ہٹا لیا۔ پیشانی عرق آلود تھی۔

اس نے اپنے دل میں کہا " مجھے کیا ہو گیا
ہے۔ ابھی اڑتالیس گھنٹے بھی قاہرہ میں نہیں
گزرے کیا بخار کی آمد آمد ہے۔ دماغ میں یہ کیا
احمقانہ وسواس سما رہا ہے۔ میں نے شہزادی
ذسکا کو اس سے پہلے کہیں نہ کہیں دیکھا ہے۔
صورت جانی پہچانی ہے۔ آواز سنی سنائی ہے۔
میں نے اس کو پہلے کہاں دیکھا؟ پیرس میں؟ سنیٹ
پیٹرس برگ، لندن — کہاں؟ چار میزیل!
.... چار میزیل! نام سے میرا کیا تعلق ہے۔
ذسکا چار میزیل۔ یہ تو ایک رومان یا Gip
sy. راگ کا نام معلوم ہوتا ہے۔

میں ضرور عالم خواب میں ہوں۔ اس کا چہرہ اس
کی آنکھیں سب بخوبی میرے حافظہ میں محفوظ ہیں
میں نے اس کو کہاں اور کب اس سے پیشتر
دیکھا تھا اور خوب واقف ہو گیا تھا کیا وہ میرے
اسٹیڈیو میں ایک ماڈل تو نہیں بن چکی؟ کیا
اتفاق سے اُس کی غربت کے زمانہ میں اس کی
میری ملاقات ہوئی ہو، اور اب حیثیت بدل جانے
کے بعد اب اُس کی اُس زمانہ کی تصویر اور خط و
خال میری نظروں کے سامنے پھر رہے ہوں۔
اُس کے زلف عنبریں کی خوشبو سے بھی میں
مانوس ہوں۔ وہ میرے خون کی روانی میں سرایت
کرتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ خوشبو مجھ کو مدہوش
بنائے دیتی ہے۔ اُس سے میں گلوگیر ہوا جاتا ہوں۔

وہ اپنے آپ کو جھٹکا دیکر کرسی سے اُٹھ
کھڑا ہوا ہے اور پھر چند منٹ کے بعد کرسی پر
بیٹھ کر قالین کو تکنے لگا۔

ترنگ پیدا کرنیوالی موسیقی کی راگنیاں
ہوا پر سوار اس کے پاس آرہی تھیں لیکن وہ

نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ کچھ سُن رہا تھا
بالآخر اس نے کہا چپکے سے کہا۔ اے
خدا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں اس عورت کے
محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں ؟

اذاں کی ابتدا

تھی مسجد نبی سے نہ پہلے کوئی جگہ
بہر نماز تھا نہ مقرر کوئی مقام
اوس وقت ابھی اذاں کے نہ احکام آئے تھے
ہوں ایک جا پہ جمع امیر اور کیا غلام
عیسائی اور یہود کا البتہ تھا طریق
ناقوس وہ بجاتے تھے اعلان تھا یہ عام
یہ شور و غل خلاف طبیعت تھا آپ کے
بانگ نماز اور ہو یہ اوس کا احترام
تھی فکر آپ کو کوئی ایسا طریق ہو
دے وہ خبر بھی اور عبادت کا دونوں کام
تھوڑے ہی دن نہ گزرے تھے اس فکر میں ابھی
القا ہوا خدا کی طرف سے یہی پیام
پھر حضرت بلال سے ارشاد یہ ہوا
پہنچاؤ پانچ وقت خدا کا یہی کلام

غزل

جناب مسلم

باز آمدہ باز آمدہ آں یار ما باز آمدہ
آں سرو طناز آمدہ آں خسرو ناز آمدہ

از میکدہ لغزش بپا با یک بطِ مئی در بغل
باز آمدہ باز آمدہ با بربط و ساز آمدہ

زلف سیہ نیلی قبا گلگوں عذار و سرخ لب
سر تا بپا رنگیں ادا آں شوخ طناز آمدہ

مسحور گشتہ گلستاں مفتون شدہ گلہا بر آں
یارب کدامیں غنچہ از گلشن راز آمدہ

مستی و شوخی ہمعناں تیر بلاہا در کماں
آں ترکتاز از خم جاں اندر تگ و تاز آمدہ

ہشیار اے آوارگاں زنہار اے میخوارگاں
آں رند مست لم یزل با چشم غماز آمدہ

مسلم مدہوش را یارائے نغمہ از کجا
شاید کہ اندر گوش او از غیب آواز آمدہ

"مشعلِ راہ"

جناب نخشب صاحب جارچوی

مجھے ہے ذرا جذبِ دل آزمانا
یہاں کچھ بھی گزرے مگر تم نہ آنا

وفا کی حقیقت جنوں کا فسانہ
جو میں چُپ رہوں گا کہے گا زمانا

مرے پاس آکر نہ دامن بچانا
مچلنے کا دل ڈھونڈتا ہے بہانا

جفا تھا مگر اب تو خوش ہے زمانا
کہ میں چاہتا ہوں تمھیں بھول جانا

مرا قصۂ غم اثر کر رہا تھا
مگر ان کا منھ پھیر کر مسکرانا

ٹھہرتی چلی جا رہی ہے طبیعت
گزرتا چلا جا رہا ہے زمانا

دوپٹہ کے آنچل میں بل دے رہے ہیں
بنانے کو ہیں کوئی تازہ بہانا

محبت ہے غماز بھی بدگماں بھی
نگاہیں بچا کر مجھے بھی بچانا

یقیں ہے تو راہِ وفا سے گزر جا
گماں ہے تو اس راہ میں پھر نہ آنا

محبت میں خود اعتمادی ہے نخشبؔ
اِدھر ایک دل ہے اُدھر ہے زمانا

پچپن کے بعد

یہ ایسا سوال ہے کہ اکثر طبائع کو جب اس کا خیال آتا ہوگا تو وہ ایک بے چینی سی محسوس کرتے ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پچپن سالہ کے بعد جنھیں کوئی کام نہیں رہتا جب بچوں کو بڑ ہوں کی صف میں اور جوانوں کو ترقی کرتے ہوئے اچھی خدمتوں پر دیکھتے ہوں گے تو قدرتاً اپنا زمانہ یاد آتا ہوگا کہ ہمارے قلم سے کیسے کیسے تقررات عمل میں آئے تھے اور آج وہ اپنے آپ کو مجبور اور عاجز پاتے ہیں اور بعض حساس طبیعتیں اس سے متاثر ہوتی ہیں اور بعض اس کا کوئی خیال ہی نہیں کرتیں۔

یورپ اور امریکہ میں ایسے وظیفہ یاب حضرات نے اپنے اوقات کو خوشگوار بنانے کے لئے کلب اور بیسیوں دلچسپ مشاغل فراہم کرلیے ہیں کہ عہد ماضی کی یاد نہ آئے اور موجودہ ساعتیں دلچسپ گذر جائیں حیدرآباد میں کہ جہاں تعلیم یافتہ وظیفہ یاب عہدہ داروں کی کافی جماعت موجود ہے اون کے لئے کچھ نہ کچھ اوقات گزاری کا مشغلہ درکار ہوگا کلب کا قایم کرنا یا کسی رسالہ کا جاری کرنا دقت طلب ضرور ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے عہدہ دار اپنے دورِ کارفرمائی کے حالات دلچسپ طور پر مہینہ میں یا جب کبھی فرصت ہو کسی رسالہ کے ذریعہ منظر عام پر لایا کریں تو اوقات کا بڑا حصہ مصروفیت میں گذر سکتا ہے۔ ایسے مضامین کی پذیرائی کے لئے ماہنامہ شہاب کے اوراق آمادۂ استقبال ہیں۔

حال ہی میں سر رضا علی نے (اعمال نامہ) کے تحت اپنی زندگی کے حالات کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں جنھیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے وظیفہ یاب عہدہ داروں کے لئے یہ مشغلہ نہایت دلچسپ ہے جس سے دوسرے بھی مستفید ہو سکتے ہیں ورنہ ڈرائینگ روم میں صوفہ پر لیٹے ہوئے روزآنہ اوقات کا پروگرام ترتیب دینا اتنا مفید نہ ہوگا جتنا کہ اپنے حالات کے لکھنے میں وقت صرف ہوگا جس کو آپ اور دوسرے کہیں گے "بلے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"۔ اگر یہ سلسلہ شروع ہو جائے تو پھر دوسرے حضرات کو بھی شوق پیدا ہوگا اور آپ کے نقوش آنیوالے نوجوان عہدہ داروں کیلئے ایک تابناک ستارہ ثابت ہوں گے جس کی روشنی میں وہ اپنے مستقبل کے لئے کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ اخذ کر سکیں گے سید محمد تقی صاحب نائب ناظم آبکاری وظیفہ یاب نے اپنی نشری تقریر میں ایسی ہی تجاویز پیش کی ہیں اسلئے ہم ان کا یہ خیال

بہ سرپرستی
محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر

شہاب

ناہید

ناہید

جلد ۸ امرداد ۱۳۵۴ف م جولائی ۱۹۴۵ء نمبر ۹

۱۔ سینما کے تاثرات ۔ یقیناً مفید مضمون ہے لیکن کتنی کمپنیاں ہیں جنھیں دوسروں کے مستقبل کا خیال ہوگا وہ اپنا مستقبل سنوارنا چاہتی ہیں ۔

۲۔ ؟ ۔ یہ ایک خود نوشتہ داستان ہے سزا اور جزا کا فیصلہ آپ کیجئے ۔

۳۔ دل لخت لخت ۔ گذشتہ اقساط کا سلسلہ ہے جو دل کے ٹکڑے سے شائع ہو رہا تھا۔

۴۔ اگر آپ کی تمنائیں پوری ہو جائیں تو پھر ایک ہنگامہ محشر برپا ہوگا ۔ تمنائیں کبھی پوری ہوئی ہیں نہ ہوں گی ۔

۵۔ پریسیڈنٹ روزولٹ وقت کی چیز ہے ۔

۶۔ آمیرے پیاس ادھر دیکھ ۔ یہ حجاب بنارسی کی دوسری نظم ہے ۔

"ب"

سینما کے تاثرات

ساجدہ احمد محی الدین

سینما آج کل ہماری تفریحی معاشرت کا ایک لازمی جزبن گیا ہے۔ یوں تو سینما کے دیکھنے سے تھوڑی دیر کی تفریح ہو جاتی ہے اور ہم ہر قسم کی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت سے واقف ہو سکتے ہیں۔ دوسرے مقامات کی سیر بہ آسانی سستے داموں آرام سے بیٹھ کر کر سکتے ہیں۔ اگرچہ کتابیں پڑھنے سے بھی دنیا کی سیاحت کر سکتے ہیں لیکن یہاں تخیل کی دنیا رہتی ہے اور وہاں اس تخیل کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی سینما ہمارے لئے ایک مفید چیز بن سکتی ہے اگر ہم حقیقت کی روشنی میں سینما کی "حقیقت" اور اس کے "تاثرات" کا مشاہدہ کریں اور اس کے مفید و مضر نتائج پر غور کر کے اپنی کمزوریوں کو دور کریں۔

سینما سے بڑھ کر بچوں کی تربیت کے لئے کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ اگر روز آنہ اس کے ذریعہ انہیں تعلیم دی جائے تو ماؤں کو اپنا فرض ادا کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ ایسے فلم جس سے بچوں کے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی نشو ونما ہو سکے اور ایسے نمونے پیش کئے جائیں جس سے وہ خودداری سچائی اور بہادری کے ساتھ نڈر بن کر عزم اور بے جگری سے ہر آفت کا مقابلہ کر سکیں اس نکتہ نظر سے عورتوں کے فرض ادائیگی کے لئے بھی یہ تعلیمی طریقہ سے مفید بنایا جا سکتا ہے اور ان کی گھریلو زندگی کو خوش اسلوبی سے خوشگوار طریقہ پر پیش کرنا اور ان کے فطری جذبات کو شریف تاثرات کا جامہ پہنانا نسوانی دنیا کی ایک اہم خدمت ہوگی۔ اور اس طریقہ سے نوجوانوں کے اخلاق بھی سدھارے جا سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ پکچرز کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری تفریحات کو صرف "رومانی دنیا" تک محدود کر دیا ہے۔ غور کیجئے۔ ہر فلم کی کشتی بغیر "پریم کہانی" کے چل نہیں سکتی۔ کیا زندگی کی راہ چلنے کے لئے ان چند محدود گھاٹیوں سے ہی گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے واقعات پست ذہنیت کے معاون ہوتے ہیں۔ یوں تو اس میں ایک حد تک ہمارے ظالم سماج کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

اور مظلوموں کی فریاد رسی اسی سے ممکن ہے لیکن کیا جس طرح ہم نے اپنی سماجی برائیوں کی طرف توجہ کی کبھی اپنے اقتصادی مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر اپنی اخلاقی کمزوریوں پر بھی غور کیا ؟ درحقیقت اخلاق ہی سے معاشرت اور سماج کو گہرا تعلق ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے کس قدر تاکید کے ساتھ فرمایا ہے کہ ــــــ

"جو قوم اخلاقی حالت سے پست ہوجاتی ہے اسے دوسری قوموں پر سیاسی حیثیت سے برتری حاصل کرنے کا حق باقی نہیں رہتا"۔ عہد حاضر کی تمام تعلیمات کے باوجود ہماری تمام تر زندگی کا دار و مدار قرآن پاک کی مقدس تعلیمات سے وابستگی پر ہے۔

کتنے ایسے ہیں جو صرف سینما ٹکٹ کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں لیکن ہر تکلیف جو انہیں اس راہ میں پہنچتی ہے اسے امتیازی نشان سمجھتے ہیں۔

وہ دل ہے جو ترے تلووں تلے ہوا پامال
وہ سر ہے جو ترے نیزے پہ سر بلند ہوا

یہ ایک ایسا نشہ ہے جو لطیف اور ذوق آفریں ہونے کے باوجود نہایت ہی مہلک ہے سچ ہے۔ جگمگاتے گناہ آنکھوں کے سامنے پرفریب جنت کھول دیتے ہیں۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
سینما ہے یا صنعت آزری ہے — اقبال

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شئی اچھی یا بُری نہیں صرف اس کے استعمال پر اس کا اچھا یا بُرا ہونا منحصر ہے جس چیز کو ہم بہتر سے بہتر کہتے ہیں جس کے اچھے ہونے پر ساری دنیا کو اتفاق ہو اگر اسے بیجا استعمال کریں تو وہی شئی بدترین اشیاء کی فہرست میں شامل ہو جاتی ہے۔

پھانس

سعیدہ مظہر بی - اے

کس قدر سرد ہے پژمردہ ہے بیجاں ہے یہ
آہ! اے میرے دکھی دل تری پہچان ہے یہ
سینہ معمور ہے مستور ہے بار غم سے
حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں غم کے دم سے
صبر کی پیٹھ بھی ہے بار صعوبت سے جھکی
مٹے ادبار سے ہے جاں بھی بہکی بہکی
کچھ گلے میں ہے پھنسا، کچھ ہے بھرا سینہ میں
بخدا لطف نہیں کوئی بھی اب جینے میں
یہ جو اک سل سی ہے سینہ پہ سرک جائے اگر
پھانس سینہ میں کھٹکتی ہے نکل جائے اگر

۹

ناعمہ

(اپنی پُر درد زندگی کے چند اوراق سمیٹ کر ایک المناک داستان آپ کی بارگاہ میں پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہی ہوں پڑھنے والوں کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ واقعات کوئی خاص غرض یا کسی کو اذیت دینے کے لئے قلمبند نہیں کئے جا رہے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ جن شعلوں نے مجھے جھلس دیا، اسی نے مجھے قلم اٹھانے پر آمادہ کیا۔)

میں ایک بدنصیب باپ کی بدنصیب بیٹی ہوں۔ بچپن میں قدرت نے ایک ایسا داغ دیا جو کبھی مٹائے نہ مٹ سکا۔ ہوا یہ کہ میری شفیق ماں دنیا سے چل بسیں۔ خوش نصیبی سمجھئے کہ باپ کی شفقت اور محبت نے ماں کی ممتا کو ایک بھولی بسری یاد بنا دیا۔ لیکن جب سوتیلی ماں سے ماحول میں تغیر رونما ہوا تو قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آنے لگیں۔ ماں کی یاد پھر ایک بار دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ دل اُن ماضی کے اوراق کو سینہ سے لگانے کے لئے آگے بڑھتا۔ لیکن مایوسی اپنا تاریک سایہ ڈال دیتی۔

وقت کو کون روک سکتا ہے وہ حسب معمول آگے دوڑتا ہی رہا۔ جیسے ہی شباب نے اپنی بہار دکھلائی تلخیوں کے نقوش بھی اُبھر آئے بہنوں اور بھائی کا ساتھ ایک ایک کر کے چھوٹ گیا۔ ان حالات کے بعد قدرت نے اچانک مجھے تنہائی پسند اور سنجیدہ بنا دیا سارے گھر کی دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ اسکول جانا اور آنا زندگی کا واحد مشغلہ بن گیا۔ اسی اثنا میں میں نے میٹرک پاس کیا اور دوست احباب نے مبارکباد دی لیکن میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کیوں؟ یہ میں خود نہ سوچ سکی۔ آج خیال آتا ہے کہ شاید وہ آئندہ کی مشکلات کا پیش خیمہ تھے۔

کالج کے داخلہ کے ساتھ ہی ایک انوکھی دنیا میں قدم رکھا۔ روز آنہ حسین خواب دیکھے گئے پُر مسرت ساعتوں کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آہ! کیا معلوم تھا تمنائیں یوں برباد ہونگی اور حسرتیں اندر ہی اندر سرد ہو جائیں گی بظاہر تو اپنی بربادی کی ذمہ دار میں خود ہوں اسلئے کہ میں نے اپنی مرضی سے بغیر بنیاد کے دیواریں

کھڑکیاں اور خود ہی آندھی کے زور سے گرتے ہوئے دیکھا۔

صولت میرے قریبی رشتہ کے ایک بھائی تھے عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑے۔ معلوم نہیں کیوں وہ بچپن سے دوسرے بھائیوں کی بہ نسبت بھلے لگتے تھے۔ میری بہنوں کا خیال تھا کہ ان کی ذہنیت عام نوجوانوں سے بالاتر ہے۔ میں بھی ان کی سیرت کی گرویدہ تھی۔ پھر میرے کان برابر یہ سننے کے عادی ہوگئے تھے کہ "صولت اور ناعمہ کا خوب جوڑ رہے گا"۔ بظاہر تو میں چڑ جاتی اور خفگی کا اظہار کرتی۔ لیکن خدا گواہ ہے میں کس طرح دلی جذبات کو چھپا کر خاموش پرستش کیا کرتی تھی۔ دل کی دھڑکن میں ایک صدا پوشیدہ ہوتی "ناعمہ واقعی صولت سے زیادہ مناسب زندگی کا شریک اور کوئی نہیں ہوسکتا رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ میرے خیالات بھی پختہ ہوگئے۔

جب میں نے انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا تو وہ نوکر ہو چکے تھے۔ رشتہ داروں کے درمیان آپس میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ مطلب واضح تھا۔ میں خوشی سے پھولی نہ سمائی کہ صرف میری ہی نہیں بلکہ اپنے گھر والوں کی تمنا پوری ہوجائیگی۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور قدرت کچھ اور نئے گل کھلاتی ہے۔ راحت جو صولت بھائی کے حقیقی بھائی اور میرے ہم عمر، ہم جماعت اور بچپن کے ساتھی تھے۔ مجھ سے بیحد دلچسپی لینے لگے۔ میں انھیں اپنا حقیقی بھائی سمجھتی تھی۔ پھر وہ تھے بھی پُر خلوص محبت کا مجسمہ۔ ان کے ہاں دوران قیام میں حد سے زیادہ بے تکلفی ہوگئی تھی، وہ ہمیشہ میرے محسن ہی رہے۔ زمانہ امتحان میں انھوں نے میری بہت مدد کی۔ اتفاقاً عین امتحان کے قریب بیمار ہوگئی۔ انھوں نے جس جانفشانی سے میری تیمارداری کی وہ میں کبھی بھی نہیں بھول سکتی مگر میں ان کے اس بڑھتے ہوئے خلوص، ہمدردی اور ایثار کو نہ سمجھ سکی۔ البتہ جب وہ اوداس اور خاموش رہنے لگے تو مجھے بڑی فکر ہوگئی۔ مگر انھوں نے باوجود اصرار کرنے پر بھی اپنے تفکروں کا اظہار نہیں کیا۔ میں ہمیشہ لاپرواہی رہی۔ علاوہ اس کے میں تو اپنے خوابوں کا سنہری محل تعمیر کر رہی تھی۔

ایک دن حسب عادت جب میں اپنے خیالات میں غرق تھی تو بہنوں کی آپس کی گفتگو نے یکایک چونکا دیا۔ "عجیب بات ہے۔ پہلے تو ـــــ" سمجھتے تھے کہ ان دونوں گھرانوں کے آپس میں تعلقات راس نہیں آتے۔ جب خود بخود ان کا رجحان اس طرف ہوگیا تھا تو صولت بھا

نے انکار کر دیا۔"

مجھے معلوم ہوا کہ کوئی قلعہ دھڑام ——— دھڑام کے ساتھ گر پڑا اور میں ان ڈھیلوں تلے دبی پڑی ہوں۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ خاموش آرزوؤں کا شمع بغیر جلے ہی بجھ گیا۔ کئی بار آنسو لگاتار بہتے رہے غیر معمولی افسردگی کا مطلب لوگوں نے جاننا چاہا لیکن میں نے اس راز کو دل کے انتہائی گوشہ ہی میں سسکنے یا دم توڑنے کے لئے چھوڑ دیا۔ چند دن بعد میرے خیالات میں زبردست انقلاب رونما ہوا۔ اپنے پچھلے گندے تصور پر لعنت بھیجی جس میں سراسر خود غرضی پوشیدہ تھی۔ میں نے سوچا کہ پاکیزہ خلوص میں کوئی غرض پنہاں نہیں ہوتی۔ واقعی کہاں میں اور کہاں وہ؟ اچھا ہوا ان کی اپنی تمنائیں میری وجہ برباد نہ ہوئیں۔ بہرحال مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی کہ قدرت نے میری آنکھوں سے نفس پرستی کا پردہ اٹھا دیا۔

اسی ایک واقعہ کے بعد میرے عظیم غم کا آغاز ہوا حالانکہ میں اپنے کو مسرور رکھنے کی کوشش کرتی تھی پھر بھی میری اندرونی حالت سے واقف ہو جاتے۔ میں اپنا دکھ درد ان سے چھپانا چاہتی تھی مگر وہ کسی طرح میرے غم شریک بن جاتے رفتہ رفتہ وہ میری زندگی میں سہارا بن کر داخل ہوئے۔ کس نوعیت کا، میں خود نہ سمجھ سکی۔ ہاں! میں حقیقی معنوں میں بے غرض دوستی کا مفہوم سمجھنے لگی۔ آخر انھوں نے اپنے دل سے مجبور ہو کر اپنا خلوص اور تمام تر جذبات میرے لئے وقف کر دیے اس احساس نے مجھے عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا عورت کی فطرت اور چاہے جو کچھ گوارا کرے لیکن کسی کی محبت اور احسان کا عوض اسی شکل میں دینے پر مجبور ہے۔ میں انجان سی رہی جس سے ان کی ہمت افزائی ہوتی رہی وہ میری دلجوئی اور بھلائی کے لئے کوشاں رہتے اور میں بھی ان کے دلی جذبات کا احساس کرتی رہتی اور دل ہی دل میں سوچتی کہ آخر اس کا حشر کیا ہوگا؟ راحت کی قربانیوں کا عوض دینا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جب ان ہی تفکرات کے بادل امنڈ آتے تو مسرت کی لہروں میں یکایک ایک غم کی اس لہر کی وجہ تلاطم پیدا ہو جاتا اور میرا چہرہ متغیر ہو جاتا راحت مجھے متفکر پا کر میری دلجوئی میں اور زیادہ [illegible] ہو جاتے۔ آخر سوچا کہ کسی دن نظروں سے غائب ہو جاؤں اس طرح وہ بھول جائیں گے۔ لیکن یہ خیال آتے ہی ضمیر نے ملامت کی۔ واقعی یہ انتہائی کمینہ پن ہوتا۔ اگر کسی کے احساسات کا بدل ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کے دل کو تکلیف

تو نہ پہنچنا چاہیئے۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ درمیانی تمام رکاوٹوں کو بالائے طاق رکھ کر خاندانی لڑکی کو اپنے لئے وقف کرنے کو بڑھے۔ والدین سے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں ناعمہ سے شادی کروں گا" جواب خوشگوار ملا کہ "تمھیں بھائی کی شادی تک انتظار کرنا ہوگا"۔ آہ! وہ غلطی نہ کرتے اور سمجھا دیتے تو آج راحت کو یوں تکلیف نہ پہنچتی۔ پھر آگے دو زندگیاں اس طرح بدنام نہ ہوتیں۔

راحت کی اس ایک بھول سے ہمارے پچھلے میل جول پر اعتراضات شروع ہوگئے خط وکتابت پر نکتہ چینیاں ہونے لگیں روزمرہ کے واقعات جو کبھی غیراہم سمجھے جاتے اب قابل تنقید ہوگئے تھے مختلف افواہیں پھیلتی ہی گئیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مخزن کہاں ہے اور کدھر سے روانی جاری ہے۔ میرا پیمانہ صبر بھی لبریز ہوگیا میں نے سارا غبار بلاسوچے سمجھے راحت پر نکالا انھیں بہت دکھ ہوا۔ لیکن اسی سادہ دلی سے نظرانداز کردیا۔

بزرگوں کی نفسیات سے لاعلمی، ان کے بچوں کی زندگی کو موت سے زیادہ ناقابل برداشت بنا دیتی ہے ــــ ان کے قوائے عمل کو تباہ، ان کے جذبات کو زنگ آلود اور آخر ان کی صحت کو داغدار بناکر منظرعام پر لاتی ہے۔ راحت کی عجیب و غریب طبیعت نے بھی ان کی صحت پر اثرات چھوڑے۔ ان کے ہمدردوں نے جو کبھی ان کے احساسات کی ترجمانی نہ کی اور ہمیشہ ان کے دل کو ٹھیس لگائی میری طرف رجوع ہوئے اور ان حالات کا ذمہ دار مجھ کو قرار دیا لیکن انھوں نے یہ نہیں تبلایا کہ میں اس کا کیا علاج کرسکتی ہوں آخر میں نے سوچ بچار کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ مجھے راحت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ چاہے میرا خلوص کسی بھی معیار کا ہو؟ بہ حیثیت ایک دوست ان کی زندگی کو سدھارنا اور ان کو اسی پیدائشی ماحول کے قابل بنانا میرا حقیقی فرض ہوگا چنانچہ میں نے ان کے دل میں یہ خیال جاگزیں کردیا کہ میں کبھی بھی ساتھ نہیں دے سکتی۔ البتہ روح ہمیشہ ساتھ ہوگی۔ پھر میں نے مجبوراً وعدہ کیا کہ وہ کوئی کام ایسا نہ کریں گے جو ان کے گھر والوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو۔ اپنے والدین کے لئے زندہ رہیں گے۔ ان ہی کی خوشنودی پر اپنی تمناؤں کو ہمیشہ کے لئے قربان کردیں گے۔ جو بھی ان کے قدموں میں پائیں گے اسی کو صبر شکر سے قبول کرنے کے لئے جھک جائیں گے۔ اس طرح میں نے راحت کو ہٹا دیا جو میرا ایک ہی سہارا تھے۔

اب تنہائی میرا سہارا بنگئی تھی۔ میں اسی میں خوش تھی لیکن کچھ دن گذرے تھے کہ بزرگوں نے راحت کی طرف سے درخواست بھیج دی میری آنکھوں کے سامنے سناٹا چھا گیا مزید چرکے کیوں لگائے گئے۔ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر مجھ میں بھی خود داری تھی۔ میں بھی اپنے خاندان کی لاج تھی۔ میں بھی اپنے شفیق باپ کی تمناؤں کا مرکز تھی۔ میں نے ٹھکرادیا۔ اس کو جس کی ہمدردیوں اور خلوص کا کبھی بدل دینا چاہتی تھی۔ کیوں؟ یہ نہ پوچھئے۔ میرا دل ایک ساز خاموش تھا۔ اس سے نکلے ہوئے نغمے میں بیشمار تمنائیں پوشیدہ تھیں ساز ٹوٹ چکا۔ نغمہ بلند نہیں ہونا۔ پھر تمنائیں کدھر سے لاؤں۔ انسانوں کے ہاتھوں مجھے اتنے چرکے لگے کہ ابھی تک داغ باقی ہیں۔ جب بار بار آبیاری کی جاتی ہے تو پھر ازسرنو زخم تازہ ہوکر ٹیس ہونے لگتی ہے۔ میں سہارا قبول کرنے پر بھی مطمئن نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر ایک ایسی ہستی جس نے حسین خواب دیکھے ہوں اور میں الٹی تعبیر لے کر پہنچوں تو کتنا دکھ ہوگا۔ میں اپنے محسن کے ساتھ دوست بن کر دشمنی نہیں کرسکتی قریب رہ کر روحانی اذیت دینے سے بہتر دور رہ کر کبھی کبھی عہد ماضی کی یاد دلا دینا کافی ہے اپنی منزل چل کر منزل پہنچنا ہی زندگی کا سب سے بڑا کمال ہے۔

میں نے اپنا فرض تکمیل کو پہنچادیا مگر خود میری زندگی ابھی تک الجھنوں کی پگڈنڈی سے گذر رہی ہے۔ ماضی کے نقوش مٹادینا چاہتی ہوں تاکہ ازسرنو زندگی شروع ہو۔ مگر قوت عمل آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ فیصلہ کرتی ہوں کہ خودکشی کرلوں لیکن جب اپنے ضعیف باپ پر نگاہ ڈالتی ہوں وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ میری موجودہ حالت خود انھیں پریشان کررہی ہے۔ ایک طرف سوتیلی ماں کا تقاضہ ہے کہ کب تک بیٹی کو بٹھائے رکھوگے۔ اور دوسری طرف میری محبت عجب کشمکش میں مبتلا ہے وہ چاہتے ہیں کہ میں کسی کو زندگی کا شریک بناکر انھیں فکروں سے نجات دلاؤں۔ میری نگاہیں دور دراز بلندیوں تک پرواز کرتی ہیں۔ ڈھونڈتی ہوئی واپس لوٹتی ہیں۔ اصل میں اپنے کو کسی کے معیار کے برابر نہیں پاتی۔ شاید زندگی ان ہی مایوسیوں کا نام ہے۔ زندگی کا کوئی مطلب سامنے نہیں رہا۔ قبر کی گود میں سکون اور آرام ہے دیکھئے کب اور کیسے نصیب ہو۔

یہ تھی میری بے پَر کی داستان۔

اب آپ ہی بتایئے کہ میں کس نوعیت کی مجرم ہوں اور کیا سزا ملنی چاہئے اور دنیا نے کیسی سزا دی۔

"میری تمنائیں"

سیدہ زہرا رضویہ

آپ کے دل میں بھی کوئی نہ کوئی تمنا ضرور ہوگی؟ —— بغیر تمنا کے کوئی جی ہی نہیں سکتا۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل مگر "تمنا" اس کے دل میں ابدی طور پر نہاں ہوگی۔ اسی طرح ہمارے دل میں بھی ہزاروں تمنائیں کروٹیں بدلا کرتی ہیں جن میں سے "کچھ" آپ سب کو سناتی ہوں۔ دعا کیجئے کہ جلد یہ "میری تمنائیں" پوری ہو جائیں

—— میری یہ دلی تمنا ہے کہ میں قوم کی خدمت کروں اور اسی سلسلہ میں تمام دنیا کی سیر سیاحت کروں۔ ہر ملک کی خواتین میرا استقبال نہایت گرمجوشی سے کریں اور میں خوب دھواں دھار تقریریں کروں جس پر مجھے خطاب دیا جائے اور میری یہ تمنا ہے کہ ایک مرتبہ صرف ایک ہی بار —— ہوائی جہاز پر بیٹھوں اور اس پر بیٹھ کر تمام یورپ اور ہندوستان میں امن اور اطمینان کی سعی کروں۔

اور میری یہ تمنا ہے کہ شیروانی پر بیٹ "پہننے والے حضرات اور سینڈل پر "پاتابے" پہننے والی خواتین کو ایک ایسا لکچر پلاؤں کہ آئندہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آئیں۔ میری یہ دلی تمنا ہے کہ میں کافی اور بہترین بسکٹ اکیلے ہی بیٹھ کر چٹ کر جاؤں مگر افسوس ہے کہ ہمیشہ تقریباً ایک درجن چھوٹے بڑے بچوں کو تقسیم کرنے کے بعد ہمیں کھانے کا موقع ملتا ہے اور میری یہ تمنا ہے کہ اپنے بھیا کے ساتھ برقع اوڑھ کر ایک مرتبہ لندن جاؤں اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ ایسے لوگوں سے خوب بدلہ لوں جو مجھے "قابل" اور "سمجھدار" نہیں مانتے اور میری یہ تمنا ہے کہ جب کبھی بھی میں سینما جانے کی امی جان سے اجازت مانگوں اور وہ بخوشی دیدیں۔ اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ ایسے ایڈیٹر صاحبان کو جو میرے مضامین بغیر شکریہ کے ہی طولانی ہونے کا بہانہ تراش کر واپس کر دیتے ہیں۔ ان کو ایسی معقول سزا دوں کہ آئندہ وہ مجھے "ادیب جلیلہ" یا "فخر خواتین دکن" ہی ماننے لگیں۔ اور میری یہ تمنا ہے کہ میں یہ معلوم کروں کہ امی جان اپنی تمام

اولادوں میں زیادہ کس کو چاہتی ہیں؟ اور میری
یہ دلی تمنا ہے کہ روزآنہ کی ڈاک میں خاص میرے
نام تقریباً ایک درجن خطوط اور کچھ اخبارات
اور ایک آدھ رسالہ ضرور آیا کرے۔ لیکن واضح
رہے کہ خطوط صرف سہیلیوں اور دیگر رشتہ داروں
کے ہی ہوں اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ صبح سے
شام تک (سوائے کھانے کے وقت کے) ریڈیو
سنا کروں۔ بس سنتی ہی رہوں اور خصوصیت کے
ساتھ فلمی ریکارڈس —— اور میری یہ تمنا
ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شخص "داڑھی" یا "مونچھیں"
نہ رکھے اور میری یہ تمنا ہے کہ جب کبھی بھی میں
قہقہہ مار کر ہنسوں اور امی جان نہ ڈانٹیں۔
اور میری یہ تمنا ہے کہ دنیا میں جس کسی کو اولاد
ہو تو صرف "لڑکیاں" ہی پیدا ہوں۔ اس لئے
کہ لڑکیاں مجھے بیحد پسند ہیں اور میری تمنا ہے
کہ آج کل جو غریب طبقے کے بچے سگریٹ نوشی
آوارہ گردی کرتے ہیں۔ سینما کی پوری نقل
اتارا کرتے ہیں اور اس کے گانے گاتے ہیں۔
غرض ایسے بچوں کو اپنے بزرگوں سے اجازت
لے کر اپنے گھر پر رکھوں اور ان کی خدمت
کروں۔ ان کے دماغوں پر جو آج کل کی اندھی
تقلید سے زنگ آگیا ہے اس کو صاف کرنے کی
کوشش کروں۔ انھیں صحیح ڈگر پر چلنے کی تعلیم
دوں اور تقریباً دو چار ہزار بچے میرے زیر تربیت
رہیں اور میری یہ تمنا ہے کہ پردہ دار بہنیں جو
موٹر یا ٹانگہ یا بنڈی میں بیٹھ کر کہیں جاتے
ہوئے تقریباً آدھی سے زیادہ باہر ہو کر جھانکتی
ہوئی جاتی ہیں تو ان کے ساتھ یہ عمل کروں کہ
سواری کے پردے اتروا کر اپنے پاس رکھ لوں
کیونکہ ایسے پردے سے ہی بہتر ہے۔ اور میری
یہ دلی تمنا ہے کہ گھر کے ہر فرد پر میرا رعب ہو
اور بالخصوص بچوں اور ملازموں پر۔ ہر ایک
میرا کہا مانیں جو بات میں کروں اس کی سب
موافقت کریں خواہ میری بات غلط ہی کیوں نہ
ہو تردید نہ کرے، ورنہ پھر مجھے غضب کا غصہ
آجاتا ہے اور اس کے بعد جانتی ہیں آپ کیا ہوتا
ہے؟ ارے صاحب! مارے طیش کے معمول سے
کہیں زیادہ کھانا کھا لیتی ہوں اور اپنے پاس
کی تمام جمع شدہ ٹافی اور بسکٹ بچوں کو تقسیم
کر دیتی ہوں اور نہ معلوم کون سے غیر معروف
رسالے اپنے نام جاری کر والیتی ہوں اور اس
دن خصوصیت کے ساتھ زیادہ مضمون اور ایک آدھ
افسانہ بھی لکھ لیتی ہوں اور سہیلیوں کو طویل خط
لکھنے کا بھی یہی دن موزوں ہوتا ہے لیکن بہت ہی
کم ایسا موقع آتا ہے جو ہمیں غصہ آئے اور بہت سی
تمنائیں ہیں مگر آپ اکتا جائیںگی۔ اسلئے پھر کبھی۔

دل لخت لخت

مرتبہ ج

۱	کیوں نہ ہوں طفل اشک آوارہ	کہ معلم نہیں، ادیب نہیں	ناسخ
۲	رُخ ناصح نے گو اتار چڑھاؤ	اس کی باتوں میں ہم کب آتے ہیں	داغ
۳	صحبت منافقانہ ہے ہر جا نفاق ہے	کچھ اتفاق ہے تو کہیں اتفاق سے	ظفر
۴	کرتا رہا میں دیدۂ گریاں کی احتیاط	پر ہو سکی نہ اشک کے طوفاں کی احتیاط	درد
۵	لیتی ہے بوسے عارض محبوب کے وہ زلف	کافر کو اب ادب ہے کلام مجید کا	امیر
۶	ابھی رقیب کے شکوے ابھی رقیب کے صف	یہ کون سمجھے الٹ پھیر تیری باتوں کا	تسلیم
۷	لگ گیا داغ اک غلامی کا	ورنہ یوسف برا نہیں تجھ سے	ناسخ
۸	طائر بازی ایام ہے باطن سے خلاف	دانہ ہوتا ہے عیاں، دام نہاں ہوتا ہے	آتش
۹	تو نہ ہوتا تو زندگی کیا تھی!	اے غم عشق تیری عمر دراز	نامعلوم
۱۰	ز ہشیاراں عالم ہر کرا دیدم غمی دارد	دلا دیوانہ شو، دیوانگی ہم عالمی دارد	گلبدن بیگم
۱۱	ہم ہی کیا اے آسماں پیر سیدھے ہو گئے	کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہو گئے	ظفر
۱۲	کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسن دو عالم سے	مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی	فیض احمد فیض
۱۳	کیا تھا جس کو خود تو نے مرتب	وہ افسانہ بھی بکھرا جا رہا ہے	جمیل احمد

۱۴ ہیں جہاں کے لئے پیام سکون!
خود مگر بیقرار ہیں ہم لوگ
شمیم

پریسیڈنٹ روزولٹ

شاکرہ

پریسیڈنٹ روزولٹ کی موت وقت کا بڑا المیہ سمجھی جاتی ہے۔ بہنوں کی دلچسپی کے لئے ان کے حالات زندگی پیش کر رہی ہوں۔

پریسیڈنٹ روزولٹ کسی بڑے دولتمند گھرانے کے فرد نہیں تھے بلکہ ایک متوسط درجہ کے کاشتکار خاندان کے فرد تھے۔ ان کے باپ کا نام جیمس روزولٹ اور ماں کا نام ڈیلانو تھا نسباً یہ ولندیزی ہیں۔ ان کے اجداد امریکہ میں متوطن ہو گئے تھے۔

آج سے ۶۳ سال قبل ۱۸۸۲ء کو فرانکلن ڈیلی لنڈ روزولٹ جو آگے چل کر دنیا کے عظیم شخص ہونے والے تھے ہا ہیڈ پارک نیو یارک میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے روز ولٹ کو تعلیم اور سیاست سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے ہاورڈ سے طیلسان اور پھر کولمبیا لا کالج سے قانون کی سند حاصل کی اور صرف ۲۵ سال کی عمر میں نیو یارک بار میں داخل ہو گئے۔ اسی وقت سے ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے روزولٹ جماعت عمومی میں داخل ہو گئے اور نیو یارک سینٹ میں منتخب ہو گئے جس وقت ولسن صدارت امریکہ کے لئے کھڑے ہوئے تو روزولٹ نے ان کی زبردست تائید کی۔ صدر ولسن کے زمانہ میں مختلف اہم خدمات انجام دیں اور وزیر بحریہ کے نائب مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں نائب صدارت کے لئے کھڑے ہوئے مگر شکست کھائی اس واقعہ کے بعد انھوں نے نیو یارک میں وکالت شروع کر دی۔

۱۹۲۱ء میں ان پر فالج کا سخت حملہ ہوا جس سے ان کا بایاں پیر بیکار ہو گیا مگر حقیقی با ہمت لوگوں کے لئے اس طرح کی رکاوٹیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ یہی حال روزولٹ کا ہوا اس بیماری سے ان کی سرگرمیوں میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی بلکہ اور زیادتی ہو گئی وہ بڑے جوش و خروش سے سیاست میں حصہ لیتے رہے اسی زمانہ میں وہ نیو یارک کے گورنر بھی مقرر ہوئے ۱۹۳۳ء میں پہلی مرتبہ وہ ممالک متحدہ امریکہ کے صدر منتخب ہوئے ان کے زمانۂ صدارت کی کامیابی کے ثبوت کے لئے صرف یہ بات کافی ہے کہ وہ

متواتر چار مرتبہ صدر امریکہ مقرر ہوئے اور کوئی ان کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوسکا اس سے ثابت ہے کہ وہ اس خدمت کے لئے بہت موزوں تھے جس وقت پریسیڈنٹ روز ولٹ نے امریکہ کی حکومت سنبھالی۔ اس وقت وہاں کی حالت کچھ قابل اطمینان نہ تھی۔ معاشی۔ تجارتی اور صنعتی انحطاط شروع ہو رہا تھا مگر صدر روزولٹ نے اپنے عزم محکم سے اس انحطاط کو ختم کر دیا اور امریکہ کو اس رتبہ پر پہنچا دیا جس پر کہ آج ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں وہ امریکہ کے بیسویں صدر تھے۔

وہ اس زمانہ کے بڑے سیاست دان اور آزادی اور جمہوریت کے بڑے حامی تھے اسی وجہ سے ان کو اکابر ثلاثہ میں شمار کیا جاتا تھا

جس طرح ان کی سیاسی زندگی کامیاب تھی اسی طرح وہ ایک کامیاب خانگی زندگی بھی رکھتے تھے ان کی بیوی الہانا روز ولٹ حقیقی معنوں میں ان کی رفیق اور سچی مددگار تھیں۔ ان کے چار لڑکے ہیں جو اس وقت جنگ کے مختلف محکموں میں کام کر رہے ہیں موت کسی کو نہیں چھوڑتی اس کے لئے بڑے اور چھوٹے یکساں ہیں۔ چنانچہ پریسیڈنٹ روز ولٹ کو بھی پیغام موت آگیا اور ۱۲/ اپریل کی سہ پہر کو دماغی شریان پھٹ جانے سے یکایک انتقال کر گئے ان کی عمر اس وقت ۶۲ سال کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آخری دم تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

لب متحرک

رحیم النسا رفیق

۱- زندگی ایک قیمتی کھلونہ ہے جسے چاہے سنوار دو یا بگاڑ دو۔

۲- آنسو انمول ہوتے ہیں جب تک کہ وہ لبریز چشم ہوں۔

۳- ایک تمنا کے پورے ہونے تک دوسری شاخ آرزو پیدا نہ ہو۔

۴- زندگی میں چند ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جنھیں کھونا اپنی خودی کو کھو دینا ہے۔

۵- ناکامی پر دل شکستہ نہ ہونا ہی کامیابی کی پہلی علامت ہے۔

۶- تکلیف میں بھی مسکرانا شان وضعداری کو اجاگر کرتا ہے۔

۷- محبت مستحکم ہوتی ہے اس مفارقت سے جسے تم سہنا نہیں چاہتے۔

۸- اپنے آرام کی امید دوسرے کے گھر نادانی ہے۔

۹- کسی کا کیا یاد رہے۔ اور اپنا کیا بھول جاؤ۔

۱۰- قرض کی ابتدا ہی آبرو کے تنزل کی انتہا ہے۔

"آ میرے پاس ادہر! دیکھ زمانہ ہے کدہر!"

حجاب بنارسی

قصہ شیریں و فرہاد — وہیں رہنے دے
داستاں گلچیں و صیاد — وہیں رہنے دے
آ میرے پاس ادہر! دیکھ زمانہ ہے کدہر

آہ مزدور کی سن — بلبل ناکام کو چھوڑ
سبز پریاں ہیں کہاں — قصہ گلفام کو چھوڑ
پردہ آنکھوں سے ہٹا — زلف سیہ فام کو چھوڑ
آ میرے پاس ادہر! دیکھ زمانہ ہے کدہر

بھول جا عشق و محبت کے ترانے — اب تو
بھول جا شعلہ و شبنم کے فسانے — اب تو
نہ بجھے گی ترے آنسو سے زمانے کی آگ
اپنی ہمت سے بجھا بھوک کے ماروں کی آگ

دیکھ نادار کے چہرے پہ نقاہت کی جھلک
دیکھ افلاس کے ماروں کی مصیبت کی جھلک
دیکھ محتاج کی مایوس محبت کی جھلک
فاقہ مستوں کو غریبوں کی تسلی دے کر!
آ بھی جا! ہاتھ میں شمشیر فتح کی لے کر!
آ میرے پاس ادہر! دیکھ زمانہ ہے کدھر

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر (۱۲۲)

3238
REGD. M. N. O

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب دبیرپورہ حیدرآباد سے شائع ہوا

جولائی ۷۵ء

جلد ۱۳ نمبر ۱۰



شہاب

جلد ۱۳ شہریور ۱۳۵۴ف م جولائی ۱۹۴۵ء نمبر ۱۹

مرتبہ

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے سالانہ چندہ
(صہ)

ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم اور ان کا سماجی مرتبہ

جناب جمیل احمد صاحب برنی - بی - اے - ریسرچ اسکالر - پی - ایچ ڈی -
(ٹی - سی - ڈی) آئرلینڈ

میں ایک نازک مسئلہ کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ ہر تعلیمی مسئلہ کو آسانی سے حل کریں گے۔ لیکن اگر کوئی مسئلہ آپ کی انتہائی سوچ و فکر کا محتاج بنا ہوا ہے تو وہ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے بعض اوقات اس مسئلہ میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ دم مارنے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اب ان مسایل کو کسی مدت کے لئے بھی ٹالنے کا ہم اپنے دل میں خیال نہیں لا سکتے۔ اس خصوص میں اقتضائے وقت سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور کافی سے زیادہ نقصان ہمارے حصہ میں آ چکا ہے۔ عورتوں کی پستی ہماری قومی و ملکی تمناؤں کو ہرگز ہرگز پورا نہیں ہونے دیسکتی ہم عورتوں کے دماغوں کو علم کے نور سے محروم رکھکر ہرگز ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتے۔

انسانی ضروریات اور خیالات میں ہمیشہ انقلاب آتا رہا اور اسی انقلاب کی بدولت زندگی کا نقشہ بھی ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا ابتدائی دور میں جب آریا ہندوستان میں آبسے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے خاص رجحانات - خاص تہذیب - اور خاص شائستگی کے مالک تھے ویدوں کے مطالعہ سے آزادی خیال اور آزادی عمل کا پتہ چلتا ہے - آریائی گھرانے میں باپ کو خاص وقار حاصل ہوتا تھا ماں بچوں کی نگہداشت کی ذمہ دار سمجھی جاتی تھی - بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کو اس زمانہ میں وہ مرتبہ حاصل تھا کہ اس کے بعد پھر کبھی حاصل ہو سکا - ان کا وہ مرتبہ آزادی خیال اور آزادی عمل پر مبنی تھا - ان کو اپنی شادی بیاہ کے معاملات میں پورے پورے اختیارات حاصل تھے - کمسنی کی شادی کا ان میں رواج نہ تھا اور نہ کسی بیوہ کو ستی کی ترغیب دیجاتی تھی گھر کے کاروبار میں لڑکیوں کو تربیت دیجاتی عبادت اور مذہبی رسومات میں ان کو شریک رکھا جاتا - مذہبی مباحث میں حصہ لینے کا موقع دیا جاتا - اور عبادت کی غرض سے مناجاتیں ترتیب دینے کا بھی انھیں حق حاصل تھا -

مہابھارتی دور کے نصف اول میں عورتوں
کے وقار میں اور بھی اضافہ ہوا، لوگ اب ان
پر دیوی کے قابل احترام جذبات کے ساتھ
نظر ڈالنے لگے۔ بحیثیت بیٹی وہ اپنے والدین
اور بزرگوں کے حسن سلوک اور داد و دہش کی
مستحق قرار پائیں۔ گھر میں اپنی ماں کے ساتھ
شریک کار رہتیں۔ اپنے بھائی اور بہنوں کے
ساتھ نہ صرف خلوص سے پیش آتیں بلکہ انھیں
کھلانے پلانے اور نہلانے دھلانے کی بھی
خدمات انجام دیتیں۔ بحیثیت بیوی وہ گھر
میں خاص وقعت کا مستحق سمجھی جاتیں اور
شوہر کے دل میں خاص اثر رکھتیں بحیثیت
ماں اپنے بچوں کے دل میں جو انھیں جگہ حاصل
ہوتی اس کا اندازہ خود لفظ ' ماتا ' کے تصور
سے ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں عورتوں کو نہ
صرف گھر بار کے معاملات میں گفتگو کرنے کا
انھیں موقع دیا جاتا تھا۔ چنانچہ یجنا والکیا
اور اس کی بیوی کی گفتگو اب تک محفوظ ہے
اور کافی استعجاب کے ساتھ پڑھی جاتی ہے
والمیکی راماینا میں نصف حقیقی اور نصف
دیوتاؤں کے جیسے واقعات سے بحث کرتے
ہوئے صنف نازک کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ
وہ نظام زندگی میں گویا خاص خصوصیت کی
مالک ہے۔ بعض اصحاب کے نزدیک اس کی تجویز
تو اس نوبت تک بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے
کہ جنس لطیف کو اگر اس کے حقیقی مقام سے
محروم کر دیا جائے تو زندگی میں حرکت ہی باقی
نہیں رہتی۔ ہم جانتے ہیں کہ راما کے ساتھ
ان کی بیوی سیتا نے دنیا میں خلوص و محبت
اور وفاداری کی ناقابل فراموش مثال قایم
کر دی ہے اور سینکڑوں صدیاں گزر جانے کے
باوجود راماینا کو پڑھتے ہوئے ہم رام لچھمن اور
سیتا کے جذبات کو اپنے دل میں محسوس کرنے
لگتے ہیں ان کی زندگی کے مطالعہ سے جو حقیقت
واضح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ زندگی کی مسرت
کا سارا انحصار حقیقی جذبات پر ہے۔ شکنتلا کا اگر
آپ مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ کالیداس
زندگی کا ایک لطیف تصور پیش کرنے کی
کوشش کرتا ہے۔ بقول شخصے وہ سبزہ زاروں
میں پل کر بڑی ہونے والی لڑکی صاف و شفاف
سطح آب پر ایک خوبصورت کنول کی مانند
نظر آتی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے
جذبات اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انسانوں کے
بنائے ہوئے رسوم و رواج تھیں۔

یہاں یہ ممکن نہیں کہ مزید تفصیلات
میں جا کر اس زمانہ کی زندگی کے حسن قبح کی

جانب آپ کی توجہ پوری طرح مبذول کرا سکوں
میں اپنی حد تک جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہی ہے
کہ حیثیت مجموعی مہا بھارتی دور کے نصف اول
تک عورتوں کی زندگی اچھی رہی۔ اور تقریباً قریب
قانون فطرت کے مطابق۔ لیکن نصف آخر
برہمنوں کے عروج کے ساتھ ان کے سماجی
وقار میں فرق آنے لگا۔ ان فطرت شناسوں
نے اعلان کیا کہ عورتیں بہرحال عورتیں ہیں اور
نئے تشکیل پانے والے معاشرہ کا مفاد اسی
میں ہے کہ ان کے اثرات کو گھر کی حد تک
ہی محدود رکھا جائے۔ آج کل مسز سروجنی نائیڈو
بھی یہی فرما رہی ہیں کہ معاشرہ میں گھر کو ایک
مرکزی حیثیت حاصل ہے اور عورتوں کے لئے
یہی وہ مقام ہو سکتا ہے جہاں وہ کچھ کر کے
دکھا سکتی ہیں۔ ان کی "گھر سنبھالو" کی تحریک
آج کل زوروں پر ہے لیکن میں جو قباحت
دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عورتوں کی انفرادیت
اس میں بری طرح ختم ہو جاتی ہے اس تحریک
میں مقصد جو پیش نظر ہے ہرگز برا نہیں لیکن
حقوق کے بارے میں قانونی گیارنٹی نہ
ہونے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ نقصان دہ ہے
اور مرد بھی اس سے حد درجہ ناجائز فائدہ
اٹھانے کا موقع پاتے ہیں۔ مسز نائیڈو کی

طرح آج سے سینکڑوں برس پہلے منو نے بھی شاید
تقسیم عمل اور تخصیص کار کے خوبصورت اصول کے
پیش نظر اپنی آواز بلند کی تھی اور کہا تھا کہ
مرد باہر کے مشاغل میں حصہ لیں تو عورتیں
گھر سنبھالیں۔ اس نے ہدایت کی کہ عورتوں کو
بیرونی اثرات سے بالکل محفوظ رکھا جائے۔
انھیں اپنے گھر میں بھی ناجائز طریقہ پر خود اختیاری
سے عمل کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ منو کی تلقین
سے یہ بھی واضح ہے کہ شوہر کی خدمت کو بمنزلہ
عبادت تصور کیا جائے۔ نسل و خون کی حفاظت
اور گھر کی اہمیت کے پیش نظر اس نے یہ بھی لازمی
قرار دیا کہ لڑکیوں کی کمسنی میں شادی کر دی جائے
گوتما بدھ کی تعلیمات سے بھی آپ واقف ہیں
بغور مطالعہ سے واضح ہوگا کہ انھوں نے اپنے
پیش کردہ نظام میں ایک حد تک عورتوں کی
انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بہت سے
حقوق عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا
کہ سب سے پہلے عورتوں نے ان کی تعلیمات کو
تسلیم کیا۔ میں اس وقت تفصیلات میں جانے
سے معذور ہوں۔ لیکن یہ بھی تاریخی واقعات
ہیں کہ بعض مقامات پر جب وہ تلقین کے لئے
گئے تو وہاں کے مردوں نے داخلہ کے دروازے
بند کر دئے۔ عورتوں نے جھگڑا کیا اور بہ جبر

مہابھارتی دور کے نصف اول میں عورتوں کے وقار میں اور بھی اضافہ ہوا، لوگ اب ان پر دیوی کے قابل احترام جذبات کے ساتھ نظر ڈالنے لگے۔ بحیثیت بیٹی وہ اپنے والدین اور بزرگوں کے حسن سلوک اور داد و دہش کی مستحق قرار پاتیں۔ گھر میں اپنی ماں کے ساتھ شریک کار رہتیں۔ اپنے بھائی اور بہنوں کے ساتھ نہ صرف خلوص سے پیش آتیں بلکہ انھیں کھلانے پلانے اور نہلانے دھلانے کی بھی خدمات انجام دیتیں۔ بحیثیت بیوی وہ گھر میں خاص وقعت کا مستحق سمجھی جاتیں اور شوہر کے دل میں خاص اثر رکھتیں بحیثیت ماں اپنے بچوں کے دل میں جو انھیں جگہ حاصل ہوتی اس کا اندازہ خود لفظ 'ماتا' کے تصور سے ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں عورتوں کو نہ صرف گھر بار کے معاملات میں گفتگو کرنے کا انھیں موقع دیا جاتا تھا۔ چنانچہ یجناوالکیا اور اس کی بیوی کی گفتگو اب تک محفوظ ہے اور کافی استعجاب کے ساتھ پڑھی جاتی ہے والمیکی رامائینا میں نصف حقیقی اور نصف دیوتاؤں کے جیسے واقعات سے بحث کرتے ہوئے صنف نازک کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ نظام زندگی میں گویا خاص خصوصیت کی مالک ہے۔ بعض اصحاب کے نزدیک اس کی تجویز تو اس نوبت تک بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ جنس لطیف کو اگر اس کے حقیقی مقام سے محروم کر دیا جائے تو زندگی میں حرکت ہی باقی نہیں رہتی۔ ہم جانتے ہیں کہ راما کے ساتھ ان کی بیوی سیتا نے دنیا میں خلوص و محبت اور وفاداری کی ناقابل فراموش مثال قایم کر دی ہے اور سینکڑوں صدیاں گزر جانے کے باوجود رامائینا کو پڑھتے ہوئے ہم رام لچھمن اور سیتا کے جذبات کو اپنے دل میں محسوس کرنے لگتے ہیں ان کی زندگی کے مطالعہ سے جو حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ زندگی کی مسرت کا سارا انحصار حقیقی جذبات پر ہے۔ شکنتلا کا اگر آپ مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ کالیداس زندگی کا ایک لطیف تصور پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول شخصے وہ سبزہ زاروں میں پل کر بڑی ہونے والی لڑکی صاف وشفاف سطح آب پر ایک خوبصورت کنول کی مانند نظر آتی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے جذبات اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے رسوم و رواج تھیں۔

یہاں یہ ممکن نہیں کہ مزید تفصیلات میں جا کر اس زمانہ کی زندگی کے حسن و قبح کی

جانب آپ کی توجہ پوری طرح مبذول کرا سکوں
میں اپنی حد تک جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہی ہے
کہ بہ حیثیت مجموعی مہا بھارتی دور کے نصف اول
تک عورتوں کی زندگی اچھی رہی۔ اور قریب قریب
قانون فطرت کے مطابق ۔ لیکن نصف آخر سے
برہمنوں کے عروج کے ساتھ ان کے سماجی
وقار میں فرق آنے لگا ۔ ان فطرت شناسوں
نے اعلان کیا کہ عورتیں بہر حال عورتیں ہیں اور
نئے تشکیل پانے والے معاشرہ کا مفاد اسی
میں ہے کہ ان کے اثرات کو گھر کی حد تک
ہی محدود رکھا جائے ۔ آج کل مسز سروجنی نائیڈو
بھی یہی فرما رہی ہیں کہ معاشرہ میں گھر کو ایک
مرکزی حیثیت حاصل ہے اور عورتوں کے لئے
یہی وہ مقام ہو سکتا ہے جہاں وہ کچھ کر کے
دکھا سکتی ہیں ۔ ان کی "گھر سینا لو" کی تحریک
آج کل زوروں پر ہے لیکن میں جو قباحت
دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عورتوں کی انفرادیت
اس میں بری طرح ختم ہو جاتی ہے اس تحریک
میں مقصد جو پیش نظر ہے ہرگز برا نہیں لیکن
حقوق کے بارے میں قانونی گیارنٹی نہ
ہونے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ نقصان دہ ہے
اور مرد بھی اس سے حد درجہ ناجائز فائدہ
اٹھانے کا موقع پاتے ہیں۔ مسز نائیڈو کی
طرح آج سے سینکڑوں برس پہلے منو نے بھی شاید
تقسیم عمل اور تخصیص کار کے خوبصورت اصول کے
پیش نظر اپنی آواز بلند کی تھی اور کہا تھا کہ
مرد باہر کے مشاغل میں حصہ لیں تو عورتیں
گھر سنبھالیں۔ اس نے ہدایت کی کہ عورتوں کو
بیرونی اثرات سے بالکل محفوظ رکھا جائے۔
انھیں اپنے گھر میں بھی ناجائز طریقہ پر خود اختیاری
سے عمل کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ منو کی تلقین
سے یہ بھی واضح ہے کہ شوہر کی خدمت کو بمنزلہ
عبادت تصور کیا جائے۔ نسل وخون کی حفاظت
اور گھر کی اہمیت کے پیش نظر اس نے یہ بھی لازمی
قرار دیا کہ لڑکیوں کی کمسنی میں شادی کر دی جائے
گوتما بدھ کی تعلیمات سے بھی آپ واقف ہیں
بغور مطالعہ سے واضح ہو گا کہ انھوں نے اپنے
پیش کردہ نظام میں ایک حد تک عورتوں کی
انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بہت سے
حقوق عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا
کہ سب سے پہلے عورتوں نے ان کی تعلیمات کو
تسلیم کیا ۔ میں اس وقت تفصیلات میں جانے
سے معذور ہوں۔ لیکن یہ بھی تاریخی واقعات
ہیں کہ بعض مقامات پر جب وہ تلقین کے لئے
گئے تو وہاں کے مردوں نے داخلہ کے دروازے
بند کر دئے۔ عورتوں نے جھگڑا کیا اور بہ جبر

دروازے کھول کر ان کو خوش آمدید کہا۔

ذرا غور فرمائیے کہ بالعموم ہندوستان میں عورتوں کی زندگی کس قسم کے اصولوں پر مبنی ہے۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ اکثر رواجات و رسومات وہی ہیں کہ جن کی ابتدا عورتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے والوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ ان کو نقصان پہنچانے والوں کی وجہ سے ہوئی۔ جب کہ عورتوں کو بیرون سے بالکل بے تعلق رکھنا مقصود ہو تو ان کی تعلیم کا بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اور یہی ہم دیکھ رہے ہیں کہ عورتوں کی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیجاتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قومی و ملکی مفاد تو درکنار خاندانی مفاد کو بھی عورتوں کی تعلیم پر مبنی نہیں سمجھا جاتا۔ بالعموم تعلیم کو کسب معاش کے لئے سمجھا جاتا ہے ذات کے لئے نہیں۔ اور چونکہ عورتوں کو روزگار سے نہیں لگانا ہے۔ اس لئے تعلیم کی جانب بھی توجہ نہیں دیجاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر کو شایان شان طریقہ پر معاشرہ کا مرکز قرار دیا جاتا ہے تو لازمی طور پر عورتوں کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے مساوی حقوق و فرائض کی بھی تقسیم کرنی پڑتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ ان سے استفادہ کرنے کے لئے عورتوں کو تعلیم دینا ضروری ہے مزید تفصیلات اس وقت ممکن نہیں۔ اسی قدر عرض کر سکتا ہوں کہ تعلیم یافتہ سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ لازمی طور پر جامعہ کی ڈگریاں رکھنے والی ہوں لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ صحیح عبارت تو درکنار ہجے بھی درست نہ لکھ سکیں اور کہلائیں تعلیم یافتہ۔ گھریلو تعلیم کو میں ہرگز ہرگز برا نہیں سمجھتا۔ لیکن ایسے معیار پر ضرور ہونا چاہئے کہ ان کی شخصیت کا بیش قیمت جوہر بن جائے۔

اب میں آپ کے سامنے عورتوں کی سماجی حیثیت کے بارے میں ایک دوسرا نقطۂ خیال پیش کرتا ہوں جس وقت آپ کو فرصت ہو اس نقطۂ خیال پر غور فرمائیے اور جس وقت آپ کی طبیعت آمادہ ہو اپنے دوست احباب سے اس نقطۂ خیال پر گفتگو کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ اس کے پیش نظر عورتیں کس حد تک اور کس قسم کی تعلیم کی مستحق ہو سکتی ہیں۔ یہ نقطۂ خیال اسلامی ہے۔ خود انگلستان اور دیگر مغربی ممالک کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ انھیں مساوات کا درجہ دیا ہے لیکن واقعات بتا سکتے ہیں کہ اسلامی قانون میں عورتوں کے حقوق جس وسعت اور جس خوبی سے محفوظ کئے گئے ہیں ان ممالک کے قوانین میں نہیں کئے گئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قانون اسلام اس وقت وجود میں آ[illegible] جب کہ دنیا میں عورتوں کا کوئی وقار حاصل ن[illegible]

جب کہ بازاروں میں اپنے ظاہری حسن کی قیمت پر انھیں فروخت کیا جاتا تھا اور ان کی پیدائش کو باعث شرم و ذلت سمجھا جاتا تھا۔ بانیٔ اسلام نے پوری دنیا کے مقابلہ میں سب سے پہلی مرتبہ ارشاد فرمایا" اے لوگو تمھیں خدائے قادر کا حکم ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ وہ تمھاری مائیں، بیٹیاں۔ اور بہنیں ہیں" دوسری جگہ فرمایا کہ" اگر کسی کے گھر میں بیٹی پیدا ہو اور وہ اس کی اچھی تعلیم و تربیت کرے تو خدا اس کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے" اسلام نے عورتوں کی انفرادیت کو کھلے اور صاف الفاظ میں اسی طرح تسلیم کیا ہے جس طرح مردوں کی انفرادیت کو۔ وقت واحد میں بموقع نکاح جس طرح مرد کے ہاں یا نہیں کہنے کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی حاصل ہے اسلام تسلیم کرتا ہے کہ حقوق و فرائض اپنے لئے علیحدہ علیحدہ راہیں نہیں قائم کر سکتے۔ انھیں ایک ساتھ توازن رکھتے ہوئے دست بدست چلنے کی ضرورت ہے اسی لئے وہ جہاں بالتفصیل عورتوں کے حقوق کی بذریعہ قانون حفاظت کرتا ہے وہیں ان پر فرائض بھی عائد کرتا ہے اول بحیثیت بیٹی۔ دوم بحیثیت بیوی۔ سوم بحیثیت ماں اور چہارم بحیثیت رکن سوسائٹی۔ اسلام عورتوں کی علیحدہ علیحدہ انفرادیت قرار دیتا ہے۔ اسلام میں بیٹی کی زندگی کسی کے خلوص و محبت پر مبنی نہیں کی جاتی اس کے وراثتی حقوق کی حفاظت بذریعہ قانون کی جاتی ہے۔ سن بلوغ کو پہنچنے تک وہ اپنے والدین یا ولی کے زیر پرورش سمجھی جاتی ہے اور ان لوگوں کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ اگر ضرورت ہو تو اس کی شادی بھی کر سکتے ہیں ایسی صورت میں کہ یہ شادی لڑکی کے حق میں مضر ثابت ہونے والی ہو مجسٹریٹ کو اختیار حاصل ہے کہ اسے پایۂ تکمیل کو پہنچنے سے روک دے مجسٹریٹ کی اطلاع سے قبل اگر تکمیل پا جائے تو لڑکی کے بالغ ہو کر توثیق کرنے تک وہ بے اثر رہتی ہے۔ بحیثیت بیوی کسی عورت کے انفرادی حقوق کسی طرح متاثر نہیں ہوتے۔ اس کو اپنے مال۔ اپنی جائداد اور اپنے میں پورے پورے اختیارات حاصل رہتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے کاروباری معاہدات کر سکتی ہے اور اضافہ آمدنی کی غرض سے چاہے جتنے جائز ذرائع اختیار کر سکتی ہے۔ شوہر بیوی کا ولی نہیں ہوتا محافظ ضرور ہے بحیثیت ماں عورت اپنے بچوں کی ولی سمجھی جاتی ہے۔ بیٹے کی جائداد پر بھی حقوق رکھتی ہے۔ بحیثیت رکن سوسائٹی عورت کی انفرادیت مرد کی انفرادیت سے مختلف نہیں عورت کو شہریت کے تقریباً وہی حقوق حاصل ہیں

جو مرد کو ہیں۔ وہ بوقت ضرورت ہر قسم کی خدمات
انجام دینے کی اہل سمجھی جاتی ہے۔ وہ ملکہ بن
سکتی ہے۔ کسی جامعہ کی ڈکٹر ہو سکتی ہے حنفی
قانون کے مطابق جج کی بھی خدمات انجام دے سکتی
ہے۔ فوجوں کی رہبری کر سکتی ہے اور میدان
جنگ میں مریضوں کی دیکھ بھال کا کام بھی کرسکتی ہے۔
بانی اسلام کا ارشاد ہے کہ علم حاصل کرنا
تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کا فرض ہے اسلامی
تصورات کے مطابق علم نور ہے۔ جہالت تاریکی
ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسلام نے ہی
کلام پاک کی تلاوت کی اہمیت جتا کر دنیا میں
سب سے پہلے لازمی تعلیم کا رواج ڈالا۔ ہندوستان
سے اسپین تک کی تاریخ اسلام میں مسلمان عورتوں
کے علوم وفنون سے تعلق رکھنے والے کارنامے
محفوظ ہیں۔ تفصیلات میں جانے کا اس وقت
موقع نہیں لیکن اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ
تاریخ ہند اس وقت نہایت مسخ حالت میں ہمارے
زیر مطالعہ رہتی ہے۔ جب صحت کے ساتھ ہمارے
سامنے آئیگی تو معلوم ہوگا کہ اس ملک کی خواتین
نہ صرف علوم وفنون میں مہارت رکھتی تھیں
بلکہ تہذیب و اخلاق کی بھی علمبردار تھیں اور
انھوں نے سلطنت چلانے اور میدان جنگ میں
فوجوں کو آگے بڑھانے کے مشکل ترین کام بھی
انجام دیے۔ بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ مغربی اقوام
کے ہندوستان میں قدم رنجہ ہونے تک یہاں
لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوئی مدرسہ ہی قایم نہ تھا
تحقیق سے ثابت ہے کہ خود اکبر نے سیکری کے
قلعہ میں لڑکیوں کا مدرسہ قایم کر رکھا تھا بعض
قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ کہیں کہیں مکتبوں میں
بچوں و بچیوں کی مخلوط تعلیم بھی ہوا کرتی تھی۔
بالفرض محال ایسے مصنفین کے قول کے مطابق اگر
روئے ہندوستان پر لڑکیوں کا کوئی مدرسہ
ہی قایم نہ تھا تو اس سے ہرگز ہرگز ثابت نہیں
ہوتا کہ ان کو جاہل اٹھایا جاتا تھا۔ مسلمان گھرانوں
میں لڑکیوں کو عربی فارسی اور ریاضی میں ہمیشہ
تعلیم ہوتی تھی اور کھانے پکانے اور سینے پرونے
میں ان کو پوری پوری تربیت دیجاتی تھی اور
طریقہ تعلیم بالعموم یہ رہا ہے کہ کہیں تو ہمہ وقتی
معلمات رکھی جاتی تھیں۔ کہیں وہ وقت معینہ
پر آکر تعلیم دیجاتی تھیں اور کہیں وقت معینہ
محلہ کی بچیاں جمع ہو کر اپنی معلمہ کے گھر پڑھ آتی تھیں
لیکن جب مسلمانوں پر زوال آیا تو وہ
کہیں کے نہ رہے۔ نہ ان میں تنظیم رہی نہ جذبۂ
عمل۔ انفرادیت اور اس کی تربیت کے لئے
مناسب ماحول کے سوالات ان کے درمیان سے
ایسے اٹھ گئے کہ گویا ان کا کبھی کوئی وجود ہی

نہ تھا۔ توہمات نے دلوں میں ایسی جڑ پکڑی کہ ہر بات اور ہر عمل پر شبہات کے ساتھ نظریں ڈالنے لگے۔ قسمت پر سہارے کے اس طرح عادی بنے کہ ان کی بجلی کے جیسی تڑپ رکھنے والی خودی ان کے دلوں میں بےحس وحرکت ہو کر رہ گئی۔ بقول اقبال مرحوم انسان کا وجود اس کی خودی پر ہے۔ جس قوم کو اپنے وجود کی فکر ہے اسے اپنے ماضی کی روشنی میں خودی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ اسلامی تصور کے مطابق خودی مٹنے والی چیز نہیں اور نہ کسی بحر میں ایک حقیر قطرہ کی مانند ضم ہونے والی ہے۔ لیکن جو کوئی اس سے غافل ہوگا ساری دنیا اس سے غافل ہو جائے گی اور جو اسے پہچانے گا ساری دنیا اس کے قدموں پر آگرے گی۔ جس طرح انفرادیت کی تعمیر کی ذمہ داری ہمارے سر تھوپی گئی ہے اسی طرح مناسب ماحول پیدا کرنا بھی ہمارا کام ہے لیکن ہم میں اس وقت بدقسمتی سے خود اعتمادی موجود نہیں۔ ماحول کے برے رجحانات سے مقابلہ کر کے اسے بہتر بنانے کی جرات بھی ہم اپنے اندر نہیں پاتے۔ حالات سے خایف رہنا تعلیم اسلام کے بالکل منافی ہے اخلاق کی کمزوری کے وجہ سے عورتوں کی تعلیم میں لوگ کافی تردد کا اظہار کر رہے ہیں ایسے حالات میں تعلیم کا نقصان کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی کمزوریوں کے مقابلہ میں ضرور تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام ایسے انسانوں کو پیدا کرنے کا قائل نہیں جو مشکلات سے نپٹنے کے لئے ضروریات کو نظر انداز کرتے اور گوشہ نشین ہو جانے کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ ایسے انسانوں کو پیدا کرنے کا قایل ہے جو حتی المقدور اپنی طاقت سے کام لے کر حالات کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شخصی کردار اتنا مضبوط کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ برائی کے ساتھ مصالحت کرنے اور ظاہری دنیاوی جھوٹی طاقت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دے۔ (SiLF RECPECT) یا اپنی عزت کا احساس ایسے کردار کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔

تعلیم نسواں میں موجودہ دور سولہویں صدی عیسوی میں اہل یورپ کے ہندوستان آنے کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ۱۸۵۵ء تک اپنے اثرات پھیلانے کی کوشش کرتی رہی۔ ۱۶۹۲ء کے بعد کسی وقت مسٹر لیوس نامی ایک معلم نے مسٹر پٹ کے پاس جو اس وقت مدراس میں گورنر تھے تجویز پیش کی کہ بچوں اور بچیوں کے لئے پروٹسٹنٹ اصولوں کی بناء پر

دو علٰحدہ علٰحدہ مدارس قایم کردیں ۱۷۱۵ء میں سینٹ میری چیریٹی اسکول کے نام سے مسٹر لیوس کے جانشین مسٹر اسٹیونس نے جو مدرسہ قایم کیا وہ ۳۰ طلبا پر مشتمل تھا جن میں ۱۲ لڑکیاں تھیں۔ اور یہی گویا پہلا وقت ہے جب کہ ہم اس دور میں لڑکیوں کی قابل لحاظ تعداد میں مدرسہ میں تعلیم ہوتے دیکھتے ہیں ۱۷۸۵ء میں مسٹر کرنانڈس نامی پادری کو کلکتہ بلایا گیا تھا کہ ایک مدرسہ قایم کریں ۱۷۸۸ء کے بعد جب اس مدرسہ کے فنڈ میں اضافہ ہوا تو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کردیا گیا۔ ۱۷۸۰ء میں مسنر ہجبس نامی ایک خاتون نے کلکتہ میں ایک مدرسہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے قایم کیا۔ ان کے علاوہ تحقیق سے دوسرے مدارس کے نام بھی دستیاب ہوتے ہیں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو ضروری مضامین کی تعلیم دیجاتی اور ہاتھ کا کام بھی سکھایا جاتا ۱۸۳۵ء میں لارڈ مکالے کی تعلیم کے بارے میں یادداشت شائع ہوئی انھوں نے علوم شرقیہ کو نہایت بے قدری کے ساتھ اپنی اسکیم سے خارج کردیا اور تجویز کی کہ ہندوستانیوں کو مغربی اصولوں پر انگریزی زبان میں تعلیم دی جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام سرکاری مدارس سے بدگمان ہوگئے اور اپنی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیا بھیجتے۔ انھوں نے لڑکوں کو بھی روانہ کرنے سے انکار کردیا۔ راجہ رام موہن رائے نے حالات سنبھالنے کی کوشش کی اور کہا کہ اہل ہندوستان فطرتاً فلسفی واقع ہوئے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ مغربی علوم حاصل کریں اور مغربی اصولوں کے مطابق ان کی تربیت ہو ۱۸۵۵ء میں حکومت نے تعلیم کے بارے میں جو احکام نافذ کئے ان میں سب سے پہلی مرتبہ تعلیم نسواں پر زور دیتے ہوئے ملکی زبانوں کی جانب توجہ کرنے کی ہدایت کیگئی۔ لندن اور بپٹسٹ مشنری سوسائٹی نے بھی اپنے اپنے زنانہ مدارس قایم کردئے۔ لیکن انہیں زیادہ کامیابی نہ ہوسکی مسنر ولسن نے ۱۸۲۹ء کے بعد کسی وقت بمبئی میں چھ زنانہ مدارس کھولے جن میں کم وبیش ۱۲ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ کلکتہ میں ملکی بچوں کی تعلیم کی ایک سوسائٹی نے ۱۸۱۹ء میں اپنی کوششیں شروع کیں اور اتنی کامیابی حاصل کی کہ ۱۸۲۴ء میں اس کے قایم کردہ چھ مدارس میں لڑکیوں کی تعداد ۱۶۰ ہوگئی۔ مس کک نے کلکتہ میں ۱۸۲۲ء میں ۶۰ لڑکیاں لے کر اپنا مدرسہ قایم کیا۔ ۱۸۲۴ء میں ان کے مدارس کی تعداد ۲۴ ہوگئی جن میں ۳۰۰ تا ۴۰۰ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں ۱۸۲۶ء میں ان مدارس کی تعداد ۳۰ ہوگئی

اور ۶۰۰ لڑکیاں زیر تعلیم آگئیں اسی طرح بکثرت مشنری مدارس سرکاری اور خانگی ہندو مسلم اسکول اور جامعات کا قیام وقتاً فوقتاً عمل میں آتا رہا لیکن ان کی تفصیلات فی الوقت غیر ضروری ہیں۔

میں نے ابھی ابھی عرض کیا کہ مسلمانوں نے سرکاری مدارس کی جانب سے بے رخی کا طرز اختیار کرلیا تھا۔ سرسید نے دیکھا کہ اس میں خود مسلمانوں کا نقصان ہے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی و مغربی علوم کے امتزاج سے جامعہ علی گڈھ قایم ہوگئی اور اس میں تعلیم حاصل کرنے کی بدولت مسلمانوں کی انفرادیت پھر ایکبار تشکیل پانے لگی۔ یہ شہرہ آفاق جامعہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے مختص نہیں۔ لڑکیوں کو بھی پردے میں رہتے ہوئے یہاں وہی سہولتیں حاصل ہیں جو لڑکوں کو ہیں۔

موجودہ دور میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں یہ اعتبار خیالات لوگوں کے تین طبقے ہوگئے ہیں۔ پہلا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اس خیال کی مخالفت کررہے ہیں کہ لڑکیوں کو مدرسوں وکالجوں میں مغربی طریقہ پر تعلیم دی جائے اور مشرقی روایات بالائے طاق کردی جائیں دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو عورتوں کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں دوسرے الفاظ میں یہ وہ ہیں جو مغربی رنگ میں رنگ جانے کی طرف مایل ہیں۔ تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو حالات حاضرہ پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور مشرقی و مغربی دونوں اصولوں سے خوشہ چینی کرنے کے قایل ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی مشرقیت کو نہیں مٹا سکتے بلکہ مغرب سے ضروری حد تک سبق لے کر اصلاحات کرسکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے اور دوسروں کے لئے قابل تقلید مثال قایم کردی ہے۔ اس طبقہ کی خواتین کے دلوں پر اپنی حقیقت کی مہر ثبت ہے۔ مشرقی و مغربی علوم کی تحصیل کی بدولت ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ ظاہر و باطن میں ان کی زندگی سادہ ہے اور خیالات میں جس چیز کی جھلک پائی جاتی ہے وہ یہ ہے۔

زندگی را بقا از مدعاست
کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار
تا نگردد مشت خاک تو مزار

آرزو صید مقاصد را کمند
دفتر افعال را شیرازہ بند
زندگی سرمایہ دار از آرزوست
عقل از زائیدگانِ بطن اوست

عام مسایل پر اس طرح نظر ڈالنے کے بعد ہمیں اپنی ریاست ابد مدت میں خواتین کی تعلیم پر غور کرنا چاہیئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سرزمین دکن عالموں اور فاضلوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اور آج اپنے سلطان العلوم کے زیر سایہ اس طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ زمانہ ہمیں حیرت سے تکنے پر مجبور ہے ۔ میرے اندازہ میں اس ملک میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ہماری فیاض حکومت کی توجہ کا محتاج نہیں۔ خود ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ ہمارے خیالات ۔ رجحانات اور رسومات میں جیسے جیسے تغیرات رونما ہوں گے حکومت اسی طرح غور و فکر کے ساتھ معاونت کرتی رہے گی ۔ ضرورت ہے کہ خیالات میں توازن رکھنے والے لوگ عوام میں ایسے رجحانات پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ جن سے علم کی پیاس میں شدت پیدا ہوتی ہے ۔ عورتوں کی صحت کی کمزوری اور علم کے نور سے عاری دماغوں کی حالت اب زمانہ کسی طرح برداشت نہیں کرسکتا وہ زندگی میں مردوں کی برابر کی شریک ہیں۔ ان کے کاندھوں پر وہی ذمہ داریاں عاید ہیں جو مردوں کے کاندھوں پر ہیں۔ انھیں سماجی و دماغی ہر دو اعتبارات سے اس قابل ہونا چاہئے کہ شریک حیات کے لقب کی صحیح معنوں میں مستحق ہوسکیں حیدرآباد میں ہم کلیۂ اناث کو دیکھ کر اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے۔ ہمیں اضلاع و دیہات کی بھی فکر کرنے کی ضرورت ہے اور خصوصاً اس فرد ور طبقہ کی کہ جس پر یاس کا سا عالم طاری ہے ہمارے ملک میں عورتوں کی تعلیم تیزی سے ترقی پر ہے۔ محکمۂ تعلیمات کی حالیہ تحریکات اور اسکیمات اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ لیکن حالات کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس طویل راہ میں ابھی بالکل ابتدائی منزل پر ہیں۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی اس ملک میں لاکھوں لڑکیاں ایسی موجود ہیں کہ جنھیں زیر تعلیم لانا ہے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ عوام میں علم کی طلب نہ بڑھے اور معلمات نہ فراہم ہوں۔ مدارس نسوان میں معلمات کی فراہمی کا مسئلہ حقیقت میں نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کو صرف ہمارے خیالات حل کرسکتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تعلیم اور اچھی تعلیم کے بغیر کسی ملک و قوم کو ترقی نصیب نہیں ہوسکتی تعلیم کے بغیر خود انسانیت ادھوری رہ جاتی ہے ۔

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

ڈرتے نہیں بتوں کی جفا سے ستم سے ہم
مانوس ہو گئے ہیں مصیبت سے غم سے ہم

رکھتے ہیں اُس گلی میں قدم پھونک پھونک کر
جھجکے ہوئے ہیں اپنے بھی نقش قدم سے ہم

مشکل میں پڑ گیا ہے محبت کا اعتبار
بدظن سے ہو گئے تری جھوٹی قسم سے ہم

قسمت کی گردشیں ہیں محبت کی رنجشیں
چکر میں پڑ گئے ہیں جدائی کے غم سے ہم

ٹوٹا ہے دل کسی کی محبت میں اس قدر
لکھتے ہیں اپنا حال شکستہ قلم سے ہم

اُس بے نشاں کا دل ہی میں ملجائیگا نشان
کیا خاک جا کے لائیں گے دیر و حرم سے ہم

کہنا پڑے گا اس سے مجھے ایک دن عزیز
بد اعتقاد ہیں ترے قول و قسم سے ہم

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

جناب ماہر القادری صاحب کی تصانیف نظم و نثر کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔ برسوں ہم مشغلہ جاری ہے۔ تازہ بتازہ نتائج فکر اخبار و رسایل میں شائع ہوتے رہتے ہیں نا ثر بھی ہیں غزل میں مضامین حسن و عشق کی ترانہ سنجی حمد و نعت میں طبع و قار کی گہر افشانی ناول اور افسانے میں ہمہ گیر طبیعت کی جولانی دکھا کر داد سخندانی حاصل فرماتے ہیں۔

اخبار مدینہ کے دو پرچے ــــ بابتہ ۱۳ مارچ اور ۲۱ مارچ ۱۹۴۵ء۔ اتفاقاً میری نظر بھی گذرے اول الذکر پرچہ میں تین اشعار کا ایک قطعہ اور ثانی الذکر پرچہ میں ایک رباعی آپ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ قطعہ یہ ہے۔

قہقہوں میں خلش دل کو سمونا ہے مجھے! آج اے دوست نئے ڈھنگ سے رونا ہے مجھے

مجھ کو اب عشرت ساحل کی تمنا نہ رہی عین منجدھار میں کشتی کو ڈبونا ہے مجھے

جس کو سب موت سے تعبیر کیا کرتے ہیں دل میں وہ آخری کانٹے کو چبھونا ہے مجھے

"سمونا" ہندی لفظ ہے اور اس کے حقیقی معنی ہیں گرم اور سرد پانی کو ملا کر اعتدال پیدا کرنا۔ اردو میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے البتہ بطور کنایہ ایک ہی جنس کے دو مختلف المزاج یا مختلف الالوان اشیاء کی آمیزش سے اعتدال پیدا کرنے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاج دہر! میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا (خواجہ میر درد)

۶ یہاں اشک گرم نے میرے دریا سمو دیا (مصحفی)

آج کل اس لفظ کا استعمال عجیب عجیب طرح ہو رہا ہے۔ مگر شاعر کو عوام کی پیروی نہ کرنی چاہئے کیونکہ شاعر کا کلام ہی سند ہوتا ہے۔ پس قہقہوں میں خلش دل کو سمونا مہمل ہے۔

دوسرے مصرعہ کو پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ جناب میکش نے کسی کے مسکراتے ہوئے رونے کی یوں تعریف فرمائی ہے۔ ۵

روتے ہیں تبسم کا سہارا لے کر
رونے کا سلیقہ کوئی اون سے سیکھے

جناب ماہر القادری نے یہ ریکارڈ توڑ دیا وہاں تو صرف "تبسم کا سہارا" قہقہوں میں خلش دل کی آمیزش ہے" مگر ہم کو تو یہ "نیا ڈھنگ" نہیں نیا ڈھونگ معلوم ہوتا ہے۔ خلش دل درحقیقت ایسی تکلیف کا نام نہیں ہے جو آہ وبکا کی محرک ہو سکے۔ قہقہوں میں خلش دل کی آمیزش کی مثال ایسی ہے جیسا کہ سرد پانی کے ایک بڑے ظرف میں لوٹا بھر گرم پانی ملا دیا جائے نتیجہ یہ کہ گرم پانی بھی سرد ہو جائے گا۔ ۶ ہر چیز کہ درکان نمک رفت نمک شد۔

پس قہقہوں کے اثر سے دل کی خلش خود معدوم ہو جائے گی رونے دھونے کا ذکر ہی کیا۔ دوسری بات یہ کہ رونا ایک اضطراری اور جذباتی فعل ہے جو قبل از قبل کسی خاص انتظام واہتمام کا محتاج نہیں "فریاد کی کوئی لے" اور رونے کا کوئی خاص ڈھنگ دیکھا نہ سنا۔

دوسرا شعر بظاہر صاف ہے گریہ عمہ سمجھ میں نہ آیا کہ "عشرت ساحل" کی تمنا نہیں ہے تو جانے دیجئے۔ ساحل کو چھوڑئے عیش وعشرت زمان ومکان کی قید سے بے نیاز ہے مگر یہ تو کہئے وہ کیا مصیبت آپڑی ہے جس نے کشتی تن کو گرداب فنا میں ڈبونے پر آمادہ کر دیا۔ فراق کا صدمہ نہیں معشوق ناراض نہیں اس کو دوست کہئے محبوب کہئے معشوق کہئے جس نام سے چاہیں مخاطب کیجئے وہ تو پاس موجود ہے اوسی سے مخاطبت بھی ہے۔ پھر یہ کیا ماجرا ہے جو خودکشی کی ٹھان لی۔

تیسرے شعر کی صورت گری بھی عجیب الفاظ سے ہوئی ہے آخر وہ کیا شئی ہے "جس کو سب موت سے تعبیر کیا کرتے ہیں" اور مصنف نے کنایتاً اوس کو "آخری کانٹا" کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کی تعبیر موت اور کنایہ "آخری کانٹا" و وہ کوئی شئی ہے جس کا نام پوشیدہ رکھا گیا۔ موت میں اور کانٹے میں کوئی مماثلت ومشابہت بھی نہیں پھر اوس کو کانٹا قرار دینا اور دل میں چبھونا کیا معنے، قواعد علم بیان کے اعتبار سے "موت" اور "آخری کانٹے کا جوڑ درست نہیں اگر علم منطق کے لحاظ سے "موت" کو جس حد کی تعبیر قرار دیا گیا اوس کا تصمن "آخری کانٹا" ہے تو ہم اوس سے ناواقف ہیں۔ الفاظ کے ان مباحث سے آخر واول کانٹے کے ذکر سے درگزر تخیل کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی یہ امر تشنہ ہی رہ جاتا ہے کہ "نئے ڈھنگ" سے رونے کا یہ اہتمام اور دل میں "آخری کانٹا" چبھونے کا یہ انتظام آخر کسی ناگہانی آفت اور ناقابل اظہار مصیبت کا نتیجہ ہے جس کے

بغیر یہ اشعار قالب بے روح ہو کر رہ گئے۔

رباعی

میخواروں کو اذن عام دیدے ساقی جام مئے لالہ فام دیدے ساقی
اور مجھ کو بجائے مستی و بیہوشی گزرے ہوئے صبح و شام دیدے ساقی

میخواروں کو مئے نوشی کی عام اجازت دینے کے بعد دوسرا مصرعہ بھرتی کا ہو جاتا ہے پہلے مصرعہ کے مفہوم میں جام اور مے لالہ فام داخل ہے مدہوشی کے لفظ کو چھوڑ کر بیہوشی کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہوتی حالانکہ مستی و مدہوشی کہنے میں جو ایک گونہ ترنم ہے وہ "مستی و بیہوشی" کہنے میں نہیں پایا جاتا۔"صبح وشام دیدے" تو قطعاً بے معنے ہے (۳) انداز طلب میں کوئی جدت یا شاعرانہ لطافت بھی نہیں۔ اس لفظی بحث سے قطع نظر اہم چیز غور طلب یہ ہے کہ عمر گزشتہ یا شباب رفتہ کی بازیافت کا مطالبہ کس سے ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ صوفیانہ طرز کلام میں ساقی سے مرشد کامل ہی مراد ہوتی ہے۔ اس رباعی میں بھی یہی مراد ہوگی ورنہ باعتبار معنی موضوع لہٗ شراب پلانے والے سے کوئی ایسی التجا نہیں کرتا مصرعہ سوم میں "مستی و بیہوشی" کے معنے کنایتاً رجوع الی اللہ اور فنافی اللہ ہو سکتے ہیں۔ گزرے ہوئے صبح و شام کا مطالبہ اگر اس لئے ہے کہ جو زمانہ لہو ولعب میں ضایع ہوا وہ واپس مل جائے تو اس کو یاد الٰہی میں صرف کریں گے تو ایسا قیاس کرنے کا یہاں کوئی قرینہ نہیں اور پھر مرشد سے ایسا سوال کرنا جس کے رد و قبول پر ان کو قدرت حاصل ہونے کا گمان بھی نہ ہو کیونکر درست ہو سکتا ہے اگر محض شباب کی مسرت ہے تو وہ بھی مناسب حال نہیں رندی و سرمستی کے لئے مرشد سے یا شراب پلانے والے سے ایسا سوال بے معنی ہے غرض جس پہلو سے نظر ڈالئے یہ رباعی مہمل ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں نہ تو کوئی اُپج ہے نہ تخیل کی خوبی نہ شاعرانہ لطافت ہے نہ مضمون آفرینی۔ تقریباً اسی مضمون کو غالب نے کس شاعرانہ لطیف انداز میں نظم کیا ہے۔ ؎

بعد از اتمام بزم عید اطفال ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم اے عمر گزشتہ اک قدم استقبال

نہ خدا سے دعا ہے نہ ساقی سے التجا صرف تخیل کی کار فرمائی ہے اور شاعرانہ طرز طلب نے جو لطافت پیدا کی ہے اس کا اندازہ ذوق سلیم ہی کر سکتا ہے حقیقی شاعری اسی کا نام ہے ؛

قطعہ تہنیت جشن سالگرہ مبارک

جناب نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ

مژدہ سالگرہ باد صبا دیتی ہے!
گل عشرت چمن دل میں کھلا دیتی ہے

یہ سعادت ہے اسی سالگرہ کا حصہ
ہر گرہ سلسلۂ عمر بڑھا دیتا ہے

رقص کرتے ہوئے کہتا ہے یہ جام صہبا
کیا مزہ قلقل مینا کی صدا دیتی ہے

چشم ساقی سے کسی جام کو نسبت کیا ہے
ایک ہی دور میں محفل کو لٹا دیتی ہے

ہے عجب رنگ حکومت کہ دم سیر چمن
شاخ گل بھی سر تسلیم جھکا دیتی ہے

شاہ کی تیغ رواں میں ہیں صبا کے انداز
جاگتا ہے کوئی فتنہ تو سلا دیتی ہے

اب کی موسم میں کچھ ایسا ہے اثر مستی کا
بوئے گل ہوش عنادل کے اڑا دیتی ہے

یہ کرامت بھی اسی سالگرہ میں دیکھی
نقش غم صفحۂ ہستی سے مٹا دیتی ہے

بخشش عام نے وہ کام کیا ہے کہ جلیلؔ
ساری دنیا شہ عثماں کو دعا دیتی ہے

جواں سال شکاری

جناب اقبال احمد خان صاحب

حیدر آباد کی شکاری دنیا میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو محمد ثناء اللہ خاں کو نہ جانتا ہو جن کے قادر اندازی کی داستانیں الف لیلیٰ کی کہانیوں سے زیادہ دلچسپ اور پر لطف ہیں۔

مرحوم محمد نعمت اللہ خان صاحب کے اکلوتے لڑکے تھے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کے پاس جو ضلع بیدر میں انسپکٹر آبکاری تھے تعلیم حاصل کی میٹرک بیدر ہائی اسکول سے کامیاب کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ بھیج دئے گئے۔

مرحوم اپنے دور کے بہت مشہور اور زندہ دل طالبعلم گزرے ہیں۔ آپ نے مزاحیہ تقاریر اور یو۔ ٹی۔ سی (U. T. C.) نشانہ بازی میں امتیاز حاصل کیا جس کی وجہ سے وہاں آپ ڈاکٹر کے لقب سے مشہور تھے اور مسلم یونیورسٹی ابھی تک ان کو نہ بھلا سکی شروع ہی سے آپ کو شکار اور نشانہ بازی کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنے دو سال یو۔ ٹی۔ سی میں رہ کر اپنی کمپنی کو یو۔ پی پراونس میں نشانہ بازی میں انعام اول حاصل کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ بہت ہی کم عمر تھے اس وقت سے آپ اپنی فرصت کا بڑا حصہ غلیل اور غلوں کے بنانے میں صرف کرتے تھے۔ موصوف کو شکار کا اتنا شوق تھا کہ طالبعلمی ہی کے زمانہ میں انھوں نے کئی سو ہرن اور کئی ریچھ اور بورنچے شکار کئے۔ علی گڈھ میں بھی آپ اپنے دوستوں کے ساتھ نرورا وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ یو۔ پی میں نشانہ بازی میں اول آنے کی سے علی گڈھ کے کلکٹر نے خوش ہوکر مرحوم کو ایک بندوق تحفہ میں دی تھی جو اب بھی موجود ہے۔

علی گڈھ سے بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد آپ نے حیدر آباد میں تحصیلداری کی کوشش کی اور تحصیلدار منتخب ہوئے۔ مرحوم خود کہتے تھے کہ "مجھے تحصیلداری صرف میرے نشانہ اور اعلیٰ امتیازات کی وجہ سے ملی جو

میں نے علی گڈھ میں حاصل کی تھیں ۔ سنہ ۱۹۲۵ء
میں عادل آباد کے تحصیلدار ہوئے ۔

عادل آباد کا جنگل شکار کے لئے خاص
شہرت رکھتا ہے اس لئے یہاں آنے کے بعد
آپ کو شکار کھیلنے اور کارگزاری دکھانے کا
بہترین موقع ملا ۔ عادل آباد اس وقت صرف
تعلقہ کا مستقر تھا اور اب جو عادل آباد مستقر ضلع
ہوا ہے وہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے آپ نے
یہاں آکر آدم خوار شیروں کے ہلاک کرنے کی
بہت کوشش کی ۔ ایک جگہ انھوں نے اپنی
ڈائری میں لکھا ہے کہ " عادل آباد آنے سے
پہلے مجھے صرف شکار کا شوق تھا ۔ مگر یہاں آنے
کے بعد اس نے جنون کی شکل اختیار کرلی ہے ۔
اور یہیں آکر انھوں نے اپنا پہلا شیر شکار کیا
اسی شکار کے دوران میں آپ پر ایک آدم خوار
شیرنی نے حملہ کردیا تھا مگر خدا کو بچانا منظور تھا
اور انھوں نے حملہ کے دوران ہی میں اس کا
شکار کیا اور یہ واقعہ عادل آباد میں زبان زد
خاص و عام ہے ۔ موصوف کو اور کئی جگہوں پر
آدم خوار شیروں کو ہلاک کرنے کے لئے سرکار نے
خود حکم دیا تھا اور انھوں نے اس کی تعمیل بھی
نہایت خوش اسلوبی سے کی اسی نشانہ بازی
اور شکار کی وجہ سے نواب معین الدولہ مرحوم
آپ کو بہت چاہنے لگے تھے اور بیٹا بیٹا کہہ کر
خطاب فرماتے تھے ۔ نواب مظہر الدین خان بہادر
فرزند نواب معین الدولہ بہادر مرحوم نواب
نصیر یار جنگ بہادر فرزند مہاراجہ کشن پرشاد
آنجہانی سے آپ کو بہت دوستی تھی اور یہ آپس
میں بھائیوں کی طرح ملتے تھے اور اکثر شکاروں
میں ساتھ رہتے تھے ۔ نہ صرف آپ شکار ہی کے
شوقین تھے بلکہ آپ کو اپنے کام سے بھی بہت
دلچسپی تھی جس وقت آصف آباد سے ضلع
عادل آباد میں منتقل ہوئے اس وقت جو کچھ مرحوم
نے کام انجام دئے ہیں اس کا ریکارڈ ان
کے دفتر میں مل سکتا ہے ۔ جس وقت عادل آباد
ڈیولپمنٹ بورڈ کے تحت قدامت پسند
ساہوکاروں اور باشندوں کے مکانات آرائش
نے لے کر ان کو توڑنا چاہا تو سب ناراض
ہو گئے ۔ اس وقت جس حکمت عملی سے مرحوم نے
یہ معاملہ طے کیا وہ قابل تحسین ہے اور اس
تصفیہ سے رعایا بھی خوش تھی اور سرکار بھی
مطمئن ۔ موصوف نے ایک گاؤں بھی اپنی
کوششوں سے بسایا جو آبادی سے نصف میل کے
فاصلہ پر خانہ پور کے نام سے آپ کی یاد کو تازہ
رکھ سکتا ہے ان کی تمام کارگزاری سے خوش
ہوکر مسٹر گرافٹن معتمد مال نے ان کا نام اسسٹنٹ سٹلمنٹ

میں درج کرلیا تھا اور یہ نو برس کے قلیل عرصہ میں تحصیلداری سے ترقی کرکے دوم تعلقدار ہوکر جگتیال چلے گئے۔

مرحوم میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس جگہ جاتے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیتے۔ خصوصاً عادل آباد والے اس قدر گرویدہ تھے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا حالانکہ موصوف اس وقت دوم تعلقدار تھے مگر جب کبھی عادل جاتے تو تحصیلدار کے نام سے ہی یاد کئے جاتے۔ لوگوں کو ان سے اتنی ہمدردی تھی کہ جس وقت ان کے انتقال کی خبر عادل آباد پہنچی تو وہاں کے بڑے بڑے سیٹھ ساہوکاروں نے مستقر کی ساری دکانیں بند کردیں اور کاروبار بند رہا۔ عادل آباد میں موصوف نے بہت سی نمایاں کارگزاریاں انجام دیں آپ نے وہاں پر صلع سرائے کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھا۔

آپ ۱۳۵۲ف مطابق ۱۹۴۳ء میں عادل آباد سے ترقی پاکر جگتیال میں دوم تعلقدار ہوکر گئے اس تمام عرصہ میں آپ کا تبادلہ کبھی عادل آباد سے نہیں ہوا جس زمانہ میں جگتیال پر دوم تعلقدار تھے تو پورے ضلع میں جگتیال سے سب میں زیادہ روپیہ جنگی فنڈ میں دلایا گیا جس سے آنریبل گریکین صاحب صدر المہام مال آپ سے بہت خوش ہوئے دوم تعلقدار ہوکر ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ کمرشیل کارپوریشن میں منتقل ہوگئے اور ضلع کریم نگر کے کارپوریشن آفیسر مقرر ہوئے۔

کمرشیل کارپوریشن میں کوئی دس ایک مہینہ کام کرنے کے بعد یکم اردی بہشت ۵۴ف م ۵ر مارچ آپ کو بمقام حیدرآباد حرارت ہونے لگی جس کی آپ نے پرواہ نہ کی کیونکہ مرحوم ۱۰۲ درجہ بخار میں شکار پر جایا کرتے تھے ان کو اس معمولی حرارت کی کیا پرواہ تھی۔ خود وہ کہا کرتے تھے کہ "جب مجھے بخار آجاتا ہے تو میں شکار پر چلا جایا کرتا ہوں" آپ کو اکثر ملیریا کی شکایت رہتی تھی اس لئے مرحوم نے اس کو ملیریا سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور حرارت ہی کے حالت میں موٹر کے ذریعہ کریم نگر چلے گئے وہاں جانے کے بعد بخار تیز ہوگیا۔ پھر بھی انھوں نے کچھ پرواہ نہ کی اور ڈاکٹر سے ملیریا کہہ کر کونین کھاتے اور کونین کے انجکشن لیتے رہے لیکن نہ ڈاکٹر اور نہ خود ان کو اس بات کا شبہ ہوا کہ ٹائیفائیڈ ہے جس کا علم حالت خراب ہوجانے کے بعد

ہوا - دسویں دن حالت بہت خراب ہوگئی
اور بارہ دن کی قلیل علالت کے بعد آپ نے
بروز جمعہ یکم ربیع الثانی م ۱۲ اردی بہشت
۱۳۵۵ف م ۱۶ مارچ ۱۹۴۵ء صبح سات بجے
بمقام کریم نگر انتقال کیا - انا للہ وانا الیہ
راجعون - مرحوم کی شادی انتقال سے
پونے تین برس پہلے ہوئی اور انھوں نے
دو لڑکیاں اپنی نشانی چھوڑی ہیں مرحوم
کی عمر انتقال کے وقت ۳۶ سال کی تھی۔

اس عرصہ میں ۲۸ شیر اور ۳۶ بور بچے
مارے - ریچھ - نیل - سابنر کی تعداد تو شاید
خود ان کو بھی یاد نہ تھی - مرحوم پانچ بہنوں
میں ایک بھائی تھے ایسی ہونہار کم عمر
اکلوتی اولاد کا ضعیف ماں باپ کے ہاتھوں
سے نکل جانا نہایت صدمۂ عظیم ہے۔

کیا اچھا ہوگا کہ مرحوم کے کوئی قریبی
عزیز یا وہ دوست جو ان کے ساتھ شکار
میں رہتے ہیں ان کی نشانہ اندازی
اور بہادرانہ کارناموں پر روشنی
ڈالیں اور ان داستانوں کو دہرائیں
جو سننے میں آتی ہیں -

نظم

جناب جمیلہ بیگم صاحبہ (کلکتہ)

ہر سمت گلستاں میں بہار آئی ہوئی ہے
ایک ایک کلی حسن پہ اترائی ہوئی ہے
روشن ہے ستارے کی طرح باغ کا ہر پھول
خود کاہکشاں چرخ پہ شرمائی ہوئی ہے
کوئل کی ہے کوکو تو کہیں شاخ پہ قمری
بلبل بھی ادھر دیکھ کے للچائی ہوئی ہے
قارون کا خزانہ ہے گلستان زر گل سے
اور موج ہوا غنچوں پہ لہرائی ہوئی ہے
سرشار مسرت سے نظر آتی ہے دنیا
پر دل پہ میرے غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے
اور باغ کی رنگین روش آج ہی روشن
خورشید کی زرتار کرن چھائی ہوئی ہے
شاداب چمن وقف خزاں کیوں ہے میرا دل؟
کیوں اس کی کلی آج بھی مرجھائی ہوئی ہے

مکتوب

جناب جہاں بانو صاحبہ ایم - اے

کیا تجھ کو بتائیں ہم کیا کیا اے گردش دوراں بھول گئے

جو تردداتِ و تفکرات میری اس طویل خاموشی کے ذمہ دار تھے - ان کو تفصیل سے بیان کر دوں تو شاید تمہاری عالی ظرفی کے لئے عفو پر مائل ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے - لیکن ان کا تذکرہ مجھے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا - یہی کیا کچھ کم بدتہذیبی تھی کہ تمہیں انتظار کی اتنی زحمت دی - جواب محض خود غرضی کے خیال سے ایک غیر دلچسپ داستان سُننے کی بھی تکلیف دوں - اس طویل خاموشی میں صرف ایک چیز ہے جس کے خیال سے میں اپنی نظروں میں بہت زیادہ نادم نہیں - وہی غالب کا ایک گھسا ہوا شعر ؎

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

کتنی حقیقت ہے غالب میں - حالانکہ کثرت استعمال نے اس کو افتادہ کر دیا ہے - لیکن اس افتادگی میں جو حسن ہے وہ کسی رعنائی میں نہیں -

کئی مرتبہ تمہارے خط پڑھے - کس قدر پُرلطف اور شگفتہ ہوتے ہیں تمہارے خط - بہار کی سانس کی طرح میری پژمردہ زندگی میں سے گذر جاتے ہیں - لیکن اب تو مجھے انھیں سمجھنے کا بھی سلیقہ نہیں - زندگی ایک پچھلے پہر کا خواب معلوم ہوتی ہے - جو سچا نہیں ہوتا - ایک زمانہ تھا جب کہ مصروفیتوں اور الجھنوں تک میں رعنائی تھی - اب تو ذرا کچھ کام کرنے لگوں تو طبیعت اکتانے لگتی ہے - زندگی کی ہیبت نے مرعوب سا کر دیا ہے - طبیعت کی تازگی اور شگفتگی جیسے ٹھٹھر کر رہ گئی ہے دن بدن کچھ اس قسم کے خیال دل میں پختہ ہوتے جاتے ہیں - کہ راحتوں اور قہقہوں کی قیمت بہت گراں ہے - اوہام بھی حقیقت معلوم ہونے لگے ہیں - تامل اور پس و پیش بڑھتا جاتا ہے - یہ انقلاب کیا ہے اور آخر کیوں ہے ؟ زندگی کا وہ رسیلا پن کہاں چلا گیا - قبل از وقت جیسے کوئی ضعیف ہو جائے - یا کسی ذہنی مرض کا شکار - تمہیں مختصر خط لکھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مجھے سوچنا

پڑتا ہے کہ کیا لکھوں۔ اور مجھے کیا لکھنا چاہیئے۔ اور کیا نہیں لکھنا چاہیئے۔

میری اور سہلیاں ؟ ہیں کیوں نہیں۔ بہت سی ہیں۔ اتنی کہ اگر تم گننے لگو تو گن نہ سکو۔ لیکن ایک دو ملاقاتوں کے بعد، جن میں بڑی وسعت سے ایک دوسرے "کو سنا" سمجھا جاتا ہے۔ ان سے طبیعت اکتا گئی۔ بس تصنع ہی تصنع۔ مصنوعی علم دوستی۔ مصنوعی ذوق۔ نمایاں طور پر ساختہ انداز۔ اپنی آرائش اور سنگھار کے احساس سے ہر وقت خبردار۔ مفتوح کرنے کی بے صبر تمنائی۔ غرض ایک گز ناقص۔ کبتک نبھ سکتی تھی۔ وہ قابلیت جس کا اظہار نہ ہو۔ وہ شائستگی جس سے خود کو بھی بے خبری سی ہو۔ وہ نفاست مذاق جس میں دکھاوا نہ ہو۔ وہ وقار و تمکنت جس میں خلوص ہی خلوص ہو غرض تم کہاں تک سنو گی کہ میرا معیار کتنا اونچا ہے کتنا بلند ہے۔ میرے معیار کا اگر اظہار نہ ہو تو ہی عافیت ہے۔ ورنہ پھر مشکل ہو جائے گی۔ میرا جینا دشوار ہو جائے گا۔ شاید میرا شنہ کار پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ یا اگر ہوا ہے تو میری آنکھوں سے چھپا ہوا ہے۔ یا میں اس کی اہل نہیں ہوں کہ مجھے میرا ممدوح مل جائے۔ ورنہ ؎

کیا جانئے ہم کیا چاہتے ہیں !! دشوار ہے خود تفسیر اپنی

ہاں نجمہ میری دوست ہے۔ وہ ایک علامہ زماں ہے۔ اس کی گفتگو میں زندگی سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ انسان نہیں مجھے تو کچھ مافوق الانسان ہستی معلوم ہوتی ہے۔ مذہب اور سیاست پر اخبار و رسایل میں اتنی روشن خیالی سے بحث نہیں کرتی۔ جس طرح پرائیوٹ محفل میں ہوتی ہیں۔ اس کی باتیں اور بحثیں۔ لیکن دنیا کا کوئی ہی ایسا موضوع ہوگا۔ جس کے متعلق اس کو چند چٹکلے نہ یاد ہوں۔ نہایت شستہ ذوق پایا ہے اور نہایت صحیح اردو لکھتی ہے۔ فارسی شعر ٹھیٹھ قدیم ایرانی رنگ و وضع میں اس طرح کہنے لگتی ہے کہ نشہ آجاتا ہے۔

وسیم شاعرہ ہے۔ عورت اگر شاعری کرنے لگے تو کچھ عجیب عجیب سا لگتا ہے۔ خصوصاً "تانیث" کا اظہار شاعری میں۔ بہت کھلتا ہے۔ خیر تو وسیم کی شاعری سے ادبی رسایل نے تمھیں روشناس کیا ہوگا۔ لیکن اس کے گیتوں کا لطف تب آتا ہے کہ وہ خود گا کر سنائے۔ سماں بندھ جاتا ہے۔ لیکن وہ بہت کم گاتی ہے۔ دنیا کس کو جینے دیتی ہے۔ اس کی نظروں میں تو ہمارا کوئی بھی فعل اچھا نہیں۔ جیسے خود بڑی اچھی ہے بچاری۔ ہمارا موسیقی ایک ایسی

جماعت کے ہاتھوں میں گرفتار ہو کر پڑی دم توڑ رہی ہے۔ کہ اگر کوئی اس فن سے علانیہ ذرا سا بھی لگاؤ ظاہر کرتا ہے۔ اس پر آوازے کسے جانے لگتے ہیں۔ وسیم صرف آواز ہی آواز ہے۔ اس کی شاعری میں وہ لوچ و کشش نہیں۔ جو رس اس کے گلے میں ہے۔

پروین خاصی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ حیدرآباد کی لائبریری میں کوئی ہی کتاب ایسی ہوگی اس کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اتنا کچھ پڑھ کر بھی اس کی زبان پر تالا پڑا رہتا ہے۔ جیسے

"کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ گفتگو بھی ساز کے نغموں کی طرح اپنے اختیار میں ہے مضراب لگنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ نہیں نہیں یوں سہی۔ گلے میں بہت کچھ کہتے اور کچھ نہ کہہ سکنے کا پھندا۔

نگہت ساری محفل کو انڈین آرٹ سے لطف اندوز ہونا سکھاتی رہتی ہے۔ گو یا یہ ہماری سوسائٹی کی "چغتائی" ہے۔ اور یہ ہرگز یقین کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ کہ انڈین آرٹ کو اظہار جذبات کی وہ قدرت نہیں جو یوروپین یا جاپانی اور چینی آرٹ کو حاصل ہے۔

ریحانہ انگریزی کی ایک قابل رشک ادیب ہے۔ بڑی زندہ دل روشن خیال اور ہنس مکھ سی ہے اس کے تفریحی مضامین تمہاری بھی نظر سے گزرے ہوں گے۔ اردو میں اگر لی کاک کی ظرافت کا نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ ریحانہ کی تحریریں ہیں۔ بے انتہا زندہ دل۔ ہنسنا اور ہنسانا ——— بس اسی محور پر اس کی زندگی گھومتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا میں اس سے بڑی نیکی اور کوئی نہیں۔ کہ انسان دوسرے کو ہنسائے۔ لیکن ہم گردش زمانہ کے شاکی لوگ اگر جنت میں بھی پیدا کئے جاتے تو یونہیں شاکی رہتے۔ کیونکہ ہمیں دار المحن کو دار نشاط میں تبدیل کرنا نہیں آتا۔ یہ بھی ایک فن ہے۔ جو مجھے تو عمر بھر نہیں آیا۔ تو یوں ہم نکمے رہے زمانہ کے۔ ایک بیکار و مجہول ہستی جس کو پیدا کر کے قدرت نے ایک کھلا ہوا مذاق کیا ہے۔ نہ مجھ سے کسی کی بھلائی وابستہ ہے، اور نہ کوئی کار آمد واقعہ ہی مجھ سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔

ان سب میں اب میں کیا بتاؤں مجھے سب سے زیادہ کون عزیز ہے۔ بہر کیف ان کی طویل سے

طویل صحبت بھی کبھی کسی کو سیر نہیں کرسکتی۔ بخمہ میری نسبت زیادہ قدامت پسند ہے اور ریحا نسبتاً زیادہ آزاد خیال۔ لیکن اپنے اپنے خیالات ورجحانات کی حمایت میں اگرچہ بہت سرگرم بحثیں کبھی کبھی ہو جاتی ہیں۔ مگر کبھی ناگوار صورت پیدا نہیں ہوتی۔

نسرین تو ان لوگوں کا لحاظ کرتے ابھی صرف "لڑکی" ہے مگر کچھ عجیب قسم کی۔ اس کو اگر صحیح راستہ پر لگایا جائے تو نہ معلوم کیا ہو۔ مگر افسوس کہ گھر کا ماحول تو ہے ہی کچھ بے ڈھنگا۔ بے اصول۔ اسکول بھی ملا تو "زر پرست" جہاں غریبوں کو بے جان خیال کیا جاتا ہے۔ اور دل اگر ہے تو صرف انھیں لوگوں کے۔ اس لئے دلی جذبات کی قدر وہ نہیں جانتے۔ بعض وقت عجیب بدتمیزی سے باتیں کرتی ہے۔ اس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ایک حمیدہ ہے۔ بناوٹ کے باوجود اس کی ہر حرکت سادہ ہوتی ہے۔ خیر ہٹاؤ اس قصہ کو۔ کسی سے ملنے کی کبھی تمنا تھی۔ نہ اب ہے۔ میں نے ان سے بہت اچھے لوگ دیکھے ہیں۔ شاید ان آنکھوں میں کسی کی قدر کرنے کی قابلیت اب باقی نہ رہی۔ شاید انھیں کوئی ایسی چیز مل گئی ہے۔ کہ نگاہیں اب کسی اور طرف اٹھنا نہیں چاہتیں۔

ثریا کا "مرہم نادر" کیا خاک اس "زخم کہن" پر اثر کرے گا۔ زخم کی حقیقت اس کے کھانے والے ہی جانتے ہیں۔ اور پھر زخم کے اندمال کی کوشش بھی کوئی تک ہے؟ ان کا کچا رہنا ہی ان کی زندگی ہے۔ درخت بھی تو سوکھنے تک کھڑا رہتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید آشکارم دید، و پنہانم نہ دید

غزل

جناب مسلم

سر شوریدہ سودائے تو دارد دل محزون تمنائے تو دارد

مہ کامل متاع نور خود را زحسن روئے زیبائے تو دارد

عجوز دہر لعنت بر تو بادا لعین اسمت آنکہ سودائے تو دارد

نہ ہے اوج کسے کو از سر عجز سر خود بر سر پائے تو دارد

نہ تنہا مسلم زار است شیدا بدل ہر کس تولائے تو دارد

"ایک بچہ"

جناب غفار سعید صاحب

صورت شکل کا وہ کچھ برا تو نہیں تھا۔
—— دو تین مرتبہ میں نے اسے دیکھا بھی ——
مگر ذرا نہیں بھاتا —— اس کی بڑی بڑی آنکھیں
تو مجھے بہت ہی بری لگتی تھیں —— دل چاہتا
تھا کہ گرم گرم سیخیں چبھوں دوں — پردے
کا کچھ خیال نہیں — ذرا چوک ہوئی اور آپ کی
نگاہیں مجھ پر —— بس بھائی جان کی اس کی
خوب گھٹتی تھی —— اور یہ آجاتا اور بھائی
کے کمرے میں بیٹھے دونوں رات گئے تک باتیں
کیا کرتے۔ کبھی یہ نہ آتا تو بھائی ذرا بے چین سے
ہو جاتے۔

چھ بجے کا وقت ہوگا۔ بھائی جان کہیں
باہر گئے ہوئے تھے۔ میں برآمدے میں سے اندر
کی طرف کو جا رہی تھی —— پھاٹک میں تیزی
سے ایک سیکل داخل ہوئی۔ سبز پتلون اور سفید
قمیص جسم پر تھا۔ میری اس کی آنکھیں اتفاقاً
چار ہو گئیں۔ میں جھپٹ کر اندر کو ہو گئی اس
کی آنکھیں مجھے برابر گھور رہی تھیں۔ مجھے بہت
غصہ آیا۔ یہ ہائی اسکول کے لڑکے ہوتے ہی بہت

بدمعاش ہیں۔ جہاں ذرا اچھی صورت دیکھی اور
لگے ڈورے ڈالنے۔ ارادہ ہوا کہ امی جان سے
کہہ دوں —— مگر پھر بھی خاموش ہو گئی "بدمعاش
کہیں کا ——" اس کے آنے کے اوقات میں
اندر رہا کرنے لگی۔

ہمارے مدرسہ میں ڈرائنگ کا انعامی
مقابلہ ہونے کو تھا۔ مجھے ڈرائنگ سے بہت
دلچسپی تھی —— میں بھی گھر پہ ایک تصویر بنا رہی
تھی —— مگر کچھ پسند نہیں آ رہی تھی —— دو
تین تصویریں بنا ڈالی لیکن ایک بھی اس قابل
نظر نہیں آتی تھی کہ مدرسہ لیجا سکوں ——
رات کا وقت تھا میں اداس بیٹھی ہوئی تھی
—— کل تصویر دینے کا آخری دن تھا تصویر
کچھ ٹھیک نہیں بنی تھی۔ میں تصویر کو ہاتھ
میں لئے اداس تھی —— میری بے بسی کو
سمجھتے ہوئے بھائی جان نے کہا۔

"لاؤ ہم بنا دیں گے"
"وہ کس سے —— !"
"اجی تمھیں اس سے کیا"

"مگر بھائی مجھے تو کل صبح دینی ہے۔"

"اوہ ــــ کل صبح ــــ اچھا لاؤ صبح تک شاید بن جائے۔"

"اللہ بھائی جان ضرور بنا دیجئے۔ میں آپ کو پڈنگ بنا کر کھلاؤں گی۔"

دوسرے دن صبح ہی سے میں برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ بھائی جان تصویر لانے گئے تھے ــــ میں بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ مدرسہ جانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کہیں بھائی بغیر تصویر کے نہ آئیں ــــ کیسی بنی ہوگی تصویر۔ نہیں نہیں بھائی جان ضرور اچھی بنا دیں گے ــــ اتنے میں پھاٹک کھلا ــــ مگر ــــ وہ بدمعاش داخل ہوا ــــ میں تیزی سے اندر کو ہوگئی ــــ غصہ سے میرا برا حال ہوگیا ــــ جب دیکھو گھورتے رہتا ہے ــــ کبھی نظریں نیچی کرے گا بھی ــــ ارادہ بہت ہوا کہ بھائی جان سے شکایت کردوں کہ آپ کا دوست مجھے اکثر گھورتے رہتا ہے ــــ اندر آ کر میں نے نوکر سے کہلا بھیجا کہ بھائی نہیں ہیں ــــ اور ایک کونہ میں اسے گالیاں دیتے ہوئے بیٹھ گئی ــــ دس بج رہے تھے۔ میں مدرسہ جانے تیار تھی ــــ اتنے میں بھائی جان کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے تصویر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ــــ "لو ــــ وہ ابھی ابھی لاکر دیئے گئے ہیں" میں نے جھٹ تصویر لے لی۔ ــــ "اوہ" ــــ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ تصویر بہت اچھی تھی ــــ مجھے بہت پسند آئی ــــ میرے معیار سے بہت بلند بھی نہیں تھی ــــ شاید انعام مجھے ہی ملے ــــ نیچے میرا نام بھی لکھا تھا ــــ مگر ــــ اسے کیونکر معلوم ہوا ــــ اُنہہ ــــ تصویر مدرسہ میں بھی بہت پسند کی گئی۔

مدرسہ کی چار پانچ لڑکیاں اور میں مل کر فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ سکندرآباد کے سینما میں زنانی درجہ نہیں تھا ــــ ہمیں مجبوراً مردانے ڈبہ میں بیٹھنا پڑا ــــ ہم سب درجہ اول میں بیٹھے ہوئے تھے میری نگاہیں ہال کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کہیں وہ بدمعاش یہاں بھی نہ ہو۔ اکثر جہاں میں جاتی یہ آجاتا ــــ مگر اب ہال میں وہ مجھے نہیں دکھائی دیا۔ میں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا ــــ میرے ایک طرف نورجہاں بیٹھی تھی اور ایک طرف رقیہ تھی ــــ وقار کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا ــــ پیچھے بعض سیٹیں خالی تھیں ــــ انگریزی فلم تھی ــــ جہاں کہیں کوئی "خاص واقعہ"

دکھائی دیتا میں وقار کے ہاتھ کو آہستہ سے دبا دیتی — سیٹ کی پشت پر ہمارے ہاتھ تھے — فلم شروع ہو چکی تھی — ہم سب متوجہ تھے۔ یکایک میں نے محسوس کیا میرے ہاتھ میں وقار کا ہاتھ نہیں بلکہ کوئی سخت ۔ ۔ ۔ ۔ !!! — میں ایک دم پلٹی — اف۔ بدمعاش — پیچھے کی خالی سیٹ پر وہ بیٹھا ہوا تھا — دل تو چاہا کہ اس کا منھ نوچ لوں — بدمعاش نے موقع دیکھ کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا — میرا شرم اور غصہ سے برا حال ہو گیا۔ — معلوم نہیں اس نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا فلم کیا خاک دیکھتی — مدرسہ کی ٹیچر ہمارے ساتھ تھی۔ ہم نے کہہ کر اپنی سیٹ تبدیل کروالی — انٹرول میں بھی وہ مجھے برابر گھورتا ہوا۔ معلوم نہیں اس کو میرا پروگرام کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟ — جہاں جاؤ موجود — نور جہاں اور رقیہ نے الگ مجھے تنگ کر دیا۔ فلم ختم ہونے سے پہلے ہی میں نکل آئی — اور موٹر میں بیٹھ گئی۔ کہیں پھر سامنا نہ ہو جائے۔

جمعہ کا دن تھا — میں اپنے کمرے میں بیٹھی ایک تصویر بنا رہی تھی — تعطیل کے دن اکثر یہی میرا مشغلہ ہوتا — اتنے میں بھائی جان کمرے میں آ گئے اور میرے پیچھے کھڑے رہ کر تصویر دیکھنے لگے۔ میں تصویر میں رنگیں لگا رہی تھی — بھائی جان نے آہستہ سے کہا

"کچھ اچھی نہیں —"

" نہ سہی — آپ کو کیا واسطہ —"

" اچھا — تو پھر کبھی نہ کہنا کہ ہمیں تصویر بنوا دیجئے"

میں نے دوڑ کر بھائی جان کو پکڑ لیا — وہ جانے لگے تھے۔

" نہیں بھائی جان — ہم نے تو ذرا یوں ہی کہہ دیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ — اچھا — بھائی ذرا درست کروا دیجئے نا — اوں ہو

" کس سے "

" وہی — آپ کے کوئی دوست ہیں نا —"

بھائی جان نے کچھ دیر سوچ کر تصویر لے لی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" شکریہ بھائی جان — شکریہ — اللہ کتنی اچھی ہو گئی یہ تصویر میں واقعی جان سی پڑ گئی تھی۔ رنگیں بہت مناسبت سے

لگائے گئے تھے۔ میں سوچنے لگی کاش اتنی اچھی ڈرائینگ میری بھی ہوتی۔ میں بہت خوش تھی۔
"کس نے درست کی ہے بھائی جان"
"ایک بچہ نے"
میں خاموش ہوگئی — جب کبھی مجھے کوئی تصویر بنانی ہوتی میں بھائی سے کہہ کر بنوالیتی۔ یا کبھی اپنی بنائی ہوئی تصویر کو درست کروالیتی — میں نے دو ایک بار جب کبھی پوچھا تو بھائی نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ ایک بچہ ہے — میں چپکی ہوگئی — معلوم نہیں کون ہے — بھائی کا شاید ہم جماعت ہے —

میں مدرسہ سے آکر منہ دھو رہی تھی کہ بھائی جان نے ایک دستی میرے گود میں پھینک دی۔" ذرا اسے کروشیا میں نکال دو" — میں نے دستی لے لی۔ اس کے ایک کونے پر کنول اترا ہوا تھا۔ ڈرائینگ اچھی بنائی گئی تھی۔ میں نے بھائی سے پوچھا۔ کس کی ہے بھائی یہ دستی —" بھائی جان نے ذرا رُوکھے پن سے کہا "تمھیں اس سے کیا" "ایک بچہ کی ہے — بس"
میں ایکدم چپکی اور دستی کو غور سے دیکھا —" ایک بچہ" — میں نے دل میں سوچا کتنی اچھی ڈرائینگ ہے اس بچہ کی — کاش میری ڈرائینگ بھی ایسی ہی ہوتی — میرے دل میں اس بچہ کے حالات معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی — شاید بھائی جان کا کوئی دوست ہوگا — معلوم نہیں وہ کیسا ہے! — ارادہ ہوا بھائی سے پوچھوں کہ یہ کون ہے — مگر پھر شرم سے خاموش ہوگئی — میں نے اس کی دستی پہ بہت ہی انہماک سے پھول نکال دیا — معلوم نہیں کیوں میں نے اسے اپنا ہی کام سمجھا — دستی بھائی جان کو میں نے دیدی — جی میں بہت آیا کہ بھائی سے پوچھوں آیا اسے پسند آئی کہ نہیں — مگر پھر خاموش ہوگئی۔ اور بھائی نے بھی کچھ نہیں کہا۔
گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوگئی تھیں — مدرسہ بند ہوئے مہینہ ہوگیا تھا — ہم سب خالہ کے یہاں جا رہے تھے۔ ریل چھوٹنے میں ابھی کچھ ہی دیر تھی — میں پلیٹ فارم پر برقع اوڑھے کھڑی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال ستا رہا تھا کہ کہیں وہ "بدمعاش" یہاں بھی نہ وارد ہوجائے — میں ریل میں بیٹھ گئی — گاڑی چلنی شروع ہوگئی — میں ڈبہ میں سے جھانکنے لگی — اسٹیشن سے

گاڑی ذرا آگے کو ہوئی تھی کہ مجھے وہ دکھائی دیا — بدمعاش" میرے منہ سے آہستہ سے نکلا — میں بہت خوش تھی کہ اب ایک دو مہینہ تک وہ نہیں دکھائی دیگا — میں نے دیکھا اس کا چہرہ واقعی اداس تھا — کیا وہ مجھے چاہتا ہے — ؟ — ریل تیزی سے آگے بڑھ گئی —

نیا سال شروع ہوگیا — جماعت میں نئی نئی لڑکیاں شریک ہونے لگیں — مدرسہ کی دنیا پھر سے شروع ہوگئی — بہت دنوں بعد میں نے ایک تصویر بنائی — شام میں بھائی جان باہر جا رہے تھے — میں نے کہا۔

" بھائی — ذرا درست کروا دیجئے نا"

"کس سے — !"

" وہی — وہ کوئی ایک بچہ آپ کا دوست ہے نا"

" اوہ — وہ بچہ تو علی گڈھ چلا گیا"

" علی گڈھ چلا گیا — ! ! ! مجھ پہ جیسے بجلی گری - بھائی جان چلے گئے لیکن میں وہیں کھڑی رہی — مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں نے کوئی اپنی قیمتی چیز کھو دی — "علی گڈھ چلا گیا —" بار بار یہ فقرہ میرے ذہن میں گھومنے لگا — کیوں چلا گیا — ؟ — کیسے گیا — کون درست کرے گا میری تصویریں — مجھے اس سے ایک قسم کا انس ہوگیا تھا — میں آہستہ بھائی کے کمرے میں پہنچی — اس کی بنائی ہوئی کئی تصویریں رکھی ہوئی تھیں — ان تصویروں میں مجھے آج ایک قسم کی اداسی نظر آنے لگی — نیچے اس کا نام لکھا تھا۔ "........." کتنا اچھا نام تھا۔ — کتنا اچھا مصور تھا وہ — کاش میں اسے ایک بار دیکھ لیتی۔

محرم کی تعطیلات تھیں — مدرسہ بند تھا — میں ان کی ایک تصویر کی نقل کر رہی تھی — گاؤں کا ایک منظر تھا — قد آدم تصویر تھی — بھائی جان کو انہوں نے شاید تحفتہً دی تھی — تین دن سے میں برابر تصویر بنا رہی تھی — ہو بہو نقل کرنے کی بہت کوشاں تھی — امی جان نے دو ایک مرتبہ کہا بھی کہ کیا ہے بچی صحت خراب کرلے گی — مگر میں برابر تصویر بنانے میں مصروف تھی شام کا وقت تھا — برآمدے سے ملحق کمرے میں میں تصویر بنا رہی تھی — نصف سے زیادہ میں نے ختم کرلی تھی — ایک دم دوڑتے

بھائی جان آئے۔

"اوہ ـــــ دیکھو ذرا تم اندر کو ہو جاؤ ـــــ جن کی تصویر تم بنا رہی ہو نا ـــــ وہ آئے ہوئے ہیں" مسرت کی چیخ میرے لبوں پر آکر رہ گئی۔ دل چاہ رہا تھا کہ بھائی جان کے پیر پکڑ کر چوم لوں۔ میں نے جھٹ برشیں رکھدیں ـــــ اور اندر کے کمرے میں چلی گئی ـــــ میرے دل میں سینکڑوں ارمان پیدا ہو رہے تھے ـــــ خوشی سے سینہ بلیوں اچھل رہا تھا ـــــ میں دروازے سے لگی کھڑی تھی ـــــ پردے کی اوٹ سے میری نگاہیں کمرے میں تھیں ـــــ دروازہ کھلا اور بھائی کے ساتھ ـــــ "بدمعاش" ـــــ میرے منھ سے ایک دم نکلا ـــــ غصہ سے میرا برا حال ہو گیا ـــــ !!! ـــــ

دوسرے ہی سیکنڈ میری حالت بدل گئی ـــــ دل میں ایک قسم کی گدگدی سے محسوس ہونے لگی ـــــ وہ میری تصویر میں گیس لگا رہے تھے ـــــ صورت شکل کے وہ کچھ برے تو نہیں تھے۔ ایک بچہ" ـــــ آنکھیں میچ کر گہری سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔

غزل

جناب میر اکبر علی خاں صاحب اکبر (حیدر آبادی)

نہ اب وہ ہنگامہ آرزو کا، نہ دل میں اوٹ ہما ہمی ہے
بغیر تیرے میں دیکھتا ہوں کہ زندگی میں کوئی کمی ہے

نظر پریشاں، خرد پشیماں، نہ ہوش باقی، نہ دل ٹھکانے
نظام ہستی میں بات کیا ہے جو کچھ دنوں سے یہ برہمی ہے

بدل گئی حسن کی طبیعت، کہ رنگ لایا غم محبت
خوشا یہ تاثیر جذب الفت کہ انکی آنکھوں میں بھی نمی ہے

نہ جانے کیسی یہ قدر و قیمت گھٹی محبت کے آنسوؤں کی
متاع دل تھی جو بند اب تک وہ بوند پلکوں پہ آ جمی ہے

تڑپ رہے ہیں ہزاروں بسمل، یہ کس کی آنکھوں کا ہے کرشمہ؟
اسیر گیسو ہیں سینکڑوں دل، یہ کس کے کاکل کی برہمی ہے؟

وہ زندگی، زندگی ہی کیا ہے جو بیت جائے بغیر تیرے
وہ انجمن، انجمن ہی کیسی جس انجمن میں تری کمی ہے

نہ رنگ و نکہت میں دلکشی ہے نہ شعر و نغمہ میں دلنشینی!
کہ دل تو نذر مسرت غم محبت کا ماتمی ہے!!

ہے انتہا بھی کوئی ستم کی، کبھی تو ہو اک نظر کرم کی
غم مسلسل سے مر نہ جائے کہ تیرا اکبر بھی آدمی ہے!

رنگینیاں

بندہ نواز۔

میری بیگانہ وشی اور طرز کرم قابل ستائش نہ سہی۔ لیکن "کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند" کو آپ نے کیوں فراموش کر دیا۔

میں واقف تھا کہ مقدر کی بے رحم گردش نے آپ کو کسی قابل نہ رکھا تھا۔ مگر دوسروں کی دلبرسی سے آپ کو انکار نہ ہوگا۔ غالباً یہی دل بہلائی کا دلچسپ مشغلہ تھا ورنہ زندگی ناقابل برداشت، بوجہ ع

موت کی تصویر اور اتنی سبک
زندگی کا خواب اور ایسا گراں

مجھے اب خبر ہوئی کہ آپ خفا ہیں ورنہ میرا متوقع خیال تھا کہ تھک کر اور ہار کر ایک نہ ایک دن آپ رجوع ہو ہی جائیں گے کیونکہ، وائے بر جان سخن، گر بہ سخندان نہ رسد، آپ کی فرمائش میرے لئے کوئی مشکل نہیں۔ لیکن آپ کے نئے احباب بھی تو نہایت آسانی سے اس کی تکمیل کر سکتے تھے۔ پھر خواہ مخواہ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹا گیا۔ میں کوئی شہنشاہ وقت تو نہیں کہ اپنے قیمتی خزانہ سے چند موتی دیدوں اور نہ ایسے موتی میرے پاس موجود ہیں۔ ہاں چند آنسو ہیں جن کی قدر و قیمت میرے پاس موتیوں سے زیادہ ہے۔ جب آپ کو ایسے در نایاب کہیں سے نہ مل سکیں تو شاید میرے خزانہ کا در اس وقت آپ کے لئے وقف ہو سکتا ہے۔

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

خدا کرے معروضہ کتاب جلد شائع ہو اور میں اس وقت کہوں گا "اللہ کرے ذوق ادب اور زیادہ۔"

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر

شہاب

ناہید

ناہید

جلد ۱ شہریور ۱۳۵۴ف م اگست ۱۹۴۵ء نمبر ۱

۱۔ منیزہ بانو کاؤس جی نے "گاتھا" سے دین زرتشت کے منتخب اقوال بھجوائے ہیں جن میں اس مذہب پر روشنی پڑتی ہے۔

۲۔ ایک عرصہ بعد نزہت سلطانہ تشریف لائی ہیں اور اپنے ساتھ "موسم گل" لیتی آئی ہیں امید کہ موسم بہار میں یہ کلیاں شگفتہ رہیں گی۔

۳۔ انتظام خانہ داری۔ لڑکیوں کا اولین فریضہ ہے۔ آصفیہ سلطانہ نے خانہ داری سے ابتدا کی ہے دیکھیں کہ وہ آئندہ اور کس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

۴۔ دل لخت لخت کو غالباً آپ محفوظ کر رہی ہوں گی کہ کبھی ایک مکمل دل بن جائے۔

۵۔ سلیقہ معصومہ جنگ بہادر کا ہے آپ بھی مشورہ دیجئے کیونکہ وہ آپ سے طالب مشورہ ہیں

۶۔ ناہید۔ حکم صدقہ۔ کام کی باتیں ہیں۔

۷۔ راحت پسند ہستی۔ شاید آپ میں بیداری پیدا کرے

دین زرتشت کے چند منتخب اصول

"گاتھا"

منیژہ بانو کاؤس جی

"گاتھا" زرتشتیوں کی مقدس کتاب "اوستا پاک" کا ایک حصہ ہے، اس متبرک صحیفہ کو اہل زرتشت کے ہاں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صحیفہ خود حضرت زرتشت کی زبان مبارک کے فرمودات پر مشتمل ہے۔ "گاتھا" کے معنی نغمہ کے ہیں جو "گاتے" بمعنی گانا سے مشتق ہے۔ یہ مجموعہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور اس کی کوئی سطر ایسی نہیں جس میں "اہورمزدہ" (ایزد تعالیٰ) کی بے پناہ طاقت اور اس کی وحدانیت کا ذکر جمیل نہ ہو۔ یہ کوثر و تسنیم میں ڈوبے ہوئے نغمات شیریں، وحدت الٰہیہ کے مظہر ہیں، اسی لئے دین زرتشت میں حضرت کی اس تصنیف منظوم کو کل مقدس کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ کہنا اظہار حقیقت ہے کہ جو زریں اصول اس کتاب میں درج ہیں وہ دین زرتشت کی روح رواں ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ واحد ہے، کوئی اس کا ہم رتبہ نہیں۔ یہ وسیع کائنات اس کے وجود کا بیّن ثبوت ہے۔ قابل پرستش صرف وہی ہے اس پر توکل انبساط حقیقی کا واحد ذریعہ ہے۔

۲۔ جو اپنے معبود کی مجبور و غریب مخلوق کی خدمت کرتا ہے وہ اپنے خالق کی عبادت کرتا ہے۔

۳۔ بے نفسی وہ جوہر بے بہا ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب تر کر دیتا ہے۔

۴۔ اپنے آپ کی کھوج لگاؤ۔ زندگی کی کامیابی کا راز اسی میں نہاں ہے۔

۵۔ ایزد تعالیٰ حاضر و ناظر ہے۔ دانا و بینا ہے، رحیم و کریم ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

۶۔ راستی و تقویٰ جو ہر انسانی ہے مسرت روحانی جو تمام مسرتوں پر بالا ہے۔ اسی میں نہاں ہے۔

۷۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مظہر ذات الٰہی ہے جس نے اس کی قدر جانی اس نے صحیح

معنوں میں ربوبیت باری، اس کے دانا و بینا اور واحد ہونے کو تسلیم کیا۔

۸۔ حقیقی مسرت صرف اسی کو حاصل ہے جو نیکی، نیکی کی خاطر کرتا ہے اور صلہ کی توقع نہیں رکھتا۔

(۹) جسمانی اور روحانی صفائی زندگی کامل کا مبدا ہے۔ صرف ظاہری صفائی پر توجہ دینا کافی نہیں ہے، روحانی صفائی بھی لابدی ہے، کیونکہ باری تعالیٰ سے قربت اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

۱۰۔ اپنی زندگی "ہمت" (پندار نیک) "ہوخت" (گفتار نیک) اور "ہورشت" (اعمال نیک) کی بنیادوں پر قایم کرنی چاہئے کیونکہ حقیقی نجات اور کامل زندگی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ (واضح رہے کہ زرتشتی مذاہب انہیں تین اصولوں پر قایم ہے)

۱۱ - علم کی جستجو میں شب و روز صرف کر دینے چاہئیں۔ یہی جہالت اور ضلالت کو جوکہ بدترین امراض انسانی ہیں، دور کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

۱۲۔ نفس سرکش پر قبضہ و قدرت حاصل کرنا چاہئے۔ یہ انسان کا بدترین دشمن ہے اس قوت کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دینا چاہئے۔

۱۳۔ نظام دنیا کا قیام جزا و سزا پر ہے، نیکی کا عوض نیکی اور بدی کا معاوضہ بدی ہے۔

۱۴۔ عبادت ایزد تعالیٰ انسان کے فرائض اولین میں سے ہے جو اس کی طرف سے غفلت کرتا ہے۔ وہ زاد عقبیٰ کی جانب سے غافل ہے۔

۱۵۔ اجسام انسانی خاکی ہیں، ایک نہ ایک روز یہ ضرور فنا ہوں گے۔ لیکن روح کو بقا ہے، اس کی حفاظت کرنی چاہئے۔

۱۶۔ پیغمبر خدا کی مخلوق ہے، انسان ہے، اپنی ریاضت و عبادت سے اس نے اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کی ہے۔ اس کی تعلیم و تلقین پر توجہ دینی چاہئے کہ وہ صراط مستقیم کی نشان دہ ہوتی ہے۔

۱۷۔ حق طاقت ہے، اس کی تلاش و تحصیل میں انسان کو انواع و اقسام کی بے شمار جھیلنی پڑتی ہیں۔ لیکن آخرکار کامرانی و شادمانی حق و صداقت ہی کا نتیجہ ہے۔

۱۸۔ قدرت کی دو قسمیں ہیں جن پر کہ نظام عالم قایم ہے۔ ایک "اہورمزد" (قدرت نیک) اور دوسری "اہرمن" (قدرت بد) اول الذکر صراط مستقیم کی نشاندہی کرتی ہے اور ثانی الذکر گمراہی اور ضلالت کی راہنما ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا تمغہ عنایت کیا ہے۔ فہم و شعور ارزانی فرمایا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ " اہور فرد " کو اپنا رہبر بنائے اور " اہریمن " سے کلیتہً اجتناب و بعد کی صورتیں اختیار کرے۔

ابتدائے آفرینش ہی سے نور و ظلمت کا، نیکی و بدی کا، ترقی و زوال کا، دن و رات کا، ہستی و نیستی کا، زندگی و موت کا، ساتھ ہے۔ عمل اور ردّ عمل کے اثرات کل عالم کو محیط کئے ہوئے ہیں۔ ایزد تعالیٰ نے انسان کو شعور و فہم کی دولت سے نواز کر اپنی صناعی کا کامل مظہر بنایا ہے۔ اور یہ کہنا از بس مناسب ہے کہ انسان آفریدگار کائنات کی بے نظیر و بے مثل صناعیوں کا شہکار ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے پرہیز کرے، نیکی کا بدی پر تفوق یا بدی کا نیکی پر غلبہ یہ سب انسان کی مستقل مزاجی یا کمزوری کا نتیجہ ہے۔

ان دو طاقتوں کو زرتشتی مذہب میں بڑی اہمیت حاصل ہے اوژ گاتھا " میں بھی " اہور فرد " کی پیروی اور " اہریمن " سے اجتناب کے بہترین اصول پیش کئے گئے ہیں۔

نوٹ .... یہ غلط فہمی عوام الناس میں پھیلی ہوئی ہے کہ " اہور فرد " اور " اہریمن " زرتشتی مذہب میں دو دیوتاؤں کے نام ہیں جن کے پرستار زرتشتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ زرتشتی مذہب میں دیوتاؤں یا بت پرستی کا تخیل ہی عنقا ہے اور اس مذہب میں از اوّل تا آخر وحدانیت کی تلقین کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ خیال مطلقاً بے اصل و لایعنی ہے۔ البتہ زرتشتیوں کی مذہبی کتابوں میں " اہور فرد " اور " اہریمن " کا ذکر آتا ہے۔ انہیں دو طاقتوں پر نظام عالم قائم ہے۔ زرتشتی مذہب میں اللہ تعالیٰ کے ایک سو ایک نام ہیں جن میں " اہور فرد " بھی ایک نام ہے جس کے معنی ہیں " خالق حیات " .... زندگی بخشنے والا۔!!

دل لخت لخت

ہم اپنے شعلۂ سوزاں سے پھونک دیتے قفس — مگر قفس کی محبت سے ہو گئے بے بس — اختر انصاری

نام ساز خموشی، نہ سامِ ہنگامہ — امینِ جلوۂ منصور و دار ہیں ہم لوگ — فراق

آرزو اپنی چوب دکھائے تو! — یاس کی سختیاں مجھے منظور — اختر انصاری

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی! — ابھی حیات کے چہرے پہ آب و تاب نہیں — فراق

ہماری خاک کا ہر ذرہ دنیائے محبت ہے — ہمیں برباد بھی کرتے تو وہ برباد کیا کرتے — نامعلوم

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسن دو عالم سے — مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی — فیض

نگاہ التفات دوست کی قیمت کہاں ممکن — اگر دونوں جہاں دیکر بھی مل جائے تو سستی ہے — نامعلوم

رہ گیا غم بھی نامکمل سا — عمر گزری ہے کس شتابی سے — نامعلوم

فکر آسانی برائے امر مشکل چاہیئے — غم کی مہمانی تو آساں ہے مگر دل چاہیئے — ثاقب

جلوہ کردیتا ہے گم گشتہ حیرت مجھ کو — وہ جو ملتے ہیں تو ہستی میری کھو جاتی ہے — نامعلوم

دل میں ہے کچھ نظر سے ٹپکتا ہے اور کچھ — کتنی زمانہ ساز کسی کی نگاہ ہے

اک شوق دید ہے جو سب کچھ دکھا رہا ہے — کوئی نہ آ رہا ہے کوئی نہ جا رہا ہے

پہلے پہلے میں مزاج برق سے واقف نہ تھا — اب مجھے اپنا نشیمن خود جلانا آگیا

نہیں ہے ہمت بیں گر صبح بہار باغ تو یارب — قفس تک جاتے جاتے زندگی کی شام ہو جائے

"ج"

موسم گل

نزہت سلطانہ

طویل سردیوں کے افسردہ کن موسم کے بعد آغاز بہار کے نغمے باغ کی شادابیوں میں گونج اوٹھتے ہیں۔ پھولوں کی دلفریب خوشبو نارنگی کی پتیوں میں سرسرانے لگتی ہے اور آفتاب ایسی دلفریب تازگی سے جگمگاتا ہے جو موسم بہار کی خفیف سی بارش کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔

نسیم صباح کے جاں بخش جھونکے سنہری دھوپ کے ساتھ مل کر عجب طرح کا کیف پرور اثر پیدا کرتے ہوئے روپوش ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھئے پھول مسکرائے کلیاں شرما گیئں۔ بلبل نے بہار کا زمزمہ چھیڑ دیا۔ اس کے طلائی بربط کی جھنکار نے کنول کے شگوفوں میں سنہری مکھیوں کو بیدار کر دیا آسمان نے پھول برسائے زمین بہار اگلنے لگی، اس جانواز موسم میں خیال پرستوں کی مسرت نہ پوچھئے۔ شام کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہار ہر طرف مسکراتی پھر رہی ہے۔ نیلگوں آسمانوں کی بلندیوں پر چھائے ہوئے سفید بادلوں کے سایہ میں ابابیلوں کے غول محو پرواز ہیں۔ ابر کی سفیدیوں میں کہیں کہیں قوس کی رنگین دھاریاں سمندر میں تیرنے والے بجروں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔

آبشار کی جانب کھلی ہوئی لمبی دریچوں کے باہر یوکل کے دراز سائے اپنی گہری سنہریوں میں سیاہی کو چھپائے ہوئے لہراتے رہتے ہیں۔ آسمانوں اور زمینوں کے بے داغ حسن میں کوئی ایسا پوشیدہ راز ہے جو بعض وقت خواب آسا خیالوں کی دنیا میں کوئی نامعلوم سی ہلچل مچا دیتا ہے۔ قصر انجم کے بلند مرمریں ستونوں پر لپٹی ہوئی سنبل کی باریک ڈالیاں خوشنما غنچوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔ شیراز اپنے وارفتہ انداز میں نرگس اور فرن کی پتیاں چن چن کر گلدستے بنایا کرتی ہے۔ اپنے ہونٹ سے ہونٹ چپکائے بوڑھا مالی بدستور شفتالو اور سیب کے درختوں کو سینچا کرتا ہے۔ رنگین شام کے اس خواب آلودہ منظر میں اپنی خوبصورتی با شکفتہ نباتی

ہوئی میں باغ کے دوسری جانب نکل آتی ہوں جہاں بادام کے درختوں کی اوٹ میں دریا کی لمبی لہروں کے درمیان پتیوں کے سائے ناچا کرتے ہیں اور سنہری ریت کے ذروں میں مولسری کی سفید باریک کلیاں بکھر کر اپنا حسن نمایاں کر دیتی ہیں اس وقت کوئی دلنواز یاد کسی چھپی ہوئی پھانس کی طرح آہستہ آہستہ میرے دل کی گہرائیوں میں نشترِ غم چبھانے لگتی ہے جب شفق کی سرخیاں نہر شمروک کے سرسبز کناروں پر مچل جاتی ہیں۔ آفتاب کی بلند شعاعیں گلاب کے زرد پھولوں پر سونا بکھیرتی ہوئی دریا کی لہروں میں گم ہو جاتی ہیں۔ یاسمن کی ابرگوں کلیاں بیتاب ہو کر مسکرانے لگتی ہیں کائنات پوری تابانی سے جگمگا اٹھتی ہے اور نہ جانے کن پوشیدہ خیالوں کے زیر اثر پرانے ملاح اپنی چھوٹی خوبصورت کشتیاں تیزی سے ساحلوں کی طرف لے آتے ہیں۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی دھندلی کرنوں کے سایہ میں کسی شکستہ دل پرندے کا پُرسوز نغمہ بہار کی مسرتوں پر سے بقا کا نقاب چاک کرتا ہوا خاموش ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں اپنے دامن کو خوشنما رنگین

پھولوں سے خوب بھر لیتی ہوں اور دبے پاؤں گورستان کازران کی جانب پتلی پگڈنڈیوں پر ہوتی ہوئی اپنے مرغوب اور پسندیدہ دوستوں کے خوبصورت مزاروں کی طرف نکل آتی ہوں جنھیں شاید آپ نہیں جانتے۔ ہاں اسی بید مجنوں کے نیچے تو پیارے باپ بس خوب آسا جزیرہ میں آباد ہیں کیا آپ کو معلوم ہے یہی تو ہماری گم شدہ محبت کا اولین مرقد ہے۔ لیکن اب وہاں سے ہماری بیتاب محبت کا جواب نہیں آتا۔ ہمارے آنسوؤں ہمارے سسکیوں کی شاید ان کو بالکل خبر نہیں ہماری اداسی اور افسردگی کا بھی اب ان کو کوئی غم نہیں ہوتا۔ کس قدر گہری نیند ہے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بصد ادب مقدس دعائیں پڑھتی ہوئی دوزانو ہو کر ان پاک مرقدوں کو خوشبودار پھولوں سے لاد دیتی ہوں۔ یہاں از خود دورِ گزشتہ کے خاموش افسانے دل کی گہرائیوں میں اپنے ورق الٹتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن کی یاد میری خیال پرست روح پر کوئی نامعلوم سا خواب بن کر چھا جاتی ہے آہستہ آہستہ قلب کی خاموشیوں میں غم کا شعلہ بھڑکنے لگتا ہے۔ افسردہ خیالوں کی روشنی میں زندگی کے خوش کن افسانوں کی یاد چپ چاپ

جھلملانے لگتی ہے۔
اچانک صبر و شکیب کا کوئی بندھن نہ جانے کس طرح ٹوٹ جاتا ہے اور میری غمناک آنکھوں سے سیلاب اشک بہہ نکلتا ہے۔

حکم صدقہ

ابن عباسؓ ہیں راوی کہ رسول اکرمؐ
تھے معیت میں بلالؓ آپؐ کا بھرتے ہوئے دم
یہ گماں آپؐ کو گذرا صنفِ نازک نے
وعظ سے میرے اُٹھایا ہے بہت فائدہ کم
پھر زبانِ اثرِ فیض سے ارشاد ہوا
صدقہ دینے کا تھا اُس وعظ میں ذکرِ محکم
سُن کے احباب کہاں پیش کیا سب نے وہیں
چھلّے اور بالیاں جو کچھ ملا خدمت میں بہم
اس سے ثابت ہوئی یہ بات کہ عورت اپنا
مال دے سکتی ہے صدقہ میں بلا اذنِ خصم

خواہش

ریحانہ

یوں تو خواہش ایک ایسا پانچ حرفی لفظ ہے کہ اس کو صرف زبان سے ادا کر لینے میں کوئی خاص جاذبیت نہیں۔ لیکن یہ کم بخت دل کہ ایک گوشہ میں ہمیشہ ہلچل مچائے رکھتی ہے انسان کے لئے یہ ایک عذاب جان ہے۔ یوں تو کم و بیش اکثر ایسی خواہشیں بھی ہیں جو زیادہ تر پوری ہوتی رہتی ہیں مگر زیادہ تر کا انجام حسرت ہے۔

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

اس چیز کو حضرت انسان جب دنیا میں پہلا قدم رکھتے ہیں جب بطور تحفہ اسے "تحفہ اولین" سب سے پہلے ساتھ لاتے ہیں۔ جیسے جیسے آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اس کی گدگداہٹ بڑھتی جاتی ہے اور آخر میں یہ عذاب جان ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیا غریب کیا امیر ہر فرد و بشر اس روز افزوں عادت پر مجبور ہے اب آپ ہی بتا دیجئے کہ اس کو کیونکر ترک کیا جائے۔
ایسا ہو نہیں سکتا، اور یہ ہے ایک مصیبت اگر پوری نہ ہو۔

انتظام خانہ داری

آصفیہ اسلطانہ

انتظام خانہ داری تو ہر عورت کا فرض ہے چاہے وہ امیر ہو یا غریب، عورت چاہے کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو اگر وہ امور خانہ داری سے ناواقف ہے تو اس کی تعلیم ادھوری ہی رہے گی۔

اکثر اسکول کی تعلیم یافتہ خواتین خانہ داری کے انتظام سے ناواقف ہوتی ہیں اور خانہ داری کا سب کام نوکروں پر ہی چھوڑ دیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر میں بڑی بد نظمی پھیلی رہتی ہے جب تک کہ گھر کی مالکہ بذات خود اس طرف توجہ نہ کرے گھر کا انتظام کبھی ٹھیک نہیں رہ سکتا اور نہ زندگی خوشحال گزر سکتی ہے۔ عموماً یہ دیکھا جا رہا ہے کہ آج کل اکثر خواتین اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر مثلاً کلبوں، پارٹیوں اور سینماؤں وغیرہ میں گزارتی ہیں گھر سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

حالانکہ گھر بھی عورت کے لئے ایک سلطنت کے مماثل ہے جس کے انتظام کی اس پر اہم ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ اکثر خواتین اپنی اتنی اہم ذمہ داریوں سے ناآشنا ہیں۔ اگر عورت چاہے تو اپنی خوش اسلوبی سے گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے ورنہ گھر جہنم بن جاتا ہے۔

ایک عورت کی فرض شناسی اور حسن انتظام سے ایک خاندان کی زندگی سنور جاتی ہے اور عورت ہی کی بد نظمی و لاپرواہی کی وجہ سے ایک خاندان کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے والدین کا فرض ہے کہ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ عمدہ تربیت بھی کریں اور امور خانہ داری سے کما حقہ واقف کرائیں تاکہ وہ اپنی آئندہ زندگی کو خوشگوار طریقہ پر گزار سکیں اور مستقبل میں کامیاب بیوی ثابت ہوں۔

اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں بھی اس عنصر کو لازمی قرار دیا جانا چاہئے کیونکہ لڑکی کے لئے ازدواجی زندگی میں یہ بہت ہی اہم چیز ہے۔

خواتین کا کام ہے کہ وہ اپنے حقیقی فرائض کو سمجھ کر ذمہ داریوں کو محسوس کریں تاکہ ان کی اور ان کے خاندان کی زندگی اطمینان اور خوشی سے بسر ہو۔

ناہید

۱۳۴۲ف میں شہاب کا پہلا پرچہ بڑی امیدوں اور توقعات لئے ہوئے شائع ہوا اس کے پانچ چھ سال بعد خواتین اور کالج وغیرہ کے لڑکیوں نے اصرار کیا کہ کوئی ایسی صورت نکالی جائے کہ شہاب کے نسوانی حصہ سے باسانی استفادہ کیا جائے کیونکہ موجودہ چندہ (للعہ) سالانہ اون کے لئے زیادہ ہے اور اس حصہ کی کامیابی اور توسیع اشاعت میں بڑے بڑے وعدے کئے گئے غور و فکر کے بعد شہاب ناہید کی اشاعت علیحدہ عمل میں آئی اور (عاں) چندہ مقرر کیا گیا جس کو آج آٹھ سال ہونے میں لیکن بلحاظ اشاعت وہ ایک انچ بھی آگے بڑھ نہ سکا - اور اب اس کے اخراجات ہمارے لئے ناقابل برداشت ثابت ہو رہے ہیں ختم سال کے لئے مہر آبان دو مہینے باقی ہیں - اگر اس عرصہ میں ناہید کی اشاعت ہمارے مفروضہ حد تک پہنچ جائے تو یہ ہمیشہ جاری رہ سکیگا - ورنہ آذر ۱۳۵۵ف سے اس کی اشاعت موقوف کر دی جائیگی - اس لئے ناہید کے خریدار یا تو مزید دو روپیہ بھجوا کر شہاب لیا کریں یا ناہید سے دست کش ہو جائیں -

رہا نسوانی مضامین وہ شہاب میں بدستور شائع ہوتے رہیں گے - البتہ افسوس اس کا ضرور ہے کہ ناہید میں کبھی کبھی نومشق لڑکیوں کے مضامین اون کی حوصلہ افزائی کے لئے درج کئے جاتے تھے کہ وہ مستقبل میں اچھا لکھ سکیں - لیکن اس کو کیا کیجئے کہ آپ کی جماعت نے ہماری اتنی بھی حوصلہ افزائی نہ کی کہ یہ جاری رہ سکتا - ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس دور میں سینما کا وہی عالم ہے لیکن مانع ہے تو ایک ادبی پرچہ کا بقا اور اوس کا گراں ترین چندہ - حالانکہ ایک مرتبہ آپ سب آمادہ ہو جائیں تو ناہید کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے - اردو سے اس قدر بے نیازی بڑی تکلیف دہ ہے کہ دکن کا واحد نسوانی پرچہ آج آپ کا شکوہ سنج ہے -

سلیقہ

آنسہ معصومہ جنگ بہادر

کون ایسا ہے جسے سلیقہ پسند نہیں جہاں کوئی گن ڈھنگ اور سلیقہ کی لڑکی نظر آئی بس سب کی باچھیں چڑ گیئں خواہ وہ اپنا ہو یا غیر سب یہی کہیں گے کہ بھئی کیا کہنا فلاں لڑکی کا ایسی سلیقہ مند ہے کہ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ہر ماں کی یہی کوشش رہتی ہے کہ ان کی لڑکیاں بھی سلیقہ مند ہوں چنانچہ ہماری امی کی بھی ہر وقت یہی خواہش رہتی ہے کہ ہم میں بھی گن ڈھنگ اور سلیقہ آئے ۔ لیکن نہ معلوم یہ سلیقہ وغیرہ کون سے ساتوں آسمانوں میں پوشیدہ ہے کہ کسی طرح میرے قبضہ میں نہیں آتا۔ اگر ایک دفعہ صرف ایک دفعہ میرے ہاتھ لگجائے تو ایسا دھر کے پکڑوں کہ پھر کبھی میرے قبضہ سے نہ نکل سکے۔

اور بھئی ہم کوئی ایسے بے ڈھنگے بھی تو نہیں جو امی ہمیں ہر وقت دوسری سلیقہ مند لڑکیوں کی مثال دیا کرتی ہیں ہم لاکھ اپنا ہنر اور سلیقہ دکھلائیں وہی گھر کی مرغی دال برابر والی مثل ہوتی ہے اور ہمارا بے بے ڈھنگا پن کیا ہے یہی نا کہ جب اسکول سے تھکے تھکائے واپس آئے تو جلدی جلدی کتابیں بجائے میز پر جاکر رکھنے کے کرسی پر پٹک دیں اور کپڑے بدل کر الگنی پر نہیں بلکہ کسی تخت پر یا پلنگ پر ہی ڈال دئے بھلا یہ بھی کوئی بے ڈھنگا پن ہے جو اتنی خفا ہوتی ہیں۔ اچھا آپ بتائیے آپ کیا کرتی ہیں۔ آپ بھی ضرور ایسا ہی کرتی ہوں گی۔

اور امی ہمارے بھائیوں کو کچھ نہیں کہتیں جو اول درجہ کے بے ڈھنگے ہیں۔ ان لوگوں کے کمرہ میں اگر بھولے سے چلے جاؤ تو پاتابوں کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا ہے کمرہ کیا ہوتا ہے پورا کباڑئے کی دکان لیکن وہ تو لڑکے ہیں ان کو سلیقہ وغیرہ سے کیا کام۔ یہ سب مصیبتیں تو ہم لڑکیوں کے حصہ میں ہی آئی ہیں کہ لڑکوں کی طرح پڑھو لکھو بھی سلیقہ اور ہنر بھی سیکھو۔ یہ لڑکیاں ہوکر تو ہماری مصیبت ہوگئی۔ دراصل سلیقہ ہے

بھی بڑی اچھی چیز اور مجھ کو بھی بیحد پسند ہے لیکن
اس کا کیا علاج کہ خود سلیقہ مجھ کو پسند نہیں
کرتا اور مجھ سے خفا ہے۔ جو کام بھی کرنا چاہتی
ہوں تو سب یہی کہتے ہیں کہ بیٹی یہ کام تم نہ
کرو ہی تو بہتر ہے۔ جہاں کسی بھائی کا کوئی
سیون لے بیٹھی کہ سب نے ستانا شروع کیا
ارے تم کیا سیو گی۔ بس بخشو بیچارے کپڑے
کی جان کو آپ بتائیے اس وقت مجھ کو کس قدر
غصہ آتا ہوگا۔ حالانکہ انہیں ناشکرے بھائیوں
کے کپڑے کئی وقت میں نے سیئے ہیں۔ سیون پر
ایک واقعہ یاد آگیا۔ بس اسی وقت سے ہم
سیون کے معاملہ میں بہت مشہور ہو گئے حالانکہ
یہ واقعہ کوئی تین سال قبل کا ہے۔ ہوا یہ کہ
ایک دن ہم نے امی سے کہا کہ سینما چلئے۔ لیکن
امی اپنی حسب عادت یہ کہتے ہوئے اپنی کسی
سہیلی سے ملنے چلی گئیں کہ بھئی وہ کھیل کچھ اچھا
نہیں اور تم لوگوں کے دیکھنے کا نہیں۔ امی کا
یہ صاف جواب سن کر تقریباً رونا سا آگیا اور
غصہ بھی بہت آیا کہ یہ فلم ڈائرکٹر بھی بڑے
بے ڈھنگے ہیں کہ انہیں سب کھیل سلیقہ سے
بنانا نہیں آتے ایسے کھیل ہی کیوں بنائے
جاتے ہیں جسے ہم نہ دیکھ سکیں۔ خیر بھئی امی تو
جا چکی تھیں ہمارا دل آج بہت گھبرا رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک تو منہ پھلائے بیٹھی رہی پھر ایکا
ایک خیال آیا کہ ارے امی کے بلاؤز کیوں نہ
سی دوں جو امی نے کل ہونیت کر رکھے ہیں۔
امی بھی خوش ہو جائیں گی اور وقت بھی گزر
جائیگا۔ بس یہ سوچ کر اٹھی اور جلدی سے
اٹیچی میں سے ایک بلاؤز نکال کر سینا
شروع کیا۔ شروع شروع میں نے مشین پر
سینا سیکھا تھا اس لئے بڑی مشکل ہو رہی
تھی کبھی تاگہ ٹوٹتا تو کبھی جھول آنے لگتا جب
غصہ آتا تو میں اپنا سارا غصہ بیچاری مشین پر
اتارتی غرضیکہ بڑی مشکل سے ایک بلاؤز پورا
ہوا، اب سی سلا کر دیکھتی ہوں تو ایک آستین
تو ٹھیک ہے اور دوسری لامبی اور پتلی ہو گئی
اور گلا تو کیا بتاؤں آپ کو اس میں بجائے
ایک سر کے دو سر آسانی سے جا سکتے تھے ابھی
میں مشین بند ہی کر رہی تھی کہ موٹر کے ہارن کی
آواز آئی میری تو جان ہی نکل گئی کہ امی آکر
اپنے بلاؤز کا یہ حشر دیکھیں گی تو نہ معلوم
میرا کیا حشر ہوگا۔ کیونکہ اس بلاؤز کا کپڑا
نہایت خوبصورت اور قیمتی تھا اور امی کا
خیال تھا کہ کسی اچھے درزی سے سلوائینگی
لیکن اس کی قیمت میں تو مجھ جیسی سوزن
کاری کی ماہر کے ہاتھوں سلنا تھا۔ میں مشین

بند ہی کر رہی تھی کہ امی آگئیں اور مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کیا سیا ہے تم نے مجبوراً مجھ کو کہنا ہی پڑا کہ آپ کا بلاوز۔ اس وقت نہ معلوم کون سی نیک ساعت تھی کہ امی نے کچھ نہ کہا اور نہ بلاوز بھی دیکھنے کے لئے کہا۔ لیکن آخر کبتک یہ بات چھپی رہتی۔ ایک دن اسکول کی چھٹی تھی میں اپنے کمرہ کی صفائی میں لگی ہوئی تھی کہ امی نے بلا بھیجا۔ ہم بڑی شان سے گنگناتے ہوئے امی کے پاس پہونچے دیکھتی کیا ہوں کہ امی سیون کی اٹیچی کھولے بیٹھی ہیں۔ اور سامنے میرا سیا ہوا بلاؤز رکھا ہے۔ بس آپ ہی اندازہ لگائیے میری اس وقت کی کیفیت کا۔ وہی زمین سخت اور آسمان دور والا مضمون تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کدھر بھاگ جاؤں۔ خیر۔ امی نے کہا کہ یہ بلاؤز تم نے سیا ہے؟ کس نے کہا تھا تمھیں سینے کے لئے؟ لو اب تمہاری یہ سزا ہے کہ دوسرا بلاؤز میرے سامنے ابھی سیو، تو تمھیں معلوم ہو کہ سیون کیسے کرتے ہیں۔ غرض کہ سارا دن ہمارا اسی میں گذرا کہ کبھی سی رہے ہیں اور کبھی ادھیڑ رہے ہیں جہاں کہیں جھول آیا سیونا ذرا ٹیڑھی ہوئی کہ امی نے پھر ادھڑوا کر سلوایا۔

اس روز سے تو کان پکڑے کہ اب کبھی امّی کی غیر موجودگی میں ان کا سیون نہ سیوں گی۔ یہ تھا وہ واقعہ جس سے ہم سلائی میں کافی مشہور ہو گئے۔ اب بھی یہ حالت ہے کہ جہاں کوئی سیون میں نے شروع کیا کہ سب لوگ ستانے لگے کہ بھئی بلاؤز کی طرح نہ سینا۔ غرضکہ رات دن اسی کوشش میں رہتی ہوں کہ میں بھی خوب سلیقہ مند اور سوگھڑ لڑکی کہلاؤں۔ میں بھی کوشش کرتی ہوں آپ لوگ بھی دعا کیجئے کہ خدا میرے مقصد میں مجھے کامیابی دے۔

بارہا عرض کیا گیا ہے بلا نام اور پتہ جو مضامین وصول ہوں گے اون پر کوئی توجہ نہیں کیجائیگی۔ ہم کو اس کا افسوس رہتا ہے کہ آپ کے مضامین ضائع جاتے ہیں اگر اظہار نام و پتہ میں آپ کو تامل ہے تو ہم پن نیم سے شائع کرنیکے لئے تیار ہیں لیکن دفتر کے معلومات کی حد تک تو نام و پتہ معلوم ہونا چاہئے کیونکہ بشیتر خطوط اور مضامین یوں ہی پڑے ہوئے ہیں امید کہ ہمیں معاف کیا جائیگا۔

راحت پسند ہستی کچھ کام کاج کر لے

بیحد اداس ہوں میں بالکل نراس ہوں میں
بیکار ہی گزارا یہ دن بھی آج میں نے
اٹھ کر نہیں سنوارا کچھ کام کاج میں نے
سوچا نہ کاہلی کا! کوئی علاج میں نے
ہمت دکھانے والے لوٹے ہیں کام کر کے
دامن خوشی سے بھر کے خوشیاں منا رہے ہیں
اور گیت گا رہے ہیں چپ چاپ سن رہا ہوں
اور سر کو دھن رہا ہوں خوش ہو کے اس طرح سے
گاتا نہیں کبھی میں اس خوشنما خوشی کی
پاتا نہیں کبھی میں میری اداس گھڑیاں
بیتاب ہو رہا ہوں چپ چاپ رو رہا ہوں
آنسو بہا رہا ہوں بے کار زندگی پر
بیمار زندگی پر لیکن ہے مدتوں سے
ایسا ہی حال میرا یہ دن یہ رات میرے
بڑھتے رہے ہمیشہ

گو خوشنما بہت ہیں خواب و خیال میرے
لیکن انھیں اگر میں تحفے کے طور پر ہی
اس در پہ لے کے جاؤں دربار میں دکھاؤں
تو دو جہاں کا آقا مجھ کو نکال دے گا

راحت پسند ہستی کچھ کام کاج کر لے

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲

کلید معرفت

دنیائے اُردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب جس میں دین زرتشت کی حقیقت و اصلیت کو نہایت مختصر اور سلجھی ہوئی زبان میں آشکارا کیا ہے حیدرآباد کی ایک زرتشتی الاصل خاتون کے روز قلم کا نتیجہ

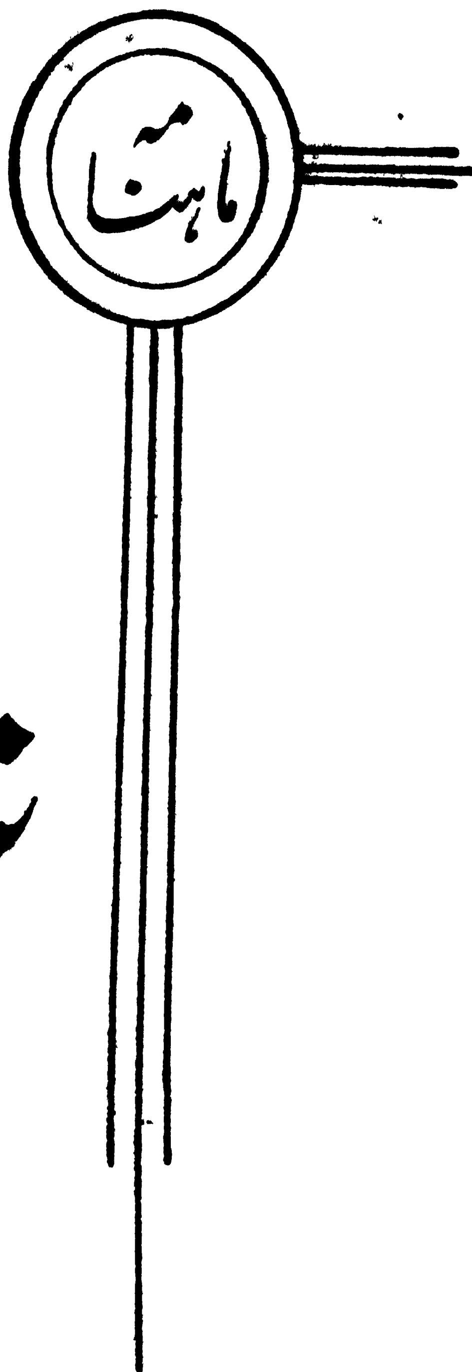
قیمت صرف ۸ر

(ملنے کا پتہ)

دکن بک ڈپو عابد روڈ حیدرآباد دکن

محمود شیین پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب بیرپور حیدرآباد سے شائع ہوا

جلد ۱۳ / ۱۱



شہاب

شہاب

جلد ۱۳ مہر سنہ ۱۳۵۴ف م اگست سنہ ۱۹۴۵ء نمبر ۱۱

(مرتبہ)

چندہ سالانہ (صہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

شاہ سراج اورنگ آبادی

جناب سید محمود صاحب مغربی

میر اور غالب اقلیم سخن کے شہنشاہ کہلاتے ہیں لیکن جب ہم سراج اور ان ہر دو خدایان سخن کے کلام کا ساتھ ساتھ مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ آسمان شاعری کے ان درخشاں ستاروں نے بھی اپنی تکمیل تابندگی کے لئے سراج سے کسب نور کیا ہے۔ میر کا ایک شعر ہے۔

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے   معشوق جو ہے اپنا باشندہ دکن کا تھا

قائم نے لکھا ہے کہ اس شعر سے میر کا اشارہ ولی اورنگ آبادی کی طرف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں ولی کا ذکر عقیدت کے ساتھ کیا ہے لیکن میر اور ولی کے کلام میں کوئی مماثلت یا مناسبت پائی نہیں جاتی۔ البتہ میر کے کلام کے حسین ترین پیکر سراج کے مرقع کلام میں موجود ہیں۔ سراج کے کلام کے متعلق میر کی رائے ہے کہ "سخن او خالی از مزہ نیست" اس لئے ممکن ہے کہ یہ شعر میر نے سراج ہی کی تعریف میں کہا ہو۔

میر اور سراج کی خصوصیات آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ دونوں کی افتاد طبیعت ایک تھی اور رجحان نفسی یکساں۔ دونوں قناعت و گوشہ نشینی کی طرف مائل تھے۔ دونوں کے دل شعریت اور سیمابیت سے مملو اور درد و گداختگی سے پر۔ دونوں شمع حسن کے پروانے اور عشق و محبت کے دیوانے تھے۔ شاہ سراج کی سرمستی اور بیخودی نے شاہ رحمٰن کو ڈھونڈ نکالا اور نوعمری ہی میں تنگنائے مجاز سے نکل کر شاہ راہ حقیقت پر گامزن ہو گئے۔ ابھی چوبیس سال ہی کی عمر تھی کہ اپنے پیر طریقت کی ہدایت کے بموجب شاعری سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ میر نے مرتے دم تک شاعری کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور اپنے گوہر مضامین سے اس کو مالا مال کرتے رہے۔ سراج کی اردو شاعری ۱۱۴۶ھ سے شروع اور ۱۱۵۱ھ میں ختم ہو گئی۔ ان کی شاعری کا زمانہ صرف پانچ سال رہا یعنی انیس سال کی عمر سے چوبیس سال کی عمر تک۔ میر نے بڑی عمر پائی تھی۔ قیاس غالب ہے کہ سراج کی شاعری کی انتہا میر کی شاعری کی ابتداء تھی۔ میر ۱۱۳۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۵ھ میں

نوت غالباً چودہ یا پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا ہوگا اس حساب سے تقریباً پچہتر سال تک ان کا اشہب قلم شاعری کے میدان میں جولانیاں دکھاتا رہا۔ ان کے افکار روحانی کی شراب کے لئے الفاظ و اسالیب کے پیمانے اکثر و بیشتر پہلے ہی سے موجود تھے۔ بخلاف اس کے سراج کو پیکران تخیل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ نئی نئی خلعتیں بھی تیار کرنی پڑیں۔ جو حالات و مواقع میر کو نصیب ہوئے اگر وہی سراج کو بھی حاصل ہوتے تو اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ ان کی شاعری کے عروج کی انتہا کیا ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ میر یاسیات کے مالک ہیں۔ اس خصوص میں اردو تو کیا فارسی میں بھی کوئی شاعر ان کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا محبوب اس دنیائے آب و گل کا مادی پیکر تھا۔ ان کے عشق و محبت کی داستان ناکامیوں اور محرومیوں پر منتہی ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر شعر یاس و حسرت کا ایک دردانگیز نغمہ بن کر رہ گیا۔ بخلاف اس کے سراج کی محبت اس مادی دنیا کے حدود سے بالاتر ہوچکی تھی۔ اس کے عشق کی پیاس اس عالم اجسام کے ماورا عرش سے پرے حسن کے ایک سرمدی چشمے کی متلاشی تھی۔ جذب و سلوک کی حالت میں اس پر مختلف عوالم طاری رہتے۔ کبھی انقباضی کیفیات رہتیں تو کبھی انبساطی واردات۔ یہی سبب ہے کہ اس کے کلام میں کہیں کہیں سوز کے ساتھ ساتھ ساز بھی پایا جاتا ہے۔

میر اور سراج کے کلام کے سرسری مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں کے کلام میں نہ صرف مضامین اور خیالات میں مطابقت پائی جاتی ہے بلکہ اکثر اشعار میں الفاظ کی ترکیب اور بیان کے اسلوب میں بھی یکسانیت نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ میر کے اشعار میں کئی مصرعے ایسے ملتے ہیں جو ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ سراج کے مصرعوں سے ٹکرا گئے ہیں۔ میر اور سراج کی کئی ہم طرح غزلیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر نے سراج کی غزلوں کو سامنے رکھ کر اپنی طبیعت کے زور کو آزمانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر محض یاد سے لکھے جاتے ہیں۔ اگر ان کے دواوین کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کر کے اشعار کا انتخاب کیا جائے تو نہ صرف ہمارے بیان کی تصدیق ہوگی بلکہ صاحبان ذوق کے لئے ایک دلچسپ مبحث نکل آئے گا۔

سراج اور میر کے تقابل سے ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ میر جیسے مسلم الثبوت استاد کے کلام کی

تنقیص کی جائے بلکہ ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ عام لوگ شاہ سراج کی شخصیت اور اس کے کمال شاعری سے واقف ہو جائیں۔

سراج کا شعر ہے :۔

دامن تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں — کیا خاک میں ملی ہیں میری جانفشانیاں

میر کہتے ہیں :۔

ظلم و ستم سے خون کیا پھر چھپا رہا! — برباد کیا گئی ہیں میری جانفشانیاں

دونوں نے حسرت و ناکامی کا ذکر کیا ہے۔ میر نے مصرعۂ ثانی میں صرف لفظاً محاورے کو بدل دیا ہے ورنہ پورا مصرعہ متوارد ہے۔ خیال کی نزاکت کے ساتھ ساتھ بیان کی صفائی اور اثر کے لحاظ سے سراج کا شعر بہت بلند ہے۔ میر نے دوسرے جگہ محاورہ تبدیل کئے بغیر اسی مصرعہ پر مصرعہ لگا کر ایک نیا مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی ہے :۔

مارا بھی ان نے سان کے غیروں میں مجھ کو میر — کیا خاک میں ملائیں میری جانفشانیاں

سراج ۔ جینے میں تم تو موت کی لذت چکھا چکے — جینے سے ہم بھی ہاتھ اٹھائے تم آچکے

میر ۔ آتے ہی آتے یہ دل ناکام ہو چکا! — واں کام ہی رہا تجھے یاں کام ہو چکا

دونوں شعر حیرت و یاس اور سوز و گداز کے پر درد نوحے ہیں۔ سادگی بیان اور صفائی زبان کے لحاظ سے ہر دو بے مثل۔ اسی مضمون کو میر نے ایک اور جگہ اس طرح باندھا ہے۔

آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے — اب آئے تم تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

سراج کا مقطع بھی سن لیجئے وہی انداز اور وہی سوز و گداز

دل سوزیاں سراج کی کرتے ہو تم عبث — جب شمع زندگی کو تم اس کے بجھا چکے

سراج :۔ گوہر اشک سب سمائے ہیں! — آج دامن وسیع ہے میرا

میر ۔ فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا — آج دامن وسیع ہے اس کا!

سراج کا شعر بہت معنی خیز ہے، روانی اور فصاحت کے ساتھ اسلوب بیان بھی نہایت دل آویز ہے۔ میر نے مصرعۂ ثانی میں صرف ضمیر کو بدل دیا ہے۔

سراج :۔ جو چڑھا دار پر ہوا منصور! — یہ محبت کی پہلی منزل ہے

میر۔ قدم دشت محبت میں نہ رکھ میرؔ — کہ سر جاتا ہے گام اولیں پر

طریقت و معرفت کا راستہ اختیار کرنا بڑے ظرف والوں کا کام ہے۔ اسی خیال کو سراج نے ایک اور شعر میں اس طرح ادا کیا ہے۔

ہر دم دم خنجر یہ سر جان سے گذرنا — اول قدم شوق ہے منزل کو ہمارے

سراج۔ دیوانے کو مت شور جنوں یاد دلاؤ — ہرگز نہ سناؤ اسے زنجیر کی آواز

میر۔ مجھ دوانے کی مت ہلا زنجیر — کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

دونوں شعروں کا مضمون اور الفاظ تقریباً ایک ہیں مگر بندش کی چستی اور جوش بیان کے لحاظ سے سراج کے شعر کا پلہ بھاری ہے۔

سراج۔ تری گلی کا نہیں عزم گر بہت دل جو — تو کیوں چلے ہیں مری آنکھ سے نکل آنسو

میر۔ تیری گلی کا جب ہم عزم سفر کریں گے — ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے

دونوں نے کوچۂ عشق کے مصائب اور دشوار گذاریوں کا ذکر کیا ہے۔ مضمون اور اثر کے لحاظ سے دونوں شعر لاجواب ہیں۔

سراج۔ خون دل آنسوؤں میں صرف ہوا — گر گئی یہ بھری گلابی بھی

میر۔ عمر بھر ہم رہے شرابی سے — دل پر خون کی اک گلابی سے

دل پر خون کی تشبیہ گلابی سے میر کی ایجاد نہیں بلکہ سراج ہی سے ماخوذ ہے۔

سراج۔ مکتب میں مرے جنوں کے مجنوں — نادان ہے طفل ابجدی ہے

میر۔ میرے سنگ مزار پر فرہاد — رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

خیال اور طرز بیان بالکل ایک ہے۔ عاشق اور اس کے متلازمات بدل دے گئے ہیں۔

سراج۔ خوردہ دنداں نما لازم نہیں لے بحر حسن — دیکھ بہہ جاتی رہے گی آن میں موتی کی آب

میر۔ مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشک آبدار — مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

میر کے مصرعۂ ثانی کی مطابقت اتفاقی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر نے سراج کے شعر کو سامنے رکھ کر اس کے مصرعہ پر گرہ لگائی ہے اور شعر میں ترمیم کر کے نہ صرف ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے بلکہ سراج کے مصرعہ کی بندش کو بھی چست کر دیا ہے۔ قدماء اس قسم کے تصرفات کو سرقات شعریہ میں شمار

نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو مستحسن سمجھتے تھے اور اس کا نام ابداع رکھا تھا۔

سراج :- نیم بسمل کسی کو حق نہ رکھے شکر للہ کہ ہم تمام ہوئے

میر :- رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی سو اس کی تیغ نے قصہ ہی انفصال کیا

لطافت ادا اور پاکیزگیٔ خیال کے لحاظ سے دونوں شعر بےمثل ہیں مگر سراج کے شعر میں نیم بسمل کی رعایت سے تمام ہوئے کا تضاد اور لطیف ایہام جو شعر میں بے ساختہ بلا قصد و ارادہ واقع ہو گیا ہے اس سے شعر کا درجہ بہت بلند ہو گیا ہے۔

چھوٹی بحروں میں شعرگوئی میر کی خاص خصوصیت خیال کیجاتی ہے۔ حالانکہ شاہ سراج بھی ان بحروں کی غواصی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ایسے ایسے افکار و معانی کے موتی نکالے ہیں کہ جن کی آب تاب کو دیکھ کر جوہریان سخن کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جن کی زبان، طرز بیان بے ساختگی، صفائی اور شستگی کو دیکھ کر میر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

دور کر دل سے نقش دانائی عاشقی میں کہاں ہے مرزائی

عشق ہے یا بلا قیامت ہے ایک جی پر ہزار رسوائی

دل آشفتہ کا میرے احوال اس کی زلف سیاہ سے پوچھو

زندگی اے سراج ماتم ہے! مجھ کو شمع مزار کی سوگند

یہ عجیب بات ہے کہ سراج کے کلام کا کچھ حصہ، سوز و گداز، قلبی واردات و کیفیات سادگی اور بے ساختگی کے لحاظ سے میر کے کلام سے لگا کھاتا ہے تو کچھ حصہ حکیمانہ اور عارفانہ حیثیت سے غالب کے کلام کے مماثل نظر آتا ہے۔ مرزا غالب میں شاہ سراج کی بہت سی خصوصیات مشترک پائی جاتی ہیں اور اکثر خصوصیات مضامین و خیالات کا اشتراک و اتحاد ایسا ہے کہ جس سے شبہ بلکہ یقین ہوتا ہے کہ غالب بھی سراج سے مستفیض ہوئے ہیں۔ بندش کی چستی، الفاظ کی شوکت، مضامین و تراکیب کی ندرت، تخیل کی رفعت، بیان کی پیچیدگی مرزا کی امتیازی خصوصیات ہیں جو سراج کے پاس بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ہم یہاں دونوں شاعروں کے ایسے اشعار پہلو بہ پہلو پیش کرتے ہیں جن سے نہ صرف اس بات کا پتہ چلے گا کہ غالب نے سراج سے استفادہ کیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوسکے کہ سراج مذکورۂ بالا خصوصیات کے کس حد تک حامل ہیں۔

سراج :- قبائے جامۂ دل دادخواہ کس کا ہے شہید زخم فرنگ نگاہ کس کا ہے

غالب :- نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

پہلے مصرعہ کا انداز بیان کس قدر ملتا جلتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ غالب نے سراج کے اسی مقطع سے اپنے مطلع دیوان کی راہ نکالی ہو ـــــ اسی غزل کا دوسرا شعر ہے۔

سراج :- نیاز و عجز و ارادت یہ سب میری تقصیر یہ ایک نگاہ تغافل گناہ کس کا ہے

غالب :- بے خود بوقت ذبح طپیدن گناہ من دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

دونوں شعروں کے مضمون کی مماثلت اور انداز بیان کی یکسانیت بالکل واضح ہے۔

سراج :- مت کرو شمع کو بدنام جلاتی وہ نہیں آپ سے ذوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا

غالب :- قفس و دام را گناہ نیست ریختن در نہاد بال و پر است

عشق کی تباہی کا ہیولیٰ خود اسی کی ذات میں موجود ہے۔ اس کا الزام حسن پر غلط ہے زبان اور الفاظ اگرچہ مختلف ہیں لیکن انداز بیان کس قدر مشابہ ہے۔

سراج :- کہا جب یار سے دیکھوں گا چہرا مجھے غصہ سے بولا بیٹھ منھ دیکھ

غالب :- چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

بیٹھ منھ دیکھ۔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے۔ ان دونوں فقروں کا استہزائی انداز بالکل ایک ہے۔

سراج :- ہنستا ہے کیوں جو تو نے میرا دل نہیں لیا معلوم ہو گئیں تیری نظر دل

غالب :- کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

خیال اور انداز بیان میں کس قدر مشابہت ہے۔

سراج :- پتھر بھی نہیں ہے شرر شوق سے خالی بے تابی نبض رگ خارہ کی خبر لو

غالب :- قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

دونوں نے محبت کی ہمہ گیری تبلائی۔ ہر دو شعر ایک ہی خیال کے حامل ہیں۔ بندش کی چستی۔ الفاظ کی شوکت۔ ترکیب کی ندرت۔ خیال کی رفعت کے لحاظ سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیجا سکتی۔

سراج :- ہے کچھ وصل میں گر شورش عاشق کو سراج فصل گل میں سبب نالہ بلبل کیا ہے

غالب :- گر ترے دل میں ہے خیال وصل میں شوق کا زوال — موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ شوق

وصل سے حقیقی عشق زائل نہیں ہوسکتا - یہ دونوں کا دعویٰ ہے - ہر ایک نے اپنے دعوی کے ثبوت میں ایک ایک تمثیل پیش کی ہے۔ سراج کی تمثیل نیچرل اور عام فہم ہے - لیکن غالب کی تمثیل پیچیدہ اور مبہم۔ سراج نے اسی مضمون کو ایک اور شعر میں بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس بیقراری کی ایک وجہ بھی بتلائی ہے۔

اگر چہ وصل میں ہوں ہم ہجر باقی ہے — قرار خاطر بے صبر کو کہاں آیا !

سراج :- دم مارنے کا عاشق بیدل کے جا نہیں — صحرا مثال خانۂ آئینہ تنگ ہے

غالب :- جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

دونوں نے تنگی صحرا کی شکایت کی ہے - غالب نے تماشہ بین کی حیثیت سے اور سراج نے خود تماشہ بن کر دونوں شعر طرز بیدل کے مکمل نمونے ہیں - غالب نے صحرا کو تنگی چشم حاسد سے اور سراج نے خانہ آئینہ سے تشبیہ دی ہے - ہر دو تشبیہات نادر اور لطیف ہیں مگر سراج کے شعر میں آئینہ کی رعائت سے دم مارنے کا لفظ بہت حسن انگیز اور معنی خیز ہے۔

سراج :- سر منصور ہے انگور نہیں — شجر دار کا پھل اور ہی ہے

غالب :- قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمایش ہے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

انسان بقدر مدارج عظمت ابتلا و آزمائش میں مبتلا رہتا ہے - دونوں نے اسی خیال کو پیش کیا ہے - ہر ایک کا انداز و اسلوب اپنی اپنی جگہ لاجواب ہے -

سراج :- اگر ثابت ہے لے دل کفر میں تو — قیامت میں بھی اقرار کرنا

غالب :- وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اپنی وضع کو مرنے تک نباہنا ہی انسانی عظمت کی دلیل ہے - دونوں شعروں میں اسی کی تلقین ہے -

سراج :- ہم شہیدوں پر ستم جیتے رہو ! — خوب کرتے ہو بجا کرتے ہو تم

غالب :- کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

مضمون اگرچہ مختلف ہے مگر طنزیہ اسلوب بالکل ایک ہے -

سراج :- آب رواں ہے حاصل عمر شتاب رو — دہر فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا

غالب :- رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے — نہ ہاتھ باگ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں
سراج :- قدرت کے بوستاں کا ہے گل جس کو دیکھئے — چاروں طرف بہار ہے کس کس کو دیکھئے
غالب :- صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے — طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھایئے
سراج :- ہمیشہ دور عالم مختلف ہے — کہ ہے گردش میں ہر دم نیلگو طاس
غالب :- رات دن گردش میں ہیں سات آسمان — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرایئں کیا

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد غالب اور سراج کے کلام کی یکسانیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے
تصوف مرزا اور سراج دونوں کے کلام کا اہم جزو ہے مگر مرزا کے حالات سے کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے اس میدان میں کوئی عملی قدم اٹھایا ہے۔ بخلاف اس کے سراج کی زندگی اس حقیقت کا آئینہ ہے جو چیز مرزا کے پاس قال ہے وہی سراج کے پاس حال ہے۔ اس لئے مرزا اس خصوص میں سراج کے مد مقابل نہیں ہو سکتے۔ اس میدان میں اگر کوئی شاعر سراج کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ میر درد کی مقدس ہستی ہے۔

فارسی تراکیب اور الفاظ تراشنے میں مرزا کو اردو زبان میں مجتہد کا درجہ دیا گیا ہے حالانکہ اس قسم کے تراکیب اور الفاظ سے سراج کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ مثلاً بیتابی نبض۔ رگ خارہ۔ فکر شرر افشانی دل، رگ برگ گل سودا۔ گوہر افشانی لب دریا، سبک روحانی معنی یہ تراکیب مفہوم و معانی کے لحاظ سے اپنے اندر وہی وسعت اور وہی ندرت رکھتی ہیں جو غالب کے فارسی تراکیب کا خاصہ ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ غالب نے اس خصوص میں سراج سے استفادہ نہیں کیا ہے، بلکہ دونوں کا ماخذ فارسی کلام ہے تو کم از کم یہ ماننا پڑے گا کہ اردو شاعری میں اس قسم کے الفاظ اور تراکیب کے استعمال کی اولیت کا سہرا سراج کے سر ہے اور یہ دکن کا شاعر جو آج سے ڈھائی سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ شمالی ہند کے خدائے سخن سے جس کے کلام کو وید کی طرح الہامی بتایا گیا ہے، طبعی میلان اور ذہنی رجحان میں کس قدر یکسانیت و ہم آہنگی رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ سہواً اس مرتبہ حضرت عطارد کی تنقید شائع نہ ہو سکی جس کے لئے ہماری معذرت پیش ہے۔

آرزو کی موت

جناب شوکت علی خاں صاحب ایم ۔ اے

اب ضبط نہیں ہو تا ۔ آخر کب تک چھپاؤں اور کیوں چھپاؤں؟ اس آگ میں جلتے پانچ برس بیت گئے میں نے اُف بھی نہ کی ۔ مجھے تمہارا خیال تھا ۔ تمہاری عزت کا، تمہاری پرمسرت زندگی کا، تمہاری گرہستی کا ۔ میں ان سب پر خاک اڑانا نہ چاہتا تھا ۔ مجھے تم سے والہانہ محبت تھی تمھیں خوش رکھنا اور خوش دیکھنا میرے جیون کا واحد مقصد تھا ۔ طلعت وہ دن تمھیں یاد نہیں جب ہم ساتھ رہا کرتے تھے ہنسی خوشی کے وہ دن رات کہاں چلے گئے؟ چاندنی راتوں میں پھولوں سے لدے ہوئے کنج میں بیٹھ کر کتنی بے سروپا باتیں کیا کرتے تھے ۔ دن میں گھنٹوں تاش کھیلتے، گراموفون بجاتے، ریڈیو سنتے اور کبھی بے خیالی میں کہہ اٹھتے ۔ ہم عمر بھر ساتھ رہیں گے ۔ کوئی ہم کو جدا نہ کر سکیگا ۔ تمھیں وہ دن بھی یاد ہے جب چھٹیاں ختم ہونے کی وجہ سے تم اپنے گھر جا رہی تھیں میں تم سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تم نہ آئیں ۔ مجھے اتنا دکھ ہوا تھا کہ میں نے تم سے بات چیت بند کر دی تھی ۔ جب رات کو ٹرین کا وقت ہو گیا اور تم اسٹیشن جانے لگیں تو میں بھی تمہارے ساتھ ہو گیا ۔ نہ جانے کیوں ۔ وہاں خاموش بیٹھے ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنی دیر تک دیوانوں کی طرح گھورتے رہے

انجن نے سیٹی دی ۔ تب ہمیں ہوش آیا ۔ چراغ کی تیز روشنی میں تمہاری پرنم جھلملاتی ہوئی آنکھیں کس قدر خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں ۔ تمہارا نکھرا ہوا رنگ یکایک کتنا زرد پڑ گیا تھا ۔ تمہارے کانپتے ہوئے ہونٹ کچھ کہنا چاہتے تھے پر کہہ نہ سکے تمہاری امی کو خدا حافظ کہہ کر میں اترنے ہی کو تھا کہ تم نے میرا ہاتھ تھام لیا ۔ تمہارے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے ۔ جی میں تو آئی کہ انھیں جھٹک کر ڈبہ سے اتر جاؤں ۔ مگر تم نے ایسی سحر انگیز نظروں سے دیکھا کہ میرا غصہ سرد پڑ گیا ۔ جذبات پھر شعلہ فگن ہو گئے ۔ ساگر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پھر تموج پیدا ہو گیا ۔ خاموش اور پرسکون فضا میں پھر آندھیاں آگئیں ۔ دل چاہ رہا تھا کہ تمھیں سینہ سے بھینچ لوں اور تمہارے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کو چوم کر بولوں طلعت جاؤ ۔ خدا حافظ مگر میں جھجک کر رہ گیا ۔ تمہاری امی جو سامنے بیٹھی ہوئی تھیں وہ کیا خیال کرتیں ۔ خیر تم نے ہی پہل کی اور کہا ۔ سلیم خدا حافظ ۔ بھول نہ جانا ۔

مجھے اس رات کو نیند ہی نہ آئی ۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ۔ میں تم کو بھول جاتا؟ میں دنیا کی ہر چیز کو فراموش کر سکتا تھا مگر تم کو نہیں ۔ خود فراموشی میں جانے میں کب تک روتا رہا ۔ صبح کو سب پوچھنے لگے ۔۔۔ رات بھر روتے رہے، شاید پریشان خواب

نظر آئے۔ میں نے بات ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔ ہاں۔ مگر بات دراصل یہ بھی۔ میں اس ڈر سے رو رہا تھا کہ کہیں سندر سپنے پریشان نہ ہو جائیں۔ تمہارے جانے کے بعد میری دنیا ایسی اداس ہو گئی کہ نہ پوچھو۔ یا تو دن بھر مذاق، دلگی، ٹھٹول، لطیفے، کہانیاں سنایا کرتے یا اب یہ کہ کسی نے منہ پر چپ کی مہر ہی لگا دی ہو۔ ہر وقت تنہا رہنے کو جی چاہتا۔ ہر وقت تمہارا تصور تنہائیوں میں ہنگامہ آرائیاں کرتا۔ پہروں باتیں ہوتیں۔ میں تم سے بار بار پوچھتا۔ طلعت! عمر بھر تم میری ہی رہو گی نا؟ تم شرما کر کہتیں۔ سو بار کہہ تو دیا۔ آخر تمہیں کب یقین آئیگا لیکن یہ گفتگو تصور ہی میں ہوتی۔ میں چاہتا تھا کہ ایک بار تم میرے سامنے اقرار کر لیتیں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ مگر وہ دن کبھی نہ آیا اسلئے کہ جب ہم دوبارہ ملے تو وہ اگلی سی بے تکلفی باقی نہ تھی۔ ہمارے درمیان حجاب کا ایک پردہ حائل ہو گیا تھا شاید ہم اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں زبان سے زیادہ آنکھیں خود بات کی ترجمانی کرتی ہیں جہاں بے زبانی زبان بن جاتی ہے جہاں خاموشی تکلم سے زیادہ پراثر ہوتی ہے جہاں لبوں سے زیادہ آنکھوں کی مسکراہٹیں دل کی گہرائیوں کو ٹٹولنے لگتی ہیں۔

طلعت! وہ پکنک بھی تمہیں یاد ہے پچاس میل موٹر میں جانا تھا میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ تم پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں ونڈ سکرین میں تمہارے حسین چہرے کو دیکھ کر طویل سفر کی تھکن محسوس ہی نہ ہوئی جب ہم منزل پر پہنچے تو کیمپ دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ندی کے کنارے ٹیلوں پر خیمے نصب کئے گئے تھے۔ ناؤ بھی تیار تھی۔ چاروں طرف جنگل تھے، ساگوان سے لدی ہوئی پہاڑیاں تھیں کہیں دھان کے لہلہاتے کھیت تھے کہیں چراگاہیں تھیں جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر چرواہے بنسری کی مست تانیں اڑا رہے تھے۔ بنسری کی تانیں، بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی ہیکلوں کی ٹنٹناہٹیں کوئل کی کوک، چڑیوں کے چہچہے، ہواؤں میں جنگلی پھولوں کی مہک کس قدر سہانا سمے تھا ناؤ میں بیٹھ کر ہم بہت دور نکل گئے تھے۔ شام کے سائے دراز ہونے لگے۔ تو فیروز گڑھ کے کھنڈر کتنے ڈراؤنے معلوم ہو رہے تھے اس قدیم قلعہ کا سایہ ندی کی لہروں پر کس وحشت سے کانپ رہا تھا جب ہم واپس ہوئے تھے تو سورج پہاڑوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا اور مغرب میں آگ سی لگی ہوئی تھی آسمان پر سنہری کرنوں کی لہریں دور دور تک پھیل گئی تھیں اور ابر کے بھورے بھورے ٹکڑے کسی گم گشتہ راہ قافلہ کی طرح بھٹک رہے تھے۔ رات کو پکنک سے لوٹے تو ہم دونوں کتنے خوش تھے تم نے خواہ مخواہ مجھے چھیڑنے کی خاطر کہا تھا "ہم کل شہر جا رہے ہیں" طلعت! جذبات کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے مغموم دیکھ کر تم گھبرا گئیں۔ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ شاید مجھے یقین دلانا چاہتی تھیں کہ تم نے صرف مذاق کیا تھا مگر میں بدستور تمہیں گم سم تکتا رہا۔ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے چھپانے کی کوشش کی پر تم نے دیکھ ہی لیا۔ میں کمرے سے اٹھ کر باہر چلا آیا۔ سارا گھر محو خواب تھا مگر زنانی ڈرائینگ روم کی لائٹ کھلی ہوئی تھی وہاں تمہاری اور ہماری امی جان کسی اہم مسئلہ پر گفتگو میں مستغرق تھیں کسی نے گویا میرے کانوں میں ہولے سے کہا ممکن ہو تو کہیں چھپ کر سن لو۔ تمہارے مستقبل کا فیصلہ آج ہو جائیگا بہت دیر تک سنتا رہا۔ مجھے چکر آنے لگا۔ ساری دنیا تاریک ہو گئی آسمان کے ہزاروں تارے سیاہ چادروں میں سمٹ گئے "طلعت کی شادی رفیق سے ہو جائیگی۔ اس سے بہتر بر نہیں مل سکتا"۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔ ریشمی نیلی ربن، سنہری بالوں کی لٹیں اور مرجھائے ہوئے پھول تمہاری نشانیاں تمہیں لوٹانے کے لئے تمہارے پاس آیا۔

تمہاری پرفسوں آنکھوں کے ڈورے کتنے سرخ ہو گئے تھے۔
"اتنی سی بات پر ناراض ہو گئے سلیم" "تمہیں کل جانا ہی
ہوگا" "وہ تو مذاق تھا" "میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤنگی"
"تمہیں جانا ہی چاہئے۔ یہ بھی ساتھ لیتی جاؤ" "یہ کیا؟"
تمہارے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ درد بھری
چیخ اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ اگر میں چاہتا تو
رفیق سے تمہاری شادی ہرگز نہ ہونے دیتا۔ میں تمہاری
خاطر جان پر بھی کھیل جانے تیار رہتا لیکن بعد میں مجھے معلوم
ہوا کہ تم کو رفیق سے محبت ہے۔ کہتے ہیں عشق میں آگ دونوں
طرف برابر لگی رہتی ہے یہ بالکل واہیات ہے، جھوٹ ہے، ہو سکتا
ہے کہ جس سے ہم محبت کرتے ہیں اس کو کسی اور سے محبت ہو،
اسی خیال سے میرے تمام ارادے ملیامیٹ ہو گئے ادھر تمہارا
گھر آباد ہو رہا تھا اور ادھر میں اپنے سینہ خانہ دل سے اٹھتے
ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں تم کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا
تھا اسلئے میں نے سوچا کہ اگر طلعت کو رفیق سے محبت ہے تو دونوں
کی شادی میں کاوش ڈالنا بیکار ہے۔ طلعت کو ہمیشہ خوش دیکھوں
یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ مجھے دکھ اسکا تھا کہ اگر تم میری
ہو جاتیں تو میں تم کو رفیق سے زیادہ خوش رکھ سکتا۔ افسوس!
انسان کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اس وقت اٹھتے ہیں جب سب
کچھ ہو چکتا ہے تمہاری شادی کے بہت دنوں بعد مجھے پتہ لگا کہ میں
ایک گہری سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ خاندان والوں نے مجھے
غلط باور کرایا کہ تمہیں رفیق سے محبت ہے ان کا ادعا یہ تھا کہ مجھے
تم سے نفرت ہو جائے اور میں ناصرہ سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاؤں
انکے نزدیک ناصرہ تم سے زیادہ خوبصورت سلیقہ شعار اور
میری رفیقۂ حیات بننے کی مستحق تھی۔ کاش! کوئی اسے میری نظر
سے دیکھتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے مجھے
پسند کرتی ہے۔ میرا بیحد خیال رکھتی ہے اسکے باوجود میرے دل میں
اس کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی اسلئے کہ
اس کی خاطر مجھے تم سے ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا گیا۔ میری ترش روئی
اور بے رخی سے اس کو بیحد صدمہ پہنچتا تھا بعض وقت اس کی
ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھ کر ترس بھی آجاتا اور میں سوچنے لگتا اس معصوم
سی جان نے بدلہ لینے میں کیا دھرا ہے۔ بہت دنوں تک میں اس
کشمکش و پیچ میں رہا کہ اس کو اپنا لوں یا نہیں۔ جب کبھی میں
کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کے قریب ہوتا تو تم میرے تصورات میں
سما جاتیں اور میں بکھر جاتا۔ بالآخر میں نے یہ تصفیہ کر ہی لیا کہ
ناصرہ میری شریک زندگی نہیں بنے گی۔ ناصرہ کیا؟ کوئی بھی نہیں
شادی ہونیکے دو سال بعد تم میرے گھر آئیں اور کئی بار آئیں
لیکن میں نے تم سے ملنے یا تمہیں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں تمہیں
بھول جانا چاہتا تھا سچ تو یہ ہے کہ میں تمہیں بھولتا جا رہا تھا۔
لیکن قدرت کو یہ گوارا نہیں کہ ہم اسے بھول جائیں جس سے صدمے پہنچے
ہوں کیونکہ اس بھول سے ہماری زندگی کو سکون و طمانیت میسر ہوتا
ہے۔ قدرت کو پرسکون اور مطمئن زندگی پسند نہیں وہ انسان کو ہمیشہ
کرب و اضطراب میں مبتلا دیکھنا چاہتی ہے۔ طلعت تمہیں وہ دن یاد ہے
جب دو سال بعد ہم نے ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھا تھا اف! اس مختصر
سے عرصہ میں تم کس قدر بدل گئی تھیں تمہارے بلوریں گالوں میں سیاہ
پوکا پڑا دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آگیا اس وقت مجھے احساس ہوا کہ

طلعت اب میری نہیں وہ کسی اور کی ہو چکی ہے میں ایسی گہری
آلودنگاہوں سے تمہیں دیکھا کہ تم گھبرا کر برآمدے میں چلی گئیں
جب میں بھی اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے تمہارے
قریب سے گزرا تو تم نے زیر لب کہا "سلیم"۔ میں حیران تھا کہ
تمہیں ابتک میرا نام کیسے یاد رہا۔ ناصر نے کئی بار کہا تھا۔
تمہیں مجھ سے نفرت ہے تم میری صورت دیکھنا پسند نہیں کرتیں
تمہیں میری طبیعت اور فطرت بھی ایک نظر نہیں بھاتی اور تمہارا خیال
ہے کہ میں دنیا میں کسی لڑکی کو بھی خوش نہ رکھ سکوں گا آہستہ
آہستہ یہ بات میرے دل میں اترتی گئی لیکن جب میں نے تمہیں دیکھا تو
میں نے ایسا محسوس کیا کہ مجھے غلط باور کرایا جا رہا تھا۔ ناصرہ کی
شادی کے بعد شاید تمہارے دل میں بھی ایسا ہی احساس پیدا ہوا ہو گا۔
طلعت وہ رات بھی مجھے یاد ہے جب تم سب کی نظریں بچا کر میرے
کمرہ میں چلی آئی تھیں "سلیم"۔ یہ دو سال میں تمہیں کیا ہو گیا
ہے۔ برسوں کے بیمار معلوم ہوتے ہو۔ تمہاری اداسی دیکھی نہیں جاتی
وہ دن یاد نہیں جب تم ہمیشہ خوش رہا کرتے تھے۔ تمہارے
مسکراتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر کبھی گمان تک نہ ہوتا تھا کہ ایک روز
اس پر غم کی بدلیاں چھا جائیں گی۔ میری قسم! بتاؤ تمہیں کس
بات کا دکھ ہے؟" اور میں بھی تم سے یہی پوچھنا چاہتا تھا۔
طلعت! یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے نازک ہونٹوں کا رس،
آنکھوں کی نورانی چمک، چہرے کی گلابی رنگت، جسم کا وہ حسین
تناسب کہاں ہے۔ رفیق تم سے محبت کرتا ہے کیا اس کی محبت کی
یہی نشانیاں ہیں؟"
مگر میں تمہارے جذبات کو ٹھیس نہ لگانا چاہتا تھا۔ رفیق سے

تمہیں بھی محبت تھی۔ اس کی شان میں یہ گستاخانہ کلمات سن کر
تمہیں ضرور رنج ہوتا۔ اسی لئے تمہارے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
"ناصرہ کسی اور کے گلے باندھ دی گئی اور تم خاموش بیٹھے
تماشہ دیکھا کئے۔ کیا محبت کا یہی انجام ہے۔ میرے خون کے قطرے تمہارے
خنجر پر ابھی خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تم نے وہی خنجر ناصرہ
کے سینہ میں گھونپ دیا —— کیا اسکی نام محبت ہے؟ یہ کہاں
کا انصاف ہے؟ بتاؤ نا سلیم؟"
پورٹیکو میں رفیق کی موٹر آکر رکی اور اس کے ہارن کی آواز نے
تمہیں چونکا دیا۔ تم آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے بھاگ نکلیں۔
گویا کسی نے مدتوں کی راکھ شعلوں پر سے سمیٹ لی۔ میں سوچنے
لگا۔ او خدا! کیا طلعت رفیق سے خوش نہیں۔ کیا اس کو رفیق
سے محبت نہ تھی؟ اگر تھی تو پھر اس نے کیوں کہا کہ اس کے
خون کے قطرے ابھی میرے خنجر پر خشک نہیں ہوئے۔ میں نے تو اس کا
خون نہیں کیا۔ اس نے تو اپنی پسند سے شادی کی تھی پھر یہ شکوہ
شکایت مجھ سے کیوں؟
مہینوں بعد تم سے ملاقات ہوئی تو تم نے پھر وہی سوال دہرایا۔
"تم اتنے اداس کیوں ہو؟ میری ایک بات مانو گے؟ شادی
کر لو۔" "طلعت! میں شادی نہیں کروں گا۔ شادی
گڑیوں کا کھیل نہیں۔ دو دلوں کا میل ہے۔ مجروح
دل کسی اور سے میل نہیں کھا سکتا۔ میرے دل میں اب
کوئی ارمان نہیں۔ اب میں ایک چلتا پھرتا لاشہ ہوں۔
تم خوش ہو میرے لئے یہی کافی ہے میری خوشی کی فکر نہ کرو۔"
"میں خوش ہوں؟ —— میری بپتا کوئی کیا جانے۔"

دنیا کو دکھانے کے لئے خوش بننا ہی پڑتا ہے ورنہ لوگوں کی زبانیں بے لگام ہو جاتی ہیں۔"

"تم میرے جذبات سے بہت دنوں تک کھیلتی رہیں۔ اب بند کرو اس کھیل کو۔ تم یہ کہہ کر میری آنکھوں میں خاک نہیں جھونک سکتیں کہ میں خوش نہیں ہوں۔ کیا تم نے ناصرہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں رفیق سے محبت کرتی ہوں۔ کیا تم نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ سلیم دنیا کی کسی لڑکی کو خوش نہ رکھ سکے گا۔ اس گھر آنیوالی کے بھاگ پھوٹ جائیں گے۔ زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"میں نے کہا تھا؟ ناصرہ سے؟؟ اوہ!! اب میں سمجھی۔ ہم دونوں ایک گہری سازش کے شکار ہو گئے اوروں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تمھیں ناصرہ سے محبت ہے اور تم دونوں کی بچپن میں منگنی بھی ہو گئی ہے۔ میں نے جھوٹ کو سچ جانا اور تمھیں بہلانے کی کوشش کی چاہئے تو یہ تھا کہ پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے ہم ان غلط فہمیوں کو دُور کر لیتے۔"

طلعت! ایک دوسرے کی آنکھوں سے بہتے ہوئے دھارے کو ہم کتنی دیر تک دیکھتے رہے۔ تمھیں یاد ہے؟

تمھارے جانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ مجھے کسی ہمدم و غم خوار کی ضرورت ہے جس کے سحر انگیز قہقہوں سے میرے گھر کی لامتناہی خاموشیاں درہم برہم ہو جائیں۔ جس کی میٹھی میٹھی باتوں سے زندگی کی تلخیاں گھٹ جائیں اور جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے "سلیم! مجھے تم سے محبت ہے۔"

میں محبت کا بھوکا ہوں اور دنیا میں مجھے نفرت کے سوا کچھ نہیں ملا۔

سلطانہ خزاں رسیدہ چمن میں بہار کے پہلے جھونکے کی طرح میری اجڑی ہوئی دنیا میں آئی اور اس نے مجھے تم سے بہت زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کی۔ ہم دونوں کا میل جول اس قدر بڑھا کہ پھر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ شاید یہ بات اڑتی اڑتی تمہارے کانوں تک پہنچ گئی اور گاہے ماہے تم نے مذاق سے مجھ پر چوٹیں بھی کیں۔ سلطانہ کو اپنانے سے پہلے میں اس کی زبان سے یہ سننا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ آخر وہ گھڑی بھی آن پہنچی۔ اس کے بعد یکایک میرے خیالات نے پلٹا کھایا۔ جن الفاظ کو سننے کے لئے میرے کان بے چین اور روح بے قرار تھی سُن چکنے کے بعد سلطانہ کی محبت کا پارہ ایک دم اتر گیا۔

مرد مغرور ہوتا ہے۔ عورت کا اقرار محبت اس کے نزدیک اعتراف شکست کے مترادف ہوتا ہے۔ مرد کی نظروں میں اس عورت کی وقعت نہیں ہوتی جو اس کے آگے سرنگوں ہو جائے بلکہ وہ اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے جو اس کی مقاومت کرے وہ جتنا اس کو پرے دھکیلتی رہے گی وہ اتنا ہی اس کے قریب آنے کے لئے بیقرار ہوگا۔ سلطانہ نے ایسا

نہیں کیا۔ اس لئے وہ میری نظروں سے گر گئی۔ اسکے بعد ایسے واقعات وقوع پذیر ہوئے کہ ہم دونوں کے تعلقات بالکل ترک ہو گئے۔

میں سلطانہ کو بھی ناصرہ کی طرح بھول جانا چاہتا تھا۔ خواہ مخواہ کل تم نے بھولی بسری کہانی یاد دلا دی۔

" سلیم! تم نے سلطانہ کا بھی دل توڑ دیا؟"

" ہاں۔ ٹوٹے ہوئے دل مجھے بیحد پسند ہیں کیونکہ خود میرا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ میں ہر لڑکی سے اپنی تباہی کا انتقام لینا چاہتا ہوں"

" انتقام کی چکی میں بے گناہ ہوں کو کیوں پیستے ہو۔ انتقام مجھ سے لو۔ میں قصوروار ہوں۔ میں اپنی خطاؤں کی پاداش میں تمہاری ہر خواہش کو پورا کرنے تیار ہوں"

اس گفتگو کو تم بھول تو نہیں گئیں۔ یہ کل رات ہی کی بات ہے۔ ضرور یاد ہوگی۔ اس وقت میں نے تمہارے آخری جملہ کا جواب نہیں دیا تھا۔ جانتی ہو کیوں؟ انتقام مجھ کو تمھیں سے لینا چاہئے۔ میری بربادیوں کی ذمہ دار تم ہو، وہ دن گئے۔ جب کہ تمھیں خوش رکھنا اور خوش دیکھنا میری زندگی کی ایک ہی آرزو تھی۔ وہ اب باقی نہیں ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ زیست کے اندھیارے میں آرزو کی شمع فروزاں ہی نہیں۔ ایک آرزو کا چراغ اب بھی جل رہا ہے جو کسی وقت بھی تمھاری مطمئن زندگی کو آنچ لگا سکتا ہے۔ تم سے انتقام لینے کی آرزو کو پورا کر سکتا ہوں مگر کرنا نہیں چاہتا۔ اسی شمع کی لو کو دیکھ کر میں عمر بھر اس آگ کو یاد کرتا رہوں گا۔ جو تم نے میرے خرمن کو پانچ برس پہلے لگائی تھی۔ میں تم سے انتقام لینا نہیں چاہتا۔ آرزو کی تکمیل آرزو کی موت ہے۔

عرض نغمہ

بالائے بام تو آہی چکے۔ لیکن رعنائی سے اس قدر گریزاں لا لکھ ہونا تو یہ چاہئے۔

خبر دہید تبا راج حسن ہے یارا ں / بہ بزم یار بر آمد نقاب بکشود

اخفا کی کوششیں ہمیشہ بے سود ثابت ہوئی ہیں کیونکہ کھوج لگانے والے تو آسمان سے زیادہ بلند پروازی دکھاتے ہیں۔ بجلیاں کس طور پر چمک رہے ہیں۔ برق چمکے اور گم کردہ راہ اس کی تجلیوں میں اپنا راستہ تلاش نہ کرے ذرا مشکل ہے۔

آئندہ جب کبھی آئیے تو برافگندہ نقاب آئیے کہ نگاہیں خیرہ تو ہوں۔ ورنہ صریح مغالطہ کا اندیشہ رہتا ہے۔ بہادر للکار کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ چوری چھپے تیر چلانے میں کوئی لطف اور لذت نہیں کیونکہ نشانہ خطا کرتا ہے۔ تیر چلائیے تو بیباکانہ کہ ٹھیک نشانہ پہ بیٹھے اور صید اپنے زخموں پر بے اختیار پکار اٹھے۔

کہیں لگے نہ نظر اون کے دست بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

اغوا

(فسانہ)

جناب نیرؔ (امرت سر)

بٹی بازار عشوہ فروش عورتوں کے لئے مشہور ہے کہ جہاں شہر کے آوارہ مزاج نوجوان بن سنور کر شام کے وقت چکر کاٹا کرتے ہیں تاکہ بالاخانوں کی کھڑکیوں میں بیٹھنے والیوں کی نگاہوں میں جچ سکیں۔ نوران بائی جو بٹی کی رونق تھی اکثر اپنے ناز و عشوہ کی بدولت تاڑنے والوں کی نگاہوں کا مرکز بنی رہتی تھی۔ اس کے ہاں بڑے بڑے لوگ رقص و سرود سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے تھے، اور کئی نوجوانوں کی جائدادیں اس کے غمزہ و اشارہ کی نذر ہو چکی تھیں۔ نوران نے اگرچہ اپنے پیشہ کی بدولت لاکھوں روپے کمائے تھے۔ لیکن پھر بھی اس کی چشم حرص و آز بھرنے میں نہیں آتی تھی، اور وہ اپنی خوبصورتی اور خوش آوازی کی داد زیادہ سے زیادہ لوگوں سے لینا چاہتی تھی۔ جوں جوں اس کی عمر زیادہ ہوتی جاتی تھی اس کے انداز میں تکلف اور بناؤ سنگار میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ لیکن اس کا فانی حسن گلگونہ و غازہ کے بے پناہ استعمال کے باوجود روز بروز دغا دے رہا تھا جسے اس کے ناز و انداز بھی چھپا نہ سکتے تھے۔ ہوتے ہوتے اس کے سیاہ اور خوبصورت بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئیں اور کوئل کی سی باریک اور سریلی آواز کچھ بیٹھ سی گئی۔ جب اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اس کا حسن بتدریج جواب دے رہا ہے تو وہ مغموم اور اداس رہنے لگی۔ جب لوگ اس کی طرف سے بے اعتنائی کرنے لگے تو اس کے احساس حسن کو سخت صدمہ پہنچا۔ ایسی عورت کے لئے جس کے حسن کا شہرہ عام رہ چکا ہو اور جس نے اپنے نغموں سے دلوں پر حکومت کی ہو، لوگوں کی عدم توجہی پیغام موت سے کم نہیں ہوتی۔ فطرت سے کون لڑ سکتا ہے۔ لیکن خصلت بد ایسے میں سوسائٹی اور سماج سے انتقام لینے پر مجبور کرتی ہے۔ نوران کو اپنے قلبی محسوسات کو کم کرنے کے لئے ایک تدبیر سوجھی جو بازاری عورتوں کا شیوہ ہے، یعنی کہ کسی معصوم لڑکی کو اپنی جانشینی کے لئے تلاش کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی شہرت کو بحال رکھ سکے۔

(۲)

ایک صبح یہ "رات کی رانی" بستر سے نکلی۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اوٹھ کر غسل کیا۔ اور بہترین لباس و زیورات پہن کر باہر نکلنے کے لئے تیار ہوئی، دو ایک ریشمی رومال نکالے، کچھ مٹھائی منگوائی اور چند روپیہ لے کر اپنی بندگاڑی میں بیٹھ کر نکلی اور کافی دیر تک شہر میں گھومتی رہی۔ گاڑی ایک چوک میں سے گذر رہی تھی۔ اچانک اس کی متجسس نگاہ ایک کمسن لڑکی پر پڑی جو بازار میں کھیلتی تھی اور گا بھی رہی تھی۔ چھ سات سالہ خوبصورت معصوم، آواز میں سوز کے ساتھ ایک قسم کا درد تھا لوچ، نورن پھڑک اٹھی۔ اسے معاً یہ خیال آیا کہ اگر یہ لڑکی اسے مل جائے تو وہ اسے "تعلیم" دیکر حسن و نغمہ کی ملکہ بنا سکتی ہے۔

اس نے کوچوان کو گاڑی ٹھیرانے کے لئے کہا اور اشارے سے لڑکی کو بلایا۔ لڑکی ڈر گئی کیونکہ گاڑی کے پیچھے دو تین بچے بیٹھے ہوئے تھے اور دو تین اپنے چہرے ہاتھوں میں چھپائے سڑک کے ایک کنارے کھڑے رو رہے تھے کیونکہ کوچوان نے ابھی ابھی انہیں گاڑی کی چھت کے اوپر سے چابک کے ساتھ پیٹا تھا۔ لڑکی بھی پٹنے کے خوف سے گھبرائی اور منہ بسور کر بولی

" نہیں نہیں میں گاڑی کے پیچھے نہیں تھی وہ تو دیکھو کئی لونڈے گاڑی سے چپکے ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہیں۔ میں نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

نورن۔ بیٹی! تو نہیں تھی۔ میں یہ جانتی ہوں۔

لڑکی۔ پھر آپ مجھے کیوں بلاتی ہیں؟ میں نہیں آؤں گی۔

نورن۔ بیٹی تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ (انگلی دکھا کر) دیکھو سامنے والی دکان سے میرے لئے پان لا دو۔

لڑکی آگے بڑھی۔ نورن نے اس کے خوبصورت چہرے کو قریب سے دیکھا۔ اس کا خیال درست تھا لڑکی گرد و غبار میں اٹی ہوئی تھی اس پر بھی لڑکی کا معصوم حسن بادل میں چھپے ہوئے چاند کی طرح نمودار تھا۔ لڑکی چلی گئی۔ دو تین منٹ کے بعد جب وہ پان لے کر آئی تو نورن نے اسے پیار کیا اور بازو پکڑ کر گاڑی کے اندر بٹھا لیا۔ لڑکی پہلے تو گھبرائی پھر سنبھلی۔ چاہتی تھی کہ جلدی سے اتر کر بھاگ جائے مگر نورن نے اسے روک لیا اور کہا "ادھر دیکھو"

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ ریشمی رومال پر مٹھائی بکھری ہوئی تھی۔

نورن نے اسے اٹھا کر زانو پر بٹھا لیا اور

اور مٹھائی کی ایک ڈلی اس کے منھ کی طرف
لیگئی۔ معصومہ کا منھ کھل گیا۔ پھر کیا تھا دو
تین ڈلیاں کھا گئی۔ نورن کا طعمہ مچھلی کے کانٹے
کی طرح اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اب وہ کہاں
جا سکتی تھی۔ گاڑی نا معلوم رفتار سے چل
رہی تھی۔ لڑکی کے آگے سونے کے زیورات،
ہاتھ میں روپئے اور کھانے کی مٹھائی تھی۔
وہ اس فضا میں کھوگئی اور اسے معلوم بھی نہ
نہ ہو سکا کہ گھر سے کتنی دور اور کہاں پہنچ چکی ہے۔
ایک معصومہ کو گناہ کی خلیج میں کھینچنے
کی یہ پہلی کوشش تھی۔ نورن اسے بھینچ بھینچ
کر پیار کر رہی تھی۔

"بیٹی! تم بہت ہی بھولی بھالی اور
پیاری لڑکی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری
کھوئی ہوئی بھانجی تم ہی ہو جسے کسی شریر نے
میری نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ بتاؤ
تو تمہارا کوئی وارث بھی ہے؟"

بچی نے توتلی زبان میں کہا۔

"میرا باپ دوکان کرتا ہے اور ماں
مرچکی ہے۔"

نورن "سب واہیات۔ وہ شخص جو
تمہیں اپنی بیٹی کہہ کر پکارتا ہے ہرگز تمہارا باپ
نہیں ہو سکتا۔ تم تو میری بہن کی تصویر ہو۔
میری بھانجی ہو۔"

ذرا اور بھینچ کر

میری بچی! میں تو تمھیں مدت سے تلاش
کر رہی تھی۔ یہ لو سونے کی چوڑیاں یہ رومال،
یہ روپئے، دیکھو یہ سب کچھ تمہاری ماں مجھے
دے گئی تھی۔

لڑکی کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک
پیدا ہوئی۔ ایک غریب اور ننھی لڑکی پر یک
بیک اتنے گرانقدر تحفوں کی بارش۔ اس کی
معصوم آزادی کو چھیننے کے لئے کافی تھی، وہ
مخملیں اور ریشمی گدوں پر بیٹھ کر اور مٹھائی
سامنے دیکھ کر اپنے غریب باپ کو بھول گئی وہ
خوش تھی کہ پرانی اور امیر خالہ اسے مل گئی
اور اب وہ معمولی دکاندار کی بیٹی نہیں ہے۔

(۳)

گامی ایک کم مایہ دکاندار تھا جسے سودا سلف
بیچتے شام سے پہلے فرصت نہ ملتی تھی۔ وہ اس
قدر غریب تھا کہ آٹھ پہر میں صرف ایک دفعہ
اور وہ بھی شام کے وقت کھانا کھاتا تھا۔ جو
پس خوردہ رات کو بچ رہتا وہی صبح لڑکی کے
ناشتہ کا کام دیتا تھا۔

جب لڑکی شام کو واپس نہ آئی تو گامی
نے خیال کیا کہ کہیں بازار میں کھیل رہی ہوگی۔

چنانچہ وہ کھانے پکانے میں مصروف ہوگیا لیکن جب وہ رات گئے تک نہ آئی تو باپ کو فکر ہوئی اور وہ جستجو میں نکلا۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈا۔ ہمسایوں کے بچوں سے پوچھا۔ بازار میں دیکھا لیکن لڑکی کا کہیں سراغ نہ ملا۔ آدھی رات کے قریب وہ واپس آیا۔ بھوک پیاس مرچکی تھی۔ اکلوتی بیٹی جو اس کی آنکھوں کا نور، گھر کی رونق اور زندگی کا سہارا تھی، کھوگئی۔ اس کی حالت ابتر ہوگئی، اسے خیال آیا کہ معصوم اور خوبصورت لڑکی کو کسی نیک ارادے سے اغوا نہیں کیا گیا۔ وہ بہت گھبرایا مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ جو والدین ننھے بچوں کو گلی کوچوں میں آوارہ چھوڑ دیتے ہیں ان کا حال یہی ہوتا ہے جو بچے والدین کے سایہ عاطفت کو مصیبت سمجھ کر آزادی ڈھونڈتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ان کی شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں

گامی آخر ایک ہمسائے کو لے کر کوتوالی پہنچا۔ اور رپٹ لکھوادی۔ بس وہ یہی کر سکتا تھا۔ پولیس نے باضابطہ کاغذی کارروائی کی، مگر نتیجہ کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ وہ غریب تھا اور غریب کی کوئی مدد نہیں کرتا۔

(۴)

دن، ہفتے اور سال گذر گئے۔ مگر لڑکی نہ ملنی تھی نہ ملی۔ وہ بہت ہی مضمحل اور کبیدہ خاطر نظر آنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں دکانداری تباہ ہوگئی۔ چونکہ اس کا گھر گھاٹ کہیں نہ تھا اس لئے دکان ہی میں پڑا رہتا تھا صبح کواڑ کھول دیتا تھا اور رات کو بند کرلیتا تھا۔ بسا اوقات دروازہ کھلا ہی رہ جاتا تھا اور وہ اونگھتے اونگھتے سو جاتا اور صبح ہو جاتی۔

جوانی دیوانی ہوتی ہے اور دیوانہ پن کا لطف بھی جوانی ہی میں ہوتا ہے۔ مگر بوڑھاپے کی دیوانگی بے مزہ، اور وحشت کی لذتوں سے یکسر ناآشنا ہوتی ہے۔ وفور درد و کرب سے بیتاب ہوکر تڑپنا اور لوٹنا کہاں نصیب ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک سرد آہ یا آسمان کی طرف ایک مایوس نگاہ۔ اور بس یا سر بزانو ہوکر اس طرح غم و الم گھڑی ہے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح کردیتا۔

گامی کی زندگی اب غریب مزدور یا محنت کش دکاندار کی زندگی بھی نہ تھی، نہ کھانے کی فکر نہ تن کا ہوش۔ کسی نے کچھ دیدیا تو کھالیا ورنہ اللہ اللہ اور خیر صلا۔

کئی سال کے بعد ایک دن بازار میں لوگوں کا ٹھٹھ بندھ گیا جب ادھر سے ایک

فٹن گزری جس پر ایک نوخیز حسینہ ریشمی کپڑوں میں ملبوس بیٹھی ہوئی تھی۔ لوگ اس کے حسن وجمال اور اٹھتی جوانی کو دیکھ کر تعریفیں کر رہے تھے اور گردنیں لمبی کرکے دیکھتے تھے اور دیکھتے جاتے تھے۔

جب گاڑی بوڑھے گامی کی دکان کے سامنے سے گذری تو اسے اپنی کھوئی ہوئی ننھی یاد آئی جس کی تصویر اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگی جیسے سات برس گذشتہ کی ننھی اب حسن کی ملکہ بن کر گاڑی میں نکلی ہو۔ وہ کسی ناقابل بیان قوت سے آگے بڑھا اور لوگوں کے جم غفیر کو چیرتا ہوا گاڑی کے پاس پہنچا اور محبت پدری کے جوش میں گاڑی پر چڑھ گیا اور اس حسینہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔

"ننھی! آہ میری پیاری کھوئی ہوئی ننھی! تم آگئیں؟"

بازار میں ہنگامہ بپا ہوگیا۔ گامی لڑکی کو کھینچ رہا تھا اور لڑکی جو اپنی مری ہوئی ماں کی طرح بوڑھے باپ کو بھی بھول چکی تھی، چلا رہی تھی کہ میرا کوئی باپ نہیں اور خالہ نورن بائی کے سوا میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ اس نے اپنی خوبصورت اور بھرائی ہوئی آواز میں عوام سے اپیل کی کہ اسے خوفناک وحشی کے پنجے سے بچائیں۔

گامی پر کوچوان اور دوسرے لوگوں کے گھونسوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی مگر وہ برابر چلا رہا تھا کہ "یہ لڑکی میری بچی ننھی ہے جسے کسی نے چھ سات سال پہلے اغوا کرلیا تھا۔ میں اپنی جان دیدوں گا مگر اسے آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔"

معلوم نہیں بوڑھے کے کمزور جسم میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ وہ اکیلا بیسیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ شاید سات سالہ گذشتہ خاموش جنون اپنی تمام قوتیں بیک وقت جمع کرکے نبرد آزما ہوا تھا۔ لوگ اسے مارتے تھے اور وہ مار کھاتا تھا مگر ننھی کا بازو نہیں چھوڑتا تھا اور برابر چلاتا تھا کہ یہ میری بچی ہے۔

لیکن وہ دیوانہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی دردناک آہیں بے رحم ہجوم پر کچھ بھی اثر نہیں رکھیں گی اور لوگ اسے پاگل کہہ کر ٹال دیں گے۔

چند منٹوں کے بعد پولیس آپہنچی اور یہ معلوم کرکے کہ شہر کی مشہور رقاصہ کی بھانجی ایک بوڑھے وحشی کے پنجے میں ہے ایک

گامی کو گردن سے پکڑ کر خوب پیٹا۔ اس اثنا میں نورن بائی کو بھی خبر ہو گئی کہ اس کی منہ بولی بھانجی خطرہ میں ہے۔ وہ بھی مقام واردات پر آپہنچی اور بہت جلد معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔

لوگوں نے زبردستی نھنی کا بازو چھڑایا اور گامی کو پٹک پٹک کر اس قدر مارا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ اور نورن ہجوم کے ہمدردانہ شور و غل میں بھانجی کو اپنے گھر واپس لے گئی۔

(۵)

اب نورن زیادہ چوکس رہنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ گامی کے دردناک نالے ظاہر کرتے تھے کہ وہی نھنی کا باپ اور حقیقی وارث ہے۔ گامی نے دکان بالکل چھوڑ دی اور نورن کے مکان کے قرب و جوار میں دیوانہ وار پھرنے لگا۔ اسے مکان کے اندر جانے کا موقع نہیں ملتا تھا کیونکہ اب پولیس کا پہرہ مستقل طور پر لگ چکا تھا۔

جس طرح چاند کو دیکھ کر کتے بھونکتے ہیں اسی طرح گامی مکان کو دیکھ کر رو دیا اور گڑگڑایا کرتا تھا لیکن بے سود۔

عدالت میں اس کی کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی۔ اس کی درخواست بھی کوئی نہ لکھتا تھا۔ ایک دفعہ ایک تنگدست وکیل نے اس کا بہت سا اثاثہ لے کر درخواست لکھ کر عدالت میں گزاری لیکن وہ پہلی ہی پیشی میں مسترد ہو گئی۔ شہر کے معزز نورن کے طرفدار تھے اور وہ ان میں بہت ہی ہر دلعزیز تھی۔ دولت کی ہر جگہ قدر و منزلت ہے اس کے بغیر مظلوم کی فریاد کی بھی شنوائی نہیں ہو سکتی۔

جب گامی کے لئے تمام راستے مسدود ہو گئے اور اس کی غریبی انتہا کو پہنچ گئی کیونکہ اس نے کام کاج بالکل چھوڑ رکھا تھا تو اس نے اپنی دکان گروی رکھدی اور بہت سا روپیہ خرچ کر کے ایک بہت ہی پرانے عرضی نویس سے ایک درخواست صوبہ کے گورنر کے ذاتی نام پر بذریعہ رجسٹری بھیجی۔ جس میں سب واقعہ درج کر کے انصاف کے نام پر نہایت دردمندانہ لہجہ میں اپیل کی تھی۔

گورنر نے خوب سوچ بچار کے بعد ایک فاضل مجسٹریٹ کے ہاں عرضی بھیج دی اور حکم دیا کہ پوری طرح تحقیقات کرنے کے بعد مقدمہ کا فیصلہ صادر کیا جائے۔

(۶)

جس دن مجسٹریٹ نے درخواست کو زیر سماعت رکھا، عدالت کا کمرہ نورن بائی اور اس کی

خوبصورت بھانجی "ننھی جان" کے مداحوں سے بھرا ہوا تھا اور گامی تن تنہا اپنی وکالت آپ کر رہا تھا۔ کیونکہ شہر کا کوئی وکیل غریب کی طرف سے کھڑا ہونے کو تیار نہیں تھا۔ دنیا اور دولت ایک طرف تھی، غریبی اور بے بسی دوسری طرف لیکن اس دفعہ انصاف کو دھوکہ سے کچلا نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ عدالت گورنر کو جواب دہ تھی۔

مقدمہ کئی ہفتے چلتا رہا، نورن بائی کی طرف سے سینکڑوں گواہ گزرے جنھوں نے حلفیہ بیان دئے کہ ننھی، نورن کی بھانجی ہے اور اس کے مکان میں پیدا ہوئی اور پیدائش سے لے کر اس وقت تک اسی کی پرورش میں رہی، چند پیشہ ور دائیوں نے بھی شہادت دی کہ وہ ننھی کی پیدائش کے وقت موجود تھیں۔

لیکن گامی اس بات پر مصر تھا کہ ننھی اس کی بیٹی ہے جو اب "ننھی جان" کے نام سے مشہور ہے گامی نے نشان دہی کے طور پر بتایا کہ اس کی دائیں بغل کے نیچے بہت بڑا سیاہ داغ ہے گو اس کے پاس کوئی گواہ نہیں۔ لیکن پولیس کا دفتر بتائے گا کہ سات سال قبل کی رپورٹ موجود ہے۔ لیکن اس وقت تک پولیس کا ریکارڈ کہاں تھا؟ ایسے بیان پر کون اعتبار کرے گا۔ لوگوں پر یہ امر بدیہی تھا کہ اس آدمی کا دماغ چل گیا ہے، عام خیال تھا کہ اسے "پاگل خانہ" میں بھیج دیا جائے گا، اس کے لئے یہی کافی سزا ہے اور جوابی مقدمہ نہ چلایا جائے۔

عدالت کے سامنے ایک نہایت پیچیدہ مقدمہ تھا، گامی کے بیان کی صداقت روشن تھی، عدالت کو معلوم ہو چکا تھا کہ دوسری جانب کے گواہ سب کرائے کے ٹٹو ہیں اور جھوٹ بول رہے ہیں۔ لیکن قانون کی نظر میں واقعات کا ہونا ضروری ہے، شہادت لازمی ہے، محض احساسات خواہ وہ کتنے ہی سچے ہوں بیکار ثابت ہوتے ہیں۔

نورن کا یہ بیان کہ ننھی کی عمر پندرہ سال ہے جس کے لئے گواہ بھی موجود تھے اور گامی کا یہ کہنا کہ اس کی عمر صرف تیرہ سال ہے، متضاد تھے۔ ڈاکٹری معائنہ سے بھی کوئی تسلی بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر عدالت نے یوروپین افسروں کی حفاظت میں ننھی کو ایکسرے کے لئے بھیجا۔ کیونکہ یہی ایک امتحان صحیح حالات بتا سکتا تھا۔ اگرچہ لڑکی جس فضا میں پرورش پا رہی تھی، اس کی رُو سے واقعی پندرہ سال سے بھی زیادہ عمر کی معلوم ہوتی تھی۔

(۷)

ایکسرے کے معائنہ کا نتیجہ سر بمہر لفافہ میں عدالت کے روبرو میز پر پڑا تھا۔ نورن بائی

گامی۔ ننھی اور دوسرے لوگ عدالت میں پیش تھے۔ یکایک نورن کا کو جوان صغیرا حاضر ہوا۔ چند دن ہوئے اس کی اکلوتی بیٹی مر چکی تھی جس کی موت نے صغیرا کے دماغ میں یہ بات پیوست کر دی کہ اس کی یہ افتاد اغواء کے ظلم کی پاداش ہے۔ اس لئے وہ تائب ہو کر نہ صرف نورن سے علیحدگی چاہتا تھا بلکہ اس کے خلاف گواہی دینے کے لئے بھی مستعد ہو گیا اور آج بغیر کسی قسم کی انگیخت کے صرف ضمیر کی آواز سن کر عدالت میں حاضر ہوا اور وعدہ معافی لینے کے بعد حلفیہ بیان قلمبند کرا دیا۔ تقدیر نے پانسہ بدل دیا۔ نورن کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں اور جرم ثابت ہو گیا۔ بیسیوں کرائے کے گواہ صاف اڑ گئے۔ معائنہ کے نتیجہ نے بھی ثابت کر دیا کہ ننھی کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہیں۔

وہی لوگ جو نورن کے نام پر جان دیتے تھے اس کے خلاف ہو گئے۔ گو انہوں میں سے بھی کئی ایک بدل گئے، عدالت نے فیصلہ کو محفوظ رکھنے کی بجائے فوری حکم سنا دیا۔ نورن کو چار ہزار روپیہ جرمانہ اور دو سال قید با مشقت کی سزا دی۔ کئی دوسرے لوگوں کو بھی سزائیں ہوئیں۔

ننھی کو گامی کے حوالے کرتے وقت نصیحت کی گئی کہ وہ اس کی شادی کسی اچھے نوجوان سے ساتھ کر دے کیونکہ عیش و عشرت کی فضاء میں پلی ہوئی لڑکی غریب باپ کے گھر میں رہنے کے لئے مجبور نہیں کی جانی چاہیئے۔

گامی کا دماغ آن واحد میں صحیح ہو گیا اس کا انتقام لیا جا چکا تھا اس لئے اسے کسی قسم کی حجت نہ تھی۔ اس نے مشورہ پر عمل کیا اور ایک متمول نوجوان کے ساتھ ننھی کی شادی کر دی جو اسے دوسرے شہر گیا۔

غزل

جناب مسلم

جفا اگر نبود چہرۂ لطف کسے — رسد بہ بوالہوساں گر بہار لطف کسے

مرا بہ محفل اغیار بردہ دلشادم — کہ سوخت خرمن جانم ز شرار لطف کسے

رسید رنج بجانم ز خویش و بیگانہ — کنوں نماند مرا اعتبار لطف کسے

چگونہ روز و شب ہجر را بسر آرم — دل است مائل لیل و نہار لطف کسے

ہزار مرحبا گویم بہ رنج بے پایاں — خدنگ شادی ما پا بہار لطف کسے

اندو بپرس تو لطف نوازش دلہا — کسے کہ کرد دل و جان نثار لطف کسے

مگر اجل بشود چارہ ساز ما مسلم
کشیم تا بکجا انتظار لطف کسے

میرا مطالعہ

زینت ساجدہ بی۔ اے

بقول شوکت تھانوی میری زندگی کا فلسفہ ایک ہی اصول ہے اور وہ ہے بے اصولی۔ اب جو مطالعہ کی نسبت کہنا چاہتی ہوں تو صرف یہی یاد آتا ہے کہ زمانے نے میرے سامنے جو کر دیا میں نے بلا سوچے سمجھے اسے پڑھنا شروع کیا۔ اور اکثر تو ایسا ہوا ہے کہ میں نے بچپن کے انتہائی حماقت انگیز دور میں زمانہ کا اہم ترین شاہکار پڑھا ہے اور اب میں بچوں کی کہانیاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے سر و پا کہانی کو کہاں سے شروع کروں۔

ذرا پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

سب سے پہلے جس ادبی شخصیت سے میرا تعارف ہوا وہ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی تھی۔ جانے کیوں مولانا اسمٰعیل کے نام کے ساتھ ہی میرے ذہن کے پردہ پر ایک نہایت ہی عقیدت مآب بوڑھے کی تصویر کھینچ جاتی ہے جس کی بڑی سی سپید و نورانی داڑھی ہوتی۔ آنکھوں میں شفقت کی جھلکیاں۔ ہاتھوں میں رعشہ۔ اور اکثر میں نے سوچا تھا کہ جب کبھی یہ مجھ سے ملیں گے تو میں انہیں داد ضرور کہوں گی۔ ان کا سادہ و مشکل، سہل ممتنع شعر مجھے ابھی تک پیارا ہے۔

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

میں سمجھتی ہوں کہ آج تک اتنا جامع مگر آسان شعر کسی نے نہیں کہا۔ عمر کے ہر دور میں اعلیٰ و ادنیٰ سبھی قسم کے دماغوں کے لئے اس میں سوچ بچار کا سامان موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنا پہلی نثر کا سبق یاد آتا ہے "ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ باپ حقہ پی رہا ہے" — اب بھی جب میں کسی بچہ کو ماں کی گود میں ہمکتا دیکھتی ہوں تو وہ پورا سبق اپنی محبوبیت کے ساتھ یاد آجاتا ہے۔ بچپن میں مجھے پھول اخبار بہت پسند تھا۔ اور اب بھی ہے۔ گرمیوں کی سنسان اور طویل دوپہر میں جب میرے سارے ننھے ساتھی جھاڑوں پر چڑھنے اور کیریوں پر پتھر مارنے کی مشق کرتے تو میں یہی پھول اخبار پڑھا کرتی۔ کیونکہ مجھے جھاڑ چڑھنا کبھی نہ آیا۔ اور میں اس خفت کو پھول کے اوراق میں چھپایا کرتی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے

پھول کہانیوں کا پورا سیٹ پڑھ لیا۔ چالاک بچا، پہاڑی ماں، لال کرتی، گل بانو۔ سعد و سعید، شہزادہ عزیز، نل دمن وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو نہ پڑھی ہو۔ یہ پڑھ پڑھ کے مجھے معلوم ہوا کہ دنیا بہت وسیع ہے۔ خاموش جنگلوں اور سنسان بیابانوں سے پرے پریوں کی بستی ہے جہاں رنگ برنگے پروں والی حسین پریاں بستی ہیں اور ہماری دنیا کے خوبصورت انسانوں سے انہیں پیار ہوتا ہے آدم زاد اور پری زاد کے پریم بندھن سے جو کہانیاں بنتی ہیں وہ ہم جیسے معصوم بچوں کے لئے ہوتی ہیں اور اکثر اور بارہا ایسا ہوا کہ میں کہانیاں پڑھتے پڑھتے سو گئی ہوں اور رات بھر میں نے لالہ زار پرستانوں یا ویرانوں کے بھتنوں کے خواب دیکھے ہیں۔ مجھے ان خوابوں میں ہمیشہ انتظار رہا کہ کوئی پری اپنی تتلی جیسی نازک اور حسین باہوں میں مجھے چھپا کر اڑا لیجائے اور میں پرستانوں کی سیر کر آؤں۔ لیکن یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے۔ صرف خیال کر کے ہی رہ گئی۔

بہت جلد یہ پریوں اور شبستانوں کی کہانیوں والا دَور گذر گیا۔ میں نے اس قسم کی کئی کتابیں پڑھ لی تھیں پیام تعلیم، غنچہ اور اتالیق ادھر ادھر سے مل جاتے۔ میری جستجو کسی نئی منزل کی تلاش میں نئی پگڈنڈیوں پر لیجا رہی تھی آخر مجھے پتہ چلا۔ ارے یہ پریاں کچھ ہوتی نہیں۔ محض جھوٹ ہے۔ بچپن کی باتیں۔ اصل مزا اور دنیا کی وسعت تو جاسوسی کہانیوں میں ہوتی ہے۔ میں اب بھی یاد کرتی ہوں بچپن کی ان حماقتوں کو، تو میرا دل چپکے چپکے دھڑکنے لگتا ہے۔ اس دور میں میرا محبوب کردار بس بہرام چور تھا۔ کیسے کیسے طلسم تھے اس دنیا میں۔ جعل سازیاں، مکاریاں، فریب، دھوکا دہی، سب کچھ۔ جاسوسی کہانیوں میں میں نے کیا کیا نہیں پڑھا۔ بہرام کی فراری۔ بہرام کی گرفتاری، چالاک چور، جانباز قاتل، پوشیدہ خزانہ، نیلی چھتری، لال کھوڑ ـــــ ایک پیاس تھی کہ کسی طرح بجھتی ہی نہ تھی۔ میری نگاہوں میں کیا بتاؤں بہرام کیا تھا۔ کہنے کو چور ڈاکو، لیکن حقیقت میں نہایت شریف دلیر۔ اس کی تصویر اب بھی میری نظروں میں گھومتی ہے۔ تنومند جسم۔ دھوپ سے تپا ہوا رنگ، گٹھے ہوئے ہاتھ پاؤں جو ہزاروں کا گلا لمحوں میں گھونٹ سکیں۔ سینکڑوں کوس چلتے جائیں۔ پھر بھی تھکن محسوس نہ کریں۔ کشادہ سینہ جس میں کبھی خوف و ہراس کو جگہ نہ دینے والا دل دھڑکا کرتا

جس میں امیروں کے لئے نفرت وظلم اور غریبوں کے لئے رحم و ہمدردی ہوتی - اور آنکھیں! نہایت جاندار جو کبھی شرمندگی سے نہ جھکیں - یہ ڈاکو گرفتار ہوتا لیکن کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلتا - کڑیاں سینے پر ٹوٹ جاتیں - ہتھکڑیاں ہاتھوں میں بے دست وپا ہوتیں - اور بیڑیاں بجائے اسے باندھے رکھنے کے اس کے قدموں سے لپٹ کر چومتیں - میرے پاس یہ چور شریف تھا - اور میں چاہتی تھی کہ کتابی صفحوں کے سوا بھی یہ کہیں دیکھنے کو ملے - سڑکوں پر پولیس کی حراست میں گزرتے ہوئے قیدیوں کو میں نے بڑے شوق وارمان سے دیکھا ہے - کہ شاید ان میں ہی کہیں میرا خیالی ہیرو بہرام بھی ہو - لیکن یہ کبھی دکھائی نہ دیا - سب قیدی شکستہ، بزدل اور بدصورت ہوتے کسی کی آنکھ میں میں نے ہمت واستقلال اور جوانمردی نہ دیکھی -

ان کہانیوں کو پڑھ پڑھ کے بہت سارے الفاظ مجھے معلوم ہو گئے تھے - لیکن دو لفظ ہمیشہ مجھے دھوکا دیتے رہے - ایک ظلمت جو اکثر تہ خانوں یا اندھیرے کنوؤں کی تعریف میں استعمال ہوتا، اسے میں فرحت، نصرت قسم کا کوئی نام سمجھتی تھی - اور ایک دفعہ تو ایک بچی کا نام رکھنے کی میں نے صلاح بھی دی تھی - دوسرا لفظ کمین گاہ" تھا - اسے میں کینہ کا کوئی بھائی بند سمجھتی اور یہی خیال کرکے خوش ہوتی کہ یقیناً یہ کمینوں کے رہنے کی جگہ کا نام ہے - کیا حماقت تھی -

اسی جاسوسی کے سلسلہ میں میں نے تیرتھ رام فیروز پوری کی کتابیں، پیلا ہیرا، شہر کا بچھو وغیرہ بھی پڑھی تھیں - یہ دور بھی جلد ہی گذر گیا - میں نے ایک صاحب فہم وفراست سے سنا کہ" لاحول ولا قوۃ - یہ چوری چکاری کی کہانیاں بھی کوئی کہانیاں ہیں - فضول خر دماغی - پڑھنا ہے تو عظیم بیگ پڑھو - واللہ ہنساتے ہنساتے مارے ڈالتا ہے" اور میں نے بھی سوچا شاید یہی ہے - اس زمانہ میں مجھ سے ایک کلاس آگے پڑھنے والا مجھے اپنے سے بہت زیادہ عقلمند معلوم ہوتا اور میں ہر بات پر ایمان لانا فرض سمجھتی - یوں بھی دل کوئی نئی چیز ڈھونڈتا تھا - عظیم بیگ میرے لئے کچھ نئے نہ تھے - ساقی کے بہت پرانے پرچوں میں بھی میں نے ان کے مضمون دیکھے تھے - لیکن کبھی باقاعدہ پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا - اب جو میں نے پڑھنا شروع کیا تو بس - گھر پا بہادر - قل پوٹ، شریر بیوی، شہزوری، کمزوری، چکی نامہ

موج لطافت، روح ظرافت، کولتار حسینی
کی انگوٹھی، لوٹے کا راز، اور خدا جانے کیا
اور کیا۔ سبھی کچھ پڑھ گئی۔ اور ان کی موت
تک مسلسل پڑھتی رہی "زن" اور "لال
ہیرے" انھوں نے ادھورے لکھے تھے۔ اب تک
کولتار پسند ہے۔ ان کی کتابوں میں محض ہنسی ہی
ہی ہنسی نہ ہوتی۔ اُس وقت میری عمر کا لحاظ
کرتے بہت کچھ تھا۔ مسرت اطمینان اور شگفتگی۔
چلبلی لہر مجھ میں دوڑا کرتی۔ اسی اثنا میں
جب لڑکپن اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا صادق
حسین صدیقی اور شرر سے ملاقات ہوئی۔
اسلامی کہانیاں انھوں نے تاریخی ناولوں
میں سنائی تھیں۔ اب سوچتی ہوں تو محض
وقت خراب کیا۔ لیکن اس وقت انہیں
کتابوں کو میں نے جاگ جاگ کے پڑھا تھا۔
اسی کی وجہ بارہا ہم سنوں سے "کٹی" بھی
ہو جاتی تھی۔ بڑوں سے ڈانٹ اور ایک
آدھ چپت سے تواضع بھی ہوتی۔ لیکن
خبط چھوٹا پر نہ چھوٹا کہ ان دونوں کا خزانہ
خالی ہوگیا۔ سمرنا کا چاند، عرب کا چاند،
بہادر دلہن، فتح انطاکیہ، سعید و فلپانہ،
قیس ولبنیٰ، شہزادی عباسیہ صلیبی جنگ،
صلیبی جہاد، مقدس نازنین، آستانہ کی حور،
دلچسپ و دلکش، منصور موہنا، حسن انجلینا،
ملک العزیز ورجینا وغیرہ وغیرہ۔ ان کہانیوں
سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اسلامی
تاریخ سے کچھ کچھ واقفیت ہوگئی خواہ افسانوی
رنگ میں ہو، اور دوسرے یہ کہ زبان بھی کچھ
ٹھیک ہوگئی۔ صادق حسین کو کہانیاں سنانے
کا ڈھب معلوم تھا۔ شرر کی زبان بڑی نکھری
ستھری تھی۔ شاعرانہ نزاکت اور معنوی لطافت
والی لکھنوی زبان۔ یہ دونوں لکھنے والے
مجھے ہمیشہ تاریخ کے صفحات کی طرح پرانے
محسوس ہوئے۔

ایک صاحب کا تو ذکر ہی رہ گیا۔ وہی
عصمت کے اڈیٹر راشد الخیری مرحوم۔ ہائے
اللہ کیا رونے رلانے والا دل پایا تھا انھوں
نے۔ مجھے ان سے ہمدردی نہایت ہمدردی
ہوگئی تھی۔ اور اسی ہمدردی کے مارے ان پر
غور کرنا میں نے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں ان "مصور
غم" کے ساتھ ساتھ خود بھی نہ رونے لگوں۔
لیکن ان کو بھی کافی پڑھا ہے۔ صبح زندگی، شام
زندگی، شب زندگی، شب غم۔ امین کا دم
واپسیں، بیلہ میں میلہ۔ غدر کی ماری شہزادیاں،
اور نسیدہ کالال۔ ان کے پڑھنے سے دلی زیادہ
قریب محسوس ہوئی۔ تصویر تو ان کی دیکھی

دکھائی تھی ورنہ شاید میں انہیں غم کا مارا، مصیبت زدہ جو راہ ہے کا مجذوب سمجھتی۔ خدا جانے وہ اتنے غم زدہ کیوں تھے۔ دلی کی تہذیب کو میرے نزدیک دو شخصوں نے زندہ جاوید بنادیا۔ ایک تو یہی راشد الخیری اور دوسرے شمس العلماء، نذیر احمد۔ نذیر احمد تو ناول کے باوا آدم ٹھہرے۔ ان کا سازِ ور بیان اور بہاؤ بہت کم تحریروں میں ہے۔ مرآۃ العروس بنات النعش، توبۃ النصوح۔ فسانہ مبتلا اور رویائے صادقہ وغیرہ۔ ناول نویسی کا فن اب تو کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے پھر بھی ان کی جگہ انہیں کی ہے۔ بار بار انہیں پڑھنے کے بعد بھی کوئی تھکتا نہیں۔

لڑکپن گزر گیا۔ جیسے بچپن گزرا تھا نادانی و دانائی گلے ملنے لگے۔ ایسے میں سب سے پہلے جو میرے ہاتھ لگے وہ جدید افسانہ کے امام منشی پریم چند تھے۔ سلیس، سادہ، دکھ درد کا احساس رکھنے والا حسن کو بجائے اس کی چمک دمک کے ذاتی اوصاف سے پرکھنے والا۔ سوچتی ہوں پریم چند میں کیا نہ تھا۔ تو حیران ہو جاتی ہوں۔ میں نے جب کبھی ان کے بحر ادب میں غوطہ لگایا ہمیشہ کچھ نہ کچھ درِ یتیم ہاتھ لگے۔ میں نے انہیں سب کا سب پڑھا ہے۔ "پریم پچیسی"، "پریم چالیسی"، "چوگان ہستی"، "غبن"، "پردہ مجاز"، "فردوس خیال"، "بیوہ"، "بازارِ حسن"، "میدانِ عمل"، "گئو دان" وغیرہ۔ ان کے مختصر افسانے تو خیر اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ان کے تین ناول "میدانِ عمل"، "چوگان ہستی" اور "گئو دان" مجھے بہت پسند ہیں۔ ان کا پس منظر ایک وسیع دنیا ہے۔ جہاں شہر و دیہات، حسن و بدصورتی، بچپن و جوانی، شباب و پیری، دولت و مفلسی، حسن و عقل، دل و دماغ، سرمایہ دار و مزدور کی ـــــ زندگی کی ہر موڑ پر ٹکر ہوتی ہے۔ میرے خیال میں موجودہ ادب کو نئے رجحانات سے روشناس کرانے والی دنیا انہی پریم چند کی تخلیق ہے۔ ان کے کردار ادب میں لافانی حیثیت کے مالک ہیں۔ حقیقت و فن کاری کا اتنا صحیح امتزاج، اتنے معتدل طور پر شاید کسی کے ہاں نہیں۔ انھوں نے زندگی کی ساری حقیقتوں کو پیش کیا ہے۔ مگر حقیقت نگاری کے پیچھے فن کی لطافتوں کا خون نہیں کیا۔

ان کی نازک تشبیہوں اور حسین استعاروں کا لطف کہیں اور نہیں۔ ان کے کردار، ان کی دنیا اور خود یہ مجھے جانے پہچانے لگتے ہیں۔

ان میں ایک دلی لگاؤ سا ہے۔

ایم ۔ اسلم کا نام مجھے ضرور لینا چاہیئے لکھتے لکھتے ان کا اپنا ایک نیا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ اسکول کے زمانہ میں یہ اچھے لگتے تھے۔ اب ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ ناظمہ کی آپ بیتی ۔ تفسیر حیات ، کارزار حیات ، مہری ، نرگس ، رنگین نظارے سبھی پڑھ چکی۔ ان کے افسانوں میں "مرگ محبوب" مجھے بہت پسند ہے۔ اب ان کا فن زوال پذیر ہے۔ اب انہیں لکھنا بالکل چھوڑ دینا چاہیئے۔ لطف تو یہ کہ پڑھتے پڑھتے جو خیالی تصویر میں نے بنائی تھی وہ ان کی اصلی تصویر سے بہت ملتی جلتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں وہ ایک ہی طرز کے پیچھے پڑے ہیں۔

آخری یا موجودہ دور نیا ادب الا ہے۔ اور اس کے سوا آج کل میں کیا پڑھوں گی اس میں مجھے بیک وقت کئی پسند ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا خاص طرز ۔ راجندرا سنگھ بیدی کی "گالی" کرشن چندر کے بہت سے افسانے ۔ احمد ندیم قاسمی کی جوانی کا جنازہ سجاد ظہیر کی لندن کی ایک رات ۔ عصمت چغتائی کے بھول بھلیاں اور ضدی ۔ سعادت حسن منٹو کی گہری نگاہیں۔ مہندر ناتھ کی نازک ادائی، اپیندر ناتھ اشک کا ستاروں کے کھیل کنھیا لال کپور کا مزاح ۔ شوکت تھانوی کی شیش محل ۔ شفیق الرحمن کی کرنیں ـــــ غرض مجھے کیا پسند نہیں۔ ابھی تو یہ نیا ادب اپنے بچپن میں ہے۔ اگر ذرا سنبھل کر قدم اٹھائے تو آگے کیا بہت ہوگا۔

حجاب امتیاز علی کی ظالم محبت و ناتمام محبت مجھے پسند ہیں۔ مگر انہیں اب لکھنا فوراً ترک کر دینا چاہیئے۔ ان میں اب تھکن سی ہے۔ اور یہی لکھنے والے کا زوال ہے۔

نظم میں مجھے پرانے اور نئے یکساں پسند ہیں۔ جو شعر دل کے تار تار کو جھنجھنا دے ساز دل سے آہستہ آہستہ کھیلا کرے۔ کانوں میں خاموش موسیقیاں ابلتا رہے۔ ایک زمانہ تک یاد رہے اور تڑپاتا رہے۔ میں سمجھتی ہوں یہی شعر ہے۔

میر کی نازک خیالی۔ غالب کا رشک۔ مومن کی گہرائی ، درد کا تصوف قدماء میں مجھے بہت پسند ہے۔ اقبال ، جوش ، مخدوم ، تاثیر ، جذبی ۔ ن ۔ م ۔ راشد ۔ ندیم قاسمی نئے شعراء میں زیادہ پسند ہیں۔ اقبال کے متعلق کچھ کہنا بے کار ہے۔ ہاں فیض اور اختر انصاری کا ہر شعر مجھے بید پسند ہے۔

سنانے کو بہت زیادہ وقت چاہئے اور پھر ایسی الجھی الجھی کہانی کوئی سنائے بھی تو کہاں تک۔

یہ میرے مطالعہ کی مکمل تفسیر و تشریح نہیں، صرف ایک افسانوی رخ ہے۔ یوں پڑھنے کو میں نے سیاست، فلسفہ، نفسیات، تاریخ، تصوف، علم و ادب نقد و نظر سبھی پڑھے ہیں۔ تنقید کی حد تک تو صلاح الدین کی رائے مستند ہے۔ مجھے بچپن سے کہانیاں سننے اور شعر گنگنانے کا شوق رہا ہے اس لئے انہی کا میں نے زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ ابھی تک مستقل طور پر میں کچھ پسند نہ کر سکی۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ میری پسند کا دھارا سنجیدگی کی طرف مڑ جائے۔ ہمارے رجحانات بدلتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی ہم کچھ پسند کرتے ہیں کبھی کچھ۔ یہ ہمارا ذہنی ارتقاء ہے۔ اور یقیناً مجھے شرمانا نہ چاہئے۔ جب کچھ بھی معلوم نہ تھا اپنے آپ کو بہت زیادہ پڑھا لکھا سمجھتی تھی۔ اب اپنی کم علمی کا آپ ہی اعتراف ہے۔ اور سمجھتی تو کچھ بھی نہیں۔ جتنا زیادہ پڑھتی جاتی ہوں محسوس ہوتا ہے کہ علم کی منزل دور ہی دور ہے۔ بہت زیادہ دور۔ میں نے اس بحر ذخار کے کسی گھاٹ پر بھی پیاس نہیں بجھائی۔ ابھی تو صرف پانی کا نظارہ کیا ہے۔ اپنی اپنی ظرف کی بات ہے۔ ذوق و طلب کا ہے۔ مجھے رہ رہ کے احمد ندیم قاسمی کے الفاظ یاد آتے ہیں "شعر میری عصا ہے اور افسانہ زادِ راہ۔ منزل بہت دور سہی لیکن وہاں پہنچنا ضرور ہے اور اس کے لئے صرف پرخلوص دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

اور کبھی کبھی آس بندھ ہی جاتی ہے کہ چلنا میرا کام ہے منزل مل ہی جائیگی۔

غزل

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

الٰہی آفتیں جھیلے گراں بار ستم نکلے
کسی پر اپنا دل آئے کسی پر اپنا دم نکلے

بتا دیتے ہیں غیروں کو پتہ میرے تجسس کا
مرے قاتل، مرے دشمن، مرے نقش قدم نکلے

تمہیں سوچو، تمہیں سمجھو، تمہیں انصاف کہہ دو
زباں کے کون سچے، کون پابند قسم نکلے

قفس تک میرے یہ آئے زمانے کی ہوا دیکھے
گلستاں سے ذرا باہر نسیم صبحدم نکلے

تعجب کیا ہے بخشش پر ہماری تجھ کو اے زاہد
خطا وار محبت ہیں سزاوار کرم نکلے

عزیز اپنے بھی جب حال ہے یہ داغ کا مصرع
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

رنگینیاں جواب میں

آپ کی دل پرسی اور چارہ سازی کا اعتراف لیکن نئے طرز ستم کی وجہ سے بدگمانی کو کیا کروں
کہ اب آپ کو "ربط کرم" کا خیال ہی نہ رہا تو بھلا مجھے جراءت رندانہ کیونکر ہوتی۔
آپ بڑے کرم نواز اور فیض گستر سہی لیکن یہ آپ کا انوکھا طرز کرم ——؟ اللہ اللہ
زمانہ ساری گردشیں ختم کردے لیکن آپ ہمدردی کا ایک لفظ نہ لکھیں۔ آہیں کنگرۂ عرش سے
ٹکرائیں لیکن آپ کی طرف سے تلقین صبر بھی نہ ہو۔
آپ بھلا عرش چھوڑ کر فرش پر کیوں اترنے لگے ؎

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را   نو اگران نخوردہ گزند را چہ خبر؟

انتظار تھا کہ اب آپ ہمدردی کا کون سا دریا بہاتے اور طویل خاموشی کی وجہ بتاتے ہیں۔
بس سُن لی وہی گھسی پٹی وجہ ——! مجھے یاد نہ تھا لیکن آپ کیوں روش بندہ
پروری بھول گئے۔ ایمان کا دعویٰ کرنیوالوں نے "شیوۂ کافری" کیوں اختیار کرلیا ——؟
دل چاہتا ہے وہ سب کچھ کہدوں جو شوخ فلسفی شاعر نے "دربان" سے کہا تھا —— یلو ھے
وہ بیگانہ وشی ——؟ پھر ——
میرا دامن چھوڑئے اپنا گریباں پھاڑئے۔ آپ شہنشاہ وقت نہ سہی، لیکن اپنے وسیع دامن
کے بہار آفریں پھولوں اور ستاروں کو کیونکر چھپا سکتے ہیں ——؟
اگر آپ نہ بھی دینا چاہیں تو زبردستی وہ موتی لئے جا سکتے ہیں۔ آپ خدا تو ہیں نہیں کہ کوئی
ڈر جائے —— یا آپ کی جنت سے نکل جائے۔ آپ کے خوش آب "شبنمی موتیوں" کا شکریہ۔ لیکن
کاش اس "لڑائی سے پہلے" عنایت فرما سکتے۔ مفروضہ کتاب ——؟

کشتی کو خدا پر چھوڑ بھی دے کشتی کا خدا خود حافظ ہے   مشکل ہی نہیں گر موجوں میں بہتا ہوا ساحل آجائے

——؟ ——

بہ سرپرستی بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر

شہاب

ناہید

ناہید

جلد مہر ۱۳۵۴ف م ستمبر ۱۹۴۵ء نمبر ۱۱

۱- جرنلزم - وحیدہ عزیز نے بڑی دُور سے مضمون بھجوایا ہے۔ توقع ہے آئندہ بھی وہ اپنے خیالات سے خواتین دکن میں روشناس ہوں گی اور اپنے مضامین کا سلسلہ جاری رکھیں گی۔

۲- "وہ" - نورجہاں نے اس سے پہلے بھی لکھا ہے، اب کی دفعہ افسانہ بھجوایا ہے جو دلچسپ ضرور ہے۔

۳- دل لخت لخت، پڑھا کیجئے کہ یہ سلسلہ ہر مہینہ آپ کے ذوق کیلئے جاری رہے گا۔

۴- شکار - کار بیکاران اشت کیسے ہوگا جبکہ تیرہ فٹ لانبی اور زمین سے آدھ گز اونچی مگر ملا کرتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ اندیشہ "شاید کہ پلنگ خفتہ باشد" سے خالی نہیں۔

۵- استاین - جمیلہ بیگم (کلکتہ) نے پھر خامہ فرسائی شروع کی ہے۔ خدا کرے کہ یہ نگارش دراز ہو۔

۶- زہرہ سلطانہ سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ ان کا مضمون شائع نہ کرسکے۔ آئندہ مہینہ اس کی تلافی کی جائے گی۔ (ب)

جرنلزم

وحیدہ عزیز (ملتان)

دنیا کے ہر ملک میں آج جرنلزم کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اور بعض ممالک میں تو جرنلزم کی آواز حکومت کی پالیسی کی رہنمائی کرتی ہے جرنلزم میں وہ طاقت پنہاں ہے کہ اس کی آواز بڑی بڑی جابر حکومتوں کو لرزہ براندام کر دیتی ہے اور جس حکومت کو خوش نصیبی سے جرنلزم کی حمایت حاصل ہے اوس کی بنیادیں مضبوط ہیں اور اسے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں رہتا۔

جرنلزم کی طاقت کا راز اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ یہ عوام کے خیالات کی راہنمائی کرتا ہے اور اس لحاظ سے جرنلسٹ ملکی اور قومی تعمیر یا تخریب میں کافی دخل رکھتے ہیں جرنلزم کی اس اہمیت کے پیش نظر چاہئے تو یہ تھا کہ اس کے ادارے ہوتے جہاں اس کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام ہوتا۔ لیکن نہ معلوم کیوں اس شعبۂ تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ مغربی دنیا میں ہر جگہ اس کا انتظام موجود ہے لیکن جہاں ہندوستان کا تعلق ہے، نہ یہاں اس کی تعلیم کا احساس ہے نہ پبلک کو اس کا احساس۔

ہندوستان کا ہر شخص بغیر کسی روک ٹوک کے میدان صحافت میں قدم رکھ سکتا ہے۔ چاہے وہ اس کے لئے کس قدر ہی نااہل اور غیر موزوں کیوں نہ ہو۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کی گندی فضا کی ذمہ داری بہت حد تک اس قسم کے نااہل جرنلسٹوں پر عائد ہوتی ہے جو نہ جرنلزم کے اصولوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ہی تعلیم یافتہ ہیں لیکن وہ بدستور اپنی تحریروں سے اپنے پست خیالات کو جراثیم کی طرح عوام میں پھیلاتے رہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایک کامیاب جرنلسٹ کیلئے مشق کی از حد ضرورت ہے لیکن محض جرنلزم کی تعلیم ایک شخص کو صحیح معنوں میں کامیاب جرنلسٹ نہیں بنا سکتی۔ اگر ایک شخص اپنے آپ کو قوم اور ملک کیلئے مفید بنانا چاہتا ہے تو مشق اور تجربہ کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جرنلزم کے اصولوں سے بھی آگاہ ہو اور اس کی تعلیم سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتا ہو۔

افسوس ہے کہ جرنلزم کی تعلیم کے متعلق

متعدد یونیورسٹیوں میں عرصہ تک غور و خوض ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس وقت تک اس کا عملی نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ امریکہ میں جرنلزم نے ایک خاص حیثیت اختیار کر لی ہے۔ وہاں بہت سے پرائیویٹ اسکول ہیں، جہاں صحافت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان درسگاہوں میں سے ہر سال کئی سو مرد اور عورتیں ڈگریاں حاصل کر کے اخباروں کے دفتروں میں ملازم ہو جاتی ہیں اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

اسی طرح لندن میں "اسکول آف جرنلزم" ایک بہترین درسگاہ ہے۔ جہاں تحریر کے مختلف شعبوں مثلاً اخبار نگاری، مقالہ نویسی، تبصرہ، افسانہ نگاری، وغیرہ کی باقاعدہ مشق کرائی جاتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی صحافت کی باگ ڈور اکثر معمولی تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور اس سے ملک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر یہاں کی یونیورسٹیاں بھی اپنے یہاں جرنلزم کا کورس شامل کر کے صحافت کا معیار بڑھائیں یا بڑھانے میں معاونت کریں تو ملک میں ایک ایسی اہم خدمت انجام دی جا سکتی ہے جس کی مثال کہیں نہ مل سکیگی۔ جرنلزم کی تعلیم صرف اس حالت میں فائدہ مند ہو سکتی ہے کہ طالب علم کو ٹریننگ کے دوران میں مشق بھی کرائی جائے۔ اس کے علاوہ اقتصادی مضامین، خبروں کا چھانٹنا، مقالہ نگاری، مضمون اور افسانہ نویسی سے بھی پوری طرح واقف کرائی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرنلسٹ کسی خاص مضمون میں بھی ماہر ہو سکے گا اور اپنے پسندیدہ موضوع پر ہر وقت لکھنے کے قابل ہوگا۔ جرنلزم کے کورس میں ان باتوں کا ہونا بھی قوانین میں شامل ہو جو اخبارات اور رسائل سے تعلق رکھتے ہیں، تاکہ وہ لکھتے وقت انہیں سامنے رکھ سکیں۔ اور پریس کی آزادی سے حتی الامکان فائدہ اٹھا سکیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستان میں عورتوں نے ابھی تک اس پر توجہ نہیں دی۔ وقت آ گیا ہے کہ وہ ملک اور قوم کی بہبودی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں حصہ لیں اور ثابت کر دکھائیں کہ وہ یورپ کی عورتوں سے اس شعبہ میں بھی کسی طرح کم نہیں۔

"وہ"

نور جہاں سید احمد

آج راجہ دیپ چند کے اکلوتے لڑکے جیون کی چوبیسویں سالگرہ کے ڈنر میں میں مدعو تھی۔ جونہی موٹر گیٹ پر رکا، میں نے آخری دفعہ اپنے پرس کے آئینہ میں صورت دیکھی سب کچھ ٹھیک تھا۔ ساڑی کا پلو درست کرتی ہوئی میں اتر پڑی۔ ہال جگ مگ کر رہا تھا۔ فرش پر پیر پھسلے جاتے تھے میری آنکھوں کے سامنے تارے چمکنے لگے کہیں دور چھپا چھپایا ارغنوان دھیمے سروں میں بج رہا تھا میں نئی نئی قسم کی ساڑیوں انوکھی تراش کے بلوزوں کو تکتی چلی جا رہی تھی۔ مسٹر جیون چند نے کرسی پیش کی اور میں گھبراہٹ میں بغیر شکریہ ادا کئے ہی بیٹھ گئی اور دستی سے پسینہ کی ننھی ننھی بوندوں کو جذب کرنے لگی۔

راجہ دیپ چند کے سکریٹری مہمانوں کا تعارف کرانے لگے۔ آپ ہیں مسٹر نادھوکر پی۔ ایچ۔ ڈی اور آپ ڈاکٹر گھوش۔ یہ ہیں مسٹر جاوید آئی۔ سی۔ ایس۔ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی۔ سوسائٹی کی جان۔ کلب کی روح رواں ہم انہیں کرکٹ گراؤنڈ سے کھینچ لائے ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا اور بھی کئی لوگوں کا تعارف کراتے رہے مگر میری نظریں صرف اسی پر جم کر رہ گئیں۔ اتنی تمام خصوصیات کے باوجود کتنا لاپرواہ ہے جیسے بالکل معمولی انسان ہو اور میں نے دیکھا سارے ہال میں سوائے جاوید کے سب ہی سیاہ ڈنر سوٹ میں تھے۔ جاوید نے سفید پینٹ اور نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اور میں سوچنے لگی آج سب ہی کے لئے بجائے سیاہ ڈنر سوٹ کے سفید پینٹ اور نیلا شرٹ کیوں نہ مخصوص کر دیا گیا۔ اب کے جو میں چھٹیوں میں بمبئی جاؤں گی تو ڈیڈی سے کہہ کر شام کا لباس ایسا ہی سلوانے میں کیا ہرج ہے اور اس روز ڈنر اس قدر دلچسپ رہا کہ چاندی کے بوجھل کانٹے اور چمچے مجھے صرف کاغذ کے ہلکے پرزے معلوم ہونے لگے۔

ہمارے گھر کے غربی حصہ میں ایک چھوٹا سا پائین باغ ہے۔ اور پھر ہلکی ہلکی بارش کا موسم جھولنے میں مزا آتا ہے۔ میں نے جھولے

کے پاس کھڑی موتیے کے پھولوں کا گجرا بالوں میں گوندھنے میں مشغول تھی احسن بھیا بھی پاس ہی کھڑے تھے وہ ایک دم ہلو کہہ کر پلٹ گئے اور میری لگا ہوں میں ہزاروں دیپک روشن ہو گئے۔ ہر طرف اجالا پھیل گیا اور اسی بڑھتے ہوئے اجالے میں میں نے دیکھا وہ۔

وہی سفید پنٹ اور سبز قمیص میں ہاکی کا بلا لئے کھڑا ہے۔ میرے ہاتھ سے پھولوں کا گجرا چھوٹ گیا۔ اس نے بھی میری پریشانی دیکھ لی۔ نہایت لاپروائی سے اس نے میری طرف پیٹھ کر دی اور بھیا کا ہاتھ کھینچ کر کہا "احسن چلو آج لاہور ٹیم سے فائنل ہے۔ تمہاری سیٹ ریزرو ہے میں سنٹر کھیل رہا ہوں" اور بھیا کو لے کر جا چکا تھا۔ میری نظروں کے تمام دیپک یک بیک بجھ گئے اور میرے خیالات کا بنتا ہوا قلعہ ایک دم زمین پر آرہا۔ اس کے بعد سے اس کا معمول تھا کہ ہر روز یا ایک دو روز کو ضرور آیا کرتا بھیا سے بات کرتا ان کے ساتھ سیر کو جاتا اور میری طرف سے نہایت لاپروائی کرتا میری طرف دیکھتا بھی نہیں اس کے اس سلوک میں ذرہ بھر بھی کمی نہ ہوئی۔ میرے لاکھ لاکھ سنگار اور انوکھے میک اپ کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ میں اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی مگر وہ مسکراتا تک نہ تھا۔ احساس شکست۔ میرے خدا کیسی ظالم چیز ہے یہ غم روح پر تاریکی بن کر چھا جاتا ہے اور پھانس کی طرح چبھتا رہتا ہے اور ہر وقت کوئی اس پھانس کو چھیڑتا رہتا ہے۔ میں عہد کرتی اب اس سے کبھی نہ بولوں گی لیکن اسے دیکھتے ہی میرا عہد کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا۔

اس روز میں نے بڑے بڑے ستاروں والی نارنجی اوڑھنی پہنی تھی اسی کے ہمرنگ شلوار و فراک میری نظر میں۔ میں اس سے پہلے کبھی اتنی حسین نہ معلوم ہوئی تھی۔ جانے وہ آج کس خیال میں تھا کہنے لگا "یہ آپ نارنجی رنگ کو کیوں اتنا پسند کرتی ہیں۔ میرے امیدوں کے چمن میں ہزاروں پھول کھل گئے۔ میں نے کہا "کتنا کھلا اور نفیس رنگ ہے کس قدر چمکیلا" لاحول ولا بھئی کپڑا پہنتے ہیں دوسروں کی پسند سے اور ایسا جو اپنے آپ پر کھلے یہ آرنج کلر تو نہایت ہی واہیات یعنی گندا ہے" —— میں نے اس دن سے تمام نارنجی کپڑے ڈیڈی کی الماری میں مقفل کر دئے مبادا مجھ سے پھر غلطی ہو جائے انہیں پہننے کی کیونکہ مجھے یہ رنگ بہت پسند تھا۔ لیکن وہ پھر بھی ویسا ہی رہا۔ میں سوچتی مالک!

مرکر دفن ہو جانا تو کچھ بھی نہیں مگر زندہ دفن ہونا کتنا تکلیف دہ ہے۔ یہ کسی کا جملہ ہے مگر کتنا سچ ہے۔

اگلے روز اتوار تھا میں برجو کے ساتھ میٹنی شو جاتے موٹر کے پاس کھڑی تھی۔ احسن بھیا گھر پر نہ تھے۔ موٹر سیکل رکنے کی آواز آئی۔ شاید جاوید میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی گئی۔ بھیا تو نہیں اس سے کون بات کرے گا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں سیٹیاں بجاتا ہوا آگے نکل آیا۔ بھیا کے کمرہ پر دستک دی۔ مگر آواز نہ پاکر پلٹ گیا۔ "آج تو خوب زور دار تیاری ہے کہاں تشریف لیجا رہی ہیں" اس نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔ مجھے تو موقع ملا۔ سوچا تھا خوب بدلا لینا چاہیئے مگر مجھ میں اتنا صبر کہاں۔ "آئیے نا آپ بھی" میں نے آخر کہہ ہی دیا "ذرا میٹنی چلیں گے الف لیلا والا فلم ہے اور مجھے یہ فلم بڑے پسند آتے ہیں کتنی اصلیت ہوتی ہے انگلش فلم میں" "یکسر فضول" وہ پلٹ گیا۔ "مجھے تو یہ فلم بالکل پسند نہیں ورنہ میں اس وقت سینما جانے کے موڈ میں ہوں، ہاں یہ آپ نے نارنجی کپڑے پہننا کیوں چھوڑ دیئے" میں نے کوئی جواب نہ دیا "دیکھئے آج سے آپ نارنجی کپڑے برابر پہنا کیجئے۔ بھولیئے گا نہیں، خدا کے لئے ضرور پہنئے" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سیٹیاں بجاتا ہوا آگے نکل گیا۔ میرے لئے ہر طرف خلا ہی تھا۔ ہم موٹر پر جا رہے تھے برجو میری خاموشی پر حیران تھی اور اس نے کہدیا کہ وہ آج سے میرے ساتھ کبھی نہ جائیگی اس روز فلم میں میرا دل بالکل نہ لگا۔ اگلے روز سے میں نے نارنجی کپڑے پہننا شروع کر دئے مگر وہ رنگ اب مجھے نہایت منحوس معلوم ہوتا اور وہ کپڑے مجھ پر کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔

دوسرے روز بھیا کے چند دوستوں کی دعوت تھی۔ خوب تیاریاں کی گئیں۔ جاوید بھی مدعو تھا۔ میں نے ڈرائینگ روم کا تمام فرنیچر بدل ڈالا دو اور نئے سٹ رکھوا دیئے تمام گلدانوں میں پھول سجا دیئے۔ کھانے کے کمرے کی خوب صفائی کی۔ کھانے کی میز نئے طلائی پھولوں والے ڈنرسٹ سے جگمگا رہی تھی بیرا کہنے لگا بے بی آج آپ اتنا کام کیوں کر رہی ہیں تھک جائیں گی مگر وہاں تھکن کا نام نہ تھا۔ تمام بڑے رومس کو دیکھ ڈالا غرض ہر جگہ تبدیلی کر دی اور جب ڈیڈی نے دیکھا تو کہا "نیلو آج تو تم نے گھر کی حالت ہی بدل

ڈالی، بڑی اچھی نیلو ہے، میری پیاری نیلوفر
بیٹی " میں نے کہا "ڈیڈی یہ کوٹھی بہت پرانی
ہو گئی ہے ایک نئی کوٹھی بنوائیے بالکل نئی
وضع کی "ہاں ضرور میری نیلو بیٹی کے لئے ضرور
کوٹھی بن جائے گی" اور جب میں خود میک اپ
ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی تو ہاتھ پیر شل
ہو چکے تھے، نیند سی آنے لگی تب مجھے تھکن کا
احساس ہوا۔ بھیا کے دوستوں میں ایک انگلو
انڈین لڑکی نیلی بھی شامل ہے۔ اس روز نیلی
بھی مدعو تھی کچھ عجیب دبلی پتلی سی لڑکی تھی
نیلا فراک کٹے ہوئے بال بے انتہا میک اپ
خوب ہنس ہنس کر جاوید سے باتیں کر رہی تھی
اور جاوید بھی اس میں ایسی دلچسپی لے رہا تھا
جیسے وہ اسے پہلے سے جانتا ہی ہے۔ میرے
لئے تمام فضا میں کانٹے بکھر گئے۔ چاندی کے
چمچے اور کانٹے بوجھل ہو گئے۔ مجھے ایسا معلوم
ہوا جیسے میرا کیا کرایا گھر کا اور خود کا میک اپ
جیسے قہقہے بار بار کر ہنس رہا تھا اور میری
پلکیں بوجھل بن گئیں۔ بھیا کے تمام دوستوں
کا اصرار تھا آج نیلو سے گانا سنیں گے بھیا نے
مجبور کیا اور مجھے گانا ہی پڑا۔

آنسو نہ بہانا۔ آنکھوں آنسو نہ بہانا۔
یہ راز ہیں دل کے دل ہی میں چھپانا
آنسو نہ بہانا۔
اچھے تم نے جھنین پلکوں کی چلمن میں چھپایا۔
پردوں میں بٹھایا انھیں رو کر نہ گنوانا۔
آنسو نہ بہانا۔

میں نے جاوید کی آنکھوں میں کچھ پڑھنا
چاہا مگر وہاں صرف سکوت تھا وہی سکوت
جو میرے لئے قاتل بنا ہوا تھا اور نیلی ایک
فاتح کی طرح مسکرا رہی تھی۔ میں نے دہرایا۔

تم سے نہیں شکوہ تقدیر ہماری
تم جیت گئی ہو قسمت ہے تمہاری
اے دل نہ دھڑکنا غم سے نہ تڑپنا
وہ خود ہی چلے آئیں اثر اپنا دکھانا
آنسو نہ بہانا　　آنسو نہ بہانا

میں نے کب گانا ختم کیا خود مجھے خبر نہیں
لیکن میرے جسم کی رگ رگ دکھ رہی تھی
میرا دل جیسے کبھی کا رک چکا تھا۔ کھانا ختم
ہوتے ہی میں اندر چلی گئی اپنے کمرے میں جا کر
لیٹ گئی تکیوں میں منھ دے کر خوب روئی
اس روز رات میں خوب ہی بخار چڑھا خلاف
توقع صبح بھی نہ اترا۔ ایک مہینہ گذر گیا لیکن
میرا بخار نہ اترا معمولی بخار اور بیس دن لگ
گئے ڈیڈی اور بھیا سخت پریشان تھے اتنے
تمام دنوں کے عرصہ میں میں نے دیکھا جاوید

ایک دن بھی نہ آیا آتا بھی تو باہر سے ہی چلا جاتا ممکن ہے اسے پتہ نہ ہو۔

اس روز بھیا کسی دوست کے ساتھ جا چکے تھے ڈیڈی بھی باہر تھے میں گھر پر اکیلی تھی بخار بدستور تھا۔ مجھے ہال میں سیٹی کی آواز سنائی دی۔ "ہم اپنا انہیں بنا نہ سکے۔" دل جل ہی تو گیا۔ آج مزا ہی بتا دوں گی ظالم کو۔ اور میں نے رضائی منہ پر کرلی۔ لائٹ تو آج کمرے کی بند ہی رکھی تھی اب اور اندھیرا ہو چکا تھا۔ سیٹی کے ساتھ گنگناہٹ میرے قریب تر محسوس ہوئی۔ میں نے کان لگا کر سنا وہ گا رہا تھا

آنسو نہ بہانا ۔ آنسو نہ بہانا

یہ راز ہیں دل کے دل ہی میں چھپانا۔

آنسو نہ بہانا۔

وہ شاید سوئچ کی تلاش میں تھا۔ سوئچ میرے پلنگ کے بالکل قریب میرے سرہانے تھا۔ میں جب چاہتی لائٹ آن اور آف کرسکتی۔ وہ ناکام کوشش کرتا رہا لیکن سوئچ نہ مل سکا کچھ دیر کے لئے کمرے میں سکوت ہو گیا۔ پیرا کے قدموں کی آواز نے سکوت کو توڑا "بے بی لائٹ جلا دو میں دودھ اور کافی لایا ہوں۔" پیرا سے بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے تپائی پر پڑے رکھ کر خود لائٹ جلا دی۔ کمرہ جگمگا اٹھا۔ میں نے دیکھا وہ ایک طرف مجرموں کی طرح کھڑا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں "آپ کی یہ حالت اور مجھے خبر تک نہیں کی۔" اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی "اس کی کیا ضرورت تھی" میں نے کہا "مرنے کی خبر تو آپ کو ضرور ہو ہی جاتی۔" وہ چونک پڑا "ایسا نہ کہو نیلو جنہیں دیکھ کر کوئی جیتا ہے بھلا انہیں مرنے کی کیا ضرورت۔ اوہ میں بھی احمق ہوں احسن سے پوچھا نہ اس نے کہا اس دن کلب میں آپ کا ذکر ہوا۔ وہاں کسی سے سنا کہ آپ بیمار پڑ گئی ہیں" کمزوری کی وجہ زیادہ بول نہ سکی آنکھیں آنسوؤں میں تیرنے لگیں "میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ نیلو تمہیں میری قسم انہیں پونچھ ڈالو۔" وہ میرے برابر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور ہم دونوں پر چاند اپنی روپہلی کرنیں نچھاور کر رہا تھا ——— ———

دفتر میں بعض خوش نصیبیاں ایسی ہیں جو پرچہ خریدنے کی مقدرت نہیں رکھتیں۔ کئی پرچے مفت جاری کئے گئے ہیں۔ مزید گنجائش نہیں اس لئے مجبوری ہے۔ البتہ ارباب خیر اس مسئلہ پر غور کریں۔

دل لخت لخت

ج

اک دل پہ منحصر ہے وجود نشاط دہر — یہ شاد ماں نہیں تو کوئی شادماں نہیں — ثاقب لکھنوی

وہی سوز دل کی ہیں گرمیاں — وہی درد دل کی ہیں لذتیں

ارے کس نے تجھ سے یہ کہدیا — مجھے تیرے غم سے فراغ ہے

غم وہ میخانہ کمی اس میں کہاں — دل وہ پیمانہ کہ بھرتا ہی نہیں — جگر

ہاں لذت پیغام کو میں بھول گیا ہوں — اے باد صبا جا تجھے کچھ کام نہیں ہے

تجھ کو خود ڈھونڈنے آئیگی نسیم صحت — پہلے اس نرگس بیمار کا بیمار تو ہو

رزاق دو جہاں کے خزانہ کو کیا ہوا — ملتا ہے غم سو وہ بھی کسی کا دیا ہوا

ٹھیرا ہے ضبط شوق پر آکر معاملہ — اس درجہ آرزو کی ٹبر ہیں بے نیازیاں — حسرت

اب انجام محبت سونچنا کیا — دل ان کا ہے، غم ان کا ہے، میرا کیا

بدل گویم کہ اینہا خواہمش گفت — چو او پیش نظر آید، زباں کو؟ — خسرو

یہ بھی تو اک طرح کی تمنا ہی ہوگئی — کیا آرزوئے ترک تمنا کرے کوئی

کشش شوق تو ابتک رہی محروم اثر — دیکھنا اب ہے مآل کشش بے اثری

بہت بڑھا میرے جینے سے شوق قصہ دید — میں جان دے کے اسے مختصر کروں کہ نہیں — شوق

گل خود تھے بے ثبات گلشان دہر میں — گلچیں غریب مفت میں بدنام ہوگیا

وجود وفا کی تلاشیں عبث
فقط نام ہی نام ہے اور بس

"شکار"

آنسہ صغرا جنگ بہادر

مشہور قول ہے کہ 'شکار کار بیکاران است' لیکن اس کی تفسیر اور اس کا شوق ابا اور میرے بھائیوں سے پوچھیں جنھیں ترکے میں ملا ہے۔ شاید ہی ہمارے خاندان کا کوئی فرد ایسا نظر آئے جو شکار کا شایق نہ ہو۔ اس شکار کے شایقین میں میرے بھائی اور بہنوی بھی شریک ہیں جنھیں شکار کرنا آتا تو نہیں لیکن خود کو "میر شکاری" سمجھتے ہیں۔ ابا کا شوق تو حد سے بھی دو چار قدم آگے ہی ہے شاید ہی کوئی جانور ایسا ہوگا جس کا شکار نہ کیا ہو۔ میں تو یہی کہوں گی کہ اگر آپ کو شکار کا صحیح لطف اٹھانا ہو تو ہمارے پاس آجایئے اور ہمارے گھر کے ان واقعات سے لطف اندوز ہویئے جو ابا کے شکار جاتے وقت اور کرتے وقت پیش آتے ہیں۔

میں خود آپ کو بتلاتی ہوں کہ شکار پر جاتے وقت کیا کیا ہوتا ہے صرف اسی وقت کے حالات لکھوں گی جب کہ ابا مع ہمارے سب بھائیوں کے جو محض بیکار ہی ہوتے ہیں گھر شکار کے لئے تشریف لیجاتے ہیں۔ مگر کا شکا

میں نے اس لئے لکھا کہ رائچور میں زیادہ تر اسی کا شکار ہوتا ہے کیونکہ دو ندیاں کرشنا اور تنگبھدرا رائچور کے شمال اور جنوب میں بہتی ہیں۔ باقی دوسرے جانور عنقا ہیں۔

مگر کے شکار کا سب سے بہتر موسم گرما ہے یا پھر ہو سکے تو جاڑے لیکن جاڑے میں چونکہ پانی زیادہ اور تیز بہاؤ ہوتا ہے اس لئے یہ مار کھا کر بھی بہہ جاتی ہے۔ یہ بہت سخت جان ہونے کی وجہ سے گولی کے مار پر فوراً نہیں مرتی اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ گرمی اور جاڑے ان دونوں موسموں میں اسکولوں اور کالجوں کو لمبی چوڑی تعطیلات ملتی ہیں۔ ہم بھی کبھی کبھی (ہمیشہ نہیں) ابا کے ساتھ شکار پر جاتے ہیں۔ آپ لوگ یہی سمجھتی ہوں گی کہ ابا ہی ہم کو اپنے ساتھ نہیں لیجاتے۔ یا یہ کہ ہم خود بندوق کی آواز یا جنگلی جانوروں سے ڈر کر نہیں جاتی ہوں گی۔ یہ بات نہیں۔ ڈر اور ہم !! ہماری تو وہی مثل ہے "تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں" اسی طرح

جب سے ہم نے آنکھ کھولی۔ گھر میں شکار اور بندوقوں ہی کا چرچا سنا۔ بلکہ ہمارے نہ جانے کی اصل وجہ یہ رہتی ہے کہ امی کو شکار سے بالکل لگاؤ نہیں ہے وہ بہت کم شکار کو چلنے پر راضی ہوتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی سوچتے ہیں کہ جب ابا اور بھائی باہر چلے جائیں گے تو ہم اپنی سہیلیوں کو بلا کر دن بھر مزے سے رہیں۔

چنانچہ شکار پر جانے کا ایک دن پہلے تصفیہ ہو جاتا ہے۔

اب دیکھئے ان لوگوں کی تیاریوں کے ٹھاٹ۔ سب سے پہلے تو چھوکرے کو یہ حکم ہوتا ہے کہ کتہ یا زنجیر وغیرہ باہر دیدے آپ کہیں گی یہ روز زنجیر کس لئے؟ تو سنئے۔ یہ زنجیر جو ہے نا وہ بکرے کے باندھنے کے لئے ہوتی ہے۔ جو شکار کو بلانے کیلئے ندی کے کنارے باندھ دیا جاتا ہے اور کتہ اس لئے کہ جھاڑی وغیرہ کاٹ کر پوشیدہ رہنے کے لئے ندی کے کنارے لگائی جاتی ہے اس سے فراغت ہو جاتی ہے تو رضا بھائی کو یہ حکم لگایا جاتا ہے کہ بندوق اور کارتوس وغیرہ وغیرہ آدمی کو دیدیں۔ پھر ابا اپنا ضروری سامان جن کی تفصیل یہاں بتلانا بیکار ہے (اس میں دوربین ضروری ہے) رکھ رکھا کر فراغت کر لیتے ہیں۔ بعض وقت امی کے غصہ سے چیخنے کی آواز بھی آجاتی ہے کہ "بھئی میں تو عاجز آگئی اس شکار سے نہ معلوم یہ شوق کب کم ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ

اور سب تو سب ان میر شکاریوں کی تیاری تو سب سے اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی ہے ذرا آیئے ان لوگوں کے کمرے کی بھی سیر کرادوں۔ سن رہی ہیں یہ بے تکی آوازیں آپ؟ "اے رضا میرا بش کوٹ کہاں ہے؟" "بھئی فریدہ! تم بھی عجیب لڑکی ہو، منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ ذرا میرے نیکر پر استری کر دو نا" "آپ لوگ تو ایسے تیاری کر رہے ہیں جیسے کوئی بردکھاوے کو جاتا ہے" "ارے لو ـــ ٹھاٹ سے نہ جاؤ تو مگر ملتی کہاں ہے۔ ابے پاشو بدتمیز منہ دیکھتا کھڑا ہے میرے جوتے پر پالش کیوں نہیں کرتا۔ توبہ توبہ آپ بھی کہتی ہوں گی کہ یہ کیا مصیبت میں لاکر پھنسا دیا اس لڑکی نے۔ چلئے چلئے بھاگئے یہاں سے۔ عجیب طوفان بے تمیزی کر رکھی ہے ان لوگوں نے۔ اس طرح سے بن ٹھن کر چلے اب شکار کو۔ اچھا اب سنئے شکار کرتے وقت کے حالات۔ ہماری غیر موجودگی میں جو واقعات ہوتے ہیں۔ ان کو سوائے ابا کے

کوئی سچ سچ نہیں بتاتا - لہٰذا میں بھی اسی
وقت کا ذکر کروں گی - جب کہ ہم بھی موجود
رہتی ہیں - شکاریوں کے بیٹھنے کی جگہ تو سچ
مچ ایک ننھا سا سمر ہوس معلوم ہوتا ہے -
جو اطراف سے ہری ہری جھاڑیوں سے گھری
ہوتی ہے - جن پر جب سب بیٹھ جاتے ہیں -
تو ابا کا حکم ہوتا ہے کہ " خاموش بیٹھو - ذرا
بھی آواز کی تو سمجھ لو کہ بس . . . .
مگر نہیں ملیگی " اس نادر شاہی حکم کے سنتے
ہی ہمارے شیطان صفت بھائی ہونٹوں پر
انگلی رکھ مسخروں کے سے چہرے بنا کر بیٹھ جاتے
ہیں - اب آپ ہی بتائیے اس حرکت پر ہنسی
نہ آئے تو کیا ہو - بڑی مشکل سے ہنسی کو دبا کر
منہ میں دوپٹہ کا آنچل ٹھوس ٹھوس کر بیٹھ
جاتے ہیں - ہم بیچارے بیٹھے بیٹھے بھائی صاحب
کو کھانسی جو آتی ہے تو ان کا کھانسی کو روکنے
کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے - رضا بھائی صاحب
کو جو چھینک چھوٹتی ہے تو انھوں نے اپنی ناک اتنی
زور سے دبا کر پکڑی : : کہ جیسے ناک ہی سے
ہنستا ہے کوئی - اسی گڑ بڑ شڑ بڑ میں ہم نے
خیال بھی نہ کیا کہ بکرے کی مین مین کوشش کر
لی مگر مچھ کے منہ میں پانی آ ہی گیا - اب جو نظر
اٹھا کر دیکھتے ہیں یہ بڑی مگرمچھ خشکی پر اپنے
شکار کے لئے خود شکار ہونے چلی آرہی ہے - ہم
سب اس طرح خاموش ہو جاتے ہیں جیسے خدا
نخواستہ سب پر سکتہ کا عالم ہو - آخر ابا نے
دھائیں سے اس کی کھوپڑی کو تاک کر بندوق
چلا ہی دی - وہ دیکھئے مگر صاحبہ تڑپتی پڑی
ہیں - اس کے ساتھ ہی ہمارے تمام آدمیوں کی
فوج نے دھاوا بول دیا - بڑی مشکل سے کئی آدمیوں
نے کھینچ کھانچ کر ندی کے کنارے سے دور کر دیا
اب جو دیکھتے ہیں کہ تیرہ فٹ لامبی اور زمین سے
تقریباً آدھ گز اونچی تو خوشی سے ہم لوگوں کی
باچھیں کھل گئیں - اب ہمارے بھائیوں کا اچھلنا
کودنا دیکھئے کہ جیسے ان لوگوں ہی نے شکار کیا ہے -

یہ تو تھی صرف ایک وقت کے شکار کی
کیفیت جو میں نے بیان کی - یوں تو اور کئی واقعات
ہیں - لیکن ایک واقعہ جو منوہر آباد میں لوریچہ
کا شکار کرتے وقت میرے بھائیوں اور بہنوئیوں
کو پیش آیا بہت ہی پر لطف ہے جو پھر کبھی
سناؤں گی ۔

حضرات اور خواتین بھی ہر ایک مسلم
عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار
فرمائیں تو مناسب ہے ۔

اسٹالین

جمیلہ بیگم کلکتہ

سال کے سب سے چھوٹے دن یعنی ۲۱ ڈسمبر کو اب سے (۶۴) سال پیشتر گوری میں تفلس کے قریب ایک موچی کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکے کی دیندار دقیانوسی خیالات کی مالک والدہ نے اس کا نام جوزف رکھا۔ کیونکہ یہ عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریم کے شوہر کا نام تھا۔ اور حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی ماں تھیں۔ اگرچہ تبرکاً یہ نام ماں نے رکھا تھا مگر اس کے پیار سے بلانے کے اس قدر نام اور بھی رکھ لئے گئے تھے کہ اس کا کوئی حساب تھا کوئی سوسو پکارتا۔ تو کوئی کوبا۔ ڈیوڈ۔ پچھوف اور اتوں اتو وِیرِچ بھی بلایا جاتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ یہ دنیا میں اس قدر مشہور انسان ہوگا۔ آخر کار حالات کے تقابل نے اسٹالین یا فولادی انسان کے حق میں قرعہ فال ڈال دیا۔ اور اس کے جوش عمل تدبر اور قوم پرستی سے نام کی تصدیق ہونے لگی چنانچہ ۱۹۳۹ء میں ۲۱ ڈسمبر کو (۲۵) روسی اہل قلم اس کے حالات زندگی کے مختلف منازل کی کیفیات قلمبند کرنے کی غرض سے گوری میں مجتمع ہوئے تھے تاکہ اس کے جلسۂ یوم میں مشاہدات مستنبط کر کے اس قابل قدر انسان کی زندگی پر روشنی ڈالیں اس وقت اس کے چھوٹے سے مکان کی تصویر بھی اتاری گئی تھی بعض عقیدت مندوں نے اس کے ننھے سے مکان جس میں یہ پیدا ہوا تھا اس کے ماڈل پر عقیدت مندی سے پچہ کاری کروائی گویا یہ سوویٹ کی عبادت گاہ تھی چنانچہ اس کے متبعین ہر جگہ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اپنا نجات دھندہ تصور کرتے ہیں۔ اس کے اعزاز میں ۱۹۳۹ء میں جب دنیا اس جنگ عالمگیر کی انتہائی مصائب سے روشناس نہیں ہوئی تھی۔ جب اسٹالین کے تدبر اور دانشمندی کا اس قدر تیقین قوموں کے دل پر نہیں ہوا تھا اس وقت صرف روسی قوم اپنے ملک کے اس محب وطن کے اعزاز میں COUNCIL OF THE PEOPLES COMMISSARS کی جانب سے ۲۶ سالانہ وظیفے ہونہار طلباء کو دینے منظور کئے جس کا پہلا انعام ایک لاکھ روبل تھا (۲۰ ہزار شلنگ) اور یہ وظیفے ڈاکٹری۔ قانون۔ سائنس۔ ملٹری سائنس اور ایجادات کے طلباء کو دئے جاتے تھے اس کے علاوہ (۵۰ ۱۴) اسٹالین اسکالرشپ اور بھی

دیا جانے لگا۔ شہریوں نے اسے سوشیلسٹ فرزند وو کا ہیرو خطاب دیا۔ اور ہر سال اس کی سالگرہ کے موقع پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اس کی اس (۶۴) سالہ زندگی میں اس نے جس قدر انقلابات کی پرورش اور رہنمائی کی ہے وہ اخبار بین حضرات سے مخفی نہیں۔ وہ دنیا میں اس وقت بہت بڑا مدبر اور معاملہ فہم انسان خیال کیا جاتا ہے۔

اس کی زندگی کا پیشتر حصہ اس جنگ عالمگیر سے پیشتر ملک کے اندرونی حصوں میں جہاں گرجوں محلوں اور بارکوں کی لاتعداد تسلسل ہے گذرا ہے وہ ماسکو کے اس حصہ کو کرملین موسوم کرچکا ہے اس کا دفتر بہت وسیع اور تصنع سے مبرا ہے اگر سجاوٹ کا کچھ شائبہ ہے تو وہ بس کارل مارکس۔ اینجل کی تصویر اور لینن کا مجسمہ ہے۔ اس کے مخصوص کردہ ۳ کمرے ہیں جو پہلے کسی کمانڈر کی جائے رہائش تھی۔ جوزف اسٹالین کی دو شادیاں ہوئیں پہلی بار ۱۹۰۳ء میں ایک جارجیائی کی لڑکی سے جس کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوگیا اس کے بعد دوسری شادی کی یہ بیچاری بھی ۱۹۳۲ء میں راہئی عدم ہوئی پہلی بیوی سے ایک لڑکا اور دوسری بیوی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ یہ دونوں بھی کرملین میں رہتے ہیں۔ اسٹالین کی بوڑھی ماں جو باتونی اور فضول گو مشہور تھی ۱۹۳۷ء میں تفلس میں

مر گئی کئی سال تک یہ عہد زار کے جارجیا کے وائسرائے کے محل میں رہ چکی تھی غیر ملکی لوگ اور اخبار نویس اس کے نامور بیٹے کے حالات صغیر سنی سننے کے لئے اس کے پاس بکثرت آتے تھے اور اس کی ابتدائی زندگی کی دور از قیاس جد وجہد سن کر بلند ہمتی اور اولوالعزمی کا سبق سیکھتے۔ مشہور ادیب میکسم گورکی بھی اس کا دوست تھا۔ غیر ملکیوں سے اسٹالین کو بہت کم ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس جنگ عالمگیر سے کچھ پیشتر اہل قلم حضرات میں جارج برنارڈ شا اور لیڈی ایسٹر ممبر پارلیمنٹ ایک مرتبہ تفریحاً بغرض سیر ماسکو گئے تھے۔ ان لوگوں نے اسٹالین سے بھی ملاقات کی۔ لیڈی آسٹر نے شوخی سے پوچھا "تم لوگوں کو ہلاک کرنا کب موقوف کروگے" "جب اس کی ضرورت نہ رہے گی" اسٹالین نے نہایت اطمینان و سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ اسٹالین فوجی قوت میں اضافہ کرنے کا برابر سے حامی رہا ہے اس کا خیال ہے کہ عہد قدیم سے برابر روس پر بیرونی حملے ہوتے رہے ہیں۔ منگل کے غولوں نے اسے تباہ کیا۔ ترکی جیسے لوگ اس پر حملہ آور ہوئے۔ سویڈن کے زمینداروں نے اس پر ستم ڈھائے۔ چونکہ پہلے روس فوجی نظم ونسق کی طرف اس قدر توجہ نہیں دے سکا تھا اس لئے جرمنوں نے حلیف بن کر بھی دوست کے پشت میں چھری گھونپ دی۔ تمدنی پست حالی

اقتصادی اور زراعتی پستی میں بھی روس جنگ عظیم کے پیشتر بدنام تھا۔ اس جنگ عالمگیر میں فن لینڈ کی جنگ میں بھی پہلے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ لیکن آخرکار اسٹالین نے اپنی حکمت عملی اور ملک گیری کی تدبیر سے اپنے رفقاء کی مدد سے پاسہ پلٹ دیا۔ ۲۶ رجون ۱۹۴۵ء کو سپریم سویٹ کی صدارت نے یو. S. S. آر کی طرف سے مارشل اسٹالین کو ORDER OF VICTORY کا خطاب سویٹ روس کی تمام اسلحہ بند افواج کی تنظیم اور اس فتح عظیم کے صلہ میں عنایت کی۔ اس صبر آزما جنگ میں ہٹلر جیسے دشمن کو سرنگوں کرنا اور جرمنی کو اپنے زیر اقتدار لانا کچھ معمولی بات نہ تھی پھر لطف یہ کہ نازک ترین اور خطرناک موقعوں پر بھی اسٹالین اپنے افواج کی سرکردگی میں موجود رہا۔ جس وقت یہ خطاب دیا جانے لگا تو سویٹ روس کی ساری آبادی اور بچہ بچہ تک حب وطنی اور فتح نصرت کے جوش میں مبارک باد دے رہا تھا۔ دنیا کے ہر گوشے سے اسٹالین کی مدح و ثنا بیان کی جارہی ہے اور شاہ بن کر نہیں بلکہ کامریڈ اسٹالین بن کر یہ عظیم الشان فاتح خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب بیرلورہ سے شائع ہوا۔



شہاب

شہاب

جلد ۱۳ آبان ۱۳۵۴ف م ستمبر ۱۹۴۵ء نمبر ۱۲

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

چندہ سالانہ (للعہ) (ص)

توہمات

جناب سید نور الحسن صاحب بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (گلاسگو)

مثل مشہور ہے کہ وہم کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں۔ بعض کو بیٹھے بٹھائے کچھ نہ کچھ خبط سوار ہوجاتا ہے اور وہ فکر ہی فکر میں گھلنے لگتے ہیں یا دماغ کا توازن بگڑ جاتا ہے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ بھائی جو خیال تم کو پیدا ہو گیا وہ خیال ہی خیال ہے۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں لیکن اس اللہ کے بندے کے سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ وہم کے پیدا ہونے کے کئی وجوہ ہوتے ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ انسان جو چیز شعوری طور پر حاصل نہیں کرسکتا اور جس کی اس کو انتہائی تمنا ہوتی ہے غیر شعوری طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً از مان کو یہ خیال پیدا ہوجانا کہ وہ بادشاہ وقت ہے یا علامہ دہر ہے۔ دوسرے قسم کا وہم لوگوں کے کہنے سے کمزور آدمی میں پیدا ہو جاتا ہے۔ کمزور دل و دماغ کا آدمی دوسروں کی باتوں میں بہت جلدی آجاتا ہے مثلاً فرض کیجئے کہ ایک شخص کا معدہ بہت اچھا ہے۔ اسے ضعف معدہ کی شکایت کبھی پیدا نہیں ہوئی وہ قبض کی بیماری میں شاید ہی کبھی مبتلا ہوا ہو لیکن دل و دماغ کا کمزور ہے اور دوسروں کے رائے مشورہ کو فوراً قبول کر لیتا ہے اس نے اکثر اپنے دوستوں اور بزرگوں کی زبان سے سنا ہے کہ فلاں فلاں غذا معدہ کے لئے مضر اور آنتوں کے لئے زہر ہے وہ ایک جگہ دعوت میں گیا اور بے خیالی میں وہی غذا کھالی راستہ میں اس کو خیال آیا کہ میں نے آج ایسی غذا کھائی ہے جو معدہ کے لئے بہت مضر ہے۔ بس اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ میٹھا میٹھا سا درد اس کے معدہ کے منھ پر اٹھتا ہوا محسوس ہوا اور گھر آتے آتے وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔ کمزور دل و دماغ کے آدمی کو اگر یہ خیال پیدا ہوجائے کہ وہ بیمار ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی تمام توانائی کھو بیٹھتا ہے اور واقعی برسوں کا بیمار نظر آنے لگتا ہے۔ تیسرے قسم کا وہم عموماً توہمات سے پیدا ہوتا ہے۔ توہمات ہر مذہب اور قوم میں موجود ہیں یہ معلوم کرنا کہ یہ توہمات کب اور کس طرح وجود میں آئے بہت مشکل ہے لیکن جتنے توہمات پرانے ہیں اتنے ہی ان کے اثرات دور رس ہیں۔ ان کا اثر بھی کمزور دل و دماغ کے آدمیوں پر زیادہ ہوتا ہے مثلاً ایک توہم تَوے کا ہنسنا ہے، یعنی جب جلتے توے کے نیچے بہت سا کاجل جمع ہوکر کسی وقت ذرا ذرا سی روشنی کے ذرات سلسلہ وار چمکنے لگتے ہیں اس حالت کو عورتیں توے کا ہنسنا کہتی ہیں اور اسے شادی اور رزق کی افزونی کا شگون سمجھتی ہیں۔

آنکھ پھڑکنا: ضعیف الاعتقادوں کے خیال میں
مرد کی داہنی اور عورت کی بائیں آنکھ پھڑکے تو اس کا کوئی
عزیز یا پیارا ملتا ہے اور مرد کی بائیں اور عورت کی داہنی
آنکھ پھڑکے تو کچھ رنج یا صدمہ پہنچتا ہے بازو پھڑکے
تو کسی دوست سے ملاقات ہوگی۔ کوّا بولے تو کوئی
مہمان آئے گا۔ بلی الانگنا اہل شگون کا خیال ہے کہ بلی کا
سامنے سے گذر جانا لڑائی جھگڑے یا کسی بڑے نقصان
کی علامت ہے۔

کسی کام کے کرنے سے پہلے اگر چھینک آئے تو
یہ شگون بد سمجھا جاتا ہے یا تو اس کام کو کرنے سے قطعی باز
رہنا چاہیئے یا کم از کم تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دینا
چاہیئے۔ سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی میں اگر کھجلی ہو تو
سمجھا جاتا ہے کہ دولت ملے گی۔ جوتے پر جوتا چڑھے
تو سفر ہوگا۔ بعض کو وہم ہے کہ آٹھ، اٹھارہ اور
اٹھائیس منحوس تاریخیں ہیں اور ان تاریخوں میں کوئی
نئی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ کسی کے گھر کے احاطہ میں
اگر الو بولنے لگے تو اس کو بیحد منحوس سمجھا جاتا ہے گھر
کی چھت پر چیلوں اور گدھوں کا بیٹھنا نحوست کی علامت
ہے۔ ٹوٹی رکابی میں کھائے تو رزق اڑتا ہے۔ ٹوٹے
آئینہ میں سنگار کرنا منحوس ہے۔

مغربی اقوام بھی ہندوستانیوں کی طرح توہمات
کی قایل ہیں۔ ان کے یہاں نمبر تیرا بہت منحوس سمجھا
جاتا ہے۔ کھانے وغیرہ کے موقع پر کبھی تیرا آدمیوں کو
مدعو نہیں کرتے۔ کھانے کی میز پر اگر نمک گر جائے تو سمجھتے
ہیں کہ کچھ نہ کچھ آفت ضرور آئے گی۔ ایک ہی دیا سلائی
سے تین سگریٹ نہیں سلگاتے۔

مغرب و مشرق دونوں ملکوں میں کانے کو
منحوس سمجھتے ہیں خصوصاً اگر کسی کام پر جا رہے ہوں اور
کانے سے مڈبھیڑ ہو جائے تو واپس آجانا چاہیئے۔

تنخواہ ملنے پر سب سے پہلے مہتر کی تنخواہ نکالنا خوب
ہے اور سب سے آخر میں دھوبی کی تنخواہ دی جانی چاہیئے
شادی بیاہ کے موقع پر بیوہ سے کسی قسم کی رسومات
کرانا منحوس سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ ماں بیوہ ہو تو
بیٹے کے سر پر سہرا نہیں باندھتی۔

کوّا کوّی کو اگر خوش باشی کی حالت میں دیکھے
تو دیکھنے والے کی موت کی خبر فوراً مشہور کر دیتے ہیں اور
اس نحوست کا یہی توڑ سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کے ماتھے
یا رخسار پر نیلا نشان لگا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس
نیلے نشان سے وہ نظر بد سے بچ جائیں گے۔ نیلا ڈورا
بھی بازو پر اسی توہم کے زیر اثر باندھا جاتا ہے۔

سات رنگ کی دھجیاں، کوئلہ ہلدی اور
چونا ملا کر ایک چندی، ایک پیلی، ایک سفید تین دفعہ سینہ
پر تین دفعہ منہ پر ہچکی آئے تو سمجھا جاتا ہے کہ کسی نے یاد
چار دفعہ پیٹ پر ——— ۔ اتارنا اور بغیر بات کئے ہوئے
لیجا کر آنچ لگا کر کسی کنارے پر رکھ دینا نظر لگی ہے
تو کپڑے جلنے کی بو نہیں آئے گی۔

پیٹ کے بھائی بہن کے پیچھے سے آگ لیجانا منحوس
سمجھا جاتا ہے۔ اگر آگ کوئی لیجائے تو اس [illegible]ڑ یا
اوتارا یہ ہے کہ پیٹ پر پانی چھڑک دیتے ہیں۔

لوبان، اسپند، لہسن کا بھونسہ ایک تھیلی میں
رکھنا۔ بچہ کو حمام کراکر جھولے کے نیچے وہ دھواں دینا
اگر پیٹ پر کے بچے نہ جئیں تو بچہ کی پیٹ داغ دیتے
ہیں۔ تلوا کھجلائے تو سفر کو جاتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے
پان لینے یا دینے سے محبت کم ہو جاتی ہے۔

ہفتہ اور منگل کو نہانے سے بیمار ہوتے ہیں
چہارشنبہ کے دن عیادت اور تعزیت کو نہیں جانا چاہیئے۔

پہلن اور پائل بچوں پر بجلی گرتی ہے۔ ناخن گھر کے
باہر پھینکنا چاہیئے

ایک آنکھ مل کر دوسری آنکھ سے بغیر ملے ہوئے
نہیں دیکھنا چاہیئے کیونکہ وہم یہ ہے کہ ایسا کرنے سے
دشمنی ہو جاتی ہے۔ نظر اتارنے کے لئے پانچ کنکر، نمک،
تین بھلاویں اور تین مرچ چولھے میں ڈالتے ہیں۔
بچہ کے ایک رخسار کو چھو کر دوسرے کو ضرور چھو لینا
چاہیئے ورنہ بچہ دبلا ہو جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی
کی ناک پر ہاتھ لگ جائے تو اپنی ناک بھی فوراً چھو لینا
چاہیئے ورنہ آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ رات کو جھاڑو
نہیں دینا چاہیئے۔ کسی عزیز یا دوست کے اپنے گھر سے
سفر پر جانے کے فوراً بعد حمام نہیں کرنا۔ چاند کے اطراف
ہالہ ہو تو غلہ سستا ہوتا ہے۔

چاند گرہن کے دن یا پانچ مہینے کی حاملہ عورت کو
پلو میں روپیہ باندھ کر سفید چادر اوڑھا کر لٹا دیتے
ہیں۔ اگر ایسے وقت میں کوئی کام کرے تو اس کا اثر
بچہ پر پڑتا ہے۔

سفر کرے تو منھ پلٹا کر دیکھتا جائے پیٹ
پلٹا کر نہ جائے۔ رات کے وقت دھوبی کو میلے کپڑے
نہیں دیتے اور بستر نہیں بدلتے۔

جاہل بڑی بوڑھیاں خالی جھولا نہیں ہلاتیں یہ
خصوصاً دقیانوسی مغلانیاں معصوم بچوں کو مارتی
ہیں، اگر وہ خالی جھولا ہلا بیٹھیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں
یہ بہت منحوس بات ہے۔ ایسا کرنے سے شیرخوار بچہ
کی جان کا خطرہ ہے۔ بعض کو وہم ہے کہ تیسری تاریخ
کا چاند دیکھنا منحوس ہوتا ہے اور اس کا توڑ چاند کی
کہانی سننا ہے۔

اگر طوفانی بارش ہو رہی ہے اور کسی طرح دن کو
مینھ برسنا بند نہ ہو تو موصل گاڑھنے یا توا اوندھا
کرنے سے بارش رک جاتی ہے۔ تلوا کھجائے تو سفر
کی علامت ہے۔

کہتے ہیں کہ ڈوئی چاٹنے سے شادی کے دن بارش
ہوتی ہے۔

کتے یا بلیاں رات کو روئیں تو کچھ نہ کچھ مصیبت
آتی ہے۔

اگر کھانا کھاتے وقت ٹھسکا لگے تو گویا کسی نے

یاد کیا۔ ہچکی آئے تو سمجھا جاتا ہے کہ کسی نے یاد کیا۔

ایک کی کنگی سے اگر دوسرا بال سنوارے تو لڑائی ہوتی ہے۔

غرضیکہ اوہام تخیل ہی کی ایک خاص صورت ہیں لہٰذا ان کی بھی اتنی ہی اور وہی قسمیں ہیں جو تخیل کی یعنے احیائی، اختراعی، اور تعمیری احیائی وہم کی مثال یہ ہے کہ ایک خوفزدہ سپاہی کو محاذ جنگ سے بہت دور بھی پہنچا دیا جائے جب بھی وہ بمب پھٹنے کی آوازیں سنتا ہے اور ڈر ڈر کر اپنا منھ بستر میں چھپالیتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی چیز کو متواتر غور سے گھنٹوں دیکھے یا سُنے تو اس چیز یا آواز کی غیر موجودگی میں وہ چیز یا آواز سنائی یا دکھائی دیتی ہے۔

توہمات لاکھوں ہیں اور مزا یہ ہے کہ رسومات کی طرح وہ ہماری ذہنی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں قدامت پرست گروہ خصوصاً عورتیں وہ بھی بڑی بوڑھیاں بیحد توہم پرست ہوتی ہیں۔کیوں کہ توہمات سینہ بسینہ ہم تک پہنچتے ہیں اور ان کا تذکرہ وقت بے وقت ہمارے سامنے ہوتا رہتا ہے اور ان کی صحت کے متعلق نہایت تیقن سے مثالیں دی جاتی ہیں لہٰذا دیر سویر اچھے خاصے دل و دماغ رکھنے والے آدمی بھی توہمات کے قایل ہوجاتے ہیں۔

اگر کسی توہم کے بارے میں بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب لغو ہے، جھوٹ ہے۔ڈھکوسلا ہے تو تھوڑے دن کے بعد اس کا اثر زایل ہو جاتا ہے۔

بہرحال بار بار کسی بات کو سنتے یا دیکھتے رہنے سے وہم اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔اگر وہم کو عقل کی کسوٹی پر کسا جائے اور سائنسی نظر سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو توہمات بے معنی اور بے اثر نظر آئیں۔

غزل

جناب مسلمؔ

دم آں زماں زدم کہ زمین و زماں نہ بود
من بودم و ز خلعت انساں نشاں نہ بود

من آشکار گشتم و خلق از من آشکار
راز درون پردہ ازاں پس نہاں نبود

ہنگام آفرینش عالم ز من بہ پرس
سودائے بیش و کم سر بازار جاں نبود

بیصرفہ بود جوشش شباب و امید وصل
چوں یار را مساعد بخت جواں نہ بود

وصل تو در اخا طرامکاں تواں شدن
یعنی کہ پائے مرگ اگر درمیاں نہ بود

مسلمؔ گناہ کردہ چہ جائے ملامت است
کاں رند از جماعت کرّوبیاں نہ بود

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

ہمارے بعض نوجوان شعراء کے کلام کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے "میکش" کا گریہ و تبسم وجد کا لہو ترنگ اور ماہر القادری کا محسوسات ماہر اہل ذوق کی نظروں سے گزر چکا ہوگا۔ آج کی صحبت میں قارئین شہاب کی تفریح طبع اور غور و فکر کے لئے آخر الذکر مجموعہ پر سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں اور ہر نوعیت کی نظمیں بھی ہیں۔ غرض سارا مجموعہ ۱۴۱ عنوان پر مشتمل ہے۔ پہلی نظم حمد میں ہے جس کا عنوان ہے:۔

فرض اولین

ارے یہ کس کی تجلی نے کردیا مدہوش   نگاہ محو تحیر زبان ہے خاموش

جس کو موسیٰ علیہ السلام بھی نہ دیکھ سکے اوس تجلی کی ایک جھلک سے جو پہاڑ پاش پاش ہوگیا اس پر نظر ڈالتے ہی بیہوش ہوگئے تھے شاعر حیات اوس کو دیکھ کر محو حیرت ہیں زبان خاموش ہے مگر زبان حال سے پوچھتے ہیں کہ ارے یہ کس کی تجلی نے کردیا مدہوش "۔ "ارے" حرف ندا ہے اے کی عوض تحقیر کے موقع پر ارے کہتے ہیں۔

کیا تو کہتا ہے میں ہوا صدقے   ارے میں تیرے آس پاس نہیں   ناسخ

ابے یارا تو نے سرتن سے جو اس شامت کے مارے کا   ارے احسان مانوں سر سے میں ٹنکا اتارے کا   ذوق

زیر نظر شعر میں منادیٰ کا کہیں پتہ نہیں۔ نعت میں ضمیر تنکیر کا استعمال نا جائز اور قابل اعتراض ہے۔

فراز عرش سے آئے وہ میکدہ بردوش   چھلک پڑے نہ ستاروں سے بادہ سرجوش

میکدہ مرکب لفظ ہے کدہ کے معنی ہیں گھر مکان وغیرہ۔ میکدہ اور میخانہ مرادف الفاظ ہیں "میکدہ بردوش آنا" یا بہ الفاظ دیگر میکدہ کا ندھے پر لئے آنا مہمل ہے۔ میکدہ کاندھے پر اٹھا لیجانے کی چیز نہیں ہے یہ نظم حمد میں ہے ضمیر "وہ" کا مرجع کس کو قرار دیا گیا۔ کاندھا کس کا ہے اور میکدہ سے کیا مراد ہے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط بھی نہیں پایا جاتا ستاروں میں یہ "بادہ سرجوش" کیوں اور کہاں سے آیا اوس کے چھلک جانے کی وجہ کیا ہے؟ وزن مقررہ پر تالیف الفاظ کی یہ بھی ایک مثال ہے باقی خیریت۔

صفات و ذات میں ہے ربط عکس و آئینہ ازل سے حسن و محبت رہے ہیں دوش بدوش

اس شعر میں بھی حمد کی کوئی شان نہیں۔ حسن و عشق کے متداول الفاظ کو چھوڑ کر وزن شعر کی خاطر حسن و محبت کہہ دیا حالانکہ عشق و محبت میں بڑا فرق ہے ان میں عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ یہ مفروضہ بھی صحیح نہیں کہ جہاں حسن ہے وہاں محبت بھی ہے پھر جہاں محبت ہو وہاں حسن کیوں نہ ہو۔

حرم کی راہ سے گزرا ہے قافلہ دل کا وہاں بھی عالم حیرت وہی فضائے خموش

شعر کا کوئی معنی و مطلب ذہن شاعر میں ہوگا کوئی عمدہ آیہ معنی شعر تو نہیں کہتا البتہ بحث "فضائے خموش" کی صحت میں ہے۔ فضا بفتحتین عربی لفظ ہے فارسی اور تازی بمعنی کشادہ میدان مستعمل ہے لیکن اردو میں بہار اور کیفیت کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے لہذا معنی اردو کے اور استعمال فارسی بہ ترکیب اضافی صحیح نہیں۔ خاموشی کی فضا کہہ سکتے ہیں۔

مشاہدہ بھی تجلی سے خاک ہو جاتا بھلا ہوا وہ نگاہوں سے ہو گئے روپوش

خاک ہونا یا خاک ہو جانا کے معنی ہیں مثل گل کر مٹی یا جل کر راکھ ہو جانا۔

سودا رہے گا سر کو بہت زلف یار کا! مدت کے بعد ہوتے ہیں مٹی میں بال خاک آتش

کرنے لگے تھے اوس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے! (غالب)

لہذا مشاہدہ کا خاک ہونا صحیح نہیں البتہ مشاہد کا خاک ہو جانا ممکن ہے۔ روپوش مرکب لفظ ہے فارسی قاعدے کے مطابق اسم اور صیغہ امر کی ترکیب سے معنی فاعلی یا مفعولی پیدا ہوتے ہیں رو بمعنی منہ اسم اور پوش صیغہ امر مصدر پوشیدن سے۔ وہ شخص جو کہیں چھپ جائے اور فوراً اوس کا پتہ نہ چلے۔ یہ لفظ عموماً ملزم مفرور کے واسطے استعمال ہوتا ہے خدائے عز و جل کی شان میں ایسے رکیک لفظ کا استعمال نہ ہونا چاہیے علاوہ ازیں "نگاہوں سے روپوش ہونا" خود بول چال کے خلاف ہے۔

چند شعر لغت میں بھی کہے ہیں جس کا عنوان ہے ذکر جمیل پہلا شعر یہ ہے۔

کیف و سرمستی کا اک پیغام رنگیں تیرا نام انبساط روح کی دعوت ترا ذکر جمیل

خالی الذہن کون کہے گا کہ یہ شعر لغت میں کہا گیا ہے

با خدا مستی کن و با مصطفیٰ ہوشیار باش

لحن داؤدی کی ہر لے تیرے نغمہ کی شہید ہر ادائے حسن یوسف ترے ابرو کی قتیل!

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کسی معشوق کی تعریف ہو رہی ہے۔ سرورِ کائنات (ص) خلاصہ موجودات کی نعت شریف میں نغمہ کی تعریف مہمل بات ہے" ادائے حسن یوسف" کہنا صحیح نہیں۔ معشوق کی حرکات و کیفیات کا نام ادا ہے ادا کا تعلق معشوق کی ذات سے ہوتا ہے نہ کہ اس کے حسن سے صاحب نفایس اللغات کہتے ہیں" ادا کیفیت و حرکات معشوقا است کہ بگفتن نیاید و جز ذوق آن را نتواں دریافت" پس حسن کی ادا اور اوس کا قبیل ابرو ہونا دونوں مہمل ہیں۔

تیرے گیسو حامل ناموس اسحاق و ذبیح تیرے عارض باعث رنگینیٔ باغ خلیل

گیسو میں اور اس کے حامل ناموس ہونے میں لفظی یا معنوی کوئی مناسبت نہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے آگ میں ڈلوا یا بحکم خدائے قدوس وہ آگ پھولوں کا باغ بن گئی فارسی میں گلزار ابراہیم اسی سے مراد ہے۔ مصرعہ ثانی میں باغ خلیل سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ اس نام کا کوئی باغ تھا۔ حضرت ابراہیم واسحاق و اسمٰعیل علیہم السلام کا زمانہ خاتم النبیینؐ سے صدیوں پہلے کا ہے اس واقعہ کو نور محمدیؐ سے تعلق ہو سکتا ہے اگر یوں کہتے کہ نام محمدؐ یا نور محمدی کے طفیل چناں و چنیں ہوا تو اعتراض کا کوئی محل نہ تھا جیسا کہ مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

اگر نام محمدؐ را نیا ورد شفیع آدم نہ آدم یافتے توبہ نہ نوح از غرق نجینا

سب کی تیرے چشمۂ رحمت سے بجھتی ہے پیاس اس میں قلزم ہو کہ دجلہ رود گنگا ہو کہ نیل

پیاس بجھنے کے معنی ہیں تشنگی دفع ہونا مجازاً و فور خواہش کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

پیاس بجھتی نہیں مستسقی الفت کی ترے (آتش)

مگر ایسا استعمال کنایتاً ہوا ہوتا ہے۔ آخر یہاں قلزم و دجلہ وغیرہ کی پیاس سے کیا مراد ہے۔ غرض یہ سب کچھ مہمل الفاظی ہے۔

خاک میں تو نے ملا دی سطوت لات و ہبل! تیرا مرہون نوازش کعبۂ رب جلیل

مرہون نوازش کے الفاظ نہایت نامناسب ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے۔ ؎

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

تیری عظمت کی گواہی کفر کی گردن کا خم رفعت اسلام ہے تیرے نبوت کی دلیل

ملا ظہوری نے بادشاہ کی سخاوت کی تعریف میں کہا۔

ہمتش ترکیب لفظ کم نخواست کاف ہر کش ز اختلاط میم باد

ہمارا خیال فوراً اس طرف منتقل ہوا اور سمجھا کہ شاعر حیات نے بھی شاید کفر کی گردن کا خم" کہہ کر

ظہوری کے مقابلہ میں اپنی کسی خاص جدت اور تخیل کی بلند پروازی کا ثبوت پیش کیا ہے بہت سوچا بہت غور کیا۔ ک۔ ف۔ ر میں کفر کی گردن یا اوس کے خم کا پتہ نہ چلا خدا جانے شاعر کے ذہن میں "کفر کی گردن سا خم" سے کیا مراد ہے۔ ہم کو یہاں نارسائی فہم کا اقرار کئے بغیر چارہ نہیں۔ "نعت اسلام" کہہ کر نبوت کی ایسی دلیل قایم کی جو باایں جلالت قدر فخر رازی کو بھی نہ سوجھی۔ (باقی)

"عید اور آرزوئے دید"

اے ہلال تو مبارک آرزوئے دید آج
کس کو دیتا ہے چمک کر تو پیام عید آج

وہ کوئی ہوگا جسے ہوتی ہے اس دن کی خوشی
میں کہاں۔ یہ دن کہاں۔ ناکامی ہے اور بے بسی

تھا ہمارا بھی کبھی یہ دل مسرت آفریں
اب تو اس میں آہ جز رنج و الم کے کچھ نہیں

تیرا جلوہ اہل دنیا کو طرب آگین ہے
اوس کا جلوہ میرے دل کو باعث تسکین ہے

ابر کے پردہ میں آخر لو منہ تو چھپ گیا
ہے مثال بدر تاباں چہرہ میرے چاند کا

کیوں ڈرے کوئی ہلالی تیغ سے تیری بھلا
وہ جو کشتہ ہے کسی کے ابروئے خمدار کا

عید میں اب کیا دھرا ہے عید آئی بھی تو کیا
جب توقع ہی نہیں ہے دید کی تو کیا مزا

تو فلک پر آج چمکا ہے تو کچھ امید ہے
میرے کاشانہ میں وہ آجائیں پھر تو عید ہے

قطعہ تہنیت عید

جناب نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ

نشاط عید بھی ہے، رنگ پر ہے گلشن بھی
زمانہ جام بکف بھی ہے ۔ گل بدامن بھی

یہی نہیں کہ ہر اک نخل بارور ہے آج
ہمائے بخت کا شاخوں پہ ہے نشیمن بھی

ثنائے حق میں جو ہے گلفشاں لب غنچہ
تو نعت پاک میں رطب اللساں ہے سوسن بھی

چمک ہے برق تجلی کی لالہ و گل میں
خدا کی شان چمن بھی ہے دشت ایمن بھی

ہوائے باغ جو بدلی تو بن گیا کیا
نوائے ساز طرب بلبلوں کا شیون بھی

دعائے دولت شاہی میں آج دن مصروف
حرم میں شیخ بھی ہے ۔ دیر میں برہمن بھی

در حضور کو رکھے خدا سدا آباد
کہ ہے جلیل یہ ملجا بھی سب کا مامن بھی

مکتوب

جناب جہاں بانو ایم۔ اے

تمہارے خط سے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ میری زندگی کی تقریباً نصف سے زاید راحتیں اس میں چھپی ہوتی ہیں۔ میں جواب جلد نہ بھی دے سکوں تو تم اس کا بدلہ مجھ سے نہ لینا۔ رہا سہا یہی ایک سکون کا ذریعہ ہے کہیں یہ بھی ختم نہ ہو جائے۔ کیونکہ عیش کو دوام کہاں۔ بعض وقت دل بڑے زور زور سے دھڑکتا ہے۔ ایک نامعلوم سبب۔ شاید قسمت کے لکھنے والے کو ہماری سرنوشت لکھتے ہوئے کھیل سوجھا تھا۔ سب کچھ اس نے ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ زندگی میں کامیابی بھی ملی تو ادھوری ملی۔ ناکامی میں بھی ادھورے رہے۔ زندگی اس لئے مکمل نہیں ہونے پاتی۔

بھڑک کے شعلۂ دل تو ہی اب لگا دے آگ　　کہ بجلیوں کو میرا آشیاں نہیں ملتا

بہرصورت یہ زندگی ہے ایک عجب گورکھ دھندا۔ ہم تو کچھ نہیں سمجھے اس کو۔ اور پھر طرفہ یہ کہ اس کو بھی ہماری خودداری گوارا نہیں کرتی کہ سمجھے تو کچھ نہیں لیکن جئے جا رہے ہیں۔ ڈٹے ہوئے ہیں۔

موت آتی ہے پر نہیں آتی

خیر۔ تو ان بڑے بڑے مسایل سے اس سایل کو کام ہی کیا۔ مشیت کے راز مشیت جانے۔

کل میں نے بہت سی ردّی جلائی۔ زیادہ تر تو خطوط تھے۔ مگر انھیں جلانے کا جی نہ چاہا۔ انھیں پھر سے پڑھ رہی ہوں۔ یوں ہی زندگی کی کچھ بیتی ہوئی سہانی گھڑیوں کی یاد سے دل بہلتا ہے۔ لیکن ایک خواب خوش تھا جو شروع ہونے سے قبل ختم ہو گیا۔ تمام ہو گیا۔ نامکمل سی حالت میں جیسے کوئی چیز مکمل ہو جائے خوبصورت حسین پھول اپنی جھاڑیوں میں کانٹے اور زہریلے ناگ لئے رہتا ہے۔ امرت کے پیاسوں میں زہر کا ذائقہ۔ ——— یہ خط ہیں ——— ؟ درندے ہیں۔ زندہ نگل جانے والے بھیڑئیے ہیں ——— انھیں رکھوں یا جلاؤں؟ نہ جلاؤں تو جی جلتا ہے۔ یہ صبر آزما اذیت بھی سہی نہیں جاتی۔

اچھا اب کچھ دوسری باتیں۔ یہی موسم پر گفتگو۔ موضوع بدلنا چاہئے نا۔ کیسا نیت سے الجھن ہوتی ہے۔ گرمی سے طبیعت نکمی و مضمحل سی ہو گئی تھی۔ آسمان ایک پتھر کی طرح بہت دنوں تک بے حس بنا رہا۔ ٹھنڈی

ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ بھی اس کے استقلال کو جنبش نہ دے سکے۔ اب حضرت جو برسنے پر آئے ہیں تو ایک گھڑی کو آنسو نہیں تھمتے۔ آف۔ پتھر کے نیچے بھی پانی رہتا ہے۔ اب ان بادلوں سے کون پوچھے کہ آخر درد کہاں ہوتا ہے جو تم یوں انھیا روتے ہو؟

میری مصروفیات نہایت غیر دلچسپ اور خشک ہیں۔ پھر آفت یہ ہے کہ مجھے ان سے خواہ مخواہ دل لگانا پڑتا ہے بعض وقت اقبال اور غالب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی سوجھ بوجھ بھی کھو دیتی ہوں۔ غالب کس قدر مشکل پسند ہے۔ اقبال کتنا دور رس ہے۔ کتنی بلند وارفع شخصیتیں ہیں۔ کوئی کیونکر سمجھائے انہیں۔ جن کا سمجھانا ہی دشوار ہے گو یا

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

بہت سے خط، کاروباری قسم کے (کیونکہ سچے دوستوں کے خطوط آنے کا موسم ختم ہو گیا) آئے رکھے ہیں۔ جواب ایک ایک دو دو کا لکھ رہی ہوں ختم ہی نہیں ہونے پاتے۔ کسی کی سفارش کرنی ہوتی ہے۔ لیکن طبیعت پر یہ چیز بڑی بارگزرتی ہے۔ کسی کی سفارش کرتے انسان کو اپنی طبیعت پر انتہائی جبر کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض وقت تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری سفارش رائیگاں جائے گی۔ ہم مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جبر اختیار کی چیز تو ہے نہیں۔ چنانچہ اس وقت کا "سلام روستائی" بے غرض نہیں تھا۔ کسی کی خواہش پر تم سے مخاطب ہونے کی دیرینہ تمنا بر آئی ہے۔ اس کے لئے میں ان کی ممنون ہوں۔ ہو سکے تو کسی بے روزگار کو روزگار دلا دو۔ ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا۔

زندگی کے ذخار تجربے، حیات مستعار کی بے معنی ضرورتیں، اپنی طبیعت کی لامحدود کمزوری، ان سب ذخیرہ کو کہاں چھپاؤں۔ اس تمنائے بے ضرر، اس آرزوئے مسلسل کو کہاں دفن کردوں۔ کیسی ناکام کوشش ہوگی یہ بھی میری۔ کوئی دیرینہ خواہش پوری ہوتی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ شکریہ ادا کرنے کا ابتک سلیقہ نہ آیا۔ یوں سمجھو۔

خلق مجھ سے طالب پابندی اخلاق ہے۔	میری یہ حالت کہ مجھ پر تھینک یو بھی شاق ہے

یہ مہذب لوگ ہمیں کیسے کیسے اخلاق سکھاتے ہیں۔ اور ہم نکمے ہندوستانی ان کی تہذیب روشن سے کچھ بھی تو نہیں سیکھتے۔

پلو نچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا

ایک لطیفہ سنو۔ کل صفیہ سے چلتے چلتے لڑائی ہو گئی۔ لڑنے میں لطف تو ہے۔ لیکن اس وقت سے ابتک ایک خلش سی ہے۔ آج انھیں ایک خط لکھا ہے۔ معافی مانگی ہے۔ گو قصور میرا نہیں۔ انھیں کا ہے۔ اگر چہ کہ مجھ سے انھیں اب کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر مجھے بھی کسی ڈرامہ کا ہیرو یا ہیروئن بننے سے تماشائی بننا نسبتاً بہتر معلوم ہوتا ہے۔ خوب ناچیگی اس پر۔ خود

تو بھی بھڑکر، رلانے کی حد تک مذاق کریں گی - اور اگر دوسرا کوئی کچھ کہدے تو بس خفا - ؎

شوخی میں تمکنت ہے، تو ہے ناز میں نیاز — تعلیم شوخ پائی ہے ، اچھے ادیب سے

آج کتنی نشیلی سہانی چاندنی نکھر آئی ہے - برسات کی بھیگی بھیگی راتوں میں چاندنی کا روپ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے - ایسی ہی راتوں میں لوگ دیوانے ہو جاتے ہوں گے - چاند ابر کے ٹکڑوں سے کھیلتا پھر رہا ہے - جیسے کوئی حسین فرشتوں کے پروں اور بازوؤں پر بیٹھا اڑ رہا ہو - درخت نشہ میں اس طرح جھوم رہے ہیں جیسے ابھی کسی خمکدہ سے نکلے ہیں - تارے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے روپوش ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں - دور سے کہیں کسی چرواہے کی بانسری سے یہ صدا آرہی ہے "من رے مت رو مت رو کیسے تجھے مناؤں" — جانے کیوں رو رہا ہے اس کا من - اور اس کو منانے کی کوشش کتنی فضول ہے -

کل بڑی بھابی جان سے یوں ہی چلتے چلتے ملاقات ہوگئی - خوب گلے شکوے ہوئے - شکایت و شکوہ میں انہیں کمال حاصل ہے اور پھر شکایت اتنی ملیح قسم کی ہوتی ہے کہ دل نہیں ٹوٹتا - ان کی باتیں اچھی لگتی ہیں - بس چپ چاپ سنتی رہی - میں تو ازل کی گونگی ہوں - وہ بھی کہاں کہاں کی ، دور دور کی ٹھیکری اٹھا لاتی تھیں کہ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں - ان کا حافظہ مجھ سے کہیں زیادہ اچھا ہے - مجھے تو کل کی بات یاد نہیں رہتی - ہاں جس چیز کو بھولنے کی کوشش کرتی ہوں - وہ البتہ یاد رہجاتی ہے - اور بار بار یاد آتی ہے - اس لئے میں اب سب کچھ بھول جانے کی مشق کر رہی ہوں - بہر کیف جی خوش ہو گیا ان کی شکایت ہائے رنگین سے - اور میرا اپنا جو حال ہوا اس کی توضیح بھی سن لو -

نکلی ہیں حشر میں دنیا کی پرانی باتیں! — میں تو کیا - میرے فرشتوں کو بھی اب یاد نہیں

عید

بہ عید شاد ہمہ خلق و من بعید ز یار — چو من ز یار بعیدم مرا بہ عید چہ کار

روٹھا ہو ہے آج ہمارا عزیز دوست — من جائے وہ تو پھر بخدا عید ہو گئی

فلک پر ہلال اور زمیں پر ہیں آپ — میری عید دو ماہ پاروں سے ہے

یک روز بود عید بہ یک سال بہ یکبار — ہر روز مرا عید ز دیدار تو ہموار

دین و دنیا

جناب خواجہ محمد ضیاءاللہ صاحب اختر بی۔اے (امرت سری)

بسلسلہ گذشتہ مئی ۱۹۴۵ء

یونانی روایات سے پایا جاتا ہے کہ یہ مصر سے ہوتا ہوا، ایران اور اس کے بعد ہندوستان میں آیا، اور ان ممالک میں کئی سال رہا، ہندوستان میں "شیو" پوجا اسی نے رائج کی جس کا مقدس ویدوں میں کہیں مذکور نہیں، اور نہ ویدوں کے زمانہ میں کوئی اس سے واقف تھا۔ "شیو" پوجا نے بعد ازاں "وام مارگ" کی صورت اختیار کر لی اور یہ مذہب ہندوستان کے طول و عرض میں شایع ہو گیا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ آریا دیوی شان و شوکت مٹ گئی اور عیش پرست راجے اور راجپوت بیرونی حملوں کی تاب نہ لا سکے اور آخر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر قناعت کی۔ ایران کا بھی یہی کچھ حشر ہوا آریائی دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں خاص خاص امتیازی نشان رکھتی تھیں۔ یونانی "بیکس" اور ہندی "شیو" کا امتیازی نشان "لنگا" ہے اور "بیل" سواری کا جانور ہے۔ جس طرح ہندوستان میں "ہولی" منائی جاتی ہے اسی طرح یونان میں "بیکس" کا تیوہار منایا جاتا، ہندی "ہولی" کرشن جی سے منسوب ہے، چالاک وام مارگیوں نے جہاں دوسرے دیوتاؤں کے متعلق مخرب اخلاق فسانے گھڑے، کرشن جی کی تصویر ایسی سیاہ ہیئت کی ہے جو "بیکس" سے ملتی جلتی ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ نہ تو ویدک زمانہ اور نہ زرتشتی ابتدائی مذہب میں اور نہ ہومر کی نظموں میں ان بیہودگیوں کا پتہ چلتا ہے۔

چونکہ ہم ایران کے دین و دنیا کا مطالعہ کر رہے ہیں اس لئے ہم مثالاً ایک خاص فرقہ "آخشتی" کا ذکر کرتے ہیں فارسی میں "آخشیجان" عناصر اربعہ خاک و باد و آب و آتش یا مادی عالم اضداد کو تعبیر کرتا ہے لیکن "آخشتی" ایک موبد تھا جو پیدائش مسیح سے قریباً سات سو سال پہلے گذرا ہے، اس کی تعلیم یہ تھی کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، جیسا کہ زرتشتی مذہب میں مذکور ہے اور عورتوں میں کوئی امتیاز نہیں خواہ وہ ماں ہو یا بہن یا بیٹی یا زوجہ، ہر ایک مرد ہر ایک عورت کے ساتھ بطور میاں بیوی رہ سکتا ہے، بلکہ نزدیک تر رشتہ میں مناکحت بہتر ہے۔ لوگوں نے عقائد خود ساختہ کو اچھا اور برا بنا لیا ہے اور عادتاً کسی شئی کو مکروہ اور قبیح اور کسی کو پسندیدہ سمجھتے ہیں۔ ورنہ انسان بھی ایک حیوان ہے اور حیوانی زندگی میں کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیئے۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ مذہب ایران کے طول و عرض میں شایع ہو چکا تھا، اس لئے جاماسپ کا تعلق اپنی سوتیلی بہن سے کوئی معیوب بات نہ تھی، بہن نے بلاش کو زہر دے کر مار ڈالا، امراء اور مغ پہلے ہی جاماسپ کے طرفدار تھے اس لئے وہ بلا تکلف تاج و تخت پر قابض ہو گیا۔

بلاؤش نے چار برس حکومت کی اور اس عرصہ میں مغان ایران کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح رہا۔

خاقان "خشنوا" نے اپنی لڑکی کا نکاح قباد سے کر دیا تھا اور اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام "خسرو" رکھا گیا، جو بعد میں "نوشیروان عادل" کے نام سے مشہور ہوا، جب خاقان اور قباد نے جاماسپ کی تخت نشینی کا حال سنایا تو لاؤ لشکر کے ساتھ ایران کی طرف بڑھا۔ یہ واقعہ سنہ ۴۹۶ء کا ہے، قباد کو نمایاں فتح حاصل ہوئی اور جاماسپ جان بچا کر بھاگ گیا، قباد کو تخت پر چھ سال کا عرصہ نہ گذرا تھا کہ ایرانی اہل دین و دنیا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ قباد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جب تک ان کا زور نہ ٹوٹے وہ خود کاروبار سلطنت خاطر خواہ طور پر انجام نہیں دے سکتا ان دنوں میں حکیم "نزدک" اور اس کے نئے مذہب کا شہرہ ہو رہا تھا، وہ کہتا کہ کائنات کے دو خالق ہیں ایک "یزدان" اور دوسرا "اہرمن"۔ یزدان نور کا اور اہرمن ظلمت کا، ہر ایک خوبی اور نیکی کا سرچشمہ یزدان پاک ہے اور تمام برائیوں اور فتنہ وفساد و جنگ و جدل اہرمن کی "شیطنیت" ہے۔ اس حد تک تو یہ مذہب کسی نہ کسی صورت میں معمولی اختلاف کے ساتھ پہلے ہی ایران میں مقبول تھا۔ لیکن اس نظریہ سے جو کچھ حکیم نزدک نے اخذ کیا، اس کا نتیجہ بہت دور رس تھا۔ وہ کہتا کہ جب یہ عقیدہ مسلمات سے ہے کہ تمام فتنہ وفساد یزدان پاک کے ہاں گناہ اور اہرمن کے نزدیک ثواب ہے اور "زر" اور "زن" کی غیر مساوی تقسیم ہی تمام فتنہ وفساد کی جڑ ہے اس لئے اس کی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ مردوں اور عورتوں کو بالکل آزاد چھوڑ دینا چاہیئے جس کے ساتھ چاہیں تعلق پیدا کریں، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک شخص تو مالدار ہو اور تمام جہان کی نعمتیں اس کے قبضہ میں ہوں اور دادِ عیش دیتا رہے اور دوسرا مفلس تلاش نان شبینہ کا محتاج، ایک شخص کے ہاں عورتوں کا ہجوم ہو، اور دوسرا ایک کو ترستا رہے، ایک بدصورت کے ہاں عورت خوبصورت اور ایک خوبصورت کے گھر عورت بدصورت، مناسب ہے کہ دونوں سمجھوتہ کر لیں۔ کبھی بدصورت بدصورت کے ساتھ اور خوبصورت خوبصورت کے ہاں رہے۔" معاشیات اور معاشرت میں اشتراکیت اگرچہ امراء کو پسند نہ تھی لیکن ادنیٰ اور متوسط الحال طبقہ نے اسے قبول کر لیا، اور اس پر عمل بھی شروع ہو گیا، اور تھوڑے عرصہ میں فسق و فجور کا بازار گرم ہو گیا۔

مغان ایران نے اس نئے مذہب میں ایک ایسا فتنہ دیکھا جو ان کے اقتدار کے سخت مخالف تھا اس لئے امراء کو گانٹھا اور بادشاہ قباد کو اس "بدعت" کی طرف توجہ دلائی، بادشاہ نے حوصلہ افزا الفاظ میں وعدہ کیا کہ بعد تحقیقات اس کا قلع قمع خاطر خواہ کیا جائے گا۔ یہ لوگ کچھ مطمئن سے ہو کر چلے گئے۔ قباد نے "زرمہر" سے خلوت میں مشورہ کیا۔ قباد نے کہا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ نزدک اور مغوں کو آپس میں لڑا دیا جائے۔ گوش خر و دندان سگ"۔ زرمہر نے کہا کہ ہاں "آہن با آہن کوفتن" ہے تو صحیح لیکن اس میں خطرہ بھی ہے۔ (باقی)

لکھنا کیوں کر آیا

وہ زمانہ ہے اور آج کا دن جب کہ اردو کی ابتدائی جماعت میرے لئے یونیورسٹی سے کم نہ تھی ایک عزیز اپنے ڈرائنگ روم میں کوئی کتاب مزے لے کر دوسرے عزیز کو سنا رہے تھے۔ قصہ کا پلاٹ یا طرز نگارش نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کیوں دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔ نہایت غور سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ الفاظ کی معنی اور انشا تک کا امتیاز نہ تھا وہ تھک گئے تو کتاب رکھ کر ڈرائنگ روم سے چلے گئے اور میں نے کتاب کا نام بدقت ہجے کر کے "ملک العزیز ورجنا" پڑھا جس کی نسبت اب کہہ سکتا ہوں کہ وہ مولٰنا شرر کا پہلا ناول تھا جو نواب آسمان جاہ بہادر کے نام معنون کیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھ سے ممکن تھا پڑھنے کی کوشش کی لفظ لفظ پر رکاوٹیں پیش آئیں لیکن اسی دوران میں ایک لفظ ایسا آیا کہ تحریر کی مناسبت سے وہاں بے محل تھا بڑے بھائی سے معنی دریافت کئے انھوں نے بتائے تو بالکل ٹھیک مگر اطمینان نہ ہوا۔

جوں جوں اسکول کا زمانہ گذرتا تھا ناول خوانی کا ذوق روز افزوں تھا۔ قریب قریب شرر۔ محمد علی۔ پنڈت رتن ناتھ پرشاد وغیرہ کے ناول پڑھ ڈالے اب اردو میں جب کہ کوئی گنجائش معلوم نہ ہوئی تو طلسم ہوش ربا اور اس کی متعلقہ کل جلدیں راتوں کو جاگ جاگ کر فرض کفایہ کی طرح ختم کر دیں یہاں تک کہ رینالڈس کی کل ناولیں دیکھ ڈالیں البتہ اس کا اعتراف ہے کہ اس ناول خوانی سے اردو لکھنے کا کچھ سلیقہ آگیا تھا اور رینالڈس کی کتابوں نے غریبوں سے ہمدردی کا جذبہ دل میں پیدا کر دیا لیکن اس کے ساتھ خیالات میں ایک طرح کا انتشار پیدا ہوتا گیا ایک لکھنوی خاندان کے رات دن کی صحبتوں نے اتنا فائدہ پہنچایا کہ بول چال میں تذکیر تانیث کا امتیاز ہوتا گیا اور زبان میں ایک قسم کا لوچ آگیا میرے ہم سن اور اکثر مسن میری بول چال سے دھوکہ کھا کر وطن کی نسبت استفسار کرتے اور انھیں جب معلوم ہوتا کہ میرا مرز بوم وہی ہے کہ جس زمین پر وہ بستے جس آسمان کے نیچے رہتے اور جس فضا میں وہ سانس لیتے آئے ہیں تو انہیں یقین نہ آتا۔

داغ کہتے ہیں ؎ کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے ۔ مگر ہمارا خیال تھا کہ زبان آچکی اب دوسروں کو اپنی زباں دانی کے جوہر دکھانا چاہیئے۔ مضامین نگاری کا شوق ہوا۔ اندیشہ تھا کہ خدا جانے کتنے لغزشیں اور کتنے غلطیاں ہوں۔ یہ وہ خیالات تھے کہ ایک عرصہ تک اسی غور و فکر نے جراءت نہیں دلائی طبیعت میں جو ولولہ اور قلم میں

جو روانی تھی وہ اپنی اپنی جگہ سرد تھے لیکن قدر کو شاید اس جذبہ سے کام لینا مقصود تھا۔ چنانچہ اسی دوران میں علی گڑھ زنانہ کالج کے لئے ایک ناٹک کمپنی نے اپنے ایک روزہ کھیل "دختر فروش" کی آمدنی کے وقف کا اعلان کیا پھر کیا تھا خوابیدہ جذبات بیدار ہوگئے اور ایک مضمون اخبار مخبر دکن کو جو اوس زمانہ میں کافی شہرت رکھتا تھا لکھ کر بھجوایا مضمون شائع ہوا اڈیٹر نے حوصلہ افزائی کی احباب نے مبارک باد دی، ہمت بلند ہوگئی، اور اب قلم اس کٹھن منزل میں تیزی سے چلنے کے لئے آمادہ ہوگیا تھا۔

اسی زمانہ میں لاہور سے سر شیخ عبد القادر بیرسٹر نے 'مخزن' جاری کرکے ادب کی دعوت عام دی اور اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہوئے۔ اقبال۔ یلدرم، ارشد، نیرنگ وغیرہ جیسے وقیع ہستیاں نکلیں جنھوں نے ادب کو معراج پر پہنچایا اور ہندوستان بھر میں اردو ادب کا ذوق پھیلا دیا ہم کو یہ شوق چرایا کہ کوئی مضمون مخزن میں شائع ہو تو شاید ہمارا بھی سکہ چل جائے۔ چنانچہ "خیال یار سے دو باتیں" جب شائع ہوا تو ہم آسمان ادب پر اڑنے لگے پھر تو مختلف اخبارات اور رسایل میں ہم تھے اور ہماری قلمی گل کاریاں۔ اور اسی شوق نے اچھے اچھے لکھنے والوں سے مراسلت کرنے کی ہمت بندھائی۔ چنانچہ اقبال۔ یلدرم۔ راشد۔ کو کئی خطوط لکھے۔ یلدرم کا جواب "آپ نے جن الفاظ میں میرے مضامین کی داد دی ہے اوس کا کمال منت پذیر ہوں لیکن آج کل زندہ درگور ہوں ہاں اب بھی چند دلدوز نالے کرنے کا ارادہ ہے اگر فرصت ملی مجھ کو جہان میں" واقعہ یہ تھا کہ کچھ عرصہ یلدرم نے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ مخزن کے بعد مولانا راشد نے "تمدن" جاری کیا، ہر نئے رسالہ کی پذیرائی ذوق ادب کا جزو بن چکی تھی چنانچہ تمدن کے دور میں اس کی ممکنہ اعانت خریداروں اور عطیوں سے کی گئی اور یہ پرچہ بھی ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ جب مولانا راشد پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تو ہم سے مل کر اونہیں حیرت ہوئی کہ ہم ان کے دانست میں نہایت ہی مسن تھے۔ یہ دور بھی گذر گیا۔ آگرہ سے "نقاد" نے سر اٹھایا اس کو بھی لبیک کہا کچھ عرصہ بعد عدم آباد پہنچ گیا تو اس کی جگہ 'شمع' نے لی۔ اوس کے مینیجر حیدرآباد آئے۔ چونکہ ادب کی خدمت اپنا فرض تھا اس کے نشر و اشاعت میں بھی دلچسپی کم نہ ہوئی۔ اب تو آئے دن نئے نئے رسایل وجود میں آنے لگے اور اڈیٹروں سے خطوط سے میز بھری رہتی تھی

یہ رام کہانی تو نثری ذوق کی تھی اب شعر و شاعری کا نزول ملاحظہ کیجئے کہ کس ماحول اور کن جذبات کے تحت تھا۔ وہی ابتدائی زمانہ ہے جس کو عنفوان شباب سے تعبیر کیا جاتا ہے اپنے ساتھیوں میں ایک شادی کی تھی ہم بھی کئی دنوں تک مصروف رہے اسی دوران میں دولہا میاں کے ہاتھوں میں مہندی لگائی گئی اور یہ خلم

رنگ لائی کہ جذبات کے لئے ایک نشتر تھی۔ ہاتھوں کو دیکھ کر بے اختیار یہ شعر موزوں ہوگیا۔

ایک عالم کو گماں نے ید بیضا ہوتا وہ اگر دست حنائی کو دکھائے جاتے

اس شعر سے تسلی نہ ہوئی تو سہرا ابھی تیار کر لیا گیا کہ چلو پانچویں سوار میں شمار ہو جائے گا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ دونوں مشغلے جاری رہے لیکن اتنی جراءت نہ تھی کہ اپنے اشعار اور مضامین کو بے دھڑک منظر عام پر لائیں۔ اس لئے دوسروں کے نام سے زیادہ اور اپنے نام سے بالکل کم شائع ہوتے۔ تھوڑا بہت ہمارے نام کا تعارف ہو چکا تھا کہ باہر سے ایک نوازش نامہ ملا۔ اس کے ہمراہ "پروانہ" پر ایک نظم مرسل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جواب میں "حقیقت شمع" اور "جواب پروانہ" کہی جائے۔ یہ امتحان بڑا ہی کٹھن تھا کیونکہ فرمائش پر کہنے کا کبھی اتفاق ہوا نہ تھا پھر "پروانہ" والی نظم ایسی مرصع تھی کہ جس کو پڑھ کر بڑی دیر تک جھومنا پڑا۔ چنانچہ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

اے عاشق دل خستہ اے سوختہ الفت تو راز محبت کا اک سالک یکتا ہے

رگ رگ سے نہاں تیری ہے آگ محبت کی تو عشق مجسم ہے تو حسن کا بندا ہے الخ

غور کیجئے اس کو دیکھنے کے بعد شمع پر شعر کہنے کی ہمت کیونکر ہو سکتی تھی۔ مگر بعض فرمائشیں ایسی ہوتی ہیں کہ اون کے آگے سر تسلیم خم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ باامتثال امر شمع کے ساتھ یوں دل سوزی کرنی پڑی۔

تخلیق کا جب میری قدرت کو خیال آیا شبنم سے لئے آنسو بلبل سے لیا نالا

پھر برق کی بیتابی رکھدی مرے سینہ میں کچھ رنگ شفق کا بھی طینت میں مری ڈالا

تاروں سے ضیاء لے کر غنچوں کے تبسم میں یوں کالبد نوری سانچہ میں مرا ڈھالا الخ

نہ جانے یہ نظم کس طرح پھیل گئی کہ اب ہر طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں، کوئی "دوشیزگی" پر کوئی "دزدیدہ نظر" پر نظمیں چاہتا تھا اور یہاں طبیعت غیر شاعرانہ تھی۔ معذرت کی جانے لگی۔ لیکن یہی حکم کہ تعمیل کرنا ہی پڑے گا۔ بتائیے ایسے ماحول میں آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں جب کہ امتحان کا پرچہ دے کر جواب طلب کیا جا رہا ہے کہ اتنے گھنٹوں میں مکمل ہو جانا چاہئیے تو ایک طالب علم کی حیثیت سے شاید یہی لکھ سکیں گے۔

عالم دوشیزگی تھا مایل آغوش شوق جب پذیرائی ہوئی جذبات عریاں ہو گئے

سینۂ معصوم میں فتنے تھے خوابیدہ تمام چھیڑنے کی دیر تھی بس وہ نمایاں ہو گئے الخ

یا

یا — وہ نگاہ ناز تھی یا برق تھی زیر سحاب یا کہ تھی پیمانۂ گل میں نشاط آور شراب
ہوش کیوں پراں ہوئے یہ رہ گیا کیسا اثر طور پر رقصاں ہیں ابتک بجلیاں کچھ بے حجاب

طور کا جلوہ نہ تھا ہاں تھی یہ "ذر دیدہ نظر" کس طرح محفوظ رہتا پھر کوئی قلب و جگر
کام اپنا کرگئی جو کچھ اسے منظور تھا یعنی ہستی کی عمارت ہوگئی زیر و زبر

آپ مطالعہ میں مصروف تھے اور ملازم ڈاک لاکر دے اور اس میں ایک لفافہ جاذب نظر ہو تو قدرتاً سب سے پہلے اس کے پڑھنے کے لئے مجبور ہیں اور جب لفافہ چاک کرتے ہیں تو ایک تصویر آپ کے دامن میں پناہ لینا چاہتی ہے تو اس سے کیا نتیجہ نکالیں گے؟ یہ کہ وہ لب خاموش سے داد خواہ ہے کہ تنقیدی نظر ڈالئے اور اس کو سلک نظم میں پروکر مرصع کر دیجئے اور اس وقت آپ اپنے تخیلات کو ترتیب دیجئے تو ان الفاظ میں:۔

ضرورت جامہ زیبی کی نہ سامان امارت کی دیا ہے جس کو قدرت نے ازل سے حسن شاہانہ
مجھے بھاتا ہے اف سادہ سا تیرا بانکپن یعنی یہ تیری وضع رندانہ یہ تیری شان ترکانہ
اسی پر ناز تھا تم کو مری خلوت میں آنے سے تو پھر کیوں آج آئے اس طرح سے بے حجابانہ الخ

اک حسین بالا تیار ہوجائے گی۔

سواد بمبئی کا ہر چپہ رنگینیوں سے معمور رہتا ہے۔ پھر "اپالو" کی ہر رنگین شام حسن کی شہر آشوبیوں کے لئے مشہور عام ہے جہاں فراوانی حسن سے قدم قدم پر نظارہ کانپ اٹھتا ہے جہاں دیباچہ حسن و رعنائی اور سیلاب قوس قزح میں سوائے لغزشوں اور ٹھوکروں کے کچھ نہیں ملتا اگر وہاں کوئی کھوجائے تو تعجب نہ کیجئے ایسی کئی شامیں اپالو کے کنارے ایک رنگین معیت میں جب بسر ہوں اور کوئی کسی کے جذبات کیلنا چاہے تو غریب ان الفاظ میں معذرت خواہ ہوگا۔

اس مجمع محشر سے گھبرانے لگا ہے جی خلوت میں کہیں لے چل اے جذبۂ تنہائی
یہ حسن کی دنیا ہے معمور اداؤں سے اک کیف برستا ہے رنگین فضاؤں سے
اللہ رے وفور حسن یہ شوق جبین سائی ہوشیار یہاں آکر بن جاتا ہے سودائی الخ

بعض اوقات کسی کی نسبت غلط خیال قایم کرکے اوس سے سوال کیا جائے کہ "شاعر تو اتنا حسین خیال کیوں واقع ہوا ہے کہیں پری بہار کے بازو تیرے رخسار سے تو چھو نہیں گئے؟"

فرمائیے اگر کوئی شاعر نہ بھی ہو تو مجبوراً اس کو شاعرانہ انداز میں یہی جواب دینا پڑے گا:۔ م

میں حسین خیال کیوں ہوں یہ سوال مجھ سے تیرا
میں جواب اس کا کیا دوں ترے حسن کا ہے صدقہ

وہ حنا کی بھینی خوشبو۔ وہ شفق کی ہلکی رنگت
لیا سبزہ سے لچک کو تو گلوں کی کچھ نزاکت

کیا قطرہ ہائے شبنم سے خمیر سب ملا کر
رگ گل کے مو قلم سے کھینچا، قلب زار شاعر

جو پسند آیا اس کو مرے لوح دل کا ٹکڑا
تو مصور ازل نے تیرا کھینچا پھر یہ نقشا

دیا اذن پھر وہیں یہ کہ جہاں میں آج جا کر
تڑپ اور سب کو تڑپا یہی تیرا ہے مقدر

میرے دل کا ہے یہ پرتو۔ ہیں جہاں میں نکتے جتنے
تجھے پھر بتاؤں گا میں، ہیں رموز اور کتنے

نہ کر اب سوال مجھ سے میں حسین خیال کیوں ہوں

اگر آپ کو کسی کے بارگاہ حسن میں پہلی مرتبہ باریابی کا موقع ملے اور کوئی حسین پیکر سرخ ردا میں ملفوف اور زلفیں چہرہ کی بلائیں لیتی ہوئی نظر آئیں اور ایک ادائے دلربا یانہ سے سلام کرے تو شاید آپ اس وقت کے منظر کو انہیں الفاظ میں قلمبند کر سکیں گے۔

وہ سلام تھا جو مجھے کیا کہ پیام تھا مری موت کا
میرے دل پہ آج بھی نقش ہے کہ وہ جس ادا سے ادا کیا

کوئی سرو قد تھا کھڑا ہوا، تھا ردا میں جسم چھپا ہوا
نظر آ رہا تھا نقاب میں کہ ہو چاند جیسے چمک رہا

میرا جسم سارا تھا مرتعش مرے دل میں پھیلی تھی سنسنی
نہ تھی کچھ خبر کہ میں ہوں کہاں مجھے اپنا کچھ بھی ہوش تھا

مجھے ہوش پھر تو یا جو اک ذرا میں جواب دیتا سلام کا
ہوا عقدہ طور کا آج حل جو کلیم کو تھا غش آ گیا

انسانی زندگی کے یہ واردات ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں ہر ایک کو پیش آتے ہیں۔ سینہ سے آہ نکلنے کے لئے بیتاب رہتی ہے جب تاب گویائی نہ ہو تو دل خون شدہ حسرت والم بن جاتا ہے۔ یہ داستان دراز اور لطیف و رنگین ہے لیکن اس کا اعتراف ہے کہ بہت کچھ لکھا پڑھا اب نہ لکھنے کی آرزو ہے نہ پڑھنے کی تمنا۔ باوجود اس کے کوئی اچھا مضمون اور نظم نظر سے گذر جائے تو اپنی جہالت اور لاعلمی پر افسوس ہوتا ہے کہ نہ لکھنے کا ڈھنگ آیا۔ نہ پڑھنے کا سلیقہ۔ زندگی کے کئی برس نذر ہو چکنے کے بعد یہ تجربہ ہوا ہے۔

تا بد آنجا رسید دانش من!
کہ بدانم ہمی کہ نادانم!!

"محبت"

جناب محمد حبیب اللہ صاحب وفاؔ بی۔ ڈی پیج

اے محبت محملوں میں دل کے اک لیلا ہے تو — ساری دنیا جس کی سودائی ہے وہ سودا ہے تو
نام لے لے کر ترا بھرتی ہے چٹخارے زباں — گدگداتی رہتی ہے رہ رہ کے تیری داستاں
قلزم جذبات دل کی تو ہے موج بیقرار — خرمن احساس دل کی تو ہے برق بیقرار
شاہد پردہ نشیں رخ پر تخیل کی نقاب — راز قدرت کی طرح تو بھی ہے مستور حجاب
دوڑتی پھرتی ہیں نظریں ان کو ہے تیری تلاش — بن کے تصویر مجسم جلوہ گر ہو جائے کاش
شمع روشن تو ہے جس کی لو سے دل ہیں نور بار — جس طرح اک شمع سے جلتی ہیں شمعیں بے شمار
حسن والفت میں بہم اک ربط کی زنجیر ہے — اس کی وہ تقدیر ہے اور اُس کی یہ تقدیر ہے
درد و غم فیض طرب ہے تیرے فیض عام میں — زہر بھی ہے شہد بھی ہے تیرے چلتے جام میں
سر الفت سے سراسر دل بھی بیگانہ رہا — راز مئے سے بے خبر جس طرح پیمانہ رہا
ہے وہی کامل محبت جس کا کچھ چرچا نہ ہو — راز الفت کا تقاضا ہے کہ وہ افشا نہ ہو
آج عنقا ہے محبت کس کو اس سے کام ہے — نام بھی باقی محبت کا برائے نام ہے
داستان لیلیٰ و مجنوں پرانی ہو گئی — مشغلہ یاروں کا دل خوش کن کہانی ہو گئی
رنگ بدلا ہے جہاں کا رنگ الفت اور ہو — رنگ ڈھنگ ہو اس طرح کا جس طرح کا دور ہو
جاں نثار دست عاشق تھے یہ تھا دستور عام — آج کے فرہاد شیریں کا کریں قصہ تمام
حسن بھی ہو مال ہو محبوب ایسا چاہیئے — بالا بالا وہ اڑے ایسا تماشا چاہیئے
رقص کا انداز ہو گانے کی کچھ گت یاد ہو — شیشۂ مے ہو بغل میں ہر طرح آزاد ہو
اے پرستار ہوس شان محبت اور ہے — زندگی کی جان بے جان محبت اور ہے
نور فیضان خدا اس سے سوا کوئی نہیں — جز محبت کے خدا کا رہنما کوئی نہیں
دل کو خالق نے کیا پیدا محبت کے لئے — ایک گنجینہ دیا ہے اس امانت کیلئے
کیا حقیقت ہے محبت کی بیاں کیوں کر کرے — ترجمانی جذبۂ دل کی زباں کیوں کر کرے
اے وفا ہم بیوفا ہرگز نہیں یاروں کے ساتھ — ساتھ رہتا ہے محبت کا وفادار ہے کے ساتھ

ناکامی

جناب مرزا سہام الدین صاحب

ضیا نے قطعی فیصلہ کر دیا ——

ظفر اٹھ بیٹھا۔ اور سیدھے اپنے کمرے کا رخ کیا اس کا سر بھاری تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا کسی نے سینکڑوں من بوجھ سر پر لاد دیا ہے۔ یا کوئی ہتھوڑے کے کاری ضربوں سے دماغ کا جوڑ جوڑ علیحدہ کر رہا ہے۔ صوفہ پر لیٹا۔ بھائی کی طوطا چشمی اور بھاوج کی چالبازی پر غور کرنا شروع کیا۔ تصورات کی رُو تھی کہ برابر بہی چلی آ رہی تھی، مختلف خیالات نے ایک دم سے یلغار کر دیا ہر طرف غبار سا چھا گیا دماغ کے گوشے گوشے سے دھواں اٹھنے لگا۔ آخر یہی دھواں آنکھوں کی راہ سے قطروں کی شکل میں بہنے لگا۔ بھائی کے آخری الفاظ اس کے دماغ سے ٹکرا ٹکرا کر بغاوت کی ہلکی سی چنگاریاں پیدا کر رہے تھے "جدھر سینگ سمائے ادھر چلا جانا بہت کچھ سن چکا اور بہت کچھ سہہ چکا اب برداشت کی طاقت نہیں روز روز کی ان خانہ جنگیوں کا فیصلہ مجھ سے کیا نہیں کیا جا سکتا اب یہ میرا آخری اور قطعی فیصلہ ہے کہیں اس کو ظلم نہ سمجھنا۔ ایک ایک لفظ انصاف پر مبنی ہے۔ پہلے تاکید کر دی تھی۔ لیکن اس کو اس کان سنا اور اس کان اڑا دیا۔ تم اسی وقت میرا گھر چھوڑ دو۔ اب چاہے تمہارے ہاتھ میں کشکول آ جائے یا قسمت سے قاروں کا خزانہ ہاتھ لگ جائے اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ جو لڑکا بھاوج کو بھاوج نہ سمجھے، بھلا وہ بھائی کو بھائی کب خیال کرے گا"

برابر والے کمرے سے باتوں کی ہلکی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہی سرگوشیاں زور پکڑنے لگیں اور باتیں صاف سنائی دینے لگیں۔

"اب چین نصیب ہوا؟" بھائی ضیا نے کہا "اب تو سنگ راہ دور ہوا! بہن! کچھ شکایتیں کرنی تھیں۔ دو رکعت نفل پڑھ لینا"

"واہ" بھاوج کہنے لگی "تم نے بھی ایک ہی کہی۔ یہ احمد کی پگڑی محمود کے سر والا معاملہ یہاں کیوں۔ میں نے ظفر کو گھر سے نکال دینے کے لئے تھوڑی کہا تھا یہ تو تمہاری اپنی عقل کا قصور ہے۔" "اور ——؟" بھائی نے طنز کیا "یہ میں نے ہی کہا تھا نہ کہ اب مجھ سے ظفر کی شرارتیں سہی نہ جائیں گی۔ مجھے کہیں علیحدہ رکھو"

"یعنی ——" بھاوج نے چیخ کر کہا "میرے منہ پر تم نے مل کیا، میں نے تم سے یہ کب کہا تھا؟" "ایک دفعہ نہیں" بھائی نے ہاتھ پیشانی پر مار کر کہا "لاکھ دفعہ کہا ہے تم نے"

"جی ـــ" بھاوج نے اسی رفتار کے ساتھ کہا "اپنی غلطی میرے سر تھوپ رہے ہو، ہائے میرے اللہ، میں نے تمہیں انہیں نکال دینے کے لئے کب کہا تھا۔"

"اچھا بھئی" بھائی نے ہار مان کر کہا "جانے بھی دو، ان باتوں کو جو ہونا تھا ہو چکا۔"

"پشیمان ہیں آپ" بھاوج نے خوش ہو کر کہا۔

"مجھے نکال دو اپنے گھر سے" "ہوں ـــ" بھائی نے لانبی سانس کھینچی "ذرا ادھر آنا۔ اس نے کس کس طرح تمہیں ستایا ہے"

"کہاں تک گنواوں" بھاوج نے تیر نشانہ پر لگتا دیکھ کر کہا "تمہاری بڑی سالی کو ایک دن اس نے کہا "دیکھو جی! تم میری باتوں میں مداخلت بیجا نہ کیا کرو، تم مہمان ہو۔ مہمان کی حیثیت سے رہو۔"

اور مہمان کی حیثیت سے چلی جاؤ؟ ذرا تم ہی غور کرو، یہ باتیں کہنے کی بھی تھیں۔ اتنے قریبی رشتہ دار کو، ـــ کوئی اتنی جلی کٹی سناتا بھی ہے ـــ وہ رو بیٹھ گئیں اور اسی وقت یہاں سے چلی گئیں۔"

ایک دن میں اپنی سہیلی سے باتیں کرتی بیٹھی تھی کہ وہ بھی ادھر آنکلے۔ پہلے تو سہیلی کو سلام کیا۔ اور پانچ منٹ تک سکوت فرمایا۔ پھر مجھے بتانے کی غرض سے وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور بڑے ادب سے جھک کر کہا "آداب عرض ہے" "معاف فرمانا ہم نے آپ کو دیکھا نہیں" میری دوست قہقہہ مار کر ہنس پڑی ـــ دیکھو، انہوں نے مجھے کس بے طرح دوست کے سامنے ذلیل کیا۔

مشاعرہ کی رات تھی، تمام دعوتی بیٹھے تھے۔ ابھی وقت کافی تھا۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ جناب بھی ٹہلتے ٹہلاتے ادھر آنکلے۔ سب سے ملاقات کی بعد صاحب وسلامت کیے بعد دیگرے سب سے پوچھنے لگے کہ آپ کہاں سے آئی ہیں سب سے اتنی بے تکلفی اور ایسے سوالات کرنا مجھے ناگوار گزرا، اس پر طرہ یہ کہ جب میری باری آئی تو بڑے اطمینان سے مجھ پر بھی وہی سوال دہرایا۔ میں پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھی تھی - ان کا یہ سوال سخت بُرا لگا۔ میں نے جل کر کہا "جہنم سے" اس پر انھوں نے مجھے بنانے کی خاطر ایک پُر زور قہقہہ لگایا اور سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا - سنئے، چچا غالب کو کسی مشاعرے میں جنت سے بلوایا گیا تھا۔ لیکن آپ کو اس مشاعرے میں جہنم سے بلوایا گیا ہے۔ واہ بھئی۔ کیا خوب کہا تو پھر وہاں مسٹر ابلیس سے بھی یارانہ گانٹھ رکھا ہوگا۔ ظفر صاحب نے بات ختم کی اور خاموشی سے چلتے بنے۔ لیکن درگت میری بنی۔ سب مجھے الو بنانے لگیں۔ سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ اور وہ رات یوں ہی پھیکی پھیکی گذر گئی۔ ذرا آپ ہی تو بتائیے۔ انہیں مجھے سر محفل رسوا کرنے سے کیا فائدہ ہوا ہوگا ـــ! اور کہاں تک سناؤں، دوسری باتیں کہنے کا زبان میں یارا نہیں، شاید انہیں سن کر آپ غش میں آجائیں۔ ظالم یہ آپ کا غصہ ہی تو بہت برا ہے۔ "زیبا نے بھائی ظفر کو کچھ کرنے دالیں" "ہوں ـــ" بھائی نے خوب سوچ کر کہا

دیوانے کو کہتے کہتے زبان دکھ گئی اور تمہاری شکایتیں سنتے سنتے کان پک گئے۔

"اف ظالم نے معمولی باتوں کو کس انداز اور کس پیرایہ سے بیان کیں۔" باتیں ختم ہوگئیں اور ساتھ ہی ظفر کے دل پر چوٹ لگی، اس گھر میں زیادہ تر اس سے رہا نہ گیا۔ سارا گھر اس کا دشمن تھا۔ دیواریں اس سے لپٹنے کے لئے دوڑیں۔ اس کی زبان سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، وہ اوٹھ کھڑا ہوا۔ وداعی نظریں مکان پر ڈالیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا حافظ کہا اور ایک طرف کو یکہ و تنہا چل پڑا۔

وہ اپنے گھر سے بہت دور نکل چکا تھا، اور اس وقت خود کو ایک پر ہیبت جنگل میں کھڑا پایا جو شہر سے بارہ میل دور واقع تھا، نہ کوئی آدم اور نہ کوئی آدم زاد۔ خونخوار درندوں کی چیخ و پکار۔ خوفناک سانپوں کی پھنکاریں۔ اِدھر، اُدھر رینگتے ہوئے موذی کیڑے ——— وہ قریب کے برگد کے درخت تلے ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ اور موت کو تلاش کرنے لگا، وہ موت کا متلاشی تھا۔ لیکن موت اس سے کوسوں دور تھی، قریب سے خوفناک سانپ بل کھاتے تیز تیز نکل جاتے پر اس کی طرف التفات نہ کرتے تھے۔ نزدیک سے خونخوار درندے گھورتے گذرتے، مگر حملہ کرنے کی جراوت نہ کرتے جانے ان کی خونخواری کدھر چلی گئی کہ شکار کو منہ میں پاکر بھی اس لقمہ لذیذ کو نگل جانے کی ہمت نہ کرتے، اور سہمی ایک طرف کو منہ اٹھائے دھڑا دھڑ بھاگے جا رہے تھے شاید جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ موت کو دور پاکر وہ مایوس ہوگیا۔ لیکن مایوسی نے آس کی شکل پیدا کردی، ناگہاں خواہش زیست کی ہلکی سی کرن اس کے دماغ سے پیوست ہوگئی۔ اور وہ اس کرن کی روشنی میں، ماضی و مستقبل کے گہرے وھندلے نقوش دیکھنے لگا ——— وہ جنگل کی پرخوف فضا میں سمند تخیل پر سوار صبا رفتاری سے پر پیچ راستوں سے گذرتا۔ جھاڑی سے نبٹتا۔ کانٹوں سے الجھتا چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً سمند تخیل کو ٹھوکر لگی اور وہیں گر پڑا۔ جہاں خود موجود تھا۔ اور وہ آنسو جو آنکھوں ہی آنکھوں میں خشک ہوگئے تھے۔ بے اختیار بہہ نکلے۔

یکایک اطراف سے بادل آئے اور دیکھتے دیکھتے اس غضب کا اندھیرا ہوگیا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیا پہلے تو ہوا نے اپنی تیز رفتاری دکھائی اور پھر بارش نے اپنا وہ زور بتایا کہ سیکڑوں آشیانے برباد اور بیسیوں درخت اکھڑ گئے۔ اسی جگہ ظفر مجسم تصویر یاس بنا بیٹھا تھا۔ انہیں خیالات میں مستغرق اور انہی تصورات میں کھویا ہوا ———۔

جب بارش کم ہوئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا، اور ادھر کو چل پڑا جدھر سے آیا تھا۔ غضب کی تاریکی چھائی

ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی سی پھوار پڑ رہی تھی بغیر کے سبک رفتاری کے ساتھ ٹھیک نشانہ کی طرف جا رہا تھا۔ جانے وہ کونسی قوت تھی جو اس کی رہبری کر رہی تھی۔ وہ بلا کسی خوف و خطر کے ان تاریک اور پُرخار راستوں سے گذرتا چلا جا رہا تھا جہاں سے شاید شیطان بھی ایسے وقت گذرتے پناہ مانگیں۔ گھر قریب تھا۔ بادل چھٹ چکے تھے — آسمان پر اِکّے دُکّے تارے بھی دکھائی دینے لگے۔

وہ بڑی احتیاط سے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی رگ رگ میں آتشِ انتقام بھڑک رہی تھی۔ جذبہ انتقام نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی وہ دو تین کمروں سے ہوتا ہوا سیدھا باورچی خانہ میں گیا۔ گوشت کاٹنے کی چھری اٹھائی۔ دستہ کو خوب مضبوطی سے پکڑا اور چوروں کی طرح قدم چراتا پاؤں دابتا دیوار کا سہارا لیتا جسم کو مختلف زاویوں کی شکل میں گھماتا۔ بھاوج کے خوابگاہ کے دروازے تک آ پہنچا۔ ریشمی پردہ لٹک رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہاں بالکل ساکت مجسمہ کی طرح کھڑا رہا۔ کان تیز کئے اور اندر کی خموشی کا خوب جائزہ لیا۔ تیز چلتی سانس درست کی پردہ کو بڑی آہستگی سے ہٹایا۔ پہلے جھانک کر اطمینان کی سانس لی دونوں محوِ خواب تھے۔ کمرے میں ہلکی سی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی وہ دبکتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا پہلے تو دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے۔ دونوں کو بڑے غور سے دیکھا، چہرے پر نفرت کھینچ آئی۔ اس کا دایاں ہاتھ اٹھا۔ یکایک بھاوج کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ ظفر کا غصہ بھڑک اٹھا۔ اس کا ہاتھ اور بلند ہوا اور دل پر نشانہ ہی لگا رہا تھا کہ یکایک دماغ نے پلٹا کھایا — سوتے ہوئے پر حملہ کرنا مردہ پر حملہ کرنے کے مماثل ہے۔ اب فرق ہی کیا رہا وہ زندہ ضرور ہے۔ لیکن بحالت مردہ، اور پھر قوت — لیکن ساتھ ہی ایک اور خیال جاگزیں ہوا — جہاں تک ہو سکے دشمن کو ختم کر دو۔ عقلمندوں کا مقولہ ہے دشمن کو کبھی کمزور نہ جانو۔ مگر دل نے اس کی تردید کی اور آنکھوں تلے ایک اور خاکہ کھینچ گیا۔ بھائی ایک نعش کی مانند لیٹا پڑا ہے۔ دونوں بھی خواب شیریں کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ لیکن ایک صبح بیدار ہونے والا، اور دوسری ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سونے والی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مرد کا بچہ تھا۔ لوٹ گیا ناکام و نامراد۔

چھری جہاں سے اٹھائی تھی وہیں دھر دی پھر اپنے کمرہ مکتب میں داخل ہوا۔ ان سب کو آخری بار گلے لگایا۔ خدا حافظ کہا اور چپ چاپ خاموش بغیر کسی آہٹ کے پھاٹک تک پہنچا۔ پھاٹک کھول کر جانا مناسب نہ جانا۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا — دوسری جانب اترنا ہی چاہتا تھا کہ پھسل پڑا — چراغ میں جب تیل قریب الختم ہوتا ہے تو روشنی دگنی ہو جاتی ہے۔ شعلہ بھڑک اٹھتا ہے اور پھر ختم۔ یہی حال ظفر کا ہوا۔ جذبہ انتقام نے اس میں ایک نئی قوت پھونک دی تھی۔ مگر عارضی طور پر — غریب تھکاوٹ و نقاہت سے چور چور تھا —

جوں ہی ظفر کا پاؤں پھسلا۔ بھاوج جاگ اٹھی پہلے
تو اِدھر اُدھر نیم دھندلی روشنی میں اپنی متجسس نظریں
دوڑائیں۔ پھر یکایک خود ہی چلا اٹھی "ظفر بھیا!
چہرہ سے پریشانی مترشح اور حرکات و سکنات سے دیوانگی
ہویدا تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی، پردہ کو اٹھا کر فوراً
باہر چلی آئی۔ تھوڑی دیر کھڑی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے
تکتی رہی۔ پھر خود ہی چیخ اٹھی "بھائی ظفر! تم کہاں ہو
ذرا ٹھیرنا، میں ابھی آئی خدارا ناراض نہ ہو۔ کہاں جا رہے
ہو، میرے بھائی! میری سنتے جاؤ۔ میں نے تمہارے
بھائی سے جھوٹی سچی شکایتیں کی ہیں۔ میں نادم ہوں،
معاف کردو۔" وہ چیختی چلاتی کئی کمروں میں سے ہوتی
ہوتی خانہ باغ کی سمت بھاگ گئی۔ ضیا بھی اس
غیر متوقع حادثہ پر جاگ اٹھا اور خود بھی منیزہ بانو کی
اس دیوانگی پر پریشان، پیچھے دوڑا گیا۔ منیزہ بانو کو
پکڑنے کی کئی بار کوشش کی، لیکن وہ ہر بار تڑپ تڑپ کر
نکل گئی۔ خانہ باغ کے کسی پودے نے آگے بڑھ کر اس کی
ساری کا دامن تھام لیا۔ وہ دھڑام سے منہ کے بل گر پڑی
منہ لہو لہان ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور برابر
اسی رفتار کے ساتھ، کسی عمل کے زیر سحر پھاٹک کی طرف
بھاگ گئی ——— !

اب باہر تھا بھی کیا ——— ایک بیکس کی پانی
میں بھیگی ہوئی، اور جاڑے کی ٹھٹھری ہوئی نعش۔

رنگینیاں

کسی کی دیوانگی پر قہقہہ لگانا عقلمندی کا شیوہ نہیں
لیکن آپ کو کیا خبر کہ اس میں کس قدر لذت و کیف اور
کتنی رنگینیاں مستور رہتی ہیں۔ ؎

ترا نگاہے گریبانے نہ شد چاک چہ دانی لذت دیوانگی را

ذرا ان دھجیوں سے پوچھئے جو جیب و دامن کی ہیں، ذرا ان
ہاتھوں سے دریافت کیجئے جو کسی کے گریبان سے گریبان گیر
ہوتے ہیں۔

اے جوشِ جنوں ٹوٹے چھالا نہ مرے دل کا
دھندلی سی نشانی ہے سوزِ غمِ فرقت کی

مسرت تو دیوانوں کے ہمرکاب رہتی ہے آپ اس کو دیوانگی
کہتے ہیں اور میں اس کو صد ہزار رنگینیوں سے تعبیر کرتا ہوں
ہاں بظاہر یہ دیوانگی ہے لیکن سیکڑوں ہوشیاریاں
اس پر قربان۔ اعتراف کر لیجئے تاکہ فلسفہ دیوانگی پر
آپ کو عبور نہیں۔ یہ اگرچیکہ پریشان حال اور بے
پروبال ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لئے جراحت نواز تر
ان کی حیات سوز نگاہیں کائنات کے پوشیدہ راز کو آشکارا
کرنا چاہتی ہیں ان کی جنبش لب میں ایک بے چینی ایک اضطراب
جلوہ گر رہتی ہے۔ جو ہر لمحہ دعوت نظارہ دیتی ہے۔ مگر

نکوہش مانع بے ربطئ شور جنوں آئی
ہوا ہے خندہ احباب بخیہ جیب و داماں

غزل

سعید شہیدی

دل کی تقدیر پریشاں نظر آتی ہے مجھے
موت ہی درد کا درماں نظر آتی ہے مجھے

کبھی بجلی کی نوازش، کبھی آندھی کا کرم
یہی تقدیرِ گلستاں نظر آتی ہے مجھے

مسکراتا ہوا یہ کون چمن میں آیا
ہر کلی سر بہ گریباں نظر آتی ہے مجھے

نہ وہ مستانہ گھٹائیں نہ وہ رندوں کا ہجوم
فصلِ گل بے سر و ساماں نظر آتی ہے مجھے

کیوں نہ ہر نقشِ قدم پر ترے سجدہ کرتا
بندگی فطرتِ انساں نظر آتی ہے مجھے

جھلملاتی ہوئی اک شمع ہے محفل میں فقط
وہ بھی کچھ دیر کی مہماں نظر آتی ہے مجھے

کبھی آہیں، کبھی نالے، کبھی فریاد و فغاں
زندگی حشر بہ داماں نظر آتی ہے مجھے

پھر مرے درد نے شاید کوئی کروٹ بدلی
پھر نظر ان کی پشیماں نظر آتی ہے مجھے

کس سے میں حال کہوں اپنی پریشانی کا
ساری دنیا ہی پریشاں نظر آتی ہے مجھے

گنگناتا ہوا کون آیا گلستاں میں سعید
کائنات آج غزلخواں نظر آتی ہے مجھے

"رعنا کی بارگاہ میں"

خدارا!! یوں نہ کہو رعنا! یوں نہ کہو! زخم خوردہ دل پر مزید نشتر نہ چلاؤ۔ قلب کے ان تاروں کو نہ چھیڑو جن کی موسیقی ہمیشہ کے لئے ناپید ہو گئی، جن کا نغمہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ جن کا سوز و گداز ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ تم ان تاروں کی ترکیب سے نا آشنا نہیں۔ تم جانتی ہو کہ ان کو کسی ناقدر شناس کی مضراب نے اس بری طرح چھیڑا کہ میرے قلب کی پرسکون فضا میں یک لخت طوفان برپا ہو گیا۔ ایک تہلکہ مچ گیا۔ لاکھ چاہا کہ تمہارے اور صرف تمہارے سریلے نغموں کا ہمنوا ہو جاؤں — بولا — لیکن بول نغمہ نہ بن سکے۔ دلی محبت کو تمہارے آگے پیش کرنے سے اپنے آپ کو قاصر پایا۔ لاچار و عاجز ہو کر چیخ اٹھا۔ تم میری آہ و بکا سن کر گھبرا گئیں۔ بدگمان ہو گئیں۔ لیکن سوچو رعنا! میں تمہیں وہ چیز کس طرح دے سکتا ہوں جو میرے اختیار میں نہ تھی۔ غلط اظہار کر کے تمہیں دھوکہ بھی کس طرح دیتا۔ تمہارا اندیشہ ہے کہ میں اب وہ نہیں رہا جو پہلے کبھی تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اعتماد کرو۔ میں تمہارے لئے اب بھی وہی ہوں — وہی نوعیت کا مخلص دوست، جس کے اب بھی وہی پاکیزہ خیالات جو تمہارے لئے کبھی تھے میری خاموش دنیا میں اب بھی تم قریب ترین رفیق ہو — ہاں! صرف رفیق۔ تمہارا وہ پاکیزہ خلوص، تمہاری وہ مخمور نگاہیں، جو خاموشی ہی میں سب کچھ کہہ ڈالتیں۔ تمہارا وہ حسن اور اس کی وہ جاذبیت، تمہارا وہ حسن جس کی لطافتوں سے تم خود بے پرواہ اور بے خبر تھیں۔

جب شب کی تنہائی اور صرف تنہائی میری مونس ہوتی ہے، تمہارا مجسمہ حسن، تمہارا مجسمہ اخلاص و وفا میرے سامنے آ جاتا ہے۔ ایک پردیسی کے لئے تمہاری وہ پرانہماک تیمارداری، تمہارے وہ غیر معمولی احسانات و مہربانیاں، تمہارے وہ ہلکے تبسم کا میرے بیمار جسم میں جان ڈال دینا۔ سچ رعنا! ایک ایک کر کے میرے چشم تصور میں کھنچ آتے ہیں، میرا دل بھر آتا ہے۔ میرے شکستہ ساز سے بھی ایک درد بھری آہ نکلتی ہے اور ساتھ ہی گرم گرم آنسوؤں کے قطرے۔

آہ! عزیز رعنا! اس کے سوائے بتلاؤ کہ مجھ جیسے کم مایہ شخص کے ہاں تم جیسی دیوی کے لئے اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ اپنی محبت تمہارے حضور میں پیش نہ کر سکا۔ تمہاری بارگاہ حسن میں اسے نذر نہ کر سکا۔ میں مجبور تھا رعنا! دل بالکل مجبور۔ رہی میری ہمدردیاں تو وہ دنیا کے ہر فرد کے لئے ہیں جن میں تم بھی ممتاز تر ہو۔ مجھے معاف کرو رعنا! مجھے معاف کردو! میرے جذبات انتہائی وفاداری سے دوسرے کی نذر ہو چکے، ایک دوسرے ہی کی بارگاہ میں بصد ادب ہمیشہ کے لئے پیش ہو چکے جہاں سے مجھے اپنی محبت کا

جواب بھی انتہائی خلوص سے مل چکا۔ بڑی مصیبتوں سے میں نے اس درخت کو لگایا ہے رعنا! ۔۔۔ اپنے آنسوؤں سے اس کی آبیاری کی ہے۔ میں کسی صورت میں بھی اپنے جذبہ کو واپس نہیں لے سکتا، میری ساری امیدیں اور تمنائیں انہیں سے وابستہ ہو گئیں، میرے خیالات کا اب ایک ہی مرکز ہو گیا اور ہمیشہ وہی رہے گا، یہ مجھے اسی قدر عزیز اور عزیز تر ہے جس طرح کہ تم ایک بہترین دوست کی حیثیت سے۔ اس مرکز کے ٹوٹنے کے تصور ہی سے میں کانپ جاتا ہوں۔

تم سے جدا ہوئے آج چار مہیب سال ہوتے ہیں۔ لیکن تمہاری نہ فراموش ہونے والی یاد ۔۔۔ ایک عزیز دوست کی یاد کی طرح اب بھی میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ تمہیں مجھ سے اتنے ہی کی تمنا تھی تو لو آج پوری کر دی جاتی ہے۔ ایک دوست کی طرح - ہاں! ایک بہترین دوست کی طرح تم ہمیشہ میرے قلب کے پُر نور گوشوں میں محفوظ رہو گی۔

اب ایک ہی جگہ میری ساری تمنائیں مرکوز تھیں وہیں میری ساری مسرتیں جلوہ گر ہیں - اور کہیں کچھ نہیں۔ دنیا کے شور و غل سے دل اوٹھ چکا۔ کسی وقت اس خاک کے ذرہ ذرہ سے والہانہ الفت تھی، ہر طرف نور ہی نور نظر آتا تھا، ہر گوشہ میں ایک غیر معمولی وسعت تھی۔ لیکن آج ۔۔۔ آج ہر طرف ایک بھیانک اداسی چھائی نظر آتی ہے، ہر لمحہ دل ڈوبا جاتا ہے۔ لیکن جب ایک طرف نگاہ اٹھتی ہے تو اپنی ساری کلفتیں فراموش ہو جاتی ہیں اور خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ بے اختیار اپنے بلند معبود سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں۔

جب تیرے اشارے سے چٹک جاتے ہیں غنچے
امید کی مرجھائی کلی پر بھی نظر کر

"مسافر"

لمعات

بجناب نیّر امرتسری

مجھ کو آرام ہے بیگانۂ ارماں ہو کر
خوف لٹنے کا نہیں بے سر و ساماں ہو کر

حوصلے گھٹتے اگر ظلم پہ باندھی تھی کمر
آپ قاتل ہوئے مشہور پشیماں ہو کر

ہم کو برباد کیا اپنوں کی غمخواری نے
راز دل کھول دیا چشم نے گریاں ہو کر

اللہ اللہ بت کافر ترا احساس جمال
کیا پری زاد بنے بیٹھے ہو انساں ہو کر

میں نے پایا ہے تصور ترا کھو کر آنکھیں
گھر یہ آباد ہوا عشق میں ویراں ہو کر

انتہا یہ ہے محبت میں مری وحشت کی
محمل آتا ہے نظر غول بیاباں ہو کر

کر کے اظہار ہوئے ان کی نگاہوں میں ذلیل
دب گئے اور محبت میں نمایاں ہو کر

اشک تھامے تھے کہ رہ جائے کسی کا پردا
کیا خبر تھی کہ اٹھیں گے یہی طوفاں ہو کر

اپنا انجام بھی معلوم ہے تم کو نیّر
سجدہ کرتے ہو بتوں کو جو مسلماں ہو کر

اے مرنے والے یہ ترے مرنے کے دن نہ تھے

پچھلے مہینہ "نوجوان شکاری" آپ پڑھ چکے ہیں ذیل کے حالات مرحوم کے ہمشیر زادے اقبال احمد خان صاحب نے مرحوم کی ڈائری سے نقل کرکے بھجوائے ہیں وہ زندہ رہتے تو شاید مستقبل میں نواب قطب یار جنگ مرحوم کی طرح اپنے شکاری واقعات کو کتابی صورت میں ترتیب دیتے لیکن موت نے اتنی مہلت نہ دی اور ڈائری نامکمل رہ گئی مرحوم شناءاللہ خان کا ہنس مکھ چہرا، چھریرا بدن چمکتی ہوئی آنکھیں اب بھی یاد آتی ہیں تو بے اختیار موت سے پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔

کیا اپنی زندگی پہ بھروسہ کرے کوئی
اے مرگِ ناگہاں تجھے کوسا کرے کوئی

کیونکہ ایک عرصہ تک مرحوم کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کا اتفاق رہا ہے شاید ہی کوئی بزم احباب ہوگی جس میں احباب نے ان کی گفتگو پر خراج تبسم ادا نہ کیا ہو۔

مرحوم مر چکے مگر چند کاغذی نقوش شاید کچھ عرصہ تک مرحوم کی یاد کو تازہ کریں گے۔ ذیل میں وہی واقعات بلا کم وکاست درج کئے گئے ہیں جو ڈائری میں قلمبند تھے البتہ ان سے دوسرے جانوروں کو علیحدہ کرکے محض شیر سے متعلقہ حالات شائع کئے جارہے ہیں۔ مرحوم کی ڈائری ۶ / اسفندار ۱۳۴۴ف سے شروع ہوکر ۱۱ / آبان ۱۳۴۵ف پر ختم ہوجاتی ہے۔ اس سے پہلے اور بعد کے واقعات کا کہیں داخلہ نہیں ملتا۔

۷ / اسفندار ۱۳۴۴ف پنجشنبہ

شیر کے گارا کردہ بیل پر بیٹھا اور شام کو ۶ بج کر ۲ منٹ پر ۳۰۰ اسپرنگ فیلڈ رائفل کی ۱۵۰ گرین کی گولی سے ختم کیا۔ یہ نہایت زبردست شیر تھا۔ اس وقت کوئی ناپنے کی چیز نہ تھی اندازاً ہاتھ سے ناپا تو تین گز سے کچھ زیادہ تھا یعنی ۹ فٹ اور چند انچ شیر بہت زبردست تھا۔ اور اس میں سے بےحد چربی نکلی۔ گولی سیدھے شانہ میں لگی۔ یہ بغیر شور مچائے دس گز بھاگ کر ختم ہوگیا۔ گو یہ پہلا شیر تھا مگر اچھا زبردست جانور ملا۔ محمد چاؤش نے کہا کہ متعدد شیر میرے سامنے مارے گئے ہیں مگر اتنا بڑا شیر صرف یہی دیکھا ہے۔ یہ شیر گونڈ کی گاڑی سے ایک بیل لیگیا تھا۔

۵ / فروردی ۱۳۴۴ف۔

میں اجلاس پر بیٹھا ہوا آبکاری کے ہراج میں مشغول تھا کہ آدمی نے خبر دی کہ . . . . (سیاہی پھیل جانے کی وجہ پڑھا نہیں گیا) میں شیر نے نیقر محمد صاحب بیل کو مارا ہے۔ میں یہاں سے ساڑھے چار بجے نکل کر قریب

ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچا اور دیکھا کہ بیل کا پیٹ پھٹا ہوا ہے اور تھوڑا سا ران کا حصہ کھا گیا ہے میں سات بجے تک جھولے پر بیٹھ گیا چونکہ نوکر تمباکو بیڑی وغیرہ پیتے ہیں اس لئے ان کو کھانسی اٹھتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے میں اکیلا مچان پر بیٹھتا ہوں۔ رات کے گیارہ بجے کسی چیز نے بیل کو کھینچنا شروع کیا۔ لائٹ ڈالی تو بور بچہ تھا جو بغیر موقع دئے بھاگ گیا۔ پھر تھوڑی دیر میں آیا اور لائٹ ڈالتے ہی بھاگ گیا۔ پھر صبح کو چار بجے آیا۔ لائٹ ڈالتے ہی چلنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے ایک گولی اسپرنگ فیلڈ کی رسید کی اور یہ پندرہ قدم بھاگ کر گر گیا۔ بہت تعجب ہوا کہ اتنے ذرا سے بور بچہ نے اتنے بڑے بیل کو کس طرح مارا۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ بیل کی گردن کے نچلے حصہ کو دانتوں سے پکڑ کر لٹک گیا اور نرخرہ پھوڑ کر اس کو ہلاک کیا۔ شیر گردن کے اوپر کے حصہ کو پکڑتا ہے اور دانتوں کے نشان بڑے ہوتے ہیں اور شیر کبھی پیٹ نہیں پھاڑتا بلکہ ران پر سے کھانا شروع کرتا ہے

تاریخ نامعلوم۔ دن کے تین بجے ہانکہ میں چلتا ہوا یہ شیر ۸۰ گز کے فاصلہ پر سے ہلاک کیا گیا۔ اسپرنگ فیلڈ کی گولی سیدھی جا پسلی میں چڑھتی ہوئی پڑی اس طرح گرا جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ۱۵۰ گرین کی گولی استعمال ہوئی۔ بہت زبردست شیر تھا۔ راجہ بہادر کے ساتھ جو انگریز تھے وہ ہر گھڑی چلاتے تھے کہ "خدایا کتنا بڑا شیر ہے" اس کی کھال مہاراجہ بہادر کے صاحبزادے کو بطور تحفہ دیدی۔

تاریخ نامعلوم

شام کے چھ بجے نیلوں کے پکارنے کی آواز سنائی دی میں اور واجد چوکیدار پیدل آواز کی طرف روانہ ہوئے۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ شیر بھی نیلوں کے تعقب میں جا رہا تھا اور اسی کی بو سونگھ کر نیل چلا رہے تھے۔ سورج کچھ غروب ہو چکا تھا تھوڑا اجالا باقی تھا شیر ایک دم نالہ سے بھاگ کر سامنے آیا اور ۲۰ گز پر مجھ کو پلٹ کر دیکھا میں نے کھڑے کھڑے اس کے گولی رسید کی یہ اچک کر میرے خلاف بھاگا میں نے خون کے نشان دیکھے تو گہرا خون کافی تعداد میں گرا ہوا تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور پھر زخمی شیر کی تلاش خطرہ سے خالی نہ تھی اس لئے ارادہ تلاش ملتوی کیا اور رات کو ایک مقام پر آرام کیا صبح کو اس کی تلاش مع کولی اور محمد چاؤش صاحب شروع کیا یہ شیر ایک درخت کے نیچے مرا ہوا ملا۔ جب یہ زخمی ہوا تھا اسی وقت مر گیا چونکہ گولی شانے میں لگ کر دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ جب بھی کوئی ۱۰۰ قدم بھاگ کر گرا۔ واجد چوکیدار اس کو چیتل سمجھا جب میں نے اس کو بتایا کہ شیر پر گولی چلائی ہے تو وہ بہت خائف ہوا کہا کہ "صاحب اگر آئندہ سے اس قسم کی جراءت کی تو میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا اگر وہ اتنے قریب سے حملہ کر دیتا تو آپ کو میگزین بدلنے کا موقع نہ ملتا" غرض یہ طریقہ جو استعمال کیا گیا نامناسب تھا۔

(باقی)

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر

شہاب

ناہید

ناہید

جلد ۸ آبان ۱۳۵۴ف م ستمبر ۱۹۴۵ء نمبر ۱۲

۱۔ خواب آسا جزیروں میں۔ نزہت سلطانہ کا رنگ وہی رنگینیاں بدوش ہے۔

۲۔ اس نے کیا کیا؟ منشی فاضل فاطمہ بیگم نسرین نے ایک عرصہ بعد فسانہ بھجوایا ہے۔ یادش بخیر یا تو یہ ناہید کے متعلق لکھنے والیوں میں تھیں، یا اب تو یہ حال ہے کہ برسوں ناہید یاد نہیں آتا۔

۳۔ اقبال کا اثر اردو شاعری پر۔ زہرہ سلطانہ کا اچھا مضمون ہے دوسری قسط کے بعد اندازہ کیجئے

۴۔ لب متحرک۔ میرا زاویۂ نگاہ بہ یک نظر پڑھئے۔

۵۔ انجم نے پہلی مرتبہ فسانہ بھجوایا ہے لیکن تاخیر کی وجہ شائع نہ ہوسکا اور ایسا ہی سلطانہ عزیز کا فسانہ بھی رہ گیا ہے۔ یہ دونوں افسانے آذر میں شائع کردئے جائیں گے۔

۶۔ زیبا حسینی نے پہلی مرتبہ ناہید نوازی کی ہے۔

۷۔ خریداران ناہید نے کیا تصفیہ کیا وہ شہاب کی خریداری پر آمادہ ہیں؟ کیونکہ ناہید کی زندگی کا مسئلہ آذر میں طے ہوجائے گا۔ ارادہ سے مطلع کیجئے۔

خواب آسا جزیروں میں

نزہت سلطانہ

---

(۱)

تاریک اور اداس راتوں میں چمکنے والے تاروں کی سنہری روشنی کو دیکھ دیکھ کر جب میری آنکھیں تھکنے لگیں تو افق کے دیرینہ کنارواں پر کہیں دُور سے تھکا ماندہ دبلا پتلا مضمحل چاند صنوبر کی اونچی چوٹیوں کے اوپر سے آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی سفید اور چمکدار کرنوں کے ہلکے سایہ میں میں نے بلند دریچوں کو کھول دیا اور سوچنے لگی۔ آخر یہ تمام نئی اور پرانی ذہنیوں کے ہجوم سے گھری ہوئی ساعتیں گذر کیوں نہیں جاتیں حیات مستعار کے باریک تر ریشے ٹوٹ ٹوٹ جڑتے اور پھر ٹوٹ جاتے۔ زندگی کی بجھتی ہوئی شمع بدستور جھلملایا کرتی۔ تفکرات کے بوجھ سے دبی ہوئی یہ طویل زندگی تیز تر اذیتوں کے درمیان میں مسکراتی رہتی۔ مسرتوں کے انبار ساز حیات سے دور ہوتے چلے گئے اور جینے کی تنہا آرزو جیسے خود بخود کسی گہری تاریکی کے پردوں میں روپوش ہو جانا چاہتی تھی۔

کبھی خیال آتا جب میری زندگی یوں روز بروز دم توڑنے کی عادی ہونے لگی تو بار بار ہو کر نئی مصروفیات نے تمام خیالوں میں اپنی جگہ بنالی۔ اور یہ معدوم خیال رفتہ رفتہ زمانہ کے چابکدست مصور نے صفحۂ تصور سے محو کر کے اس کی جگہ دوسری رنگین اور دلچسپ دلنواز تصویریں بنا ڈالیں۔ اس ہلکی سی یاد کے پرانے دھبے جو لوح خیال کی کسی تاریکی میں باقی رہ گئے تھے مٹا کر بالکل صاف کر دیئے۔ تاریک پردوں میں روپوش ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر کھوئی ہوئی یاد شمع کی آخری لو کی طرح خواب آسا خیالوں میں جاگ اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کی آخری جھلک تک اس طرح غائب ہو گئی جیسے تھی ہی نہیں ماہتاب بلند ہوتا رہا اس کی مدہم روشنی میں کائنات آہستہ آہستہ جگمگانے لگی۔ میں اس طرح اپنے سفید بستر کے کنارے پر بیٹھی کنول کے نیم وا غنچوں کی جانب دیکھتی رہی جن کے درمیان میں چاند اپنا رخ انور جھکائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ لیکن کنول اسی طرح جھیل کے ساکن سیاہ پانیوں میں ابتک اپنا سر اٹھائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ آج کے دن زندگی بہت بے لطیف معلوم ہونے لگی تھی۔

تمہارے خیالوں کی رعنائی میرے دل سے ایک پل کیلئے بھی محو نہ ہو سکی۔

تمہاری دلربا آواز کی موسیقی میرے خیالوں میں
گونجتی رہتی ہے۔ بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
محبت کا کوئی ٹوٹا ہوا بت جو میرے دل کے نہاں
خانے میں پوشیدہ تھا۔ اچانک میری نگاہوں
کے سامنے جلوہ افگن ہو گیا ہے۔ جس کی تابناکیاں کائنات
کو جگمگا رہی ہیں۔ لیکن نہیں یہ تو کوئی دھندلا سا
موہوم خواب ہے جس کی تعبیر پریشاں خیالیوں کے
سوا کچھ بھی نہیں۔ اس دنیا میں کیا نہیں۔ تیرو تار
راتیں چمکدار دن ساکت جھیلیں رنگین کنول خوبصورت
پرند سرسبز وادیاں یہ سب آخر یہی تو ہے جو تمہارے
سامنے ہوا کرتا تھا۔ مگر اب اس میں وہ تازگی وہ
رنگینی وہ دلربائی نظر نہیں آتی جو پہلے ہوا کرتی تھی
معلوم ہوتا ہے جیسے اس جہان رنگ و بو کا تمام
حسن جاتا رہا ہے۔ تمہارے بغیر یہ سب جیسے سونا
اور اداس پڑا ہے۔ وہ پریم کا ہلکا ہلکا پرتو جو
زندگی کی تاریکیوں کو اپنی چمک سے دل آویز بنا
دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کائنات کی ساری
رعنائیاں سارا حسن ساری دلفریبیاں کوئی چھین کر
لے گیا ہے سحر انگیز طاقتوں میں چھپا ہوا محبت کے خوبصورت
دیوتا کا سایہ ساز حیات کی گردشوں میں نئی جان
ڈال دیتا ہے تاریک اور طویل راتوں میں جاگتے جاگتے
جب میری آنکھیں تھک جاتیں اور میرا سر بوجھل
ہونے لگتا تو میرے دماغ کے پردوں پر کسی معلوم
فکر کے غیر محسوس بادل آہستہ آہستہ چھا جاتے اور میری
روح اس نظر نہ آنے والے بوجھ سے دب کر تحلیل ہونے
لگتی۔ خیالوں کی بستی سے زندگی کی رعنائیاں چپ چاپ
رخصت ہوتی ہوئی معلوم ہوتیں۔

کبھی خیال آتا گویا میری ساری کی ساری
زندگی کسی عزیز ترشے کی تلاش میں سرگرداں ہو
جھیل کی ساکن لہروں میں کنول کی دلربائیوں میں
کلیوں کی دلنواز خوشبو میں مسرتوں کی شاداب وسعتوں
میں سمندر کے ریتیلے ساحلوں پر آسمان کی پرسکون
گردشوں میں ہر جگہ کوئی انوکھا خیال مجھے از خود
رفتگی کے عالم میں لئے جاتا ہے۔ یونہی طویل زندگی
کے دن ہفتے مہینے اور سال بنتے جاتے ہیں۔

باغ کی مشرقی روشوں پر جب بانس کی پتیوں
میں سرسرانے والی نسیم کے جان بخش جھونکے مسرور
دماغوں میں تازگی پیدا کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس
وقت بھی میرے خیالوں کی دنیا تمہاری دلنواز یاد سے
معمور ہوتی ہے۔

(۲)

وہ پیکر نور جو ہمارے خیالوں کی تابندگی
کا باعث تھا۔ وہ دلربا آواز جس کی موسیقی روح
کی بالیدگی کا سرچشمہ تھی۔ وہ رخ انور جس کی ضیائیں
سے ہمارے دل کے نہاں خانے روشن تھے۔ آج جانے
ہیں کہاں روپوش ہے۔ جب زندگی کے تار رفتہ رفتہ

شکست ہونے لگتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے فنا کا سفر
ہاتھ خود بخود ساز حیات کو بکھیر دینا چاہتا ہے۔ نئی
اور پرانی تکلیفوں کا ہجوم نحیف و زار جسم پر غلبہ پانے
کے شوق میں اس درجہ دلیر ہو چلا ہے کہ اب اس کی
نگاہیں کبھی کبھی میری آزاد روح کو کچلنے پر آمادہ
دکھائی دینے لگتی ہیں۔ میں بدستور خاموش ہوں مسکرا
رہی ہوں۔ بعض وقت ناتواں جسم سے اس طرح چمٹی
ہوئی زندگی کو دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے۔ کبھی نیند سے
لبریز آنکھوں میں کھوئے ہوئے خواب بیدار ہو کر شمع
پر چھا جاتے ہیں۔ گزرتی ہوئی شب گویا نئے فکروں کا
کوئی انبار اپنے ساتھ لئے آتی ہے لیکن یہ بیمار دل
مسکرا مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ زرد اور مغموم
لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ چھا جاتی ہے۔ کبھی کیف پرور
نشیلی دواؤں کے اثر سے مدہوش کن نیند مجھ پر طاری
ہو جاتی ہے اور میں جیسے سب کچھ بھول کر اپنے بستر
پر چپ چاپ سو جاتی ہوں۔ خواب کی دنیاؤں میں
میرا طائر خیال مجھے کہیں فردوسی سرزمینوں میں لیجانا
چاہتا ہے۔ جہاں خواب آلودہ جزیروں کی سنہری خاک
کے ذروں میں ہماری محبوب اور محترم شخصیتیں اپنی ابدی
آرام گاہوں میں خوابیدہ ہیں۔ گہری نیند کے آغوش میں
انھوں نے شاید ہمیں فراموش کر دیا ہے خوبصورت
مقبروں اور خوشنما مزاروں کے سایہ میں سنہری ریت
کی قبا میں ڈال کر سو جانے والے کسی فردوسی خواب کے
کیف پرور اثر سے ایسے مدہوش ہیں کہ اب انہیں اپنے
دوستوں اور قریب ترین عزیزوں کی یاد نہیں ستاتی۔
وہ بلند و بالا معطر جسم جو خاک کے ذروں میں روپوش
ہو چکے ہیں لیکن جن کی دلنواز یادوں کے تمام نقوش
میرے خیال کے پردوں پر یکسر روشن اور کھلتے ہوئے
کنول کی طرح شاداب اور شگفتہ ہیں۔ مجھے یقین ہونے
لگتا ہے کہ کبھی محبت ضرور ان صفات سے مزین ہو سکتی ہوگی
کہ خود کو غیر فانی بناکر ہر اس نقش کو جس سے گزرے
ہوئے دنوں کی یاد تازہ رہ سکتی ہے پائیدار کر دے
کبھی خیال آتا ہے کہ زمانے نے جیسے محبت کی تمام رعنائیوں
کا رس چوس لیا ہے اور کائنات کوئی بے رنگ میدان
کارزار ہے جہاں کہیں سے کوئی تیز نوکدار خنجر کوئی
شمشیر خون آشام یا کوئی تیز تر تلوار زندگی کی مسرتوں
کی شہ رگ کو کاٹ دینے کے لئے بے تابانہ تڑپ تڑپ
کر رہ جاتی ہو اور رہ رہ کر تڑپ رہی ہو۔ میری روح
اپنی آخری گہرائیوں تک لرزنے لگتی ہے۔ کیا محبت کے
متعلق آپ کو کچھ معلوم ہے۔ کہتے ہیں جب بزم رخصت
ہو جاتا ہے زندگی اداس ہو جاتی ہے میں حیران ہو جاتی
ہوں جب سنتی ہوں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں محبت کا فلسفہ کیا ہے
یہی ہے کہ وہ نہ عمر ہے نہ دولت شوکت سے نہ ہی حسن خال ہوتی ہے لیکن مجھے
تو صفات کے ذرے بہت محبوب ہیں جن میں میری حیات کے سرچشمے مدہوش
ہیں بچے قدموں میں ہماری جنتیں پوشیدہ تھیں جن کی دلنواز
آغوش میں زندگی کی بہترین ساعتیں گزریں

اس نے کیا کیا ــــــ؟

فاطمہ بیگم نسرین (منشی فاضل) لکھنؤ

حنا کی شادی کو پانچ برس ہو چکے ہیں۔ روپیہ پیسہ افراط کے ساتھ ہے۔ نوکر چاکر اچھا مکان موٹر سب ہی کچھ ہے لیکن پھر بھی حنا سست اور چپ چپ رہتی ہے جیسے اس کو کوئی دکھ ہو۔ نہ جانے کیوں ــــ؟ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ پھول سی صورت کملا کر زرد ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بالآخر رائے دی کہ " ایسی صورت کی جائے جس سے حنا کا دل بہلے ــــ" نجمی نے کہا اچھا یونہی سہی۔ ایک دن محفل ہوئی اچھے اچھے گانے والے بلائے گئے بڑے ہال میں فرش بچھا نجمی کے دوست بھی آئے اور حنا دوسرے کمرے میں چلمن کی آڑ میں بٹھائی گئی گانا ہوا اور اس سے حنا کی طبیعت بہت کچھ بہلی اور اس کے چہرہ سے افسردگی اور بددلی کچھ کم معلوم ہونے لگی۔ نجمی نے بھی سوچا چلو اچھا نسخہ ہاتھ آیا۔ دوسرے دن پھر بھی محفل سرود قایم ہوئی اور حنا پھر خوش ہوئی اب برابر یہی معمول سا ہو گیا کہ آئے دن حنا کے بہلانے کے لئے کبھی گانا ہو رہا ہے تو کبھی ناچ۔ کبھی مراسینیں بلائی جاتی ہیں تو کبھی بھانڈ۔ کبھی سینما ہے تو کبھی پکنک۔ آج آم کے باغ میں جھولا پڑا ہے تو کل دریا کے کنارے خیمہ ــــ آہستہ آہستہ حنا کی حالت کچھ سدھرتی چلی پتھر کے بت میں زندگی کی دھڑکن اور سرخی دکھائی دینے لگی نجمی کے دوست کہنے لگے " چلو اس خوشی میں محفل شعر شاعری ہو جائے ــــ"

نجمی بھی راضی ہو گئے۔ مشاعرہ کا دن آیا کوئی نو بجے تک سب آ گئے اور مشاعرہ بہت شان سے شروع ہوا۔ ایک بجے رات کو جب مشاعرہ ذرا گرمایا تو ایک صاحب ملگجے کپڑے پہنے ہوئے بزم مشاعرہ میں داخل ہوئے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ پر وحشت برس رہی تھی لوگ ان کو دیکھ کر ذرا چونکے لیکن پڑھنے والے شاعر کی میٹھی آواز اور اچھی غزل نے کچھ کہنے سننے کی مہلت ہی نہ دی۔ وہاں تو " واہ واہ " " خوب کہا " ماشاء اللہ مکرر ارشاد ــ؟ کیا بندش ہے۔ کیا نازک تخیل ہے " کی آوازوں سے چھتیں اڑی جا رہی تھیں۔ چیختے چیختے گلے پڑ گئے تھے۔ غرض کہ جب یہ ہنگامہ ذرا کم ہوا تو ان کامیاب شاعر کی غزل ختم ہوئی تو وہ " سودائی صاحب " کھڑے ہوئے اور ہاتھ جوڑ کے صدر سے عرض کی کہ

قبلہ ــــ میں بھی غزل کہہ کر لایا ہوں پڑھ دوں

اجازت دیجئے کہ پڑھ کر چلا جاؤں — ؟ صدر نے تجمی کی
طرف دیکھا انھوں نے بزم مشاعرہ کی طرف۔ آخر بولے۔
پڑھ ہی لینے دیجئے کوئی خبطی یا پاگل معلوم ہوتا ہے اگر
روک دیا گیا تو نہ جانے کیا گڑبڑ کرے۔ صدر نے کہا بسم اللہ
— ارشاد فرمائیے — ؟

آپ نے تسلیم کی اور وہیں سے کھڑے کھڑے غزل
پڑھنی شروع کر دی۔ مطلع تھا۔

ہوتا دل حزیں جو مرے اختیار میں
پھر دیکھتا — نہ کوئی مجھے کوئے یار میں

پڑھتے وقت یہ حالت تھی کہ دونوں آنکھوں سے
آنسو جاری۔ سینہ پر ہاتھ۔ آواز میں اس قدر درد کہ
شعر نوحہ بن گیا۔ نفرت سے دیکھنے والے حیرت سے دیکھنے
لگے اور مشاعرے میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ پھر ساری
محفل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ گویا ساری محفل ہی
اس مصیبت کے مارے شاعر کی طرح درد کی تصویر ہے
شاعر نے پھر مطلع پڑھا۔ اب لوگوں نے سر دھننا شروع
کر دیا اور اچھی خاصی محفل مشاعرہ مجلس ماتم بن گئی
کلام میں کوئی خاص خوبی نہ تھی یہی روزمرہ کی باتیں
اور اپنی بدقسمتی کا رونا۔ مگر خدا جانے کیا جادو تھا
کہ سارا مشاعرہ تڑپ رہا تھا۔ تجمی گھبرا کے اٹھے لیکن
اس سے پہلے کہ وہ اس اجنبی شاعر کے پاس جا سکیں
اس نے غزل ختم کی ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنا
مطلع پڑھتا ہوا مشاعرہ سے باہر نکل کر اندھیرے میں
غائب ہو گیا۔ لیکن جیسے ہی یہ دیوانہ شاعر مشاعرے
سے باہر گیا چلمن کی طرف سے ایک چیخ کی آواز آئی
حنا روتے روتے بیہوش ہو گئی تھی۔

اب پھر لینے کے دینے پڑنے لگے۔ ڈاکٹروں کی
رائے ہوئی کہ تبدیل آب و ہوا کی بہت ضرورت ہے
تجمی کی بھی تعطیل تھی بیوی کو ساتھ لے کر آگرہ پہنچے
ہوٹل میں سامان رکھا۔ تھوڑا سا آرام کر کے تاج
دیکھنے چلے گئے۔ تاج یوں بھی دنیا کے سات عجائبات
میں سے ہے لیکن چاندنی رات میں اس کی خوبصورتی
اور دلکشی کچھ نہ پوچھئے۔ دنیا کی جنت یا شاعر کا
خواب معلوم ہوتا ہے۔

حنا اور تجمی شاہجہاں اور ممتاز محل کی محبت
کی کہانی پڑھتے اور تعریف کرتے چلے جا رہے تھے کہ
راستہ میں تجمی رک گئے اور کسی سے باتیں کرنے لگے
حنا کہاں تک کھڑی رہتی آگے بڑھ گئی۔ ہوا کے ٹھنڈے
جھونکوں اور خوبصورت سماں کی دلکشی سے اس کا
دل کچھ خوش تھا وہ دریا کے کنارے والے مینارے
کے پاس گئی جہاں جمنا اپنے چھپے ہوئے آنچل کو پھیلائے
کچھ گنگناتی ہوئی ساحل سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی
ابھی وہ وہاں بیٹھ کر دم بھی نہ لینے پائی تھی کہ اس نے
دیکھا کہ ایک آدمی میلے کپڑے پہنے ہاتھ میں تسبیح لئے
اس سے کچھ دور پر بیٹھا نجانے کیا سوچ رہا ہے۔

حنا کو کچھ جرات ہوئی کچھ شبہ ہوا اور وہ بے اختیار اس طرف بڑھی قریب پہنچی تو ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اجنبی نے پلٹ کر دیکھا تو کانپنے لگا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد جب حواس پر قابو ہوا تو اس نے ہانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ حنا ــــ!!

اور حنا نے بھرائی ہوئی آواز سے جواب دیا ــــ جمیل ــــ! اس کے بعد پھر دونوں چپ تھے۔ کہنے کو تو بہت کچھ تھا اور مدتوں کی یادیں دہرانی ہیں ــــ لیکن جذبات کی زیادتی اور اچانک ملاقات نے زبان بند کر دی تھی۔ وہ تصور کی آنکھوں سے نہ جانے کیا کیا دیکھ رہے تھے۔

حنا سوچ رہی تھی کہ میں نے بچارے جمیل کے بال اتنی سی بات پر خوب نوچے تھے کہ اس نے میری گڑیا کی چوٹی نوچ ڈالی تھی۔ جمیل دل میں کہتا "اف یہ وہی حنا ہے جس نے میری گیند کیچڑ میں پھینک دی تھی اور میں نے اسے مارا تھا۔"

پھر جمیل کو وہ دن یاد آیا جب کہ اس کی بیوہ ماں نے جمیل کے چچا حنا کے باپ سے حنا کا رشتہ مانگا تھا اور انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ "نہیں بھئی ہم ایسی محبت سے باز آئے جس میں میری بچی کی تباہی ہو۔ ہم تو کسی ایسے سے کریں گے جو میری حنا کو رانی بنا کر رکھے اور اس پر دولت اور پیسہ کا منہ برسایا کرے ــــ"

اور انھوں نے کیا بھی یہی تھا لیکن دولت ہی سے تو خوشی نہیں خریدی جا سکتی نا۔ دونوں کا خیال اور مذاق بھی یکساں ہونا چاہئے۔ جب دل کو سکھ ہی نہ ملا تو دولت کس کام کی ــــ؟ اس کے بعد اس کی چاہنے والی ماں اس کے سر پر سہرا باندھنے کا ارمان لے کر اس دنیا سے چلی گئی اور جمیل ایسا غائب ہوا کہ کچھ پتہ نہ چلا کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

آج پھر مدت کے بعد دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا اور قدرت اب کونسا نیا کھیل کھیلنا چاہتی تھی جب حنا اور جمیل کو ہوش آیا اور حیرت دور ہوئی تو حنا نے کہا

جمیل جس جان لیوا حادثہ کو میں بھلانا چاہتی تھی تم نے پھر یاد دلا دیا اب اس سے کیا فائدہ ــــ؟

میں شرمندہ ہوں حنا! جمیل نے جواب دیا۔ لیکن یقین کرو کہ مجھے ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ وہ تمھارا گھر ہے۔

اور اب یہاں کیسے آئے ــــ؟ حنا نے پوچھا ــــ؟

یہ بھی ایک اتفاق یا کشش ہے حنا ــــ! میرے لئے اب دنیا میں رہ کیا گیا ہے بس یونہیں مارا مارا پھرتا رہتا ہوں۔ جمیل نے مغموم آواز میں کہا نجانے کونسی کشش مجھے بھی یہاں کھینچ لائی۔ اچھا کل پھر ملونگی خدا حافظ جمیل۔

اس کے بعد حنا ہوٹل واپس چلی گئی۔ وہاں

جا کر معلوم ہوا کہ نجمی غائب ہے اور ایک لفافہ میز پر رکھا تھا۔ حنا نے بے صبری سے خط کھولا۔ لکھا تھا

حنا ---!

مشاعرے کے بعد سے میرا قیاس یقین میں تبدیل ہوگیا تھا اور میں نے تمہارے خیالات اور جذبات کا پتہ لگانا شروع کر دیا تھا کل جمیل سے ہماری اتفاقی ملاقات کے بعد مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا کیونکہ اتفاق سے میں نے تم دونوں کی باتیں سُن لیں۔ مجھے تم دونوں سے بہت ہمدردی ہے حنا ---! مجھے یقین ہے کہ میں کبھی تم کو اپنا نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہو۔ میں تم کو صرف خوش دیکھنا چاہتا ہوں اس لئے میری طرف سے تم کو اجازت ہے تم جمیل کے ساتھ جا سکتی ہو۔ میں جا رہا ہوں اور تمہاری دلی مسرت کی دعا کرتا رہوں گا۔"

حنا بہت دیر تک سوچتی رہی۔ ادھر اپنے شوہر کی مہربانی محبت اور اتنی بڑی قربانی --- اتنا بڑا ایثار --- اُدھر بچپن کی محبت --- بچھڑے ہوئے کی یاد --- اور زندگی کی تباہی چھپی ہوئی سوزش کے نشتر --- اس کی میخانہ بدوش حسین آنکھوں میں آنسو بھر آئے --- لیکن اس نے سوچنے کے بعد کیا فیصلہ کیا --- یہ راز معلوم نہ ہوسکا۔

چاندنی رات

رفیعہ سلطانہ بی۔اے (عثمانیہ)

ہے شب مہتاب میں جلوہ چراغ طور کا — چھا رہا ہے ہر طرف عالم پہ عالم نور کا

نور کی موجیں رواں ہیں آسماں پر چار سو — چاند سرچشمہ ہے گویا آبشار نور کا

چاندنی یا ہے بحر پُرسکوں سیماب کا — یا زمیں پر فرش ہے اک چادر بلور کا

اتصال تیرگی و نور ہے خلد نگاہ — ہے یہ دورنگی دوپٹہ کس بہشتی حور کا

شعلہ بار ہے رقصاں پرتو مہتاب میں
اک جہان حسن ہے اس نور کے سیلاب میں

یہ زمیں خاموش ہے وہ آسماں خاموش ہے — بادۂ راحت سے سب کون و مکاں مدہوش ہے

ہیں ستارے آسماں پر ہر طرف بکھرے ہوئے — نو عروس صبح گویا سر بسر گلپوش ہے

عندلیبوں کی ترنم ریزیاں اب ہو چکیں — محفل قدرت بساں گل سراپا گوش ہے

ساز ہستی کی تلاطم خیزیاں اب تھم گئیں — بربط عالم سے پیدا نغمۂ خاموش ہے

شاہد فطرت نے پھونکا ہر طرف افسون خواب
قلب شوریدہ مگر اب بھی ہے وقف اضطراب

زندگی

زیبا حسینی

لوگ کہتے ہیں کہ زندگی خواب ہے، زندگی سراب ہے۔ زندگی سیماب ہے، زندگی حباب ہے، زندگی ساز ہے، زندگی نغمہ ہے، زندگی شراب ہے، زندگی نشہ ہے، زندگی کلی ہے، اور زندگی صرف بہار ہے اور پھر زندگی تماشہ ہے، زندگی فسانہ ہے، زندگی جنت ہے اور بھی زندگی مصیبت بھی اور پھر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ زندگی سکھی بھی ہے اور دکھی بھی۔ اس میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور آنسو بھی، آس بھی ہے اور نراس بھی۔ خلک شگاف قہقہے بھی اور دلدوز آہیں بھی۔ خار دار راہیں بھی اور سایہ دار پگڈنڈیاں بھی۔ بس یوں سمجھئے کہ ایک طرف سکھ ہے مسکراہٹیں ہیں، قہقہے ہیں آشائیں ہیں، بلندی ہے، کامرانی ہے، راحت و مسرت بھی ہے اور ظلم و حاکمی بھی ——!! اور دوسری طرف دکھ ہیں ہیں، آنسو ہیں حسرتیں ہیں کامیابیاں ہیں نا امیدیاں ہیں کلفت و عسرت بھی ہے اور مظلومی و محکومی بھی —! زندگی سب کچھ ہے یہ بھی اور وہ بھی پھر بھی کچھ نہیں کچھ نہیں لیکن پھر بھی بہت کچھ۔ لوگ کہتے بہت ہیں اور سمجھتے کم اور پھر یہ زندگی —— ! زندگی کچھ نہیں صرف زندگی ہے ہاں زندگی زندگی ہے —— طویل سی، لانبی، یونہی فضول اور بے مصرف موت کی آغوش میں چلی جانے والی زندگی —— !!!

لوگ یونہی کہا کرتے ہیں کہ زندگی یہ ہے اور زندگی وہ ہے لیکن میں ——؟ میں کہتی ہوں۔ زندگی بندے جیئے جا۔!!!

آج کل، پندرہ روزہ دلی۔ اس عالمگیر جنگ میں بیسیوں رسایل عالم وجود میں آئے اور بیسیوں ناقابل برداشت مصارف کی وجہ بند بھی ہو چکے۔ لیکن جدید رسایل میں "آجکل" نے ایک نمایاں امتیاز پیدا کر لیا ہے اور یہی اس کی روز مرہ مقبولیت کا سبب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظاہری اور معنوی خوبی ارباب ذوق کو دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ کیونکہ مضامین اور افسانوں کے سوا بہترین تراجم بھی اس کا مسلک ہے۔ سالنامہ زیر نظر میں افغانستان کے سنسکرتی تحریر۔ قلوپطرہ و مدار ستارے۔ جدید اردو ادب کے پس منظر میں مفید اور اچھے مضامین ہیں۔ نظم کا معیار بھی کافی بلند ہے۔ جنگی حالات پر مفید نوٹ ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں شاذ ہی کوئی اخبار یا رسالہ ہوگا جو بیک وقت اتنے بلاک دیتا ہو، ملک کو ایسے بلند پایہ رسایل کی ضرورت ہے کہ وہ بیک وقت ہر قسم کا رطب و یابس فراہم کرتا ہے جو ارباب ذوق کے مطالعہ کو خوشگوار اور معلومات میں اضافہ کرے، کہنے کو تو اس کا چوتھا سال ہے۔ لیکن یہ اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے کئی منزلیں طے کر چکا ہے۔ چندہ سالانہ (عہ)

اقبال کا اثر اُردو شاعری پر

زہرہ سلطانہ

بڑے شاعر کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ادبی دور کو ختم کرنے والا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری اور ادب کا دھارا ایک مخصوص سمت میں پلٹ جاتا ہے جو زیادہ تر ایسے بڑے شاعر کی رہین منت ہوتی ہے۔ یعنی وہ حد فاصل ہے۔ پچھلے باب کو ختم کرنیوالا اور نئے باب کا افتتاح کرنیوالا۔ اقبال بھی ایک بڑا شاعر تھا۔ اس کا رتبہ صرف اردو اور فارسی ادب ہی میں نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے ادب میں بھی بہت بلند ہے اور اس کے بعد شاید ہی کوئی اس کی جگہ لے سکے۔ اس نے دوسری زبانوں پر کیا اثر ڈالا خارج از بحث ہے کہنا صرف اس قدر ہے کہ اردو ادب پر اقبال نے کتنا اثر ڈالا اس سے پہلے کہ میں اپنے اصل موضوع کی طرف آؤں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے ایک ہلکے سے پس منظر سے آپ کو روشناس کرا دوں۔

۱۔ اس سے پیشتر اردو ادب زندگی کا ترجمان نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اس کے اکثر شعرا و ادیب تصنع آمیزی اور ظاہری سجاوٹ کے دلدادہ ہیں اس کا ثبوت ان تنقیدوں سے ملتا ہے جن میں محض زبان اور محاورہ اور بحر و قوافی کا لحاظ کیا جاتا تھا اور مضمون کو بہت کم اہمیت حاصل تھی۔ اردو شاعری (جو زیادہ تر غزلوں پر مشتمل تھی) بیشتر تفریح طبع کا باعث تھی۔ حالانکہ شاعری کو در اصل اعلیٰ جذبات کا بہترین انداز میں وزن اور بحر کے ساتھ اظہار ہونا چاہئیے اور اس کا مقصد انسانی دل و دماغ کی تربیت ہے۔

اردو شاعری میں قومی وطنی اور مذہبی جذبات کے علاوہ خودداری بلند ارادی اعتماد نفس شجاعت اور اسی طرح کے اعلیٰ فاعلی جذبات کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ غزل میں محض جذبۂ عشق کے بعض مخصوص مظاہر نظم کئے جاتے تھے اور ان میں بھی عاشق کے ساتھ پستی ذلت عاجزی رشک و حسد احساس کمتری اور اسی طرح کے اوسط درجہ کے جذبات منسوب کئے جاتے تھے۔

اردو شاعری غور و فکر کی دعوت نہیں دیتی تھی میر اور غالب کے علاوہ اقبال سے پہلے کوئی اور ایسا شاعر نہیں تھا جس نے ہمیں تفکر و تعمق کی دعوت دی ہو۔ اور گہرے خیالات کو اعلیٰ طور پر نظم کیا ہو۔

اردو شاعری میں صوفیانہ عقاید کے سوا اور کچھ نظم کرنا بدعت تصور کیا جاتا تھا۔ اور ان صوفیانہ

عقاید میں بھی ان کی روح سے سروکار نہ تھا بلکہ چند دھو
مثلاً وحدت الوجود بیخودی اپنے آپ کو فنا کر دینا
اور بے عملی تھے جن کو ہر کس و ناکس اپنا موضوع بنائے
ہوئے تھا۔ اقبال نے ان تمام رجحانات پر تصنیع افکار و
خیالات اور فرسودہ راستوں کے خلاف اپنی پیمبرانہ آواز
بلند کی اور اس نے ان تمام کو بدل کر رکھ دیا۔

ابتدائی اردو شعرا نے اپنی فکر کی جولانی کے
لئے جو میدان منتخب کیا وہ ان کا مقرر کردہ نہ تھا بلکہ
اس میں اس سے پہلے فارسی شعرا نے اپنی جودت و
ذہانت کے جوہر دکھلائے تھے۔ لامحالہ یہ امر ناگزیر
تھا کہ اردو شاعری اسی ڈگر پر چلتی رہے جس پر اس
سے پہلے فارسی شاعری چل چکی تھی اور قصیدہ غزل
مثنوی رباعی اور قطعات وغیرہ کا قالب وہی تیار
ہوا جو اس سے قبل ایران میں بن چکا تھا۔ یہ سب کو
معلوم ہے کہ فارسی شاعری میں تصوف کا خاص درجہ ہے
فارسی کے نامور اور جلیل القدر شعرا مثلاً ابوالخیر مولانا
رومی، نظامی اور حافظ وغیرہ کا کلام سراپا تصوف ہی
تصوف ہے یا دنیا سے دل برداشتگی کی تحریص ہے۔ اس
زمانہ میں عام طور سے اسلامی دنیا میں
حملۂ تاتار کے نتیجہ کے طور پر خیالات میں جمود اور ہمتوں
میں پستی پیدا ہو گئی تھی۔ ان اثرات نے ملک بہ ملک
گھر کر دیا تھا چنانچہ ایران اور مشرق وسطیٰ سے یہ خیالات
ہندوستان بھی آئے اور ہندوستانی شاعروں کی نظم نگار

میں ... کا اثر صاف طور سے نمایاں ہونے لگا

یہ واقعہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کو ذات
باری اور دیگر غیب کی باتوں کے متعلق منطقی موشگافیوں
اور قیاس آرائیوں سے منع کر کے ان کو اور ان کی طاقتوں
کو عمل کی طرف مایل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چند صدیوں
میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت علم و حکمت کے علمبردار اور
تہذیب و تمدن کے مالک بن گئے لیکن تیرہویں صدی
عیسوی میں شیخ محی الدین عربی نے قرآن مجید کی تفسیر بالکل
اسی انداز میں پیش کی جیسی شنکر نے گیتا کی پیش کی تھی۔
اونھوں نے ویدانت کو وحدت الوجود کے قالب
میں ڈھالا اور اس عقیدے کو اپنی شخصیت اور علم
وفضل کے زور سے اسلامی دنیا کا ایک جزو لاینفک
قرار دیا۔ سوء اتفاق سے اسلامی دنیا میں بعض ایسے
عوامل اس سے پیشتر کارفرما رہ چکے تھے جو اس نظریہ
کو مسلمانوں میں قبول عام حاصل کرنے میں ممد ثابت ہوئے۔

(۱) مسلمانوں نے مصری اور شامی عیسائیوں کے
صحبت میں رہکر غیر اسلامی تصوف کے بعض ایسے اصول
اپنی زندگی میں داخل کر لئے تھے جس کا ثبوت نہ تو قرآن
مجید سے مل سکتا ہے نہ سنت رسول اللہ صلعم سے۔ مثلاً نفس
کشی، عزلت گزینی، ترک دنیا، گوشہ نشینی، خانقاہ اور
تسبیح کے علاوہ فنافی اللہ کا تحصیل یہ سب باتیں غیر اسلامی
ہیں اور ذوق عمل کی سراسر دشمن۔ چنانچہ قرآن مجید واضح
الفاظ میں ان سب اصولوں کی تردید کرتا ہے۔

(۲) ایرانی لوگوں کا تخیل نسلی مناسبت کی بناء پر ہندی اقوام کے تخیل کی طرح آریائی تھا۔ اسلامی تعلیم نے اگرچہ انہیں عمل کی طرف مائل کیا لیکن وہ سابقہ اثر پوری طور پر زایل نہ ہو سکا۔

(۳) گیارھویں صدی سے ایرانی مسلمان فلسفۂ یونان کی بھول بھلیوں میں پڑ کر صراط مستقیم سے دور ہو چکے تھے اور فقہی خیالات نے اختلافات کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عملی قوت اس آگ کے شعلوں کی زد میں آ گئی۔ اس کی مثالیں چھٹی صدی کے اشاعرہ اور معتزلہ کے مابین جو مناظرے ہوئے ان سے بخوبی مل سکتی ہے۔

ان حالات میں جب شیخ عربی کی تعلیم مصر، شام، عراق اور ایران میں آئی تو لوگوں نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ علی الخصوص ایرانی شعراء نے تو اپنا سارا زور کلام اس کی نشر و اشاعت کے لئے کر دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی نے تو وحدت الوجود کو یعنی شاعری کا موضوع قرار دیا۔

اگرچہ ہندو حکماء نے اس مسئلہ کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب بنایا تھا اور ایرانی شعراء نے دل کو لیکن ماوک شعر کا نشانہ بنایا۔ لیکن نتیجہ دونوں جگہ یکساں مرتب ہوا۔ یعنی ہندی اقوام کی طرح پندرھویں صدی سے مسلمان بھی ذوق عمل سے محروم رہ گئے۔

ذوق عمل سے محروم ہونے کا لازمی نتیجہ تلاش سکون ہوتا ہے۔ انسان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بجائے کنج عافیت کو محبوب رکھنے لگتا ہے اور اس نکتہ سے غافل ہو جاتا ہے کہ کنج عافیت اس کے لئے ہلاکت کا دروازہ ہے۔

اٹھارویں اور بیسویں صدی کا لٹریچر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لذت سکون ہندوستانی مسلمانوں کا نصب العین بن گیا تھا اور وہ سکون کے اس قدر دلدادہ بن چکے تھے کہ انہیں جنبش نگاہ تک گوارا نہ تھی۔

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

یا

دیکھ جو کچھ سامنے آئے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا

اس دور کی شاعری سراسر ترک عمل تلاش سکون یاس و نومیدی اور قنوطیت کا مرقع ہے جس کے مطالعہ کا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ انسان حقیقت پسندی سے دور ہو جاتا ہے اور ایک خیالی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے جہاں نہ کوئی تکلیف ہو اور نہ کوئی جدوجہد۔

کہتے ہیں کہ شاعری اپنے نقطۂ عروج پر اسی وقت ہوتی ہے جب کہ قوم زوال پذیر ہوتی ہے اس کا اندازہ ہم اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتصادی معاشرتی اور علمی انحطاط کا دور اسی زمانہ میں

اپنے آخری منزلیں طے کر رہا تھا جب کہ شاعری اپنے ترقی کے زینے پر پہنچ چکی تھی ۱۸۵۷ء کا ہولناک انقلاب ایسی خواب کی تعبیر تھی جو مسلمان قوم گزشتہ چند صدیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس انقلاب نے مسلمانوں کی غلامی اور بربادی دونوں پر مہر توثیق ثبت کر دی۔

غدر کے بعد اگرچہ انگریزی تعلیم کا چرچا عام تھا تاہم بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغربی خیالات نے ۱۸۵۷ء سے ہندوستانیوں کو متاثر کرنا شروع کیا اور ان خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہب اور آخرت کا تصور مادی ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔

پچاس سال تک مسلسل انکار کے بعد ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں نے مجبوراً انگریزی تعلیم شروع کی۔ علوم دین سے تو پہلے ہی بیگانہ ہو چکے تھے اب جو مغربی علوم پڑھے تو نتیجہ یہ نکلا ذہنیت اس درجہ مسموم ہو گئی کہ

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا
بتوں کے عشق میں پڑ ہی چکے تھے عقل پر پتھر
مسوں کا بت کا تطف چڑھ گیا ہر قلب پر پارا

بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ بیسویں صدی کا مسلمان مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر بھی ہو گیا — ان مسلمانوں کا نقشہ علامہ مرحوم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

مسلم از سرّ نبی بیگانہ شد　　باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
از مَنات و لات و عزیٰ و ہبل　　ہر یکے دارد بتے اندر بغل

شیخ ما از برہمن کافر تر است　　زانکہ او را سومنات اندر سر است
رخت ہستی از عرب برچیدہ　　در خمستان عجم خوابیدہ
شل ز برفاب عجم اعضائے او　　سرد تر از اشک او صہبائے او
ہمچو کافر از اجل ترسندہ　　سینہ اش فارغ ز قلب زندہ

اسلامی ممالک کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

الغیاث از دشت خویش از راہ رفت
از دمِ او سوز الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گرداب نیل
سُست رگ تورانیان زندہ لعل
آل عثماں در شکنجے روزگار
مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئین سلمانی نہ ماند
خاک ایراں ماند و ایرانی نہ ماند
مسلم ہندی شکم را بندۂ
خود فروشی دل ز دین برکندۂ
در مسلماں شانِ محبوبی نہ ماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند

اگرچہ اس عرصہ میں بعض دردمند مسلمانوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی مثلاً سر سید نے ۱۸۷۵ء میں مدرسہ دارالعلوم علی گڑھ میں قایم کیا۔ حالی نے ۱۸۷۹ء میں اپنی غیر فانی مدس لکھی۔ اکبر الہ آبادی نے مسلمانوں کو پستی اور زبان حالی کا

احساس دلانے کے لئے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو قوم کے لئے وقف کردیا۔

لیکن پھر بھی مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے ایک مسیحا کی اشد ضرورت تھی یعنی بیسویں صدی کے مسلمانوں کو ایک ایسے پیغامبر کی ضرورت تھی جو زندگی کے مسائل ان کے سامنے کھول کر بیان کرسکے اور انھیں حقائق و معارف قرانیہ سے روشناس کرسکے جو نہ صرف ہندی مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو قرآن مجید کا پیام سنا سکے اور ساری دنیا کے سامنے اسلام کی برتری ثابت کرسکے۔ خدا کا شکر ہے کہ علامہ اقبال کو خدا نے مسیحا بنا کر بھجوایا جنھوں نے انسان کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دی۔ حضرت گرامی بھی کیا خوب فرماتے ہیں۔ ؎

در دیدہ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اب میں آپ کو اس مصلح اعظم کے شاندار کارناموں کی ایک جھلک دکھلانے کی کوشش کروں گی اگرچہ کہ ان چند اوراق میں نہ تو ان کے کمالات کے تمام گوشے بے نقاب کئے جا سکتے ہیں اور نہ خود مجھ میں ایسی صلاحیت موجود ہے لیکن یہ صرف حقیر کوشش ہے جس کا سبق خود علامہ دیتے ہیں۔

برآور ہرچہ اندر سینہ داری
سُرودے، آہے، نالہ یا فغانے

یوں تو اقبال کی تعلیمات نے زندگی کے تمام مسائل کو محیط کر رکھا ہے تاہم میں ان کو چار اہم عنوانات کے تحت بیان کروں گی۔ اور پھر اس کے بعد غور کروں گی کہ ان میں سے کونسی خصوصیات اردو ادب پر اثر انداز ہوئیں۔

۱۔ اقبال کا وطنی اور قومی تصور (۲) اقبال قرآن کریم کی روشنی میں (۳) مغربی تہذیب (۴) ہدایات۔

اقبال کا وطنی اور قومی تصور

علامہ مرحوم نے وطنیت اور قومیت کی تحریک کو مسلمانوں کے حق میں بہت زیادہ خطرناک محسوس کیا جیسا کہ نتائج سے ظاہر ہے۔ وطنیت مذہب کی اور اس لئے اسلام کی نفی کرتی ہے۔ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندوستان کے علماء کثرت سے اس غیر اسلامی مسلک کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ لیکن ہمارے مصلح قوم علامہ اقبال نے آج سے بیس سال پہلے اس کے جراثیم قوم میں دیکھ لئے تھے اور اس سے پیش آنیوالے واقعات کا اندازہ لگا کر مسلمانوں کو ان الفاظ میں یہ فرمایا تھا۔

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نہیں ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

(باقی دارد)

3238
REGD. M. N. O.
غ ۹۷
رجسٹرڈ بہ آصفیہ نمبر (۱۲۲)

لب متحرک

رحیم النساء رفیق

۱۔ تلخ تجربہ ایک شفیق طمانچہ ہے۔

۲۔ غرور ایک ظرف سفالی ہے شکستہ۔

۳۔ پرواز بلندی میں نظر نیچی ہو۔

۴۔ قلب بے حس بے جان برابر

۵۔ گونجتے فرمائشی قہقہوں سے ایک قلبی تبسم لطیف

۶۔ بیکار انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔

۷۔ ٹھوکریں زندگی کی راہیں ہیں۔

۸۔ انحصار حیات چند غیر معین سانسوں پر مشتمل ہے جس میں معصیت کی عفونت نہ ہو۔

۹۔ شاخ شباب سے پہلے خشک ٹہنی پر نظر ہو۔

۱۰۔ اصلیت پر سے جامع تصنع کھینچ پھینکو۔

۱۱۔ کھوکھلے پن کو سمجھنا ہی امتیاز پختگی ہے۔

۱۲۔ یاد ماضی بطور درس ہو نہ کہ مستقبل کھو بیٹھو۔

میرا زاویۂ نگاہ

مظہر النساء مہر

۱۔ زندگی ایک صبر آزما امتحان ہے جس کی کامیابی لازم ہے۔

۲۔ مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا خوش قسمتی کا دوسرا نام ہے۔

۳۔ کچھ کر گذرنے سے پہلے انجام پر ایک اچٹتی نظر ضرور ڈالو۔

۴۔ اتفاق چاہتے ہو تو تمدن پیدا کرو۔

۵۔ جھوٹ ایسا شجر کہ جس کی ہوا بھی انسانی زندگی کے لئے مضر ہے۔

۶۔ مظلوم کی آہ شعلۂ جہنم سے کم نہیں۔

۷۔ تکبر ایک کھوکھلا ستون ہے جس سے عمارت انسانی فوری ڈھل جائے گی۔

۸۔ راز ایک پوشیدہ خزانہ ہے جسے کھونے کو مائل ہے۔

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب دبیر پورہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔



نیا سال
قومی عید
شہاب

شہاب

جلد ۱۴ آذر ۱۳۵۵ف م اکتوبر ۱۹۴۵ء نمبر ۱

(مُرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

چندہ سالانہ ([illegible])

ذکر ماضی

اگرچہ کہ اس عرصہ مدت میں پندار کے سینکڑوں صنمکدے ویران ہو چکے ہیں لیکن دل کا پھر بھی یہ حال ہے کہ وہ "گوشۂ ملامت" میں جانے کے لئے آمادہ اور اپنی کہانی سنانے کا تقاضہ کر رہا ہے جب کہ اوس میں کوئی لطف ہے اور نہ لذت۔ مگر صحافت کی نسبت دیرینہ "کس بشنود یا نشنود" آپ بیتی کے لئے ابھارتی ہے۔ **شہاب** اپنی زندگی کی تیرہ منزلیں ختم کرکے چودھویں منزل کی جانب جادہ پیما ہے۔ کیا عجب کہ اس کا یہ عزم اس کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔

نیا سال نئی امیدوں کا پیامبر ہوتا ہے اور وہ جو سب سے بڑا بخشش و کرم والا ہے بندوں کی امید کو ناکام نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ اوس کا کس قدر فضل و احسان ہے کہ آج سے ٹھیک (۱۴) سال پہلے اسی مہینہ میں ایک بے نوا جب میدان عمل میں سائل بن کر آیا تھا تو کیا توقع تھی کہ زندگی کی تیرہ منزلیں نہایت کامیابی سے طے ہوں گی۔ جب کہ قدم قدم پر رکاوٹیں موجود تھیں۔

ماضی کی یاد قابل فراموش ہے جب کہ مستقبل رہبری کے لئے موجود ہے اسلئے مستقبل کی توقعات مستقبل ہی پر چھوڑی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ قلمی معاونین کا جن کی نگارشات پر پرچہ کا انحصار رہتا ہے شکریہ ادا کریں خصوصاً جناب عطارد صاحب حیدرآبادی، جناب سید نور الحسن صاحب بی۔ اے حیدرآبادی، جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے امرتسری کا جنھوں نے ابتداء اشاعت سے قلمی اعانت فرمائی ہے۔

سال حال کے قلمی معاونین میں شوکت علیخاں صاحب ایم۔ اے حیدرآباد اور جناب نیر صاحب تسری قابل ذکر ہیں جن کے کئی ایک افسانے شائع ہوئے ہیں۔ شعراء میں جناب امام الفن حضرت فصاحت جنگ بہادر جلیل اور نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز اور جناب مسلم حیدرآبادی تھے۔

خواتین میں جہاں بانو صاحبہ ایم۔ اے۔ زینت ساجدہ صاحبہ بی۔ اے۔ سلطانہ عزیز صاحبہ بی۔ اے۔ فیروزہ بانو کاؤس جی۔ معصومہ جنگ بہادر۔ صغرا جنگ بہادر ہمارے شکریہ کے متوقع نہ سہی لیکن شہاب ان کا نہایت شکر گزار ہے۔ یقین ہے کہ ان کی قلمی اعانتیں مستقبل میں بھی شہاب کو فراموش نہ کریں گی۔

اون خریداران شہاب ہمارا شکریہ قبول فرمائیں جنھوں نے ابتک اس کو قابل مطالعہ تصور فرمایا ہے امید کہ ان کی دلچسپیاں شہاب کے ساتھ روز افزوں رہیں گی۔

میدانِ سیاست

جناب محمد یوسف صاحب ناظم ایم۔ اے۔

کئی دنوں کے غور وخوض کے بعد یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ میدان سیاست میں جوہر دکھلائے جائیں۔ ادب کے میدان میں ایڑیاں رگڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ برسوں دماغ بنجر پڑا رہتا ہے اور جب کچھ فصل رہتا ہے تو کوئی اسے چرنے کی بجا زحمت نہیں اٹھاتا صحیح بھی ہے آخر کب تک۔ کوئی تین سو سال گذر گئے لیکن ادب اور شاعر ہیں کہ دنیا کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ کوئی تو کرم خوردہ کتابوں پر مشق سیاست کرکے پیش کرتا ہے کہ لیجئے صاحب انہیں پڑھ کر دل و دماغ کی جلا فرمائیے کوئی ان کی مذمت کرکے ایک ضخیم کتاب کے ذریعہ بتاتا ہے کہ ان میں دہرا کیا ہے۔ کوئی خود اپنی تصنیفات سے جی بہلاتا ہے۔ ادیبوں کی انہیں حرکتوں کا نتیجہ ہے کہ وہ آج بھگت رہے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ والدین بچپن سے اپنے بچوں کو فٹ بال کھیلنے کی مشق کرائیں تاکہ آئندہ چل کر ان کی معاش کا سوال تو باقی نہ رہے کوئی نہ کوئی زندہ دل و دولتمند ان کی سرپرستی کرہی ڈالیگا یا پھر زندہ رہنے کی دوسری ترکیب بھی میدان سیاست کی شہسواری ہے۔ اب آپ خواہ مخواہ بھی اس کی پیچیدگیوں پر غور کرکے ہمت نہ ہارے۔ اس میں کچھ زیادہ تعلیم وعلم کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ تھوڑی سی ہمت درکار ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہماری یہ تمدن دنیا جب تک باقی ہے سیاست کے میدان میں کبھی دھول نہیں اڑ سکتی۔ کیونکہ یہ میدان پانی پت کا میدان نہیں کہ تین لڑائیوں کے بعد ہندوستان کے نقشہ ہی سے نجات ہوجائے۔ اگر کسی اخبار کا نامہ نگار خوش قسمتی سے گٹھ جائے تو بس آپ خم ٹھونک کر میدان سیاست میں اتر سکتے ہیں۔ چند ہی دنوں میں آپ کا وہ شہرہ ہو جائیگا کہ اخباروں کے نمائندے آپ کے گھر کے چکر کاٹنے لگیں گے گھنٹوں آپ کا انتظار کریں گے اور آپ اطمینان سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر دوسرے سیاستوں کے ساتھ چائے نوشی فرماتے رہیں گے۔ آپ کے جی میں آئیگا تو بیان دیں گے ورنہ مسکرا کر چپ رہ جائیں گے اور آپ کا یہی تبسم اخبار کے کالم کی زینت بن جائیگا۔

خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ خوش آئند مستقبل کے تصور میں کہیں آپ نے زیادہ زندہ دلی دکھائی تو بجائے اخباروں کے نمائندوں کے خفیہ ہرکارے آپ کے گھر کی دربانی کریں گے۔

میدان سیاست میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کسی چلتے ہوئے مسئلہ کے متعلق دو چار پمفلٹ پڑھ ڈالئے۔ یہ چار چھ آنے میں مل جائیں گے اور

انہیں ہاتھ میں لے کر دو چار دوستوں سے مل لینا ہی آپ کی وقعت بڑھا دے گا کہ کیا ذی شعور آدمی ہے اس کے بعد اگر آپ ملازم نہیں ہیں تو کسی قومی ادارے کے رکن بن جائیے۔ اور اس نامہ نگار کے ذریعہ (جو درپردہ وہ آپ کا دوست ہو) اخبار میں بیانات چھپواتے رہئے کسی کانفرنس کے لئے اگر چندہ جمع ہو رہا ہو تو آپ کہیں نہ کہیں سے قرض لے کر ضرور دیجئے اور اگر آپ کا قرض بہت بڑھ گیا ہو تو بجائے چندہ دینے کے ایک بیان دیجئے جس میں اس بات پر زور دیجئے کہ "چندہ جمع کرنا بڑی معیوب بات ہے اور بالخصوص اس کانفرنس کے لئے جس کا مقصد قومی خدمت نہیں بلکہ قومی دولت کو ضائع کرنا ہے۔ بڑا مذموم فعل ہے" لوگ اول ہی کون سے چندہ دیتے ہیں آپ کے بیان سے ان کی قسمت اور بڑھ جائیگی۔ اور اچھی خاصی ہونے والی کانفرنس چل بسیگی۔ آئندہ سے کانفرنس کرنے والے پہلے آپ کو منائیں گے اور جب تک آپ مان نہ جائیں گے ایسی حرکتوں سے احتراز کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے۔

میدان سیاست میں جوہر دکھلانے کے لئے مقرر ہونا بھی قطعی ضروری نہیں۔ صرف پڑھنا آنا کافی ہے۔ تقریر تو نہ صرف لکھی جا سکتی ہے بلکہ لکھائی بھی جا سکتی ہے۔ عین جلسہ کے وقت آپ کا بیمار ہو جانا بھی کچھ برا نہیں۔ اس صورت میں آپ ایک پیام بھجوا سکتے ہیں جس میں اپنی اور اپنی بیوی کی طرف سے جلسہ کی کامیابی کی دعا کیگئی ہو۔ مختصر جلسہ آپکے پیام حاضرین کو سنا دیگا۔ اس دوران میں آپ اور آپ کی بیوی دونوں بازار میں شاپنگ کے لئے نکل سکتے ہیں۔ منفردہ بیان کے لئے علاوہ آپ کبھی کبھار متفقہ بیان بھی ضرور چھپوائیے۔ اس سے عوام پر رعب یہ پڑتا ہے کہ بھئی جب چار آدمی مل کر ایک بات کہہ رہے ہیں تو اس میں کچھ نہ کچھ تو حقیقت ہوگی۔ کوشش ہمیشہ اس امر کی کیجئے کہ آپ کے بیان میں قطعیت نہ ہو۔ تاکہ اگر کچھ غلطی ہو گئی تو بعد میں درست کیا جا سکے ورنہ آپ ہی کے بیانات میں اگر اضافہ ہو تو مشکل آن پڑتی ہے۔ ہاں جب آپ اس کام میں منجھ جائیں تو پھر کسی احتیاط کی ضرورت نہیں جو جی میں آئے بیان دیجئے۔ اور اس پر آخر دم تک اڑے رہئے۔ اس سے آپ کے خلوص اور استقامت کا اظہار ہوگا۔

اگر دنیا کے کسی بڑے آدمی کی وفات واقع ہو جائے تو آپ پر لازم ہے کہ فوراً اپنے گہرے رنج و الم کا اظہار کریں اور ممکن ہو تو اس کی بیوی کو شوہر کی یاد دلانے کے لئے ایک تار کر دیں۔ بلدیہ، تعمیرات، آرائش بلدہ، حفظان صحت اور اغذیہ کے محکموں پر بھی آپ کی کڑی نگرانی ہونی چاہئے۔ اگر کسی موری میں پانی کی آمد و رفت ٹھیک طریقہ سے نہ ہوتی ہو اور آپ کو اس کا علم ہو جائے تو معاشرہ کی طرف سے آپ پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ متعلقہ محکمہ کو توجہ دلانے کی خاطر آپ فوراً بیان دیں۔ فرصت کے اوقات میں مختلف خرابیوں کو جمع کر کے آپ ایک یادداشت بھی حکومت میں پیش کر سکتے ہیں۔ جس کا آپ کو فوراً

جواب دیا جائیگا کہ حکومت آپ کی یادداشت پر ہمدردانہ غور کر رہی ہے۔

ایک اور طریق کار یہ بھی ہے کہ آپ مختلف دفتروں میں لوگوں سے تعلقات بڑھاتے رہیں اور اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ حکومت آوارہ کتوں کے بارے میں کوئی قانون نافذ کرنے والی ہے تو اس خبر کے اخبار میں چھپنے سے پہلے آپ کا مضمون اخبار میں آجانا چاہیئے جس میں آپ ان آوارہ کتوں کی لائی ہوئی مصیبتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتائیں کہ حکومت کو ایک ایسا قانون جلدی نافذ کرنا چاہیئے جس کی رُو سے کتوں اور کتوں کے مالکوں پر تحدید اور ذمہ داریاں عاید ہوں۔ جب قانون نافذ ہو جائیگا تو ہم سب یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ فلاں صاحب کی رائے کی روشن خیالی اور پیش بینی کا نتیجہ ہے۔

میدان سیاست میں آنے کے بعد آپ کی معاشی کا سوال بھی بڑی حد تک حل ہو جائیگا ایسے مسایل سے آپ کی مخالفت، جن سے دوسروں کا مفاد متعلق ہو، یقیناً آپ کا جیب گرم کر دے گا۔ گھر بیٹھے آمدنی کا یہ ذریعہ اگر آپ کو ابتک نہیں سوجھا ہے تو یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس متمدن دنیا میں آپ کا کوئی مقام نہیں۔

طالب علمی کے زمانہ ہی میں اگر آپ میدان سیاست میں آجائیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے بعد میں ملازمت کیلئے آپ کو کسی سفارش کی ضرورت نہیں رہتی۔ کچھ دھوکے میں چلے آئیں گے مرکار بند ہے والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعد پھر آپ کی سیاسی زندگی پر قفل پڑ جاتا ہے اگر آپ کو یہ گوارا نہیں (جو آپ کی سراسر زیادتی ہوگی) تو پھر آپ اس شوق میں پوری زندگی گذار سکتے ہیں۔

ہاں آپ کی موت کے بعد اگر کوئی آپ کی یادگار قایم رکھنا چاہے تو آپ کا چندہ کی مخالفت والا مضمون اس راہ میں ضرور حایل ہوگا۔ اس کی آپ پرواہ مت کیجئے۔ آپ کی نسل کو اس سے ضرور فائدہ پہنچے گا جو آپ کی روح کو تسکین کا باعث ہوگا۔

آپ اگر نیک نام رہ کر مریں تو اس کا بھی یقین ہے کہ آپ کے سارے قرضے بھی معاف ہو جائیں گے۔

ان امور کے پیش نظر کیا آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ زندہ رہنے کے لئے میدان سیاست میں جو ہر دکھلانے چاہئیں۔

شہاب کا خصوصی نمبر مصنوعات ملک بڑی آب و تاب سے شائع ہوگا۔ خواتین۔ تفریحی۔ معاشی صنعتی مضامین چاہے نظم ہوں یا نثر۔ اور نمایش سے جو تاثرات پیدا ہوں کہ کیا دیکھا۔ کیا ہونا چاہیئے پر اظہار خیال فرمائیں خصوصاً جہاں بانو صاحبہ۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ۔ سعیدہ مظہر صاحبہ۔ زینت ساجدہ صاحبہ۔ رفعیہ سلطانہ صاحبہ۔ سلطانہ عزیز صاحبہ۔ جمیلہ نسیم صاحبہ۔ معصومہ جنگ بہادر صاحبہ۔ صغرا جنگ بہادر صاحبہ توجہ کریں۔

غزل

امام الفن جناب نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ

ستم کرنے والے یہاں اور بھی ہیں
تہ آسماں آسماں اور بھی ہیں

نگاہیں تری دیکھ کر میں یہ سمجھا
سوا اس جہاں کے جہاں اور بھی ہیں

خدا رکھے درد و غم و بیکسی کو
تمھیں اک نہیں مہرباں اور بھی ہیں

مٹاتے گئے مجھ کو اک اک ادا پر
ستاتے گئے امتحاں اور بھی ہیں

فقط اشک خوں کیا ہیں آہوں کو دیکھو
پس کارواں کارواں اور بھی ہیں

مجھی پر ہیں کیوں باغباں کی نگاہیں
اسی شاخ پر آشیاں اور بھی ہیں

جلیلؔ آہِ دل کے شراروں کو دیکھو
ستارے سرِ آسماں اور بھی ہیں

نقد و نظر

جناب عطار د صاحب

ماہ گذشتہ "محسوسات ماہر" میں سے چند اشعار پر میں اپنے شکوک کا اظہار کر چکا ہوں آج اور چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جناب ماہر القادری میں بلاشبہ وہ صلاحیتیں ہیں جو ایک اچھے شاعر میں ہونی چاہئیں۔ "محسوسات ماہر" کے ذی علم ناشرین کی اس رائے سے مجھے اختلاف نہیں کہ اس مجموعہ کلام ماہر میں "آپ فکر و نظر بھی پائیں گے اور علم و حکمت کے موتی بھی۔ اس میں جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے بھی ملیں گے اور منظر نگاری کے بھی۔ اس میں تغزل بھی پائیں گے اور محاکات بھی" مگر —— میں صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں —— اس میں زبان و بیان کی لغزشیں بھی ملیں گی اور محاورے کی غلطیاں بھی لیکن اس سے شاعر کی فطری صلاحیت اور ذاتی قابلیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس قسم کی غلطیوں کی بنیاد خود رائی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کیونکہ شاعری میں کسی سے مشورہ کرنا اپنے آپ کو بے علم اور جاہل قرار دینے کے برابر سمجھا جاتا ہے" علم و حکمت کے موتی اور جذبات نگاری" کے جوہر کو پرکھنا میرے مقصد سے خارج ہے اس کو جانچنے اور پرکھنے والے ارباب فن اور تاجداران ملک سخن سے دنیا خالی نہیں ہے۔

ملک کے طول و عرض میں زبان اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے مختلف ادارے سرگرم عمل ہیں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک طبقہ شاعری اور افسانہ نگاری میں مصروف ہے اس کے ساتھ ضرورت اور شدید ضرورت اس کی ہے کہ زبان کو غلطیوں سے اور اسلوب بیان کو بے راہ روی سے اور محاورے کو بیجا تصرف سے محفوظ رکھنے کی بھی سعی کی جائے۔ ورنہ نظر بہ حالات موجودہ وہ زمانہ دور نہیں جب کہ اردو کا حسین چہرہ داغدار ہوتا جائے گا اور آنے والی نسلیں ان داغوں کو بھی حسن میں شمار کرنے لگیں گی۔ جو بزرگوار اس کام کو باحسن الوجوہ انجام دینے کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہیں اون کا سکوت قابل افسوس ہے۔ میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود یہ جرات اس توقع سے کرتا ہوں کہ ارباب فطانت و خبرت میں سے کسی کو ترغیب ہو اور موجودہ رفتار زمانہ کے اعتبار سے وہ اس ضرورت کو شدت سے محسوس فرمائیں۔

گنگا کے کنارے

فرد (۱) میں بیٹھا ہوں کہ گنگا کے کنارے بھرتی ہیں نگاہیں جو ترارے پہ ترارے

فردوس بہشت کو کہتے ہیں اور ایسے باغ کو بھی جس میں ہر قسم کے میوہ دار درخت ہوں۔ بہشت کا نظارہ تو دور کی بات ہے لیکن گنگا کے کنارے میوہ دار درختوں کا کوئی باغ ہو، اور اسی کے نظارے سے شاعر میں جذبات پیدا ہوئے ہوں تو تعجب کیا ہے مگر "نگاہوں کا ترارے پہ ترارے بھرنا" ضرور قابل تعجب وحیرت ہے۔ اردو میں گھوڑے کے کودنے اور جست کرنے کو ترارے بھرنا کہتے ہیں۔ ع

سمند عمر منزل طے کریگا دو تراروں میں　(آتش)

پس "نگاہوں کا ترارے بھرنا صحیح نہیں۔

یہ تابش مہ اور یہ موجوں کا تصادم　　پانی سے نکلتے ہوئے بجلی کے شرارے

تابش خورشید خاور کا خاصہ ہے ماہ میں یہ چمک اور گرمی کہاں۔ واضح ہو کہ تاب بہ معنی روشنی اور تابش بمعنے پرتو و فروغ مستعمل ہے۔

شب بہ گلگشت آمد از مہتاب . برد　　صبح از ہر جلوہ اش مہتاب . برد　(ظہوری)

لفظ تابش عموماً آفتاب ہی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔

پیش حسنش باغ را نرخ تماشا بشکند　　تابش خورشید رنگ روئے گلہا بشکند　(عالی)

وہ مخفی اجسام کو کہئے جنھیں حشرات　　لیتے ہوئے انگڑائیاں کائی کے سہارے

انگڑائی جس کو فارسی میں خمیازہ کہتے ہیں ایک خاص قسم کی حرکت ہے جو سستی دفع کرنے کے لئے دونوں ہاتوں کو بلند کرکے بدن کو توڑا جاتا ہے۔ لفظ انگڑائی کا استعمال انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیا کسمسا کے ہاتھ

پانی میں جو "مخفی اجسام" یا کیڑے ہوتے ہیں۔ اون کو حشرات نہیں کہتے۔ انگڑائی کے لئے سہارے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کائی سطح آب پر بچھی ہوتی ہے اوس کا سہارا انگڑائی میں کوئی کیسے لے سکتا ہے غرض حشرات کی "انگڑائی" اور "کائی کا سہارا" دونوں مہمل ہیں۔

گرداب کے ہیں پیچ کہ فانوس کے شعلے　　دریا کی یہ موجیں ہیں کہ انوار کے دھارے

بھنور کو فارسی میں گرداب کہتے ہیں، گرداب مرکب لفظ ہے گرد اور آب سے چونکہ پانی ایک ہی جگہ چکر کھاتا رہتا ہے اس لئے اس کو گرداب کہتے ہیں۔ گرداب یا بھنور کے پیچ نہیں ہوتے۔ گرداب کو "فانوس کا شعلہ" کہنا بھی صحیح نہیں۔

نکھرے ہوئے ساحل پہ یہ بگلوں کی قطاریں　　حوروں کے پرے جیسے ہوں کوثر کے کنارے

نکھرنا بمعنی آرائش و زیبائش کرنا۔ گنگا کے ساحل کی آرائش و زیبائش کا تو کہیں ذکر ہی نہیں آیا

پھر اس کو "نکھرتے ہوئے ساحل" کس بنا پر کہا گیا۔ مصرعہ اول میں لفظ "یہ" حشو ہے۔ بگلوں میں اور حوروں میں کوئی وجہ مناسبت یا وجہ شبہ ہی نہیں پائی جاتی گنگا کے ساحل کو کوثر کے کنارے سے اور بگلوں کی قطاروں کو حوروں کے پرے سے تشبیہ نادرست اور مہمل ہے۔

ہر موج اٹھتی ہوئی انوار کے پردے　　　اے آنکھ تو کیا روح پہ واجب ہے نظارے

موج فاعل ہے "یہ انوار کے پردے" کس چیز سے مراد ہے جس کو موج الٹ رہی ہے۔ روح کا محظوظ یا مسرور ہونا تو سنا مگر روح کا نظارہ کرنا بعید از فہم ہے قطع نظر اس کے "نظارے کے وجوب" کی کوئی خاص وجہ بھی پائی نہیں جاتی۔ اس موقع پر بصیغہ جمع نظارے کہنا ہی خالی از تکلف نہیں۔

نو جوان بیوہ

زلف بے ترتیب کپڑے ملگجے چہرہ اداس　　　ایک پژمردہ تمنا ایک غم انجام آس

تمنا کو پژمردہ کہنا صحیح نہیں۔ پژمردہ تمنا اور غم انجام آس نوجوان بیوہ کے لئے نہ کنایہ ہے نہ استعارہ۔

پھول سے رخسار میں زردی کی جھلک　　　ہونٹ کمھلائے ہوئے شبنم آلودہ پلک

"ہونٹ کمھلانا" بے معنی ہے کمھلانا ہونٹ کی صفت نہیں۔ اشک آلودہ پلک کے عوض "شبنم آلودہ پلک" کہنا بے محل ہی نہیں بلکہ مہمل ہے۔

ہر طرف سے ہے دوپٹے کی کناری تار تار　　　چھن چکے ہیں بجلیاں کانوں کی اور گردن کا ہار

جس بیوہ کا زیور چھن چکا ہو وہ کناری کا دوپٹہ نہیں اوڑھتی۔ "گردن کا ہار" سراسر غلط اور خلاف محاورہ ہے گلے کا ہار کہتے ہیں جو زبان زد خاص و عام ہے۔

اس قدر ویران نگاہیں اس قدر حالت تباہ　　　جیسے دنیا میں نہیں اوس کے لئے کوئی پناہ

ویران نگاہ کے لئے نہ صفت ہے نہ تشبیہ نگاہ کو ویران کہنا بے معنی اور غلط ہے "اوس کے لئے کوئی پناہ نہیں" مہمل جملہ ہے۔ کوئی پناہ دینے والا یا جائے پناہ نہیں کہنا چاہیے۔

روح بھی غلطاں ہے اوس کے دیدۂ خونبار میں　　　دل کی دھڑکن بھی ہے شامل نبض کی رفتار میں

دیدہ میں یا دیدۂ خونبار میں روح کا غلطاں ہونا سراسر غلط ہے۔ دیدہ اسم اور خونبار صفت ہے کوئی خون میں لوٹتا اور غلطاں ہو سکتا ہے مگر کوئی دیدہ میں غلطاں نہیں ہو سکتا چاہے وہ خونبار ہی کیوں نہ ہو غرض دیدۂ خونبار میں غلطاں ہونا قطعاً مہمل اور لغو ہے۔ دل کی معمولی حرکت کو دھڑکن نہیں کہتے اختلاج قلب کے معنی پر یہ لفظ عورتوں کا محاورہ ہے جس کو حرکت قلب کے معنی پر مرد ہی آج کل استعمال کرتے ہیں۔

لیکن یہ لفظ اس معنی میں فصحا کی زبان پر نہیں ہے ۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ نبض کی رفتار دل کی حرکت پر موقوف ہے ۔ دل کی "دھڑکن" نبض کی رفتار میں شامل نہیں ہوتی بلکہ نبض کی رفتار دل کی حرکت کا نتیجہ ہے ۔

ایک غم کی رات جس کی صبح ہو سکتی نہیں		اک کلی جو اُس سے بھی منھ کو دھو سکتی نہیں

غم اور فرقت کی رات کو طویل قرار دیا جاتا ہے مگر یہاں امدادی فعل سکنا کے اضافہ نے صبح ہونے کو ناممکن ہی بنا دیا جو مہمل ہے نوجوان بیوہ اور کلی میں کوئی وجہ شبہ نہیں پائی جاتی یہ تشبیہ غلط اور کلی کا اوس سے منھ نہ دھو سکنا بے معنی لفاظی ہے ۔ آخری مصرعہ میں "بھی" کے لفظ سے یہ مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ پانی تو بڑی چیز ہے شبنم جیسی حقیر شئی سے بھی منھ نہیں دھو سکتی غرض ان کو مہملات کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں ۔

اک جوان امید جو سینہ میں گھٹ کر رہگئی		اک مہاگن اپنے جو ساجن سے چھٹ کر رہگئی

وہ کونسی امید ہے جس کو "جوان" کہا گیا اوس کا تو کہیں ذکر ہی نہیں کس مناسبت سے امید کو جوان قرار دیا گیا "جوان امید" اور بوڑھی امید کو مہمل نہیں تو اور کیا کہئے ۔

اک چمن جس پر بہار آتے ہی بجلی گر پڑی		اک مسلسل مرگ اک پیہم قیامت کی گھڑی

"مسلسل مرگ" اور "پیہم قیامت" دونوں لغو اور بے معنی ہیں موت اور قیامت لگاتار اور پیاپے نہیں آتی ۔ "چمن پر بجلی گری" خاتمہ ہو گیا ۔ اس بجلی گرنے کو "مرگ یا قیامت" کہئے تو اس میں تسلسل یا تواتر کا کیا موقع ہے ۔

ایک دکھیاری نہیں جس کا کوئی جز بیکسی		ایک کہرے کی سحر جس میں نہیں تابندگی

"کہرے کی سحر" نوجوان بیوہ کے واسطے کنایہ یا استعارہ نہیں ہو سکتا اسی کو تنگ بندی کہتے ہیں ۔

تجھ سے بیاہی عورتیں ملتے ہوئے کترائینگی		دور رہ کر تجھ سے ساون کی ملہارین گائینگی

ساون بارش کی ایک کارتی کا اور ملہار ایک راگنی کا نام ہے کہتے ہیں صحیح اصول پر ملہار راگنی گائی جائے تو پانی برستا ہے مگر "ساون کی ملہار" خدا جانے کس راگنی کا نام ہے ۔ بہرحال ساون کی ملہار یا بھادوں کی ملہار کہنا صحیح نہیں

تیری امیدوں سے لیگی فطرت ہستی خراج		تجھ کو ٹھکرائیگا اک اک گام پر ظالم سماج

ہستی کی فطرت اور اوس کا امیدوں سے خراج لینا مہمل ہے آخر وہ کیا چیز ہے جو بطور خراج امیدوں سے لیا جائیگا ۔ یہ مصرع ہی بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے ۔

حالیؔ

۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء

"بہ حیثیت شاعر و صناع"

جناب ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم۔اے

غزل کی جاذبیت اور دلاویزی مسلم ہے لیکن اپنی خاص کشش اور جاذبیت کے باوجود اس کی جولانیوں کا میدان تنگ ، اور اس کی کم مایگی لاکلام ہے - غزل کی اس تنگ دامنی کو حالی کے استاد مرزا غالب نے بہت پہلے محسوس کیا تھا اور 'بقدر شوق' یا بقدر ضرورت کچھ اضافے بھی کئے - لیکن یہ سعادت مرزا نوشہ کے شاگرد کے نصیب میں تھی کہ اس نے ایک غزل ہی نہیں بلکہ شاعری کی دوسری صنفوں (مثلاً مثنوی ، مسدس ، قصاید ، ترکیب بند ، رباعی ، اور قطعات) میں نئے راستے نکالے - نئے امکانات کی نشان دہی کی ، اور آنے والے شاعروں کے لئے ہر صنف میں اچھے نمونے چھوڑے - وہ اردو کی نئی شاعری کا نقیب ہی نہ تھا - بلکہ ایسا معمار اور انجینیر بھی جس نے پرانے مال مسالے سے ایک وسیع اور دل کش عمارت خود کھڑی کی اور مستقبل کے معماروں کیلئے ایسے خاکے ڈال گیا جن کی مدد سے آنے والوں نے اپنے عالیشان محل تعمیر کئے - وہ ایک بڑا شاعر ہی نہیں - ایک بڑا صناع بھی تھا - حالی کی صناعت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور اُس کی شاعری کی صداقت اور معنویت کو محسوس کرانا ، یہی میری خواہش اور میرے اس مختصر مقالے کا بنیادی موضوع ہے -

ہماری زبان کے بہتیرے باکمال شاعروں کی طرح حالی نے بھی ابتدا غزل سے کی اور خوب شعر کہنے لگے ہنگامۂ غدر سے کوئی دو سال پہلے مرزا غالب سے دوچار ہونے کا موقع بھی مل گیا ، جوہر شناس آنکھوں نے جواں سال شاعر کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھانپ لیا - بہت کچھ دل بڑھایا اور پانی پت کے انصاری محلے کے رہنے والے ایک اور شاگرد کی طرح حالی کے شعروں کی بھی مرہم پٹی کرنے لگے - بعد کو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت میں حالی کی شاعرانہ صلاحیتیں اور بھی چمکیں - لیکن مشورہ سخن اور غالب سے عقیدت مندی کا سلسلہ اسی طرح قایم رہا غالب و شیفتہ (ا - متوفی ۱۸۶۹ء - متوفی ۱۸۶۹ء) کی وفات کے کچھ دنوں بعد حالی فکر معاش میں لاہور آئے - قیام لاہور سے ان کی شاعری کا نیا دَور شروع ہوتا ہے - نئے دور کی شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اُس دور کی شاعری کی خصوصیات بیان کر دی جائیں ، جو دہلی کے ایک ٹمٹماتے ہوئے دئے کا ادنیٰ عکس تھا -

جس کی بدولت حالی نے اپنی شاعری کا دیپک راگ الاپا۔

اس دور کا حاصل چند قصائد، مرثیے، اور غزلیں ہیں جو بعد کو ایک امتیازی نشان "ق" کے ساتھ دیوان حالی مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں جدید غزلوں کے ساتھ چھپیں۔ دیوان کے ساتھ ایک بسیط مقدمہ ("مقدمہ شعر و شاعری") بھی چھپا تھا جو بعد کی اشاعتوں میں حذف کرکے الگ چھاپا گیا۔ آج کل کی اشاعتوں میں تو قدیم غزلوں کا امتیازی نشان بھی ناشروں نے غائب کر دیا ہے جس سے قدیم و جدید غزلوں کا بہ آسانی امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے میرے پاس ایسا اڈیشن موجود ہے جس کی بدولت قدیم و جدید غزلوں کے درمیان حدِ فاصل قایم کرنے اور ان کی خصوصیات اور ارتقائی مدارج متعین کرنے میں مجھے سر کھپانا نہیں پڑا۔

اپنے ابتدائی دور کی یادگاریں دو قصائد حالی نے اپنے دیوان میں ہمارے لئے چھوڑے ہیں۔ دونوں کے دونوں نعتیہ ہیں اور ان قصیدہ نما نظموں کی غمازی کرتے ہیں جو اپنی نئی شاعری کے دور شباب میں حالی نے اپنے عہد کی بعض ممتاز شخصیتوں کی تعریف میں صداقت شعارانہ انداز میں لکھے اور عملاً بتایا کہ قصیدے کی صنف اور اس کی زبان کو بھٹی اور مبالغہ آمیز تعریف سے کس طرح پاک کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی دور کے ان قصاید میں ایک قصیدہ وہ ہے جو حالی نے اپنے استاد کی مشہور غزل کی زمین میں (جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

"بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے")

لکھا تھا۔ کم نعتیہ قصیدے اس خاطر نشین اور فطری انداز میں اس سے پہلے لکھے ہوں گے۔ پھر بھی زبان کسی قدر بوجھل ہے اور گو اتنی تیز نہ سہی، لیکن قصیدے کی ہلکی سی گھن گرج رکھتی ہے۔ دوسرا قصیدہ البتہ ہمارے لئے ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اس طرح کہ اس قصیدے کے ساتھ ایک "دیباچہ نوٹ" کے ذریعہ انھوں نے بڑی دلیری اور صاف گوئی کے ساتھ اپنے نفس کی چوری پکڑی ہے اور نہایت بلند دردی کے ساتھ اسے آشکارا کیا ہے۔ اس سے حالی کی صاف گوئی اور صفائے باطنی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک بلند کردار انسان ہی کا حق ہے کہ وہ نفس کی چوری پکڑنے میں اپنے اور پرائے کی تمیز کو روا نہ رکھے۔ اس قصیدے کے چند اشعار دیکھنے سے پہلے ان بصیرت افروز الفاظ کو ملاحظہ کیجئے جو قصیدے کی شان نزول سے متعلق ہیں۔ فرماتے ہیں:- "اس قصیدے کی تمہید ۱۲۸۰ھ یا ۱۲۸۱ھ کے ہذیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن، ذوق، غالب، آزردہ، اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھیں دنوں میں سیتارام بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں۔ جن دوستوں کی جا و بیجا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں، وہ کسی وجہ سے مشاعرے میں نہ آئے۔ خام خیالی کے جوش میں اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ کہ اگر لوگ ہماری

قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منہ سے میاں مٹھو بنتے ہیں۔لیکن جب تفاخر حد سے گزر گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔لہٰذا قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا، تاکہ فخر کے لئے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔

زیر بحث قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔مطابقت کی رُو سے ۱۸۶۳ء یا ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ ہوتا ہے۔اس لحاظ سے یہ قصیدہ گو یا حالی کے لاہور آنے سے کچھ ہی پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے — میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنو اہل عصر میں مجھ کو — میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت — مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
میں نے دیکھی تمیز اہل ہنر — میں نے دیکھا مذاق اہل شعور
ہے غرض ان کو صوت و معنی سے — نالہ دل ہو یا نوائے طیور
اس زمانہ میں وہ غریب ہوں میں — جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور
کون دیکھے میرے چمن کی بہار — مرگیا عندلیب نیشاپور* (ظہوری)
چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد — دل خسرو میں ڈال دوں ناسور
لوں ملائک سے داد حسن کلام — گر لکھوں نعت سرور جمہور
اے ترا پایہ فہم سے برتر — اے ترا نام عرش پر مسطور
میں ترے در پہ سُن کے آیا ہوں — نام تیرا شفیع روز نشور
جا لگے در پہ تیرے کشتیٔ عمر — جب کروں بحر زندگی میں عبور
جیتے جی دل میں یاد ہو تیری — مرتے دم لب پہ ہو تیرا مذکور

مرثیوں میں سے ایک (جو ترکیب بند کے سانچے میں ہے) مرزا غالب کی رحلت کا بے مثل نوحہ، اور حالی کی بے پایاں عقیدت کا چھلکتا ہوا پیمانہ ہے۔درد، خلوص، اور اثرانگیزی کے علاوہ یہ مرثیہ حالی کی نظم گوئی کی خوابیدہ صلاحیتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔اشعار اُس مقام سے دیتا ہوں، جس میں مرزا غالب کے بلند کردار اور اعلیٰ ظرفی کے نقوش بڑی صداقت، اور چابک دستی کے ساتھ کھینچے گئے ہیں۔

بلبل ہند مرگیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج | رند اور مرجع کرام وثقات
لاکھ مضمون۔ اس کا ایک ٹھٹول | سو تکلف، اور اس کی سیدھی بات
اس کے مرنے سے مر گئی دہلی | خواجہ نوشہ تھا، اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اوس کی بزم | یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

شاعری کا کیا حق اُس نے ادا | پر کوئی اس کا حق گذار نہ تھا
بے صلہ مدح و، شعر بے تحسین | سخن اُس کا کسی پہ بار، نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی | سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ | دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے | زہد اُس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست وخراب | ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شان حُسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

۱۸۹۳ء کے مطبوعہ "دیوان حالی" کی رُو سے قدیم وجدید غزلوں کی مجموعی تعداد (۱۱۶) ہے جس میں قدیم غزلیں نسبتاً بہت کم، یعنی صرف (۱۶) ہیں۔ پھر بھی دور اول کے پُر تنوع کلام کے عام تیور، اور ہر صنف میں اسلوب کی پختگی اور روانی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آگے چل کر حالی نئی راہیں نہ بھی تلاش کرتے اور قدیم ڈگر ہی پر رہتے، تو بھی اپنے ہم عصروں میں کسی سے ہیٹے نہ رہتے قدیم غزلوں کی قلیل تعداد سے اس خیال کو بھی تقویت ہوتی ہے کہ حالی نے اس دور کی بہتری غزلوں کو جو جدید رنگ کی غزلوں سے بہت کم میل کھاتی تھیں اپنے دیوان میں شامل نہ کیا ہوگا۔

زیر بحث غزلوں میں تین غزلیں تو وہی ہیں جو اپنے خاص احباب سے خراج تحسین لینے کی نیت سے سیتارام بازار کے مشاعرہ کے لئے حالی نے بڑی محنت اور دعوے کے ساتھ تیار کی تھیں، یہ تینوں غزلیں ردیف "ی" کی شق میں دیوان میں درج ہیں۔ ان کی ردیف ہے "تو نے یہ خبر نہیں کہ نعتیہ قصیدے کا پائین نوٹ لکھنے کے بعد ان غزلوں کی نشان دہی میں چند ایک توضیحی سطور کا اضافہ حالی نے غیر ضروری کیوں سمجھا۔ اس سے پڑھنے والوں کی دلچسپی بڑھ جاتی۔ خیر، جو حالی کسی وجہ سے نہ کر سکے،

میں کر رہا ہوں - میری اس نشان دہی کے بعد ، ان غزلوں کو آپ اپنے طور پر پڑھ سکتے ہیں - یہاں ان کا نقل کرنا باعث طوالت ہوگا -

اس طرح قدیم غزلوں کی تعداد اور بھی گھٹ کر صرف (۱۳) رہ جاتی ہے - اس مختصر سی تعداد پر کوئی سیر حاصل تبصرہ نہ ممکن ہے نہ سودمند - مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے نئے عزائم کے آغاز سے پہلے بھی حالی کی غزلوں میں جدت اوجان صاف جھلکتی ہے - لَے گو عاشقانہ ہے لیکن ابتذال اور غلو سے اجتناب کیا ہے - کہیں کہیں غالب و شیفتہ کے اسلوب کی جھلک بھی صاف نمایاں ہے - (باقی آئندہ)

تیرا جگ دیکھ لیا!

جہاں بانو ایم - اے

بس —— ؟ یا اور بھی کچھ دکھانا ہے ؟ زندگی کی یہی کوفت، یہی جان لیوا یکسانی، ان ہونی باتوں کا دیکھتے دیکھتے ہو جانا - اور پھر چون وچرا کی گنجائش نہیں —— صبح بہت دیر کی ہو چکی تھی - میں سوتے سوتے جو اٹھی تو چاروں طرف سورج کی ضیاء پاس کرنیں بکھری ہوئی تھیں - کچھ خواب میں نے رات دیکھے تھے - ایسے جیسے سچ مچ ہو رہا تھا سب کچھ - کتنی بیکار سی چیز ہے یہ زندگی - اور میری زندگی - تو اُو بھی بدتر - کسی مصرف کی نہیں - اس سنسار میں اب مطلق جی نہیں لگتا - پھیکا پھیکا سا ہے یہ جیون - دنیا میں کتنی ناانصافی ہوتی ہے - کتنی بے ڈھنگی ہے یہ دنیا ساری - کتنوں کے حقوق تلف ہوتے ہیں - کتنے گلوں پر چپکے چپکے ہی چھری پھر جاتی ہے - کتنے آنسو صرف دامن کا دھبہ بن کر رہ جاتے ہیں دنیا نہیں دیکھ سکتی ان آنسوؤں کو جو چپکے چپکے بہتے ہیں - ان میں پہاڑی کا سا سریلا شور نہیں ہے اور نہ آبشاروں کی سی فراوانی و روانی —— یہ رات کی تاریکیوں میں کھو جانے والے انمول موتی —— ان کا انجام —— کتنا حسرت ناک ہوتا ہے بڑی سرد مہر ہو گئی ہوں - طبیعت میں ایک ناگوار سی جلن ہے - ہر ملنے والے سے بدظنی ہو گئی ہے - آخر کب تک یہ بناوٹی خاطرداری ؟ —— ؟ کچھ سوچتے سوچتے سو جانے کا تو مرض ہی ہے - یہ سوچ لاشعوری دماغ پر کچھ عجیب وغریب اثر کرتی ہے - سینکڑوں خیالات دماغ میں چکر لگاتے ہیں - نیند میں چلنے کی ایک بیماری ہے یہاں ہم کو ایسی بیماری ہے کہ ہم نہیں چلتے ہمارا دماغ چلتا رہتا ہے ان سب سوچ بچار کی باتوں کو یہ سمجھیں پتھر جیسی دنیا کیا جانے جس کو صرف مکاری آتی ہے - خلوص جس کے قلب سے کوسوں دور ہے - درد دل کا جس کو پاس ولحاظ نہیں، جس کے نزدیک زندگی صرف ایک ٹھٹول ہے - ایک مذاق ہے - ایک مضحکہ ہے - اور کچھ بھی تو نہیں -

تمام دن کئی افسانے پڑھ ڈالے تھے جنھیں پڑھ کر کتنی کتنی دیر تک سوچتی رہتی تھی کہ کیا حقیقت میں یہ سب ہو سکتا ہے - لیکن یہ بات میرے قیاس سے ذرا دور تھی کہ ہر افسانہ ایک حقیقت ہی کا تو عکس ہوتا ہے کتنی سچی سچی باتیں تھیں - اور پھر لکھنے والے نے ان سب کو افسانوی طرز پر لکھ کر دھوکہ دیا تھا - ایک خود فریب کہیں کا - کتنے جعلساز ہوتے ہیں یہ افسانہ نویس - یہ شاعر - یہ ادیب - زندگی اب کتنی بدل سی گئی تھی -

احساس ہی نہ تھا کسی میں۔ کسی بات کا بھی۔ میں بیمار
ہوئی۔ تو میری بیماری کا مذاق سب کو سوجھا۔ خود بیمار
ہوئے تو ہمدردی کے طالب ہوئے۔ خوب! یہی ہے
تیری دنیا —— ؟ کتنی دورنگی سی چیز۔ نت نئے رنگ
بدلنے والی۔ دیکھ لیا تیرا جگ۔ بس دیکھ لی تیری دنیا۔
اب تو کچھ بھی اچھی نہیں لگتی۔

سوچ کا مرض جب ہو جائے تو نیند کسے
آتی ہے۔ اس بیکاری میں دماغ خیالات سے بوجھل
بنا رہتا تھا۔ کچھ پڑھ کر اس بیکار سے گھنٹوں کا بھولا
جانے، گم کر دینے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن چراغ
سلگنے سے دوسروں کی نیند خراب ہو جاتی تھی ——
یہ دوسروں کا خیال —— یہ بھی تو ایک آفت کی چیز ہے۔
ہم کو ان کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جو ہمارا خیال رکھتے ہیں۔
مؤمن نے سچ ہی تو کہا تھا ؎

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا، صیاد کیا

میکسم گورکی کہتا ہے "انسان کی انسان سے ہمدردی
کرنی کتنی عجیب شئی ہے" —— ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔
جانے کیا سمجھ کر کہہ دیتے ہیں یہ کہنے والے کہ پھر دل سوچ
لگ جاتی ہے۔ ٹالسٹائے کا قول ہے "میں شری سوائی
قسم کے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ بشرطیکہ ان کے دل میں
خلوص ہو" یہ فلسفی زندگی کو جس زاویہ سے دیکھتے
ہیں۔ کاش یہ فن مجھے آجائے۔ جان دے کر بیلوں آسا
توقع کو۔ مگر "یہ کاش" کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔
اور نہ ہو سکے گا۔

یہی سب کچھ دیکھ کر مصلحت آمیز جھوٹ بہت
بولنے لگی ہوں۔ اور دنیا اسی میں خوش ہے۔ سچ کی تلخی
ابھی گوارا نہیں ہوئی کسی کو۔ کڑوی دوا میں شفا
ہوتی ہے۔ مریض —— جو زبان کے ذائقہ کو روتا ہے
اس کا مزہ کیا جانے۔

مجھے تو ہر لحاظ سے غالب پسند ہے۔ اس کی مشکل
پسندی تو سب سے زیادہ میری پسندیدہ چیز ہے۔ کس کس طریقہ سے
زندگی کو سمجھاتا ہے۔ کیسے کیسے انجھر یاد ہیں اس کو۔ یہی
غالب ہے جو کہتا ہے ؎

میں بھی رک رک کے نہ مرتا۔ جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا میرے غمخوار کے پاس

منہ پر رام بغل میں چھری —— یہ ہیں تیری یاد والے۔
سیدھے سیدھے گالی دے دینا۔ برا بھلا کہہ دینا۔ جیسا جو
ویسا ہی اس کو ثابت کر دینا۔ کتنی سچائی اور کتنا خلوص ہے
اس طرز عمل میں —— کاش دنیا جانتی یہ سب۔ کتنی کم
فہم ہے یہ دنیا۔ اور اس پر بڑے بڑے دعوے ہیں۔ ڈینگ
ہے۔ شیخی ہے۔ اور جانے کیا کیا ہے۔

یہی ہے تیری دنیا کی شوبھا۔ یہی ہے تیرے
سنسار کی زینت۔ کتنی مکار حیلہ سازی۔ اف یہ سپنوں
کی دنیا۔ یہ خواب و خیال کے قلعے۔ کتنے منصوبے قسم کے
ہوتے ہیں۔ مگر نتیجہ —— بے ثمر ——!

سوچنے کے مرض سے الجھن بھی ہونے لگتی ہے
جی گھبرانے لگا تو دریچہ سے راستہ کی طرف دیکھنے
لگی۔ دور دور نگاہیں جاکر کھو جاتی تھیں۔ راستے
سنسان سے تھے۔ اکا دکا رہگیر دکھائی دیتا۔ ایک تانگہ

چلی آرہی تھی۔ اس کا بچہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا اس کے کلیجے سے لگا تھا۔ قریب آئی۔ بھوکی تھی۔ چہرہ پر ادا سی بے کیفی —— قلبی ہیجان کا پتہ دے رہی تھی۔ صرف دیکھتی رہی۔ کچھ پوچھا تو جواب نہ ملا —— جوان سی تھی۔ شاید کسی صدمہ نے دماغ مفلوج کر دیا ہو۔ ظاہر تو یہی ہوتا تھا۔ اس کے قلب کی گہرائیوں تک کون پہنچے۔ کس کو فرصت تھی۔ اس کی خاموش نگاہیں تو مجھی سے کچھ سوال کر رہی تھیں۔ میرا سوال اور اس کا جواب دونوں فضا میں تحلیل ہو گئے۔ وہ خود مجسم ایک سوال تھی۔ اس کی خاموشی سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بول ہی نہیں سکتی۔ صدمات انسان کو گونگا بھی کر دیتے ہیں؟ قوت گویائی بھی سلب ہو جاتی ہے۔ چپ سی لگ جاتی ہے؟ مگر کس سے پوچھوں۔ کون بتائے گا یہ سب۔ یہ خود ایک دیوانے کی بڑ ہے۔ اس نوجوان بھکارن کو دیکھ کر میں پھر ایک گہری سوچ میں چلی گئی۔ موت کیوں نہیں آتی ان لوگوں کو —— بھلا ان کی زندگی سے کسی کو فائدہ ہی کیا۔ صرف جوانی ہی تو سب کچھ نہیں۔ جینے کی اور بھی ضرورتیں ہیں۔ مرنے والا تو اس طرح سوتا ہے جس طرح کوئی تھکا ہوا انسان بقول اقبال سے

فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے۔

اور بقول حسرت سے

موت اک فرصت اول ہے جو ہو دل کو نصیب
زندگی کہتے ہیں رہ رہ کے تڑپ جانیکو

غزل

جناب خواجہ عباد اللہ صاحب اختر

مسلم صدپرست ہے ہندو صنم پرست
ناآشنائی معنی ہیں ہم پرست

راہ نیاز پر ہے سراغ خرام ناز
کہتے ہیں اہل سجدہ کو نقش قدم پرست

دنیا و میکدہ کا ہے احوال راز غیب
آگاہ مے فروش ہے یا جام جم پرست

لازم ہے دل ہو واقف آئین کیش عشق
واجب ہے جو ہو حسن کا بندہ ہو غم پرست

تیری کمر سے باندھ کے کھولا ہے راز دہر
کتنا ہے موشگاف خیال عدم پرست

زیبا نہیں ہے حضرت انساں ہو گاؤ خر
بار جہاں اٹھاتا ہے دوش شکم پرست

یہ اور بات ہے کہ سبکسر ہے بے دماغ
ہلکا نہیں ہے پیٹ کا لیکن شکم پرست

ارمان دل کے قلب سے نالہ بلند ہے
ہوتا ہے رزم گاہ میں لشکر علم پرست

ایجاد کوئی اور ہی آزار کیجئے
ہم خوگر ستم ہوئے آخر ستم پرست

دل میں ہے نقش کعبہ و بتخانہ اک خیال
یہ آئینہ ہے صورت دیر و حرم پرست

اختر تیری جبیں پہ ہے حرف "بلیٰ" رقم
یہ لوح ہے "الست" سے نقش قلم پرست

کرنی بھرنی

افسانہ

جناب نیر صاحب امرتسر

شہر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک ویران سا باغ تھا جسے "وحشت باغ" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس میں طرح طرح کے ثمردار درخت تھے۔ مگر مالک کی اچانک موت کے بعد باغ بالکل برباد ہو گیا اور اس میں خاردار جھاڑیاں اور خود رو پودے اس کثرت سے پیدا ہو گئے کہ ان میں گیدڑ۔ لومڑیاں بندر اور کئی قسم کے جنگلی جانور رہنے لگے۔ یہ شاداب خطہ زمین بحیثیت مجموعی بیک وقت باغ بھی تھا اور جنگل بھی جس میں سے اکثر راتوں کو بھیانک اور ڈراؤنی آوازیں آتی رہتی تھیں یہ جنگلی باغ اگرچہ سڑک سے ذرا فاصلہ پر تھا لیکن جانور عام طور پر سڑک کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے اس لئے لوگ ادھر سے بچ بچ کر گزرا کرتے تھے کیونکہ جانور راہگیروں کو بہت دق کیا کرتے تھے اس طرف اکیلے دوکیلے مسافروں کا جانا کام رکھتا تھا۔

اکثر مسافروں کا بیان تھا کہ ان ہولناک آوازوں میں جو راتوں کو دور دور تک سنائی دیتی تھیں ایک دلدوز آواز ایسی بھی ہوتی تھی جو بھیانک ہونے کے باوجود قلب انسانی کے سوز میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جو کوئی اس آواز کو سنتا تھا دل تھام کر بیٹھ جاتا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہاں ایک دیوانہ رہتا ہے جو رات دن چیختا، چلاتا اور روتا ہے مگر کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ جانور اس کی صورت دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں، جب چیخ مارتا ہے تو سارا باغ گونج اٹھتا ہے پھر چاروں طرف سے جانوروں کے چلانے کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور شور محشر برپا ہو جاتا ہے۔

ایک دن شام کے وقت میرا بھی ادھر سے گذر ہوا۔ دیوانہ سڑک کے نزدیک کھڑا تھا۔ گندمی چہرہ۔ لال لال چمکدار آنکھیں، سیاہ گھنی داڑھی، بدن ننگ دھڑنگ، صرف ستر کے لئے اس نے اپنے گرد کیلے کی چھال لپیٹ رکھی تھی، مجھے دیکھ کر وہ قریب آیا۔ میں گھبرا سا گیا، اور جلد جلد قدم اٹھانے لگا۔ اس نے کہا "ڈرو نہیں، میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

میں ٹھہر گیا۔ جب وہ ذرا اور نزدیک آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں وہ وحشت نہ تھی جو دیوانوں کی تپلیوں میں اکثر پائی جاتی ہے۔ چلتے وقت اس کے پاؤں کی آہٹ میں تھاپ بھی نہیں تھی۔ میرے قریب آکر کہنے لگا۔

"تم ڈرے کیوں تھے میں دیوانہ نہیں ہوں!"

میں نے جواب دیا۔

میں نے کب کہا کہ تم دیوانہ ہو۔ دیوانوں کو

تن بدن کا ہوش نہیں رہتا اور نہ ہم کو ستر پوشی کا
خیال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم پر کوئی صدمہ گذرا
ہے اور کوئی بات نہیں۔"

وہ کہنے لگا "تم ٹھیک کہتے ہو"——
اور دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی۔ وہ جلد ہی سنبھل گیا
اور التی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "تم بھی بیٹھ
جاؤ۔ میں ایک کہانی سناتا ہوں، سنو گے؟"

میں نے کہا۔ "ضرور!"

چنانچہ اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کے
لہجے میں اسلوب بیان، فصاحت، تسلسل اور روانی
تھی، وہ واقعی دیوانہ نہیں تھا۔ وہ کہتا جاتا تھا
اور میں نہایت غور سے سن رہا تھا۔

(۱)

"ملاں شرف الدین بڑے نامی بزرگ تھے اور
شہر کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے
نعمت دین کے ساتھ دولت دنیا بھی دے رکھی
تھی، نیک نہاد اور پاک طبینت تھے، اس لئے ہر
شخص ان کی عزت کرتا تھا اور ان کی صحبت میں بیٹھنے
کو سعادت دارین سمجھتا تھا۔ البتہ ان کی سیرت میں
ایک کوتاہی تھی کہ وہ بہت طامع واقع ہوئے تھے
اور انہیں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی
دھن لگی رہتی تھی۔

"خدا جب دینے پر آتا ہے تو اتنا دیتا ہے
کہ انسان سنبھال نہیں سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ عظیم
ملاں صاحب نے اتنا روپیہ کمایا کہ سب کاروبار چھوڑ
کر گھر میں بیٹھ گئے۔ ہرچند قرآن کریم میں پڑھ چکے تھے
کہ "تمہارے مال اور تمہاری اولاد ہی فتنہ ہیں" ہنوز
ایک فتنہ سے فراغت نہیں پائی تھی کہ دوسرے کے
طالب ہوئے۔ جب اپنے جمع کئے ہوئے مال و دولت
کو دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے۔
وہ اس دولت کے لئے کسی وارث کے متلاشی تھے
کیونکہ ابتک ان کے گھر میں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا۔
ان کی بیوی شرف النساء بیگم جب ملاں صاحب
کی یہ کیفیت دیکھتی تو اپنی حالت پر افسوس کرتی
مگر اندر ہی اندر تعویذ گنڈے کراتی۔ مناجاتیں
پڑھتی اور دعائیں مانگتی کہ اے اللہ میری گود بھی
بھری کر دے۔

جب ملاں صاحب فارغ البال ہو کر خانہ نشین
ہوئے تو بیگم کی طرح وہ بھی دعائیں مانگنے لگے صبح
کی نماز کے بعد جب وہ نہایت خوش الحانی کیساتھ
اس شعر کا ورد کرتے۔

"ہے زیبا تجھے کبریا سروری
مری بار کیوں دیر اتنی کری"

تو خود بھی جھوم جھوم جاتے اور در و دیوار پر بھی
کیفیت طاری کر دیتے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ پہلے
ہی سال جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا اور
ایک لڑکی۔ دونوں چندے آفتاب چندے ماہتاب
نکلے۔ ماں باپ نے جمیل اور جمیلہ نام رکھے۔ خوشیاں
منائیں۔ شادیانے بجے اور دعوتیں ہوئیں۔ وقت

گذرتا گیا اور بچے پروان چڑھنا شروع ہوئے۔

(۲)

جمیلہ لڑکی تھی۔ گھر کی چار دیواری میں پڑھی اور بڑھی۔ قرآن کریم حفظ کیا، احادیث پڑھیں اور علم دینیات کے دوسرے شعبوں میں خاطر خواہ ترقی کی۔ اکثر عورتوں کی مجالس میں جاتی، مولود شریف پڑھتی اور وعظ بھی کہتی۔

جمیل لاڈلہ تھا۔ لڑکا جو ہوا۔ ملاں صاحب کا جانشین اور جائداد کا حقیقی وارث۔ ناز و نعمت میں پلا۔ گلی کے لونڈوں میں کھیلا۔ اسکول اور کالج گیا۔ شیکسپیر اور برنارڈ شو کے عشقیہ ڈرامے، رینالڈز اور وکٹر ہیوگو کے رومان انگیز ناول پڑھ کر ایسا بگڑا کہ پھر نہ سنبھل سکا۔ طبیعت میں آوارگی اور مزاج میں عشقبازی اس درجہ سرایت کر گئی کہ تمام محلہ بلکہ شہر بھر میں بدنام ہو گیا۔ راہ چلتی عورتوں سے چھیڑ خانی کرنا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ کالج کے بعد اس کا سارا وقت یا تو کلب گھر میں گذرتا یا بازاروں میں آوارہ گردی کی نذر ہو جاتا۔ جگہ جگہ ذلتیں اٹھاتا مگر اپنی حرکات سے باز نہ آتا تھا۔

ملاں صاحب اس کی شکایتیں سنتے اور لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔

(۳)

اٹھارہ سال گذر گئے۔ اب عنفوان شباب کی منزلیں طے ہونے لگیں۔ لیکن بھائی بہن کے طور طریقے الگ الگ تھے۔ جمیلہ کی عفت و عصمت شعاری، پاکبازی اور دینداری کے چرچے اونچے اونچے گھرانوں میں ہوتے تھے۔ مگر جمیل کی زوالت آخری حدوں تک پہنچ گئی۔ ہر وقت رنگ رلیاں مناتا۔ نشہ میں مخمور اکثر راتوں کو دیر سے گھر آتا اور ایک ہی مکان میں رہنے کے باوجود نہ وہ ملاں صاحب سے ملتا اور نہ ملاں صاحب ہی اس کی صورت دیکھتے۔

جب کوئی دوست جمیل کی نسبت شکایت کرتا تو ملاں صاحب کی پلکیں بھیگ جاتیں۔ خدا کی شان بے نیازی وہی آنکھیں جو کبھی اولاد کے لئے ترستی تھیں آج اولاد ہی کی وجہ سے گریاں تھیں۔ دوست احباب سب جانتے تھے کہ ملاں صاحب جنہوں نے اکثر انسانوں کی زندگیاں سنوار دی تھیں اور کئی بچوں کو تربیت دے کر قابل فخر انسان بنا دیا تھا، اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود جمیل کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کے لئے مجبور ہو گئے۔

کہتے ہیں اولاد کے نیک و بد ہونے کی ذمہ داری والدین پر ہوتی ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہوتا تو پسر نوح غرق طوفان نہ ہوتا۔ بفرض محال اگر اس امر کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس کی حقیقت یوں تھی۔

جنسی نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ باپ کو بیٹے کی نسبت بیٹی سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور ماں کو بیٹی کی نسبت بیٹے سے زیادہ۔ یہی وجہ تھی کہ ملاں صاحب جمیلہ سے زیادہ مانوس تھے اور اس کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص خیال رکھتے تھے اس لئے جمیلہ بالکل ملائی جبلیت و سیرت کی مالک تھی۔

جمیل شروع ہی سے ضدی اور بے پروا تھا۔ اس پر ماں کی محبت مستزاد تھی۔ جب کبھی اس سے کوئی غلطی ہوتی یا سبق یاد کرنے میں اس نے کوتاہی کی اور ملاں صاحب نے ڈانٹا تو بیگم کی ناجائز طرف داری نے نہ صرف ملاں صاحب کے غصہ کو ٹھنڈا کیا بلکہ بیٹے نے شہ پاکر اور بھی مچلنا شروع کر دیا۔ عورت ماں ہو یا بیوی، وہ صرف محبت کرنا جانتی ہے وہ نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی محبت اندھی ہوتی ہے۔ جمیل کو ماں کی محبت نے بگاڑا۔ جھوٹ، مکر، فریب، دغا بازی، جوا، شراب، آوارگی، غرض سب کچھ اسی بے جا محبت اور طرفداری کا نتیجہ تھا۔

مرد باپ ہو یا خاوند، وہ اگر ایک ہاتھ سے پیار کرتا ہے تو ضرورت کے وقت دوسرے سے دھپڑ بھی رسید کر دیتا ہے۔ لیکن صنف نازک میں یہ خوبی نہیں ہوتی۔ دنیا میں جتنے تباہ ہوتے ہیں وہ فقط ماں کی اندھی محبت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

ماں کی گود تربیت کا گہوارہ ہوتی ہے لیکن ماں اگر بچے کو برے کاموں سے روکنے کی بجائے پناہ دے تو یہی گود پھانسی کا تختہ یا تابوت بن جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ جمیلہ ملاں صاحب کی بیوی اور جمیل بیگم کا لاڈلا بیٹا تھا۔

(۴)

ایک دن جمیل کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ دن بھر گھر میں پڑا رہا۔ شام کے وقت کاب چلا گیا لیکن اس کا دل وہاں بھی نہ بہلا۔ اس لئے جلد لوٹ آیا راستہ میں بائیسکل خراب ہو گئی ایک دوکان پر مرمت کرانے کے لئے ٹھیر گیا پاس سے ایک برقعہ پوش عورت گزری جمیل اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دور جاکر پہلو بہ پہلو چلنے لگا اور اپنی دیرینہ عادت سے مجبور ہو کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

"کہاں جا ئیں گی آپ؟" اس نے سوال کیا عورت کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا۔ وہ گھبرا کر ایک طرف ہو گئی مگر جمیل نے پیچھا نہ چھوڑا اور کہنے لگا۔

"دیکھو! میں کتنی دور نکل آیا۔ تم بولتی بھی نہیں کیا یونہی مار ڈالو گی؟"

عورت نے قدم اور تیز کر دیئے۔

جمیل نے آگے بڑھ کر کہا

"او ہو! تم تو کوئی پری معلوم ہوتی ہو جو اس برق رفتاری سے چلی جا رہی ہو"

عورت بالکل خاموش تھی۔ مگر اس کی رفتار کی لغزشیں بتا رہی تھیں کہ وہ روحانی کرب و اضطراب میں مبتلا ہے۔ اب اس کے قدم سست پڑ گئے۔ جمیل سمجھا کہ اس کا جادو چل گیا۔ وہ بالکل نزدیک آکر بولا۔

"ذرا اور آہستہ چلو!"

عورت کے قدم پھر تیز تیز اٹھنے لگے۔

جمیل نے پھر کہا

تم کو اتنی جلدی کیا ہے؟

ادھر سے تیز رفتاری اور خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ تھوڑی دور جاکر ایک موڑ آتا

جو ایک گلی کی طرف جاتا تھا۔ عورت جلدی سے اس گلی کی طرف مڑی جو اتفاق سے اس وقت بے رونق تھی۔ جمیل بھی پیچھے چلا۔ موڑ سے دو ہی قدم کے فاصلہ پر جاکر عورت نے منہ پھیر کر برقعہ کی نقاب اُلٹ دی اور سہم کر بولی۔

"بھائی جان . . . . "

یہ جمیلہ کی آواز تھی۔

جمیل پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یا یہ آں شورا شوری یا یہ ایں بے نمکی۔ زبان گنگ۔ گردن خم۔ بدن عرق انفعال میں تر بتر۔ اس پر سکتہ کا سا عالم طاری ہوگیا۔ قریب تھا کہ گر پڑے۔ مگر سنبھلا۔ نگاہ اوپر اٹھائی۔ جمیلہ جا چکی تھی۔

گلی سے نکلا۔ بازار میں آیا۔ بازار سے نکلا شہر کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر نہایت تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا گھوڑا گاڑی، ٹانگے۔ موٹر، بائیسکل وغیرہ کسی کی آواز نہیں سنتا تھا۔ ڈرائیور یا سوار خود بچ بچا کر نکل جاتے تھے مگر جمیل تھا کہ عین سڑک کے درمیان چلا جا رہا تھا۔ شہر سے دور بہت دور نکل گیا۔ پسینہ آیا تو کوٹ اتار کر پھینک دیا اور تلخی محسوس ہوئی تو قمیص کا گریبان چاک کر ڈالا۔ پاؤں بوجھل معلوم ہوئے۔ بوٹ اتار دیا۔ مگر چلتا رہا۔ سورج غروب ہوگیا اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

دیوانے نے کہا،

"سُنتے ہونا"

میں نے جواب دیا۔

"ہاں! ہاں!! بھائی سُن رہا ہوں۔ بڑی دلچسپ مگر افسوس ناک کہانی ہے"

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہی وقت تھا جب کچھ مہینے پہلے جمیل اس ویران باغ میں داخل ہوا۔ اور یہی . . . . . یہی دیوانہ وہ جمیل ہے"

یہ کہہ کر اس نے ایک دردناک چیخ ماری اور کھڑا ہوگیا۔ اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ پھر میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا، اور آہستہ سے میرے کان میں کہنے لگا۔

"تمہارے سوائے اس راز کو کوئی نہیں جانتا"

میں نے کہا۔

"ایک شریف گھرانے کی آبرو کا سوال ہے۔ یہ راز ہی رہے گا"

اس نے پھر ایک چیخ ماری اور کہا

"میرا باپ شریف، میری ماں شریف، میری بہن شریف۔ مگر میں پاجی! پاجی!! پاجی!! کاش میں ہر عورت کو جمیلہ سمجھتا"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا سر قریب کے سنگ میل پر دے مارا آناً فاناً میں اس کا جسم لہولہان ہوگیا دو ایک بار تڑپا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔

میں ملاں شرف الدین کو جانتا تھا، ان کے بیٹے کی

گم گشتگی کا حال بھی سُن چکا تھا وہاں سے سیدھا اپنے مکان پر آیا تاکہ اس سانحۂ فاجعہ کی خبر کردوں مگر یہاں آکر دیکھا تو اور ہی قیامت برپا ہو رہی تھی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ملاں صاحب کی اکلوتی صاحبزادی کئی ماہ تک بعارضہ بخار بیمار رہ کر آج ہی شام کے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی ہے۔

جمیل کو ماں باپ پہلے ہی رو چکے تھے اس لئے میں نے اس کی موت کی خبر دینے میں لیت و لعل نہ کی اور ملاں صاحب سے کہہ دیا کہ ان کا بیٹا باغ کے قریب سڑک کے کنارے مردہ پڑا ہے۔

دوسرے دن بھائی بہن کی لاشیں ایک ہی وقت قبروں میں اتاری گئیں۔ جڑواں بچے تھے ایک ہی دن پیدا ہوئے ایک ہی وقت مرے اور ساتھ ساتھ دفن ہوئے۔

ملاں صاحب سب مال و متاع مقامی انجمنوں کے نام وقف کرکے بیگم کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لئے چلے گئے۔ ان کی نسبت پھر کسی سے کچھ نہیں سنا گیا۔ شاید پیوندِ خاکِ حجاز ہو گئے۔

نوٹ:- بہت جلد وہ زمانہ آنیوالا ہے جب کہ اردو وہ اردو نہ رہے گی جس کو حقیقی معنی میں اردو کہنا چاہیئے فارسی اور عربی کے مروجہ اور مستعملہ الفاظ سے نفرت اس لئے ہے کہ وہ خود ان کو نہیں سمجھتے ہندی کے نامانوس الفاظ موقع بے موقع استعمال کئے جاتے ہیں اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو دوسروں سے معلوم کریں گے لیکن فارسی عربی کے الفاظ اس قابل نہیں سمجھے جاتے کہ ان کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ ہر ایک نئی تالیف یا تصنیف فسانہ ہے یا ڈراما یا مزاحیہ مضامین یا مختصر کہانیاں، ان کے بھی عجیب عجیب نام رکھے جاتے ہیں حال ہی میں رہبر دکن میں بعض جدید تصانیف پر ریویو ہوا ہے اس میں ایک کتاب کا نام مسکراتے آنسو ہے۔ کہتے ہیں کہ نام کے کوئی معنی نہیں ہوتے اس لئے تجدد کا تقاضا ہے کہ کوئی بات ایسی کی جائے جس میں جدت ہو اس لئے سرخ سویرا۔ لہو ترنگ۔ مسکراتے آنسو تصانیف کے نام ہیں جس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کس پایہ کے شاعر یا ادیب ہیں۔ اس قسم کی جدید تصانیف میری نظر سے نہیں گزریں۔ چند ماہ قبل ایک بڑے پروفیسر کی تصنیف محض مصنف کی اعلیٰ قابلیت کے مدنظر خریدی جس موضوع پر کتاب لکھی گئی وہ بلاشبہ قابل صد آفریں ہے مگر افسوس ہے زبان اردو کے اعتبار سے نہایت ناقص ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت مدرسہ کے طالب علم کی ہے بات یہ ہے کہ آج کل کوئی ادب کے طرف مائل نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اردو ہی میری مادری زبان ہے اس کو سیکھنا ہی کیا ہے علم ادب اور علم معنی صرف نام ہی نام ہے جو فی زمانہ بیکار آمد نہیں؛

عطارد

یاد

افسانہ

انجم

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

موسم سرما کی تعطیلات میں، ہوسٹل سے میں گھر آگیا - دھندلی شام تھی اور مطالعہ میں جی نہ لگتا تھا میں یونہی باغ میں ٹہلنے لگا - ٹھنڈی ٹھنڈی سرد ہوا چل رہی تھی - پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دماغ کو فرحت پہنچا رہی تھی - اور ننھی منی ثریا ہر فکر و غم سے آزاد تتلیوں کے پیچھے بھاگی بھاگی پھر رہی تھی میرے خیالات بھی ماضی کی طرف گھوم گئے - چند خوش گوار لمحات کی یاد نے ہلچل مچادی - مالن نے پھولوں کا گندھا گجرا ثریا کو دیا - اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر خوش خوش لے کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی - اور کہنے لگی "بھائی جان! یہ پھول ذرا ہمارے بالوں میں لگا دیجئے نا" میں نے ان الفاظ کو سنا - لیکن اس کی خواہش پوری کرنے کی مجھ میں سکت نہ تھی - اس بات نے اور زیادہ ماضی کو روشن کر دیا -

ایک دن اسی باغ میں، اسی جگہ میں نے سنجیدہ کے بالوں میں پھول لگائے تھے - اس نے فوراً نکال دئے - میں نے وجہ دریافت کی تو کہا تھا "شاید تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ عورت اور پھول میں کیا رشتہ ہے تازہ پھول سے ہم سنگھار کا کام لیتے ہیں مگر جب یہ مرجھا جاتے ہیں تو اٹھا کر پرے پھینک دیتے ہیں - کیونکہ ان کا حسن کھو جاتا ہے - یہ صرف کچرا ہو کر رہ جاتے ہیں - یہی برتاؤ عورت کے ساتھ بھی ہوتا رہتا ہے - اسی لئے تو شاید میں بالوں میں پھول سجاتے ڈرتی ہوں - تاکہ پھر انہیں نکال پھینکنے کی نوبت نہ آئے - البتہ یہ پتوں کی آڑ میں مسکراتا رہے تو میں اسے دیکھ دیکھ خوش ہوتی ہوں - تم ہی خیال کرو نا میں ان گونگے پیا میوں کے پیام کو سمجھ کر بھی کیسے انجان بن سکوں گی پھول اور عورت ایک ہی تو ہیں"

سنجیدہ جیسی لڑکی آج میرے پاس نہیں رواج کی پابندیوں نے ہم کو مجبور کر دیا کہ ایک دوسرے سے علحٰدہ ہو جائیں - ہمارے خوابوں کی تعبیر اس دنیا میں ناممکن ہی ہے - ہم خواہ اپنے خیال اور اعمال میں کتنی ہی بے لوثی پیدا کریں - دنیا کی ناپاک نگاہیں ایسے پاکیزہ نہیں رہنے دیتیں - "ابن عم" اور "بنت عم" معلوم نہیں کیوں دنیا کی نگاہ میں افسانوی کردار بن کے رہ گئے ہیں - سنجیدہ بھی میری چچا زاد بہن تھی - ہم دونوں نے اکٹھے مل کر ہی بچپن کو لڑکپن میں بدلا تھا - ہمارے خیالات میں بلا کی یکسانیت تھی -

جوں جوں دن گذرتے گئے کوئی انوکھا بندھن ہمیں
ایک دوسرے سے باندھتا رہا۔ کبھی خیال بھی نہ گذرا
تھا کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ کبھی
کبھی کچھ امکان معلوم بھی ہوتا تو ہم خدا کی بارگاہ
میں سر جھکا کر کہتے "معبود ہمیں جدا نہ کرنا"
ہماری قسمت ہماری خواہش کی تابع تو نہیں
اور کھوٹی قسمت کو بھلا کس نے سنوارا ہے۔ ہمارے
خواب پھیکے پڑ گئے۔ امیدیں نقش بر آب ثابت ہوئیں
ایک دن سنجیدہ چلی گئی اور میں تنہا رہ گیا۔ وہ جدائی
کی گھڑیاں بھی کتنی کٹھن تھیں۔ جب سنجیدہ نے اپنے
اُبلتے آنسوؤں کو روک کر میری زندگی کی بھیک مانگی
تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کبھی بھی زندگی
سے بیزار نہ رہوں گا۔ میری خوشی سے اس کی زندگی
بنی رہے گی۔ میں نے ایک شرط پر اس کی بات مان لی تھی
کہ وہ خوش رہے اور سکھی۔ تو میں بھی چین سے رہوں گا
بے وقوف تھے ہم دونوں جو ایک دوسرے کو سزا دے
رہے تھے کہ دل کی آگ کو مسکراہٹوں سے بھڑکاتے رہو۔
اپنی ناکام زندگی کی گذشتہ ناکامیوں کو فراموش کر کے
میدان عمل میں انسان ہر بار ایک نئی بازی لگاتا ہے
صرف اسی امید پر کہ شاید کبھی پانسہ سیدھا پڑ جائے
مگر میرا دل نئی بازی لگانے کی طرف مائل نہیں ہوتا
میں نے ہار کر بھی بہت کچھ جیت لیا۔ سنجیدہ چلی گئی
تو کیا ہوا۔ اس کی روح تو سدا میرے ساتھ رہتی ہے
اب بھی میرے دل کے ستار پر صرف اسی کی یاد گیت
چھیڑتی ہے۔ اب بھی صرف اسی کی آنسوؤں سے

تر آنکھیں میری آنکھوں میں بسی ہیں اور اکثر چونک
چونک کر میں انہیں نرم قدموں کی آہٹ کو محسوس کرتا
رہتا ہوں۔ جنت سے چرائی ہوئی انھیں چند گھڑیوں
کی یاد مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میری مایوسی
میں صرف ایک ہی خیال ڈھارس بندھاتا ہے۔ میں
سنجیدہ کی حالت پر غور کرتا ہوں۔ کس خوبی سے اپنا
دل خون کر کے اس نے اپنے سہاگ کی کھیتی سینچی ہے
اس کے دل کی بات تو وہی جانتی ہے یا پھر خدا جانتا
ہے۔ ایک سال کے اتنے طویل عرصہ میں میں نے اُسے
صرف ایک ہی دفعہ دیکھا تھا۔ بات بات پر ہنس دیتی ہے
مگر تاڑنے والی نظر تاڑ ہی لیتی ہے کہ قہقہے کتنے کھوکھلے ہیں۔
سنجیدہ سے کیا ہوا وعدہ میری آنکھوں میں
قابل احترام ہے۔ میں کتابوں میں گم ہوں۔ ان سے
کبھی بیزار نہیں ہوتا۔ میرا دل تو کبھی کا مر چکا۔ زندگی
کی بہاریں کب کی خزاں بن گئیں۔
معلوم نہیں اس یاد کی وادی میں کہاں کہاں
بھٹکتا رہا۔ مجھے ثریا کا خیال ہی نہ رہا۔ اس نے مجھے
جھنجھوڑ کر کہا "بھائی جان! ہم کب سے کھڑے ہیں کہ
ذرا پھول ہمارے بالوں میں لگا دیجئے۔ مگر آپ تو
سنتے ہی نہیں۔ میں خوابوں کی دنیا سے زمین پر اتر
آیا۔" ہاں ثریا بی بی، جاؤ۔ میں نے سنا تھا لیکن
جی اچھا نہیں اپنی آپا سے پھول لگوا لینا۔ مجھے تو آتا
بھی نہیں۔
بچی معصوم وانجان بھی سر جھکائے چلی گئی۔ وہ
کیا جانے اس کے بھائی کے جی کو کس نے خراب کیا میری

آنکھیں ابھر آئیں اور موتی ٹپکنے لگے مگر ان موتیوں کو
چننے والی خود بھی موتی برسا رہی ہو گی۔ میری ہی طرح
چپکے چپکے اکیلے میں ـــ آنسو ڈھل ڈھل کر گھاس
میں جذب ہوتے رہے اس کی سبزی نے ان کی آگ کو پی
لیا۔ ثریا اسی گھاس کو روندتی ہوئی ڈگمگاتے قدموں
سے چلی گئی۔ اپنے دل کے داغ دھوؤں کا اور روں کا خیال
کر دل ـــ اسے دوبارہ آواز دینے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

میں نام نہاد ترقی یافتہ اردو علم ادب
پر کچھ لکھوں بسر و چشم، لیکن بات یہ ہے کہ اب مغربیت
نوجوانوں پر اس حد تک چھا چکی ہے کہ وہ اپنی قومی
روایات اور زبان کو بھلا چکے ہیں۔ ان کی ہر ایک بات
میں مغربیت کی جھلک نمایاں ہے اور وہ وقت دور نہیں
جب وہ سرے سے اردو ہی کو خیرباد کہیں گے شاعر کے
لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے قادر الکلام ہو اور یہی
وہ بات ہے جو آج کل کے نوجوان شعرا میں نظر نہیں آتی
اس لئے وہ قافیہ اور ردیف کی پابندی گوارا نہیں کرتے
مناسب ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو ممکن ہے کہ
کسی وقت ردِ عمل شروع ہو، البتہ آپ اپنا فرض ادا
کرتے رہیں اور اس کے لئے حضرت عطارد کی تنقید
بہت مفید ہے۔ اب کے شہاب میں اس کی کمی محسوس
کی۔

خواجہ عباد اللہ (شملہ)

غزل کے دشمن

جناب محمد حبیب اللہ صاحب فاپی۔ ڈی پچ

آج کے لوگ میں جتنے وہ ہیں کل کے دشمن
نظم گو جتنے ہیں وہ سب ہیں غزل کے دشمن
بند کوزے میں ہے دریا وہ ہے اعجاز غزل
دیکھ لے نظم کے کوچے سے نکل کے دشمن
نظم ہو یا ہو غزل صنف سخن ہیں دونوں
ان منازل سے گزر جا تو سنبھل کے دشمن
قافیہ اور ردیف ان سے فزوں حسن کلام
اصل پرزے ہیں یہی شعر کی کل کے دشمن
نظم کیا ہے فقط الفاظ کا ہے اک طومار
تو نے کیا خاک کیا رنگ بدل کے دشمن
استعارہ ہے نیا اور نہ تشبیہ نئی
ساری بکواس ہے بے سود عمل کے دشمن
جاذب گوش و نظر نظم کا عنواں دیکھا
اس نمائش پہ ہیں مغرور غزل کے دشمن
بندشیں الجھی ہوئی معنی و مطلب مفقود
(!) معائب پہ نظر کر تو سنبھل کے دشمن
نظم دلکش ہے غزل سے کہیں دلکش بھی ہوئے
نغمہ بے ساز سے آوازے دہل کے دشمن
عرصہ نظم کی وسعت کا وفا ہے خواہاں
خلل انداز ہیں کیوں اس میں غزل کے دشمن

نقد و نظر پر ایک نظر

یکے از ناظر

رسالہ شہاب میں ہر مہینہ کسی نہ کسی شاعر کے کلام کی نقد و نظر سے تواضع ہوتی ہے ۔ چنانچہ ماہ آبان کے پرچہ میں ماہر القادری صاحب کے چند اشعار تنقید کی زد میں آئے ہیں ۔ ایک شعر میں لفظ "ارے" کے استعمال پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ لفظ ندا ہے جو تحقیر کے موقع پر بولا جاتا ہے لیکن شعر میں اس کے منادی کا پتہ نہیں یہاں یہ لفظ حیرت و تعجب کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے جیسا کہ کوئی اچانک واقعہ پیش آنے پر بے اختیار یہ لفظ منہ سے نکل جاتا ہے جس کا ذکر خود صاحب مضمون نے کیا ہے لیکن آگے چل کر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ لغت میں ضمیر تنکیر کا استعمال ناجائز ہے ۔ جب نظم حمد میں ہے تو نعت کا حوالہ دے کر اعتراض زبردستی ہے ۔

میکدہ بردوش کی ترکیب پر بھی اعتراض کیا گیا ہے لیکن بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی ۔ آپ اس شعر کی نسبت کیا فرماتے ہیں ؎

ایک وہ بھی ہیں کہ ساقی کی بدولت سر پر
سارے میخانہ کا میخانہ لئے پھرتے ہیں

روپوش کے قانونی معنی کا حوالہ دے کر اس کے استعمال کو ممدوح کی تحقیر قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ قانون میں اگر کوئی لفظ کسی خاص مفہوم کو ادا کرتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عام تحریروں میں بھی اس کا وہی مطلب لیا جائے ۔

رب جلیل کو مرہون نوازش جو کہا گیا اس پر بھی آپ کو اعتراض ہے ۔ اس کو آپ بے ادبی خیال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ۔ ع

گر فرق مراتب نکنی زندیقی

لیکن آپ یہ بھی تعلیم دیتے ہیں کہ باخدا مستی کن ۔

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہاں بحث نظم کی شاعرانہ حیثیت سے ہے یا کوئی مذہبی مسئلہ حل کیا جا رہا ہے کہ کہیں فرق مراتب کا ذکر ہے تو کہیں مستی کی تعلیم ہے ۔ اکثر اعتراضات محض برائے اعتراض ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جناب عطارد صاحب کو زمانہ حال کے شعراء کے کلام میں نقص ہی نقص نظر آتا ہے جس کی آپ اصلاح پر مائل ہیں ۔

شہاب کے ایک عنایت فرما جو باہر کے رہنے والے ہیں حضرت عطارد کے تنقیدی مضامین میں کوئی حقیقت نہیں پاتے اور اس کو "تنقید عالیہ" سے موسوم فرماتے ہیں نجی خطوط میں خامہ فرسائی کے بجائے شہاب کے صفحات کو ترجیح دیں تو آپ کے اعتراضات اور حضرت عطارد کے جوابات ادبی ذوق میں اضافہ کرنے والے ثابت ہوں گے ۔

شادی

شادی سے پیشتر دلہا اور دلہن کے باہمی
تعلقات یا ان دونوں کی جان پہچان کے متعلق حالات
جنھیں انگریزی میں کورٹ شپ کا نام دیا جاتا ہے
مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔

سپین۔ میں کسی نوجوان کو شادی سے پہلے اس کی
منگیتر سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ البتہ سگائی کے
دوران میں وہ چھپ چھپا کر اسے دیکھ سکتا ہے اور
چاہے تو خطوط وغیرہ بھی لکھ سکتا ہے۔ یعنی سگائی کے ایام
میں دونوں کے درمیان خط وکتابت کی اجازت ہے مگر ملنے
جلنے کی اجازت نہیں

امریکہ میں شادی سے پیشتر ہونے والے دولہا
اور دلہن کو ہر قسم کی آزادی ہوتی ہے وہ جہاں چاہیں
ساتھ چلیں، پھریں، کھیلیں، کودیں اور موج اڑائیں
ان کی باہمی کشش ان کو جو کچھ بھی کرنے کی انگیخت کرے
بغیر کسی قسم کی جھجک کے کریں۔

روس اور سکینڈے نیویا کے بعض حصوں
میں ہونیوالے خاوند بیوی کا ننگے تالاب یا ندی میں
نہانا معیوب خیال نہیں کیا جاتا بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے
کہ اس سے دونوں کی محبت بڑھے گی۔ انگلستان کے بعض
شتوں میں بھی فیشن ایبل مردوں اور
رواج پایا جاتا ہے۔

خواجہ عباد اللہ

فرانس میں عام طور پر شادی بیاہ کے معاملات میں
بہت کچھ احتیاط برتی جاتی ہے۔ اس ملک کے ایک
صوبہ برٹنی میں یہ رواج ہے کہ جب کسی نوجوان کی آنکھ
محفل رقص وسرود میں یا کسی اور جگہ کسی لڑکی کی آنکھ سے
لڑ جاتی ہے اور وہ اس سے شادی کرنے کا خواہشمند ہوتا
ہے تو وہ اس سے اس کی چھتری اٹھا کر چلنے کی اجازت
طلب کرتا ہے۔ اگر وہ لڑکی اسے اپنی چھتری اٹھانے کی اجازت
دے دیتی ہے تو پھر وہ اس کے ساتھ اس کے والدین کے
گھر پہنچتا ہے اور وہاں بھی کھانا کھاتا ہے اور سگائی
کی رسم ادا ہو جاتی ہے۔ اس صوبہ میں انتخاب کا حق
صرف لڑکی کو ہی ہوتا ہے وہ ہی اپنے ہونے والے
خاوند کے اوصاف خاندانی حالات اور دیگر تمام امور کے
متعلق معلومات حاصل کرتی ہے۔ اور وہی آخری فیصلہ
کرنے کی مجاز ہے۔

اگرچہ ہر جگہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ شادی
دوشیزہ سے ہی کی جائے۔ مگر اب بہت سے ملکوں میں
اس قاعدہ کلیہ کو کسی قدر نرم کیا جا رہا ہے۔ لیکن
جہاں تک مہذب دنیا کا تعلق ہے۔ یہ قاعدہ ابھی تک
تسلیم کیا جاتا ہے غیر مہذب ممالک کے قدیم باشندوں میں
اس سلسلہ میں مختلف رواج پائے جاتے ہیں۔ شمالی افریقہ

کا ایک قبیلہ اولڈ نیل ہے جس کی عورتیں تمام افریقہ میں خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں۔ اس قبیلہ میں یہ رواج ہے کہ دولہا یہ توقع کرتا ہے کہ دولہن اپنے ساتھ خود حاصل کردہ بہت سا جہیز لائے۔ اس کے لئے عورت کو ناچ کر یا اور جس طریقہ سے ہو سکے دھن کمانا پڑتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں بعض قبیلوں میں شادی سے پہلے عورتوں کا دوشیزہ رہنا ضروری خیال نہیں کیا جاتا مگر ایسے قبیلے بھی موجود ہیں جن میں عورتوں کے لئے بدکاری کی سزا موت ہے۔ سکینڈے نیویا میں جہاں عورتوں کی بڑی قدر ومنزلت کی جاتی ہے۔ شادی صرف دوشیزہ لڑکیوں کی ہی ہو سکتی ہے جو لڑکیاں کنواری رہتی ہوئی بدکار ہو جائیں۔ ان کے لئے سہاگ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ جرمنی کے دیہات میں بھی یہی رواج ہے۔ بیوہ اور بدکار عورتوں کے لئے شادی کا تاج سر پر رکھنا ممنوع ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں کورٹ شپ کی سہولتیں بھی مختلف ہیں۔ برما میں کوئی نوجوان اپنی منگیتر سے نو بجے رات سے قبل کسی وقت نہیں مل سکتا۔ اسے اپنی ہونیوالی بیوی سے تنہائی میں ملنے کی اجازت تو ہوتی ہے۔ مگر لڑکی کے والدین ہر وقت نزدیک ہی رہتے ہیں عام طور پر کمرے کے درمیان ایک پردہ سا لگا رہتا ہے۔ اگر پردے کے ایک طرف دونوں منگیتر بیٹھتے ہیں تو دوسری طرف لڑکی کے والدین موجود ہوتے ہیں کسی اور مقام پر اکیلے کسی لڑکی کا اپنے منگیتر سے ملنا بالکل بند ہے حالانکہ انگلستان اور دوسرے یوروپین ممالک میں ہونیوالے خاوند بیوی کو آزادی دیدی جاتی ہے جس سے لڑکیوں کا کیرکٹر لازمی طور پر تباہ ہو جاتا ہے جزیرہ سلیمان میں بہت چھوٹی عمر میں بچوں کی منگنی ہو جاتی ہے لڑکے کے ماں باپ لڑکی کے والدین کو کچھ رقم ادا کر دیتے ہیں اس کے بعد لڑکی کو اپنے ہونیوالے سسرال کے گھر بھیجدیا جاتا ہے وہ وہاں جتنا عرصہ چاہے رہ سکتی ہے مطلب یہ ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی کی ایک دوسرے سے اچھی طرح جان پہچان ہو جائے۔ ایک اور جزیرہ ملیٹا میں یہ رواج ہے کہ جب ایک چھوٹی سی لڑکی کو اوس کے والدین سے شادی کے لئے خرید لیا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے سسرال کے گھر جا رہتی ہے۔ وہاں ہی اس کی پرورش ہوتی ہے۔ بسا اوقات ہونے والے خاوند بیوی بھائی بہنوں کی طرح رہتے ہیں۔ مگر جب بڑے ہو کر ان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیوی خاوند ہیں۔ تب ان کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔

اگرچہ آج کل تو نہیں مگر کوئی وقت تھا جب رومانیہ میں قابل شادی کنواری لڑکیوں کی منڈیاں لگا کرتی تھیں۔ ۲۹ رجون کو (یہ دن اس ملک میں تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے) شہر گاؤں کی تمام نوجوان لڑکیاں ایک اونچی پہاڑی پر جمع ہوتی تھیں ہر ایک کے جہیز کا نوٹس بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا اس نوٹس اور حضرت عطارد کے جوابات نوجوان اپنے والدین کے ہمراہ ہونے والے ثابت ہوں گے۔

چن لیتے تھے۔ چاہے اس سے پہلے ان میں سے کسی نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ ہو۔ البانیہ میں بھی کورٹ شپ کا تقریباً یہی طریقہ ہے۔ عیسائیوں میں بھی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ منگیتروں کی شادی اس وقت تک نہیں ہونے پاتی جب تک کہ عورت کے بچہ پیدا نہ ہو جائے کیونکہ شادی کا مقصد افزائش نسل ہی سمجھا جاتا ہے جس عورت کے سگائی کے دوران میں نرینہ اولاد پیدا نہ ہو، اس کی شادی کی رسوم سرانجام نہیں پا سکتیں یہی رواج مغربی افریقہ کے یہبی قبیلہ میں ہے۔ یقدو نیہ میں بھی کنواری لڑکیوں کی منڈی لگتی ہے فصل اٹھنے کے بعد تمام لڑکیاں ایک محفل رقص میں جمع ہوتی ہیں اور نوجوان لڑکے آکر اپنی دلہن منتخب کرتے ہیں اور اس کے بعد سگائی کی رسم ادا ہوتی ہے۔

اسٹریلیا کے ایک قدیم قبیلہ انائی میں ایک عجیب غریب رواج ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی نوجوان ایک ایسی لڑکی سے ملتا ہے جو اسے پسند آ جاتی ہے تو وہ اسے ایک خاص نام سے پکار کر بلاتا ہے جس پر وہ بھی اگر ایک مقررہ لفظ سے جواب دے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اسے پسند ہے۔ چنانچہ اس کے بعد چند ایک سوال وجواب ہوتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ منگنی قرار پا گئی بعض اوقات جب کوئی نوجوان شرمیلا واقع ہونے کی وجہ سے کسی لڑکی کو بلانے کی جراءت نہ کرے تو لڑکی اسے گالیاں دیتی ہے اور اس وقت تک دیئے جاتی ہے جب تک لڑکا طیش میں آکر جواب اسے نہیں دیتا۔ اس کے بعد دونوں غیظ وغضب میں آکر لکڑیاں بھی اٹھا لیتے ہیں اور لڑ پڑتے ہیں بعض اوقات سر بھی کھل جاتے ہیں اور اس طرح دونوں کی منگنی طے پاتی ہے وا ثنا میں کسی وقت آزمائشی شادیاں ہوا کرتی تھیں بعض اوقات چھ ماہ تک نوجوان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے رہتے اور اس عرصہ میں جب دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہو جاتے تو ان کی شادی کی رسم ادا کی جاتی۔ ورنہ نہیں۔ نیوگنی میں بھی شادی کا یہی رواج تھا۔ وہاں دولہا اور دلہن شادی سے ایک رات پیشتر اکٹھے بسر کرتے۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کر لیتے تو ان کی شادی ہو جاتی ورنہ نہیں اور پھر وہ دوسرے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ اسی طرح راتیں گذار کر تجربات کرتے تا آنکہ ان کو اپنے حسب منشاء خاوند بیوی نہ مل جاتے۔ جاپان میں شادی کرانے کے لئے خاص آدمی یعنی پروہت وغیرہ ہیں۔ اس کے گھر ہونے والے دولہا دلہن چائے پر مدعو ہوتے ہیں اور دلہن چائے بنا کر پلاتی ہے۔ کریلیا میں ایک قوم نن نام کی رہتی ہے وہاں جب کسی لڑکے اور لڑکی کی سگائی کی تجویز ہو تو دونوں کے والدین ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور لڑکی کا باپ ایک موم بتی روشن کرتا ہے اگر لڑکی اس موم بتی کو نہ بجھائے تو منگنی ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ اسے پھونک مار کر بجھا دے تو سگائی نہیں ہو سکتی۔ سرڈین میں اگر کوئی لڑکا اور لڑکی مل کر ایک ہی روٹی کھا لیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں آپس میں محبت کریں گے۔ اس لئے ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب بہادر یار جنگ بہادر

شہاب

ناهید

ناہید

جلد (۹) آذر ۱۳۵۵ف م اکتوبر ۱۹۴۵ء نمبر (۱)

۱۔ فیشن، پر ریحانہ نے اچھی روشنی ڈالی ہے جو لکھا ہے وہ حقیقت سے خالی نہیں، کیونکہ ہمارے سماج کے دل و دماغ پر آج کل فیشن بری طرح قابض ہے، اور ہم اس کے صدقہ میں اپنی قدیم روایات کو فراموش کر رہے ہیں۔ نہ جانے آئندہ فیشن اور کیا دکھائے۔

۲۔ تربیت اطفال۔ ہمارے غور کے قابل ہے، پھر یہ بھروسہ کرنا کہ اولاد کا کردار اچھا ہو۔ ایک بے معنی سی بات ہوگی۔ والدین جب تک کہ تربیت میں خود حصہ نہ لیں ایسی توقع بے سود ہوگی۔

۳۔ جمیلہ بیگم کلکتہ اب نثر سے اکتا کر نظم کی جانب متوجہ ہیں جو کچھ لکھتی ہیں اچھا لکھتی ہیں۔

۴۔ اقبال کا اثر اردو شاعری پر۔ زہرہ سلطانہ نے تفصیلی طور پر روشنی ڈالی ہے اور نمایاں کیا ہے کہ ہمارے شعرا پر اقبال کا اثر کس قدر غالب ہے۔ مضمون سلجھا ہوا ہے آئندہ حصہ میں چند سطور آپ پڑھیں گی۔

۵۔ آذر ۱۳۵۵ف سے دفتر نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ "ناہید" کے علحدہ اشاعت کا طریقہ مسدود کر دیا جائے لیکن اکثر خواتین کے اصرار پر سال حال پھر اس کو جاری کیا جا رہا ہے کہ اس عرصہ میں خواتین کی توسیع اشاعت کی توقعات پوری ہوں۔ اور دفتر مزید اخراجات ایک سال اور برداشت کرنے آمادہ ہے

چندہ وہی سالانہ مع ڈاک دو روپیہ "ب"

فیشن

ریحانہ

تہذیب نو کی بھول بھلیاں بڑی پیچیدہ اور اس کی جکڑ قانون کی گرفت سے زیادہ خوفناک ہوتی ہے جہاں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا جائے اور گرگٹ کی طرح نت نیا رنگ بدلتا رہتا ہے جہاں آدمی اپنی اصلیت کھو کر تصنع و ظاہرداری، نمائش و رنگ آمیزی سیکھتا ہے۔

موجودہ تہذیب نے صورت و سیرت بلکہ فطرت تک کو مسخ کر ڈالا ہے۔ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے جب تک کہ سر کے بالوں سے لے کر ناخنوں تک ہر ہر چیز کو مصنوعی رنگ میں نہ رنگ لو حتّٰی کہ اصلی آواز میں بات چیت کرنا بھی خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے اصلیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تاوقتیکہ آواز میں سریلا پن نہ پیدا کیا جائے۔ اگرچہ کہ وہ دوسروں کے کانوں کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ لیکن کامیابی کی دلیل یہی ہے کسی چیز کو اوس کی خوبی دیکھ کر اچھا نہیں کہا جاتا بلکہ ہر نئی چیز کی تقلید آج کل روز افزوں ہے۔ جب ہنسنا ہی چاہو تو بناوٹی آواز میں مصنوعی قہقہہ لگاؤ یا مصنوعی طور پر منہ بنا کر مسکراؤ، شاید کسی کو دھوکا ہوگا کہ یہ منہ چڑایا جارہا ہے۔ یہاں تک رونا بھی آئے تو وہ تال اور سُر سے خالی نہ ہو اور رونے کا طرز بھی دلکش رہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ رونے کی نقل اتاری جارہی ہے اور دل پر کسی قسم کا رنج واثر نہیں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے جذبات کی طرح رنج وغم کا اظہار بھی مصنوعی طریقہ سے کرنا پڑتا ہے۔ اور اس وقت بھی حسن و سنگھار کا کافی خیال رکھنا لازمی ہے۔ ایک تو رنج وغم کی حالت میں یوں بھی انسان کا حسن مرجھا جاتا ہے۔ اس پر اگر سنگھار بھی نہ کیا جائے تو پھوہڑ پن کے علاوہ اپنی بدصورتی کا بھی سکّہ بٹھانا ہوگا۔

مہذب انسان کو اس کا خوب خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ہر حرکت تہذیب جدید کے موافق اور نت نئے فیشن کے تحت ہو، چنانچہ جب کسی تقریب میں جانا ہو تو گھنٹوں آئینہ کے سامنے اپنی چال ڈھال اور بات چیت کرنے کا ڈھنگ، رونے ہنسنے کے طریقوں وغیرہ کا امتحان کر لینا چاہیئے۔

جب کبھی چلنا ہو تو ایک قیامت ڈھانے والی چال چلنے کی کوشش پیش نظر رہنی چاہیئے۔ ابتداءً کسی قدر راچک کر چلنا چاہیئے۔ گویا گرنے کے قریب ہیں یہ ایسا دلچسپ خرام ناز تھا کہ اس پر صاد کیا گیا اس کے بعد رفتار زمانہ کے ساتھ یہ طرز خرام بھی فرسودہ ہوگیا۔ اس کے بعد تیمور لنگ کا طرز ایسا بھایا کہ سبھوں نے اس کو اختیار کیا۔ بعضوں نے بطور اظہار ہمدردی

استفسار بھی کیا کہ نصیب دشمناں پیر میں لنگ تو نہیں پھر تو ایسی ایسی چالیں چلی گئیں کہ کوا ہنس کی چال بھی بھول گیا۔

فیشن یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بہت سی ادائیں، ہاتھوں کی حرکات۔ چہرہ کے اتار چڑھاؤ وغیرہ میں کافی مشق کی ضرورت ہے۔ موقع اور وقت کی مناسبت سے ترمیم و تنسیخ عمل میں آتی رہنا چاہیئے جہاں کوئی نئی بات نظر آئی اختیار کر لیا اور پرانی کو چھوڑ دیا وغیرہ اس فیشن کی تکمیل میں سینما سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ایکٹرسوں کی حرکات و سکنات اور لباس چال، ڈھال وغیرہ کا بغور مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور گھر آکر آئینہ کے سامنے ان کی نقل اتارنی ضروری ہے لہٰذا ہر فیشن پرست کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ کوئی نیا فلم دیکھنے سے نہ رہ جائے۔ اس قدر معروف زندگی میں نماز بھی پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں نماز پڑھنی آتی کس کو ہے۔ شاید زندگی بھر میں دو ایک مرتبہ کسی موقع پر یوں ہی اٹھک بیٹھک کا موقع ملا ہوگا۔ البتہ جب کوئی مر جائے تو قرآن شریف غلط سلط پڑھنے کا موقع بہم پہنچتا ہے لیکن اس وقت خواہ مخواہ انگریزی کے غلط الفاظ زبان پر آکر تلفظ میں رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ وضو کا ذکر ہی نہیں۔ یہاں یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ غازہ رخسار دھل جائے گا۔ لبوں کی سرخی مٹ جائیگی اور بال پریشان ہو جائیں گے۔ یہ گمان نہ ہونا چاہیئے کہ اس سے دہریت پیدا ہو جائے گی۔ جب کہ دل سے خدا کے وا حد پر ایمان ہے۔ لیکن یہ رنگ برنگی عبادتیں قسم قسم کے مذاہب تنگ نظری اور تعصب کی علامت ہے کہ ہر ایک اپنے مذہب کی لایعنی باتوں کی پیروی کرے اور دوسرے مذاہب سے نفرت۔ یہاں پرانی باتیں ترک کرکے نئی راہیں اختیار کرنے کا دور ہے۔ ترقی کے راستہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ بلکہ ہمیں نہایت وسیع نظر، کشادہ دل ہونا چاہیئے۔ اس میں ہرج کیا بات ہے کہ مسلمان کبھی کبھار پوجا پاٹ میں حصہ لیں اور ہندو مسجدوں میں جاکر نماز پڑھ آئیں۔ آخر سب اسی ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں تو پھر کیوں نہ مختلف مذاہب کے لوگ بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کی عبادت میں شریک ہوکر اپنی آزادخیالی کا ثبوت دیں اگرچہ اس سے نہ کوئی مسلمان ہندو ہوسکتا ہے اور نہ کوئی ہندو مسلمان، کیونکہ ہر ایک اپنے عقاید پر قایم رہے گا۔ اضافہ حسن کے لئے پیشانی پر اگر تلک لگایا جائے تو اس میں مذہب سے انحراف کا سوال ہی پیدا نہ ہونا چاہیئے

زمانہ اب وہ نہیں رہا کہ انسان عبادت میں فضول وقت ضائع کرے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ انسانوں کی مصروفیتیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ پہلے عورتیں گھروں میں بیٹھ کر چرخہ کاتا کرتی تھیں۔ اب انہیں باہر کے کام بھی انجام دینا پڑتے ہیں۔ بیشتر عورتیں اپنی معاش کی آپ کفیل ہیں کلب، سینما، دوستوں کی ملاقات اور سیر و تفریح کے لئے بھی کافی وقت بچانا پڑتا ہے۔ ان حالات میں

عبادت کے لئے وقت کیسے مل سکیگا ۔

تہذیب جدید کے لحاظ سے وہ لباس زیب تن کرنا پڑتا ہے جس کا فیشن زوروں پر ہو چنانچہ آج کل زیادہ تر ساری اور بلاؤز نظر آئیں گے ۔ جدید قسم کے بلاؤز اور ساری کی شکل ہی اور ہوتی ہے ۔ بلاؤز کو اگر نیم واسکٹ کہا جائے تو بجا ہے ۔ کیونکہ اس میں پیٹ اور پیٹھ کا کچھ حصہ اور بازو کھلے رہتے ہیں آج کل ساری پہن کر سر پر اوڑھنا انتہائی بدتمیزی میں داخل ہے ۔ اس سے بالوں کا سنگھار خاک میں مل جاتا ہے لہذا ساری کا آنچل اس طرح ڈال لیا جاتا ہے کہ سر، بازو ، شانے وغیرہ کھلے رہیں اور ساری لانبی ہونی چاہیئے کہ اونچی ایڑی کی گرد پوشی کرتی رہے مفلس سہی لیکن فیشن کے صدقہ میں روزآنہ نئی ساڑیاں خریدنی ضروری ہیں ۔ موقع کی نزاکت کے پیش نظر پورا لباس انگلش ہو تو کوئی ہرج نہیں ۔

بال اس طرح سنوارے جائیں کہ آدھی بھونئیں اور سارے کے سارے کان زلفوں کی تاریکی میں غائب ہو جائیں ۔ مگر چونکہ اب فیشن بدل چکا ہے اسلئے گیسو بریدہ ہونے میں کوئی قباحت نہیں ۔ لیکن یاد رہے کہ فیشن کے مطابق ناخن تقریباً آدھ اینچ بڑے رہیں جنھیں ترشوا کر خوبصورت بنوایا جائے ۔ کیا عجب کہ آئندہ چل کر بالشت بھر لانبے مصنوعی دانت فیشن ایبل لیڈیوں کے منہ سے باہر نکلے ہوئے دکھائی دیں اور ممکن ہے وہ زمانہ بھی آئے کہ عریانی اور درندگی اپنی آخری حد پر پہنچ جائے اور فیشن ایبل مہذب لیڈیاں اپنے لانبے لانبے مصنوعی دانتوں اور ناخنوں سے شیروں کی طرح شکار کر کے کچا گوشت کھانے لگیں ۔ گویا اس وقت تہذیب اپنے اعلیٰ مدارج طے کر چکی ہوگی ۔ اس وقت ہم جیسی ہستیوں کو عجائب گھر میں رکھا جائے گا ۔ اسی کو "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کہہ سکتے ہیں ۔ زمانہ سے الگ تھلگ رہنے کی بیکار کوشش نہ کریں ۔ کم از کم باہر ہی نکل کر دیکھیں کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے ۔ یوں گھونسلے میں بیٹھ کر صحت بگاڑ لینے سے کیا فائدہ ؟ فیشن کے لحاظ سے پردہ نہایت مضر صحت ہے اکثر کھلی موٹروں میں سینما اور کلب جانا مردوں کی نظروں کا نشانہ تہذیب کا بلند معیار ہے ۔ ابتداءً شرم دامنگیر ہوگی مگر رفتہ رفتہ عادت فطرۃ ثانیہ اور حجاب رفع ہو جائیگا ۔ اور کلب میں جوان مردوں کے ساتھ ناچنا عوائد رسمیہ میں داخل ہو گیا ہے ۔

کوئی ظاہر پرست طمع ساز اور بے حیا کے القابوں سے نامزد کرے لیکن کیا جرم ہے انہیں چیزوں سے تہذیب جدید کا اُلّو سیدھا رہتا ہے ورنہ مہذب سوسائٹی میں کوئی پاس بھی پھٹکنے نہیں دیگا ۔ آج کل جو چیزیں عیب میں داخل تھیں وہ سب تہذیب جدید کے لوازمات سے ہیں ۔ حیا اور خودداری تو پرانے زمانہ کے فرسودہ الفاظ ہیں جب کہ عورت مقید اور جاہل تھی ۔ اب عورت آزاد ہے ۔ ان الفاظ کا مفہوم ہی جدا ہو گیا ہے فطرت مسخ اصلیت فنا ہو چکی ہے اور حیا مردہ ۔ اسلئے ایسا اعتراض بے محل مضحکہ خیز اور بے اثر ہے ۔

تربیت اطفال

آصفیہ
خلیل الدین احمد

اولاد کی تربیت ماں کے ذمہ ہوتی ہے کیونکہ اس ہی کی گود سے بچے پل کر بوڑھے ہوتے ہیں۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ بچہ کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے۔ بچہ کی بچپن میں جیسی تربیت کی جائے گی بڑا ہو کر بھی وہ ویسے ہی کردار کا انسان بنے گا۔

اگر بنیاد پائیدار ہو تو عمارت بھی مضبوط رہتی ہے۔ یہی حال بچپن کی تربیت کا ہے جس پر انسانی کردار کے بگڑنے اور بننے کا دارومدار ہوتا ہے ناقص تربیت سے بچوں کے عادات واطوار بگڑ جاتے ہیں اچھی تربیت کیلئے ماں کی خاص نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ ملازمین کے ہاتھوں پرورش پانے والے بچے کبھی اچھے کردار کے حامل نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ بچہ میں نقل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کو جیسا کرتا ہوا دیکھتا ہے خود بھی فوراً وہی کرنے لگتا ہے اور ماں ایک بہترین مثال ثابت ہوسکتی ہے بشرطیکہ وہ خود کو اچھا نمونہ بنا کر بچہ کے سامنے پیش کرے۔ بعض گھروں میں بچے بالکل ہی ملازمین کے سپرد ہوتے ہیں اور ماں سے انھیں کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

جاہل ملازمین کی ناقص صحبت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بچوں میں بعض بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً خود سری۔ ضد۔ بدکلامی اور جھوٹ وغیرہ اور یہ ملازم بچوں کو ڈرا کر ڈرپوک بھی بنا دیتے ہیں۔ جس سے بعض بچے بوڑھے ہو کر بھی بزدل رہتے ہیں اور اکثر والدین خود بھی اپنی غلط تربیت سے بچوں کی عادتیں بگاڑ دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ بچہ نے کسی ناجائز خواہش کے لئے ضد کی تو بجائے روکنے کے فوراً اس خواہش کو پورا کردیا جاتا ہے۔ جس سے بچہ میں ضد کرکے اپنی ہر اچھی و بری بات کو منوانے کی عادت پیدا ہوتی ہے اگر بچہ اپنے سے چھوٹے کو یا ملازم کو کچھ برا بھلا کہے یا مارے اور بڑوں کے ساتھ بے ادبی سے پیش آئے تو تنبیہہ نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی ناسمجھ بچہ ہے۔ بڑا ہونے کے بعد خود ہی سب عادتیں درست ہو جائیں گی مگر ایسا سمجھنا خود والدین کی ناسمجھی ہے کیونکہ ناقص تربیت پا کر چاہے کتنی ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے مگر وہ ابتدائی خامیاں کبھی دور نہیں ہوسکتیں۔

اور اچھی تربیت پانے کے بعد اگر تعلیم نامکمل بھی ہو تو بہت سی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے تربیت کو تعلیم پر فوقیت ہے۔

بہتر تربیت اور اچھی تعلیم پانے کے بعد ہی انسانی فطرت کے اعلیٰ جوہر کھلتے ہیں اور صحیح معنوں میں

بہترین کردار کا حامل ہو سکتا ہے۔

یورپین لوگوں کا اصول ہے کہ وہ بچوں کے خیالات کو دیکھ کر اسی مناسبت سے ان کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستان میں بہت ہی کم گھر ایسے ہوں گے جہاں بچوں کی طبیعت کی مناسبت سے ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے اور والدین پر اس کی بڑی ذمہ داری ہے خصوصاً ماں پر کیونکہ بچوں کی تربیت ماں سے متعلق ہوتی ہے اور باپ سے زیادہ واسطہ نہیں رہتا۔ بعض لوگ تو بچوں کو اسکول میں شریک کرا کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ تعلیم و تربیت دونوں حاصل ہو جائیں گے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اسکول صرف تعلیم کے لئے ہے اور تربیت بہت گھر پر ہی ماں کی نگرانی میں اچھی طرح ہو سکتی ہے۔

جو خواتین اصول تربیت سے ناواقف ہوتی ہیں وہ تو خیر قابل معافی ہیں کیونکہ ان بیچاریوں کو یہ بتایا ہی نہیں جاتا کہ کن اصول پر بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔

مگر بعض خواتین تربیت کے اصول سے واقف ہوتے ہوئے بھی محض اپنے آرام کے خاطر بچوں کو ملازمین پر چھوڑ دیتی ہیں اور اپنی اتنی اہم ذمہ داری سے غفلت کرتی ہیں۔ ایسی ماؤں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کے مستقبل کو پیش نظر رکھ کر بذات خود ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت سے بھی طرح واقف کرایا جائے تا کہ آئندہ ان کی [illegible] پرورش پانے والے بچے ملک و قوم کے لئے اچھے خدمت گزار ثابت ہو سکیں۔

نظم

دیار عشق میں اک صاحب وفا نہ ملا
کسی کی راز محبت کا آشنا نہ ملا

تمام گلشن و صحرا کو غور سے دیکھا
ہوس تمام ملا عشق بے ریا نہ ملا

انہیں نگاہوں سے ہم شعلہ رو بہت دیکھے
جہاں میں ہم کو کوئی قلب باصفا نہ ملا

تلاش جادہ الفت میں ہو کے سرگرداں
نشان راہگزر کا بھی کچھ پتہ نہ ملا

ہمارے دل میں ابھی تک خودی ہے چھائی ہوئی
کہوں تو کیسے کہوں آج تک خدا نہ ملا

جمیلہ عمر مری اس فراق میں گذری!
مگر جہاں میں کوئی مجھ کو ہم نوا نہ ملا

جمیلہ بیگم کلکتہ

اقبال کا اثر اردو شاعری پر

(بسلسلۂ گذشتہ)

ایک جگہ اس مفاسد کا اس طور پر اظہار فرمایا ہے۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ... تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ... کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اسی سے ... قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے

علامہ کی نظر میں وطن پروری جائز اور وطن پرستی ناجائز۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں بیشک وطن کی خدمت کرنا اور وطن سے محبت رکھنا جرم نہیں اور نہ یہ کسی طرح اسلامی اصولوں کے خلاف کہا جاسکتا ہے لیکن موجودہ زمانے میں اس کو مذہب اور اسلام کے بنیادی تصورات کے بالمقابل کھڑا کیا گیا ہے جو کسی طرح ایک مسلمان کے لئے قابل قبول نہ ہونا چاہئیے کیونکہ مسلمان خدا پرست ہے نہ کہ وطن پرست دیکھئے کہ علامہ کی نظر میں یہ فتنہ کس درجہ خطرناک ہے۔

زہرہ سلطانہ

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین وطن ... اس زمانہ میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

اخوت اسلام کے اساسی اصولوں میں سے ہے۔ لیکن وطنیت قطعاً اس کے منافی ہے لہذا اس سے اجتناب لازم ہے۔ فرماتے ہیں۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا ... نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

مغربی اصولوں کے مقابلہ میں اسلام کی غرض و غایت کس خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ علامہ ہی کی زبان سے سنئے۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود ... اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام ... جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

لاہور میں ۱۹۲۲ء کے خطبۂ صدارت میں علامہ کے الفاظ یہ ہیں۔ میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم کا مخالف ہوں اس لئے کہ مجھے اس تحریک میں مادیت اور الحاد کے جراثیم نظر آرہے ہیں اور یہ جراثیم میرے نزدیک دور حاضر کی انسانیت کے لئے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہیں۔ اگرچہ حب وطن ایک فطری امر ہے اور اس لئے انسان کی اخلاقی زندگی کا ایک جزو ہے۔ لیکن جو شئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب

اس کا کلچر اور اس کی ملی روایات ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہئیے اور جن کی خاطر انہیں اپنی جان قربان کرنی چاہئیے۔ وہ خطۂ زمین جس میں وہ رہتا ہے اور جس کے ساتھ عارضی طور پر اس کی روح وابستہ ہو جاتی ہے اس لایق نہیں کہ اسے خدا اور رسول سے برتر قرار دیا جائے۔

اب آپ اقبال کی اس خصوصیت کا ذکر سُنئے جس نے انہیں تمام شعراء سے ممتاز کیا ہے۔ یعنی اقبال قرآن کی روشنی میں۔

علامہ ان بلند و برتر ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے قرآن کریم کو اپنا قبلۂ مقصود قرار دیا۔ چنانچہ ان کا ایمان رہا کہ وہ سوچیں تو اس کی مدد سے سمجھیں تو اس کی روشنی میں دیکھیں تو اسی نور سے اور پرکھیں تو حقائق اسی کسوٹی پر پرکھیں، وہ اس چیز کو قبول کریں جو اس کی رُو سے قبول کئے جانے کی مستحق ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص اس شخص کے مقابلہ میں جس کے سامنے کوئی منزل مقصود نہ ہو۔ جس کی زندگی کا کوئی منتہی نہ ہو، کس قدر بالاتر ہوگا۔ اس کا ہر قدم ایک خاص سمت میں اٹھے گا۔ اس شخص کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد اور وہ مقصد بھی جو اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ قرآن کریم کا متعین فرمودہ ہو۔ اقبال کی قرآن فہمی کی ان بلندیوں کو دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عالم اسلامی نے ایسا شاعر ابتک پیدا نہیں کیا۔ اقبال کو جب تک اس زاویۂ نظر سے نہ دیکھا جائے ان کا کلام کما حقہ سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ پیغام اقبال کو اس روشنی میں دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کے بڑے اہم حقائق اور رادق مسایل کو کس خوبصورتی اور سلاست سے ایک ایک سطر میں حل کر کے رکھدیا ہے۔ شرک کے متعلق ابتک ایک عام عقیدہ یہی رہا کہ پتھر کی مورت کے سامنے سر جھکانے ہی کا نام کفر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر اس طاقت کے نام سر جھکانا شرک جو اللہ کے سوا ہو خواہ وہ کسی سنگ تراش کی رہین منت ہو یا خود ذہن انسانی کی ڈھالی ہوئی۔ انسان کے حجلۂ دماغ میں متعدد قسم کے بت تراشتے رہتے ہیں جن کی وہ پرستش کرتا ہے۔ دولت و ثروت، عزت وجاہ، حکومت و سلطنت، مال و اولاد، غرض کہ اسی قسم کے ہزار ہا لات و منات کے سامنے انسان سر جھکاتا نظر آتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ علامہ اقبال انھیں بتوں کے متعلق فرماتے ہیں۔

مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را	ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

قرآن کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَرَئیتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ وَاَضَلَّهُ اللّٰه عَلٰی عِلم

کیا تونے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے باوجود اس کو علم و عقل کے اسی سیدھے راستہ سے ہٹادیا۔

انسان کی خواہشات اس قدر خطرناک ہیں کہ ان کے غالب آنے کے بعد پھر عقل و علم بھی رہنمائی نہیں کر سکتے ان ہی کی وجہ سے انسان ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر! دست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

یعنی اس کی خواہشات اسے اس قدر گمراہ کر دیتی ہیں کہ ایک زنجیر اگر اس کے پاؤں میں سے نکالی جائے تو وہ دوسری میں اپنا پاؤں الجھا لیتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کرائیں۔

دل میں جب تک حاسد خیالات جمع ہوں پاکیزہ خیالات پرورش نہیں پا سکتے۔ جب تک لوح قلب صاف نہ ہو توحید کے نئے حروف و نقوش اس پر لکھے نہیں جا سکتے بقول علامہ اقبال

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے تیرے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہئے

ظاہر کہ کسی پرانی چیز کو بگاڑ کر ہی نئی چیز کی تعمیر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو خوف باطل کیا کہ ہے غارتگر باطل بھی

اب ان آیات قرآنی کو سنئے اور اس شعر کو سمجھئے۔

قُلْ جاء الحق وَ زَهَقَ الباطِلَ انَّ الباطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ کہئے کہ حق آیا اور باطل غائب ہو گیا۔ باطل تو بنا ہی اس لئے ہے کہ فنا ہو جائے۔

آگے چل کر علامہ فروغ حق کے طریقے بتاتے ہیں۔ سنئے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جان پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

بظاہر یہ پُر شوکت الفاظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے جب کہ نبی کریمؐ کے سامنے کفار وغیرہ حجتیں کیا کرتے تھے تو خداوند کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لئے فرمایا۔

فتمنو الموت ان کنتم صادقین اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔ موت کی تڑپ پیدا کرو۔

قرآن کریم علم کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ سمع اور بصر اور قلب کی گواہی سے حاصل ہوتا ہے ہر علم کے متعلق روز جزا میں پوچھا جائے گا کہ علم کو تسلیم کرنے سے پہلے تم نے سماعت و بصارت تجربات مشاہدات کے ذریعہ سے تم نے جانچ بھی لیا تھا کہ نہیں۔ ان کے خلاف عمل کرنے والے کو قرآن کریم نے جہنمی قرار دیا۔

لَهُمْ قلوبٌ لا يفقهون بها وَلَهُمْ اَعْيُنٌ دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے

لا یبصرون بها ولهم اذانٌ لا یسمعون بها آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اولئك كالانعام بل هم اضل یہ تو بالکل جانور ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ان سے بھی زیادہ بے راہ رو۔

حضرت علامہ اسی قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں۔

دیکھے تو زمانہ کو اگر اپنی نظر سے — افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے
خورشید کرے کسب ضیاء تیرے شرارے — ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہو تیری موج گہر سے — شرمندہ ہو فطرت تیرے اعجاز ہنر سے

اغیار کو افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

غور کیجئے کہ فطرت کی ہر شئے کا مقصد سوائے اس کے کیا ہے کہ وہ انسان کے کام آئے۔ اس کی خدمت کرے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ کائنات کی ہر چیز کا وجود انسان کے لئے ہے نہ کہ انسان دنیا کے لئے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ جائے اس کی تخلیق کا مقصد بلند و بالا ہے اور یہی چیز اس کو تمام نظام کائنات سے ممتاز کرتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

ان ہی کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

ولا تهنوا ولا تحزنوا انتم الاعلون ان كنتم مومنين۔ مت گھبراؤ۔ مت خوف کھاؤ، تم دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔

دوسری جگہ علامہ فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام تو ہے جاوداں تو ہے
تیری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی — جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

طوالت کے خیال سے میں ان چند نمونوں پر اکتفا کرتی ہوں اس قسم کے نمونوں سے کلام اقبال بھرا پڑا ہے۔

اب آپ یہ سُنئے کہ تہذیب مغرب کے متعلق علامہ کا کیا ارشاد ہے۔

تہذیب مغرب۔ بالعموم موجودہ زمانہ میں یورپ سے فارغ التحصیل ہوکر واپس آنے کے بعد لوگوں میں مغرب پرستی بہت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن علامہ اقبال کے ساتھ معاملہ بالکل اس کے برعکس رہا۔ انہیں وہاں سے واپس آنے کے بعد اس پستی کا بہت زیادہ احساس ہوا جو مغربی تہذیب نے ہمارے اندر پیدا کردی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس تہذیب کی بنیاد بے دینی الحاد اور مادہ پرستی پر قایم ہے۔ اس لئے علامہ اس سے سخت بیزار ہیں اور مختلف طریقوں سے اس کی مذمت فرماتے ہیں۔

نگہ کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی   یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے   مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ الا

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی   کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا   دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس   کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

ہدایات۔ علامہ کو چونکہ خداوندکریم علم و حکمت اور نور معرفت عطا فرمایا تھا اس لئے انھوں نے مسلمانوں کی ہدایات کے لئے ایسی عمدہ نصائح قلمبند فرمائی ہیں کہ وہ زندگی میں کامیابی کی ضامن ہیں۔ ان میں حفظ خودی اور عشق کی قدر و منزلت بہت کثرت سے ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

حفظ خودی۔ خودی علامہ کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد ان کی تمام شاعری اور ان کی تمام فکر گردش کرتی ہے۔ انھوں نے بار بار خودی کی حفاظت کرنے کی تاکید فرمائی۔

گرانبہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ   گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

تیری زندگی اسی سے تیری آبرو اسی سے   جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض   نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن   خودی کی موت ہے جس میں وہ سروری کیا ہے

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی   کیا تجھکو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

انسان کے دو قسم کے جذبات ہیں فاعلی اور انفعالی۔ اقبال نے فاعلی جذبات کو اہمیت دی اور بتلایا۔ انسان کی اہمیت اپنی نفی اور اپنے آپ کو بے عمل بنائے رہنے میں نہیں بلکہ اپنی قوتوں کے صحیح استعمال سے اپنی ہستی کو مضبوط کرنا اپنے فاعلانہ جذبات سے قدرت پر فتح یاب ہونا ہے (جیساکہ آج کل برق و نور پر فتح پاکر ہو رہا ہے)۔

عشق کی قدر و قیمت — علامہ کی نظر میں عشق دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور حیات انسانی کی تکمیل کیلئے اشد ضروری چیز ہے۔ علم کی انتہا صورت عشق کو دل میں پیدا کرنا اور دماغ کو دل کا تابع کر کے اپنی اندرونی قوتوں کو پوری طرح ابھرنے کا موقع دینا ہے۔ عشق کا جو مفہوم اردو شاعری میں تھا اس کو اقبال نے یکسر بدل دیا۔ عشق فنا اور اپنے آپ کو مجبور و بیکس کر دینے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اور عاشق کی خصوصیات لاغری دنیا سے گریز کرنا۔ وحشت اور ہر طرف سے ذلیل ہونا تھا۔ لیکن اقبال نے اسی لفظ کو قوت اور بقا کے معنی پہنائے۔ عشق صرف چند عشاق تک ہی محدود سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اقبال نے اسے غیر محدود اور کائناتی کر دیا۔ اس نے بتلایا کہ کائنات کا سارا انتظام فرشتے خدا کا کلام سب کا سب عشق ہے اور اس کی کارفرمائی سارے جہان میں جاری و ساری ہے۔ علامہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی زندگی کی بنیاد عقل کے بجائے عشق پر رکھیں کیونکہ ؎

حزو کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں　　　تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

عقل ناقص اور محدود ہے رہنمائی کا صحیح فرض یہ پورا نہیں کر سکتی۔ انسان کا حقیقی رہنما عشق ہے جو اسے اس کی اصلی منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ عاشق کے مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ علامہ عشق کو معیار ایمان قرار دیتے ہیں۔

اگر ہو عشق تو کافر بھی ہے مسلمانی　　　نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق
دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر　　　نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
عشق دم جبرئیل عشق دم مصطفیٰ　　　عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک　　　عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق　　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہ تو تھے علامہ کے کلام کے وہ چند نمونے جو ان کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لئے پیش کئے گئے ہیں ہر چند کہ اس کوشش نے مجھے اصل موضوع سے بہت کچھ ہٹا دیا ہے۔ لیکن یہ موضوع ہے تو ایسا کہ اس سے سرسری طور پر گذر جانا ممکن نہیں۔ مجھے امید ہے کہ سامعین موضوع کا لحاظ کرتے ہوئے طوالت مضمون کا خیال نہ کریں گے۔

اب میں اپنے عنوان کی طرف رجوع ہوتی ہوں یعنی اقبال نے اردو شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ اس سے پیشتر میں کہہ چکی ہوں کہ ہر بڑا شاعر پہلے دور کو ختم کر کے ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے جو اسی کا دور ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دور دور اقبال ہے۔ آج کل قدیم طرز شاعری کیوں مفقود نظر آرہا ہے۔ گل بلبل کے افسانے اب کیوں نہیں الاپے جاتے

شاعری میں یہ زبردست تغیر کیوں رونما ہوا۔ یہ سب اقبال کی بدولت ہے۔ آج کل بیشتر شعرا اقبال کے خیالات کے ترجمان ہیں۔ اکثر انداز بیان بھی وہی اختیار کر چکے ہیں۔ اقبال کی الفاظ کی بندشیں تو آج کل اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ اکثر نثر میں بھی وہی استعمال ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال کے "شکوہ" کا ایک شعر ہے۔

جراءت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو		شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

چنانچہ آج کل ہر واعظ کی زبان سے دوران وعظ میں پہلے خاکم بدہن سننے میں آتا ہے اور پھر کچھ اور ظاہر ہے کہ قدیم طرز کے شعرا جو اپنی عمر کے بہت سے حصے طے کر چکے ہیں زیادہ متاثر نہیں ہو سکتے۔ جتنے کہ نوجوان شعرا اور ہونے والے شاعر۔ پھر بھی اقبال نے جوش گرامی، حفیظ سیماب پر بھی جو اثر ڈالا ہے وہ بہت ہی قابل لحاظ ہے نوجوان شعرا میں ماہر القادری، نظر حیدر آبادی، احسان دانش، علی اختر، اختر تابش اور کاوش نے اقبال کا اثر قبول کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی پر بھی اقبال کا رنگ بہت کچھ چھایا ہوا ہے۔ امین حزیں سیالکوٹی نے تو ہو بہو اقبالی رنگ قبول کر لیا۔ ان کا مجموعہ کلام گلبانگ حیات بالکلیہ اقبال کے رنگ میں ہے۔

اقبال کے اس رنگ کی جو ماہر القادری نے قبول کیا ہے خصوصیت ہے کہ وہ شعر کی شعریت کو باقی رکھتے ہیں خواہ وہ زندگی کا ترجمان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ طرز بیان کی لطافت استعارہ اور تشبیہ کے صحیح استعمال سے شعر میں ایک ایسا حسن بیان پیدا کر دیتے ہیں کہ خشک سے خشک موضوع دلچسپی اور رنگینی کا جامہ پہن لیتا ہے۔ احسان دانش کو موجودہ نظم گو شعرا میں کافی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ انھوں نے بھی اقبال کا رنگ قبول کیا ہے ان کی نظمیں ان کے ذاتی تجربات حسیات اور تاثرات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کا کلام دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کا مطالعہ یہاں تک کیا ہے کہ وہ ان کے دماغ پر طاری ہی نہیں ہو گیا ہے بلکہ ان کی روح میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ یہ دور حاضر کے تمام اہم مسائل پر زور قلم صرف کرتے ہیں۔ اقبال کی طرح اقتصادیات، معاشرت ان کے پسندیدہ عنوان ہیں۔ مسلمانوں کی پستی کا بہت شدید احساس رکھتے ہیں۔ غرضکہ اقبالیت کے کلام پر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ پیش نظر اس وقت ان کا مجموعہ نظم نہیں ہے۔ ورنہ میں آپ کے سامنے چند نمونے پیش کرتی ہوں جن سے آپ خود اس حقیقت کا اندازہ لگا لیں۔ دو تین غزل کے اشعار ذہن میں محفوظ ہیں، ان میں بھی رنگ اقبال نمایاں نظر آ رہا ہے۔ سنئے۔

(۱) ہر ایک سجدہ ہوا نمایاں خودی کے دامن پر داغ بن کر
خدا سے بھی منحرف ہوں جب سے مآل دیکھا ہے بندگی کا

(۲) وہ عشق خاک عشق ہے وہ حسن خاک حسن		جو قید ہو فسانۂ ہجر و وصال میں

(۳) ازل میں زندگی کی شوخی سے دنیا جگمگا اٹھی		فضا نے قہقہہ مارا مگر انجام انساں پر

علی اختر بھی ان ہی شعرا کی صف میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔جنھوں نے تقلید اقبال کی آبیاری سے اپنے نہال شاعری کو سینچا۔ انھوں نے ابتدا میں غزل کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن جوں جوں زمانہ کے سرد و گرم سے روشناس ہوتے گئے۔غزل کو چھوڑ نظم کو اختیار کرتے گئے۔ان کے کلام کو سلسلہ وار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ جو سب کا بہترین معلم ہے ان کا بھی معلم رہا۔اس پر اقبال کے کلام کا اثر مستزاد ہوا اقبال کے کلام کے حقائق و معارف کا ان پر کھلنا تھا کہ طبیعت نے دفعتہً ایک کروٹ لی اور ان کی شاعری اسی دھارے کے ساتھ بہنے لگی جس طرح کہ اور دیگر معتقدین اقبال کی۔یہاں تک کہ وہ بالکلیہ نظم گو شاعر ہو گئے۔شروع شروع میں انھوں نے عام عنوانات اختیار کئے۔ لیکن آگے چل کر ان کی توجہ فطرت کے سربستہ رموز کی طرف مبذول ہو گئی چنانچہ ایک نظم "رموز" میں ان کا طرز تحریر اقبال سے حیرت انگیز طور پر ملتا ہوا ہے۔اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

دل کی نبضیں نوک خنجر سے کوئی چھوتا نہیں — یہ حدیث آرزو ہے اے نگاہ نکتہ چیں
کون پوچھے گا جہانِ آرزو میں رازِ شوق — آسمانوں سے ادھر آباد ہے میری زمیں
ربط مرگ و زندگی کیا ہے جنوں سے پوچھئے — عقل اس نازک حقیقت کو سمجھ سکتی نہیں
پیر میخانہ میری ہستی پہ حیراں ہو گیا — میں نے جب کرلی گوارا آپ دردِ تہ نشیں

اس آخری شعر میں مسلمانوں کی موجودہ حالت پر بالکل اسی انداز میں کہا گیا ہے جس طرح اقبال کے کلام میں جا بجا اس مضمون کے اشعار نظر آتے ہیں مثلاً

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

احمد ندیم قاسمی بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں۔الفاظ کا جہاں تک تعلق ہے وہ اقبال کے مقلد نظر نہیں آتے۔ لیکن خیالات و احساسات کا تلاطم صاف بتا رہا ہے کہ یہ بھی اقبال کی جادو بیانی کا شکار ہیں کیونکہ اقبال سے بیشتر ادب زندگی کا ترجمان نہ تھا۔یہ انقلابی درس اقبال ہی کا دیا ہوا ہے۔اس شاعر کو موجودہ معاشی مسائل نے بہت متاثر کیا ہے۔چنانچہ وہ اس قسم کے ہولناک مناظر پیش کرنے کا بہت عادی ہے۔میں کہہ چکی ہوں کہ امین حزیں سیالکوٹی نے تو ہو بہو خود کو اقبال کے رنگ میں رنگ لیا۔ان کا مجموعہ کلام گلبانگ حیات بالکلیہ اقبال کے رنگ میں ہے۔ان چند اشعار سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔

(۱) لالے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام کر — جن میں ہو کرب زندگی بہر خدا وہ کام کر
(۲) یہ حقیقت کا آئینہ ہے امیں — اس کا دل نام رکھ دیا کس نے

(باقی دارد)

3238
REGD. M. N. O

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۰۲

فراک
مختلف مضامین کا مجموعہ مصنفہ جہاں بانو صاحبہ ایم۔ اے۔ چھپوائی۔ لکھوائی دیدہ زیب
حجم (۲۰۴) صفحہ قیمت (۱۲/عہ) سو کتابیں یکمشت خریدنے والوں کو (۲۵) روپیہ کمیشن
دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد سے شائع ہوا